UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222750

UNIVERSAL
LIBRARY

22250

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۱۹۱۵۴۳۱۶ Accession No. ۹۱۴۹

Author مولانا سید علی حیدر

Title مراثی انیس حیدر قلی

This book should be returned on or before the date last marked below.

۷۸۶

مقدمہ

اساتذۂ اُردو میں میر ببر علی صاحب **انیس** کے کلام کا پڑھنا سمجھنا پرکھنا اُس سے زبان و طرز بیان کا سیکھنا اُن کا تتبع کرنا اُن کے نقش قدم پر چلنا ہر شاعر و ادیب جو واقعہ نگار ہو سرمایۂ افتخار سمجھتا ہے فارسی ترکیبوں میں اُن کے تصرفات ایک اوستاد زمانہ ہونے کی حیثیت سے اُردو میں قابل استناد ہیں اس اہمیت کو مدنظر رکھ کر جناب سید راس مسعود صاحب بی اے (اکسن) ناظم تعلیمات دولت آصفیہ نے اپنی اسکیم کی دوسری قسط کے طور پر اس کے شایع کرنے کی ضرورت محسوس فرمائی اور اعلیحضرت قدر قدرت ہز ایگزالٹڈ ہائی نس آصف جاہ جہاں پناہ ظل اللہ سپہ سالار مظفر الممالک نظام الملک محی الملۃ والدین نواب **سر میر عثمان علی خاں** بہادر نظام الدولہ فتح جنگ بالقابہ سلطان دکن خلد اللہ ملکہ کے شاہانہ عطیہ سے جو مستند شعرائے اُردو کے کلام کی اشاعت کے لیے سید صاحب موصوف کی درخواست پر مرحمت ہوا تھا **مراثی انیس** کی پہلی جلد شایع ہونے کی نوبت آئی۔ اس جلد میں میر صاحب کی آخر عمر کا کلام ہے اور اس میں بعض وہ مراثی ہیں جو ابتک طبع نہیں ہوئے درحقیقت یہ جلد میر صاحب کے اُس کلام کا مجموعہ ہے جس کی نسبت اُنھوں نے خود فرمایا ہے ؎

گھٹا زور مشق سخن بڑھ گئی
ضعیفی نے ہم کو جواں کر دیا

سید علی حیدر صاحب **نظم** طباطبائی المخاطب بہ نواب حیدر یار جنگ نے اس جلد کی ترتیب و تصحیح کی خدمت کو انجام دے کر ملک پر بالعموم اور اُردو داں پبلک پر بالخصوص احسان فرمایا ہے۔ آغا سید حسین صاحب بی اے صدر مہتمم تعلیمات بلدہ (حیدرآباد) بھی شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے میر صاحب کا اصلی فوٹو عنایت

فرمایا جس کے بغیر یقیناً یہ مجموعہ نامکمل رہتا۔

اُمید تھی کہ اس جلد کے قابل مرتّب مولانا طباطبائی صاحب اس کا مقدمہ لکھ کر اپنے کامل الفن ہونے کی حیثیت سے فن مرثیہ گوئی اور شاعری کے متعلق مفید معلومات کا ذخیرہ جمع کر دینگے جس سے ناظرین کو میر انیس اور ان کی شاعری کے متعلق صحیح رائے قایم کرنے میں مدد ملے گی۔ لیکن ہماری بدقسمتی سے مولانا سے موصوف اپنی پیرانہ سالی اور مصروفیت کی وجہ سے ہماری اس خواہش کو پورا نہ کر سکے اُنھوں نے اپنے ایک نوازشنامہ کے چند فقروں میں اس جلد کی خصوصیات کا جو ذکر فرمایا ہے اس موقع پر اس کا نقل کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"اس جلد میں میر صاحب مرحوم و مغفور کے یا تو وہ مرثیے ہیں جن میں مصنف نے خود صراحتاً یا اشارتاً یہ بات ظاہر کر دی ہے کہ ان کی آخر عمر کا کلام ہے یا وہ مرثیے ہیں جو آخر عمر میں نواب ابو صاحب کی مجلسوں میں جناب مرحوم نے پڑھے اور یہی مرثیے مرحوم کے بستے میں تھے۔ جس دن جناب مرحوم نے منبر و مجلس کو الوداع کہی تینوں صاحبزادے سامنے حاضر تھے چھوٹے فرزند میر محمد صاحب سلیس کو اشارے سے پاس بلایا بستہ اپنے ہاتھ سے اُٹھا کر ان کے ہاتھ میں دیدیا سلیس مرحوم مٹیا برج و حیدرآباد کی مجلسوں میں زندگی بھر یہی مرثیے پڑھا کیے یہ مرثیے منشی نولکشور کو نہ ہاتھ آسکے کہ ان کی مرتّب کی ہوئی جلدوں میں شامل ہو جاتے اس کے علاوہ دو یا تین مرثیے ایسے بھی ہیں جن کا حال مجھے اپنے بزرگوں سے معلوم ہوا کہ یہ جناب مرحوم کے انتہائے مشق کا کلام ہے۔ لوگوں کی خاطر سے مرحوم کو یہ مرثیے بستے سے جدا کرنے پڑے۔"

مولانا طباطبائی کی طرف سے دیباچہ یا مقدمہ لکھنے کے متعلق جب مایوسی ہوگئی تو میں نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی وہ ہذا۔

تمہید

دنیا میں جس قدر روشن دماغ اور مہذب قومیں ہیں وہ قدرتی طور پر شاعری کی دلدادہ ہیں کسی قوم کی تاریخ اُٹھا کر دیکھیے اس میں کچھ نہ کچھ ایسی روایات ضرور ملینگی جن کو نظم کا لباس پہنا کر مشاہیر کے شجاعانہ مذہبی اور اخلاقی کارناموں کو پیش کیا گیا ہے اسی وجہ سے جملہ اصناف سخن میں رزمیہ شاعری کو فوقیت حاصل ہے اور وہ آئندہ نسلوں میں جرات دلیری اور قومی غیرت کے جذبات پیدا کرنے کو صدیوں تک زندہ رہیگی۔ یونانی زبان میں ہومر نے الیڈ[۱] کے صفحات پر رزم و بزم کی معرکہ آرائیاں پیش کی ہیں۔ لاطینی میں ورجل نے ایینڈ[۲] کے اوراق میں اینیس[۳] کے واقعات زندگی کا نقشہ کھینچا ہے سنسکرت میں مہابھارت کے واقعات آج تک انسانی دل و دماغ پر گہرا اثر ڈال رہے ہیں۔ انگریزی میں پیراڈیا نیر لاسٹ[۴] میں ملٹن کے بیانات مہذب سوسائٹیوں کے دل پر نقش بٹھا رہے ہیں کہ جنگ تہذیب و تمدن کے رخ سے نقاب اُٹھا کر انسانوں کو علوم و فنون کا مالک بنا دیتی ہے عربی میں سبعہ معلقہ کے بعض قصاید ایسے ہیں جو دلوں پر برچھی اور بھالے کا کام کر جاتے ہیں۔ فارسی زبان میں شاہنامہ فردوسی کی رزمیہ داستانیں مشہور و معروف ہیں مگر اُردو میں رزمیہ شاعری کا چرچا اس وقت تک نہ ہوا جب تک کہ ہندوستان میں ایک ایسا شاعر پیدا نہ ہوا جس نے اُردو کی رزمیہ شاعری کا نہ صرف پارسی سے رتبہ بڑھا دیا بلکہ یونانی۔ لاطینی اور انگریزی شاعری سے بھی ارفع کر دیا۔ وہ کون تھا **انیس**۔ اُس نے اپنے قلم کے سمند کو اس شان سے میدان میں دوڑایا کہ ہومر۔ ورجل اور کالیداس کی روحیں ٹاپوں سے اُٹھنے والے غبار کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانے لگیں۔ بالمکی اور بیاس اس کی علم برداری پر آفریں کہہ اُٹھے۔ اہل عرب کی رجز خوانی اور شجاعان عرب کے نعرے اس کے شکوہ و تجمل سے خجل ہو گئے اور اُس نے اپنی تیغ زبان کے جوہر سے فردوسی کی فصاحت پر پانی پھیر دیا۔ انیس نے اپنی شاعری کے لیے جس جاں گداز واقعہ کو انتخاب کیا وہ نہ صرف تاریخ کا ایک اہم جزو ہے بلکہ اس کو تہذیب و تمدن مذہب و اخلاق سے خاص تعلق ہے اور ان کی ممدوح وہ مقدس ذات تھی جو ان کی مدح سے مستغنی تھی اس لیے اس کی مدح خود مداح کے لیے باعث مباہات ہے۔ برخلاف اس کے فردوسی نے اپنی قوت مبالغہ اور چرب زبانی کے زور سے اپنے ہیرو کے شجاعانہ

داستانوں میں جان ڈالکر اس پر احسان کیا ہے۔ جیسا کہ وہ خود کہتا ہے ؎

منش کردہ ام رستم داستاں
وگرنہ سیلے بود در سیستاں

خلاصہ یہ کہ میر انیس نے جن واقعات کو نظم کیا ہے ان سے انسانی طبائع ہمیشہ متاثر ہوتی رہینگی اور ایک عظیم الشان مذہبی قربانی کے حالات عالم اسلام کے ستونوں کو جنبش میں لاتے رہینگے۔

میر صاحب کے اسلاف

میر انیس کے اسلاف ہرات کے سادات سے تھے پرانی دلی میں آکر آباد ہوئے۔ میر ضاحک، میر حسن میر خلیق کے نام ادبی دنیا میں آفتاب کی طرح روشن ہیں۔ میر انیس کے دادا **میر حسن** عالم جوانی میں اپنے والد میر ضاحک کے ساتھ دلی سے فیض آباد (اودھ) چلے آئے تھے اور سرفراز جنگ کی سرکار میں ملازم ہوگئے تھے وہاں سے لکھنؤ تشریف لے گئے۔ آپ کی مثنوی "نے نظیر بدمنیر" اردو لٹریچر میں لاجواب چیز ہے جس میں زبان کی سلاست، محاورات کے خوش اسلوبی کے سوا جواہر نگار خامہ سے قدرت کے مرقعے کھینچے گئے ہیں۔

ولادت

میر انیس میر خلیق کے گھر ۱۲۰۱ھ کے قریب فیض آباد میں پیدا ہوئے بعض سوانح نگاروں نے ان کی جائے پیدائش دہلی کو لکھا ہے لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا دہلی میں تو کبھی ان کا جانا بھی ثابت نہیں۔

تعلیم و تربیت

ابتدائی تعلیم فیض آباد میں حاصل کی۔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں میر صاحب اور ان کے بھائی میر مونس لکھنؤ تشریف لائے۔ میر خلیق اور اُن کے منجھلے بیٹے میر انس عرصہ تک فیض آباد میں مقیم رہے میر صاحب کے دیکھنے کو خلیق اور انس دونوں اکثر لکھنؤ آتے جاتے رہے مدت کے بعد لکھنؤ کی کشش میر انس کو بھی فیض آباد سے کھینچ لائی میر خلیق اب بھی فیض آباد ہی میں اپنے بزرگوں کے مکان میں مقیم رہے لیکن خاک اُن کی بھی لکھنؤ ہی کی تھی ان کا انتقال لکھنؤ

میں ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ میر انیس کی مشق سخن اس وقت ترقی پر تھی اپنے مرحوم باپ کی قبر پر مجلسیں کرتے تھے اور ہر مجلس میں نیا مرثیہ پڑھا کرتے تھے۔ مفتی محمد عباس صاحب مرحوم خود فرمایا کرتے تھے کہ صدر امیر صاحب نے ان سے پڑھا تھا۔

علمی معلومات میر صاحب کو ادبی علمی مسایل کی تحقیق اور تدقیق کا بہت شوق تھا۔ چالیس سال کی عمر تک انھوں نے طالب علمانہ زندگی بسر کی وہ عالم نہ تھے لیکن تمام تذکرہ نویس اس بات کے معترف ہیں کہ علمی معلومات اعلیٰ درجہ کی تھی۔ جس طرح میر صاحب کا گھر تعلیم و تربیت کے اعتبار سے ایک علمی درسگاہ کا رتبہ رکھتا تھا اسی طرح علما و فضلا کی سوسایٹی نے ہر علم و فن کے رموز سے آگاہ کر دیا تھا۔ تلوار کی تعریف میں آپ کا ایک مصرع ہے "ہر جزو تن کو لاتیجز نے بنا دیا" ذوق مرحوم فرماتے ہیں ع "جوہر فرد تھے بالفرض تو کیا قیمت"۔ یہ دونوں مصرعے اپنے اپنے مصنفوں کے مبلغ علم کو ظاہر کر رہے ہیں۔ ازرق کے قتل پر میر صاحب فرماتے ہیں ع "لوکو فیو گرا دیا حرف ثقیل کو"۔ یہ مصرعہ خبر دیتا ہے کہ کوفیین و بصریین میں تحقیق زبان و نحو عربی میں جو جو مباحثے ہوئے ہیں وہ سب مصنف کے پیش نظر تھے۔

باپ بیٹے کی اصلاح کا مقابلہ ایک نکتہ کا ذکر ہے کہ خلیق اپنے دونوں بیٹوں انیس اور مونس سے ملنے کے لیے فیض آباد سے لکھنؤ آئے ان کے منجھلے بیٹے مہر علی انس ان کے ہمراہ تھے میر خلیق نے میر انیس سے کہا مہر علی انس نے جو مرثیہ اس سال کہا ہے ذرا اسے سنو اس مرثیہ پر میر خلیق کی اصلاح تھی اور وہ بیٹے سے اس اصلاح کی داد کے طالب تھے چنانچہ انیس نے مرثیہ سن کر بہت داد دی اسی کے ساتھ کہا کہ باوا جان میر نواب (مونس) نے جو مرثیہ اسی سال کہا ہے ذرا اسے بھی سنیے۔ مونس نے مرثیہ سنایا یہ کچھ چیز ہی اور تھا اس پر انیس کی اصلاح تھی۔ اس مرثیہ کو سنانے کی غرض بھی یہی تھی کہ میر خلیق بیٹے کی اصلاح کی داد دیں۔ خلیق چھوٹے بیٹے کے مرثیہ اور بڑے بیٹے کی اصلاح سے بہت خوش ہوئے۔

چھوٹے بھائی کے ساتھ محبت میر صاحب کو اپنے چھوٹے بھائی مونس سے جو بچپن سے میر صاحب کے ساتھ لکھنؤ میں رہے تھے کمال درجہ کی محبت تھی باوجود صاحب اولاد ہو جانے کے

کبھی شفقت مربیانہ میں فرق نہ آیا میر صاحب کے صاحبزادہ میر خورشید علی نفیس ہمیشہ رشک کرتے تھے اور کہا کرتے تھے ہمارا مرثیہ باوا جان کی اصلاح سے مہینوں محروم رہتا ہے اور چھوٹے چچا کے مرثیہ پر فوراً اصلاح ہو جاتی ہے۔

خودداری میر صاحب اس قدر خوددار اور نازک دماغ تھے کہ کوئی شخص آپ سے ملنے کے لیے اُس وقت تک نہ جا سکتا تھا جب تک پہلے سے اس کی ملاقات کا وقت مقرر نہ ہو جائے روزمرہ کے آنے جانے والے بھی اطلاع کے بعد شرف ملاقات حاصل کرتے تھے

خودداری کی ایک مثال حکیم مہدی سے لوگوں نے ذکر کیا کہ انتزاع سلطنت کے بعد سے میر انیس نے مجلسوں میں پڑھنا ترک کر دیا ہے اکثر لوگوں نے بہت کچھ الحاح و اصرار و اظہار شوق کیا مگر بے سود ہوا اور سب کا اشتیاق برسوں سے تقاضا کر رہا ہے کہ پھر میر صاحب کو منبر پر دیکھیں حکیم مہدی نے کہا "دیکھو میں پڑھواتا ہوں انیس کو" رقعے چھپوا کر انھوں نے تقسیم بھی کر دیئے کہ فلاں تاریخ مجلس ہے میر صاحب پڑھینگے میر انیس سے لوگوں نے پوچھا کہ حکیم مہدی کے یہاں آپ پڑھینگے میر صاحب نے کہا میں تو نہیں پڑھونگا حکیم مہدی کو یہ خبر پہنچی اُس نے اس برتے پر میر انیس کو پڑھوانے کا دعوے کیا تھا کہ نجف کے ذاکروں میں مبارک محل میر انیس کو بھی وثیقہ مقرر کر گئی تھیں وہ وثیقہ آج تک جاری تھا مگر میر صاحب خود پڑھنے کو نجف کی مجلس میں نہ جاتے تھے۔

میر نفیس مرحوم کو حکم تھا کہ میرے بدلے تم جا کر پڑھا آیا کرو اس وثیقہ کی تولیت حکیم مہدی کو تھی اُس نے نواب غضنفر الدولہ کی وساطت سے میر صاحب کے پاس کہلا بھیجا کہ میری مجلس میں آپ نہ پڑھینگے تو مبارک محل کے وظیفہ سے ہاتھ دھو بیٹھیے غضنفر الدولہ بہادر میر صاحب کے اخلاص مندوستوں میں تھے اُنھوں نے بہت چاہا کہ میر صاحب کو مجلس پڑھنے پر راضی کر لیں جب دیکھا کہ انھیں بھی اس بات میں کد ہے کہ حکیم مہدی کے یہاں ہرگز نہ پڑھیں گے تو کہدیا کہ نجف سے جو وظیفہ آپ کو ملتا ہے وہ ظالم موقوف کر دے گا میر صاحب کے پاؤں میں زردوزی اوگی تھی کہنے لگے میں جانونگا میری اوگی کے ستارے جھڑ گئے آخر نہ پڑھنا تھا نہ پڑھے وظیفہ کے موقوف ہو جانے کی کچھ پروا نہ کی زوال سلطنت

اودھ کا قلق میر صاحب کو برسوں رہا پڑھنا بلکہ مجلسوں میں جانا تو یک قلم موقوف کر دیا تھا کہتے بھی کم تھے یہ زمانہ مونس کی اصلاح میں بہت صرف ہوتا تھا ایک دفعہ نواب فدا علی خاں کے اصرار پر پڑھنے کا وعدہ کر لیا یہ خبر مشہور ہو گئی لکھنو کے چاروں طرف ریل نکل چکی تھی دور دور سے لوگ اشتیاق میں آتے تھے اہل مجلس منتظر تھے کہ انیس آئے پینس میں سے میر خورشید علی نفیس اُترے انھوں نے منبر پر جا کر پہلے یہ عذر کیا کہ سب حضرات جناب قبلہ و کعبہ کے اشتیاق میں جمع ہوئے ہیں میرے پڑھنے کا کوئی محل نہ تھا لیکن میں معذور ہوں ارشاد ہوا کہ میں اس وقت نہیں جا سکتا تو جا کے پڑھ دے امتثال حکم کرتا ہوں۔ مرثیہ انیس کا بنایا ہوا اور اُن کی نظر میں کھبا ہوا بھی تھا جانتے تھے انیس کے پڑھنے کی ضرورت نہیں یہ مرثیہ نفیس کی زبان سے بھی بے رنگ دکھائے نہیں رہیگا یہی ہوا ہر شخص مجلس سے یہی کہتا اُٹھا کہ میر خورشید علی کبھی ایسا نہیں پڑھے جیسا آج پڑھے اس کے چند مہینے بعد حیدر خاں کے یہاں میر خورشید علی پڑھنے والے تھے حیدر خاں نے آکر قدموں پر ٹوپی رکھدی اور کہنے لگا ایک میری مجلس میں شریک ہو کر مجلس کی رونق اور میری عزت بڑھائے میر خورشید علی صاحب کو آپ نے کبھی مجلس پڑھتے نہیں سنا ہے گا تو نہایت خوشی ہو گی۔ میر صاحب حیدر خاں کی مجلس میں چلے آئے دیکھتے کیا ہیں کہ لکھنؤ کے تمام ماہرین فن اور نقادان سخن کا مجمع ہے اُن لوگوں میں ناسخ والوں میں سے بڑے خوش فکر مرثیہ گو سید صاحب تشنہ بھی موجود تھے ان قدر شناسوں نے کچھ ایسا اصرار اور اشتیاق کا اظہار کیا کہ میر صاحب منبر پر چلے گئے ۱۸۵۵ء کے بعد لکھنؤ میں پہلی مرتبہ میر صاحب نے یہی مجلس پڑھی مگر آدھا مرثیہ پڑھا ہو گا کہ نواب فدا علی خاں پر نظر پڑ گئی کہ وہ بھی مجلس میں موجود ہیں آنکھ ملتے ہی میر صاحب پر حجاب طاری ہوا مرثیہ بند کر کے اہل مجلس سے خطاب کیا کہ باقی مرثیہ نواب فدا علی خاں صاحب کی آئندہ مجلس میں پڑھوں گا پھر نواب فدا علی خاں کے یہاں بھی پڑھے نواب ابو صاحب کی مجلسیں بھی پڑھے یہ میر صاحب کا آخر عمر کا پڑھنا تھا۔

طبعی خصوصیات شہسواری۔ سیف زنی پٹا۔ بانک۔ بنوٹ کے فنون سے بخوبی ماہر تھے۔ ورزش کا شوق آخر وقت تک قایم رہا۔ چند ڈنٹر اور پچاس ساٹھ ہاتھ مگدر ہلا لینا کبھی

ناغہ نہ ہوا۔ میر صاحب کی طبیعت حسن پرستی سے خالی نہ تھی اور وہ حسن پرستی انسانی خوبصورتی تک محدود نہ تھی بلکہ اُن کی نگاہ تمام موجودات عالم میں سے اپنے دل بہلاؤ کا ذریعہ پیدا کرلیتی تھی خوبصورت اور خوشنما پھولوں کو دیکھ کر اُن کا ذوق وجدانی ترقی کرجاتا تھا جمادات، نباتات، حیوانات کے مشاہدہ میں ان کی نظر قدرتی خوبیوں کو پا جاتی تھی۔

حلیہ اور وضع میر صاحب کا قد لانبا تھا۔ سر کے بال باریک اور ملایم۔ چہرہ خوبصورت۔ کتابی۔ رنگ کھلا ہوا گندمی۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ مونچھیں بڑی اور افگندہ مو۔ ڈاڑھی صاف۔ گردن صراحی دار۔ سینہ کشادہ۔ چال نہایت نستعلیق۔ اپنی وضع کے نہایت پابند تھے جو وضع انھوں نے شروع سے اختیار کی تھی وہی آخر دم تک قایم رہی۔ سر پر بیضاوی پنج گوشہ ٹوپی رکھتے تھے اور اپنے سامنے آئینہ رکھ کر جب تک ٹوپی کو درست نہ کرلیتے اور وہ سر پر موزوں نہ معلوم ہوتی ہرگز چین نہ آتا۔ بعض مرتبہ ایک ایک گھنٹہ اس شغل میں صرف ہوجاتا۔ ایک خاص وضع کا گھیردار کرتہ گل پردہ کا انگرکھ زیب جسم فرماتے تھے۔ ڈھیلا پائجامہ پہنتے تھے۔ ہاتھ میں پتلی چھڑی اور سفید رومال ہوتا تھا پاؤں میں لکھنؤ کا زرد مخملی اور اکثر زرد وزی جوتا۔

معاصرین جس زمانہ میں میر انیس لکھنؤ تشریف لے گئے شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش کی غزل سرائی اور میر ضمیر خلیق کی مرثیہ گوئی کے ڈنکے بج رہے تھے۔ میر خلیق نے اپنے پیارے بیٹے کو بھی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے آداب سکھائے اور خاص خاص مجالس میں ان کو اپنے ساتھ لیجانے لگے۔ آخر وہ دن آیا کہ شایقین کے اصرار سے میر خلیق نے انیس کو منبر پر بٹھادیا۔ میر صاحب جب پہلی مرتبہ منبر پر تشریف لے گئے تو اول تو چند لمحہ تک خاموش بیٹھے رہے پھر ایک رباعی پڑھی۔ پڑھنے کے انداز اور جوانی کی آواز نے دلوں پر گھر اثر ڈالا چاروں طرف سے واہ وا اور سبحان اللہ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ آپ نے ایک سلام پڑھا جس نے تمام مجلس کو گرویدہ بنالیا۔ پھر اس شان سے مرثیہ شروع کیا کہ آپ کی فصاحت اور بلاغت نے محفل کو گرما دیا رزم و بزم کی تصویروں پر ارباب سخن غش ہوگئے اور مرثیہ ختم ہونے کے بعد قدرشناس اپنی جگہ سے اُٹھ کر مصافحہ کرنے لگے اور ہاتھ

چومنے لگے۔ خوش نصیب باپ کی زندگی ہی میں آپ کی مرثیہ گوئی کا شہرہ ہوگیا اس وقت جبکہ لکھنؤ میں میر صاحب کے کلام کا چرچا ہو رہا تھا ناسخی گروہ کے بعض شعرا کو ماہرین فن سمجھا جاتا تھا چنانچہ ان لوگوں نے جواب کہنے کی طرف توجہ کی۔ ہرملہ کے تیر مارنے کا ذکر میر علی اوسط رشک نے اس طرح نظم کیا ؎

حلق اصغر باز وئے سرور دلِ زہرا چھدا ۔ ہرن کہاں جنت کہاں اللہ رے پہلے تیر کا

عشق کہتے ہیں ؎

علم کا جب پھر ہرا دوش پر عباس نے کھولا ۔ پکارے جعفر طیار شہپر ایسے ہوتے ہیں

علم کا لچکنا دیکھیے ؎

عالم عجب لچکنے میں ہے آب و تاب کا پنجہ بجھا رہا ہے چراغ آفتاب کا

ان لوگوں نے زمین آسمان کے قلابے ملا دیے مگر میر انیس کا جواب نہ ہوا ؎

انیس کی شاعری کا جو خاص میدان تھا اُس کی ہوا بھی کسی کو نہ لگی تھی حر شہید کا لشکرِ یزید سے

علیحدہ ہونا ایک تصویر ہے جو انیس نے کھینچ دی ہے ؎

کس لشکر بدخو سے بگڑ کر نکل آیا دو لاکھ ستمگاروں سے لڑ کر نکل آیا

تنہا ہوا تلوار پکڑ کر نکل آیا

پھر حر کی آمد لشکرِ یزید میں تصویر نہیں کرامات ہے ؎

زور بازو کا نمایاں تھا بھرے شانوں سے دست فولاد دبا جاتا تھا دستانوں سے

برچھیوں اُڑتا تھا دب دب کے فرس رانوں سے آنکھ لڑ جاتی تھی دریا کے نگہبانوں سے

پسرانِ زینب کی تصویریں دیکھیے ؎

وہ نیچے ہلال کے دم خم پہ جن کو فوق جرات کا جوش تیغ زنی کا دلوں میں شوق

ہنس ہنس کے زخم کھائیں نشانوں کو اس کا ذوق گیسو رخوں پہ۔ کانوں میں سبزے گلوں میں طوق

آنکھیں جو نرگسی ہیں تو رخ پھولے پھالے ہیں تدروں کے منتوں کے مرادوں کے پالے ہیں

پھر دونوں بھائیوں کا ہجوم فوج میں ساتھ چھوٹ جانا اور پھر یکایک مل جانا میر صاحب کی معجز بیانی کا ایک کارنامہ ہے ملاحظہ ہو ؎

وہ چھیڑ کے تازی کو سواروں میں در آیا — دم بھر میں پیادوں کو یہ پامال کر آیا
جب شیر سا پہنچا وہ اُدھر یہ اِدھر آیا — جان آگئی بھائی کو جو بھائی نظر آیا

بچ بچ کے نکلتے تھے جو تیغوں کے تلے سے
اک بھائی لپٹ جاتا تھا بھائی کے گلے سے

لشکر یزید میں کیسے کیسے سنگدل تھے سب جانتے ہونگے مگر انیس نے اُن لوگوں کو آنکھوں سے دکھا دیا ؎

کہتا تھا کوئی تیر کو چلہ میں جوڑ کے — گزرے گا یہ گلا علی اصغر کا توڑ کے
سوئیں گے جب زمین پہ جھولے کو چھوڑ کے — دونوں کڑے اُتار رونگٹے پہنچے مروڑ کے

شاہزادہ علی اکبر کی امام حسین سے رخصت ؎

تسلیم کر کے بولے علی اکبر غیور — لاکھوں برس جہاں میں سلامت ہیں حضور
فرمایا شہ نے خیر اجل بھی نہیں ہے دور — برچھی لگے کے دل پہ خوش آمدید کیا ضرور

پھوپھی کو بھتیجے سے شکایت ہے ؎

کنگھی کسی کے ہاتھ کی بھاتی نہ تھی کبھی — نے میرے لیٹے نیند انھیں آتی نہ تھی کبھی
بے ان کے ماں کی قبر پہ جاتی نہ تھی کبھی — روئیں پسر پہ ان کو رلاتی نہ تھی کبھی

میرے سوا کسی کو کبھی جانتے نہ تھے
جو تھی سو میں تھی ماں کو تو پہچانتے نہ تھے

ہر چند دونوں تھے مرے فرزند خرد سال — پر ان کے آگے اُن کا مجھے کچھ نہ تھا خیال
راتوں کو جب لپٹتے تھے مجھ سے وہ نونہال — میں کہتی تھی یہ ہٹو علی اکبر ہے میرا لال

وہ دونوں مرنے والے تو پہلو میں سوتے تھے

پھیلا کے پاؤں یہ مری چھاتی پہ سوتے تھے

میر انیس کے مقابلہ میں مرزا دبیر بھی حریف بنکر مرثیہ گوئی کے میدان میں نمودار ہوئے۔ اور دونوں کی شہرت حضرت جانعالم محمد واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے گوش گزار ہوئی۔ مفتاح الدولہ کے ذریعہ سے دونوں مرثیہ پڑھنے کے لیے شاہی امام باڑہ میں بلائے گئے پہلے مرزا دبیر وقت پر پہونچے اور حضور میں باریاب ہوکر ایک جانب بیٹھ گئے۔ میر صاحب نے گھڑی گھڑی کی خبریں پہنچنے کا انتظام کر لیا تھا۔ جب آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ مرزا صاحب پہونچ گئے تو اپنے جانے میں قصداً دیر لگانا شروع کر دی۔ یہانتک کہ تمام مجلس حاضرین سے بھر گئی اور وقت معینہ سے کچھ وقت زیادہ آگیا تب شاہی چوبدار حاضر ہوا اور عرض کی کہ مجلس تیار ہے صرف آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ میر صاحب تیار تو تھے ہی پنیس سامنے حاضر تھی اس میں سوار ہوکر روانہ ہو گئے۔ مجلس میں فرش پر پاؤں رکھتے ہی تمام ارباب مجلس تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے میر صاحب سیدھے منبر کی طرف گئے اور اپنے قاعدۂ مقررہ کے موافق منبر کے پاس بیٹھ گئے نواب مفتاح الدولہ سامنے آئے تو اُن سے کہا آپ حضرت جانعالم سے عرض کریں کہ انیس حاضر ہے اور آپ کو دعا عرض کرتا ہے۔ مفتاح الدولہ نے بادشاہ سے اطلاع کی دیکھنے والے حیران رہ گئے کہ میر صاحب کو اپنی خودداری کا خیال کہانتک تھا۔ بادشاہ کی طرف سے پہلے مرزا دبیر کو پڑھنے کا حکم دیا گیا اُنھوں نے بادشاہ کی تعریف میں ایک رباعی پڑھی جس پر چاروں طرف سے آفریں کی صدائیں گونج اوٹھیں پھر میر صاحب کو پڑھنے کے لیے ارشاد کیا گیا۔ اُنھوں نے جناب امیر علیہ السلام کی منقبت میں ایک رباعی پڑھی جس کو سُن کر سامعین پر وجد طاری ہو گیا۔ اس کے بعد سلام شروع کیا جس کا مطلع یہ تھا ؎

غیر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہوکر
مجرئی اپنی ہوا کھوؤں سلیماں ہوکر

لکھنؤ سے باہر کی مجلسیں

لکھنؤ کے علاوہ میر صاحب عظیم آباد الہ آباد وحیدر آباد جانے کا اتفاق ہوا جہاں کہیں بھی آپ نے مرثیہ پڑھا ماہران فن کے دلوں پر

اپنی شاعری کا سکہ بٹھا دیا حیدرآباد میں آج تک یہ روایت مشہور ہے کہ وہاں ایک صاحب نے میر صاحب کی شاعری کی تعریف کرتے ہوئے اُن سے کہا کہ میر کی شاعری کا پایہ بھی آپ کے سامنے پست نظر آتا ہے فرمایا کہ میر غزل کے اُستاد تھے میں ایک مرثیہ گو مجھے اُن سے کیا نسبت اُنھوں نے کہا جناب عالی میرا قول بے دلیل نہیں مقابلہ کر لیجیے میر کا مطلع ہے ؎

"اُوس زلف پہ محو ہو گئے ہم
یعنی سرِ شام سو گئے ہم"

اور آپ (میر انیس) فرماتے ہیں ؎

ایک آہ میں سرد ہو گئے ہم
ٹھنڈی جو ہوا تھی سو گئے ہم

اپنے اور میر تقی کے مطلع کو سُن کر میر صاحب کو جواب دیتے کچھ نہ بن پڑا مسکرانے لگے

میر صاحب کی مرثیہ گوئی کا طرۂ امتیاز اور اس کی مثالیں

میر صاحب کی شاعری پر تنقید کرنا صرف اس شخص کا کام ہے جو خود بھی اس فن کے نکات سے آگاہ ہو لیکن ہر شخص جو ذوق سلیم رکھتا ہے کہہ سکتا ہے کہ اُردو زبان میں اُنھوں نے اس فن کو ایسی ترقی دی کہ ان کا نام اُردو ادب کی تاریخ میں زریں حروف سے لکھا جائیگا۔ مرثیہ گوئی کا فن نیا فن نہیں ہے انسانی نسل کی نشو و نما کے ساتھ ساتھ اس کا بھی وجود پایا جاتا ہے۔ عربی تاریخوں کی ورق گردانی سے پتا چلتا ہے کہ جب قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر ڈالا تو حضرت آدم کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور اس وقت جو الفاظ ان کی زبان سے نکلے اپنی موزونیت کے اعتبار سے وہ شعر کا درجہ رکھتے تھے۔ ایام جہالت کے اکثر مرثیے عربی کی ادبی کتابوں میں موجود ہیں فارسی میں بھی مرثیہ گوئی کا رواج قدیم زمانہ سے پایا جاتا ہے مقبل مخلص محتشم وغیرہ شعرا نے فارسی زبان میں حسرت و یاس کے دردناک مناظر پیش کرنے میں کوئی بات اُٹھا نہیں رکھی ہے اُردو شاعری میں بھی میر انیس کے زمانہ سے قبل مرثیہ گوئی کا پتا چلتا ہے حضرت میر تقی

میر نے اپنے مشہور تذکرہ نکات الشعرا میں یکرنگ معاصر میاں آبرو کی تصنیف سے یہ اشعار درج کیے ہیں جو بطور مرثیے کے لکھے گئے تھے۔

زخمی برنگ گل ہیں شہیدانِ کربلا — گلزار کی نمط ہی بیابانِ کربلا
کھانے چلا ہی زخمِ ستم ظالموں کے ہاتھ — دو ہاتھ زندگی ستی میدانِ کربلا
اندھیر ہی جہاں میں کہ اب شامیوں کے ہاتھ — ہی سر بریدہ شمع شبستانِ کربلا

اشعار مندرجہ بالا سے معلوم ہوتا ہی کہ قدیم اُردو میں جو مرثیے لکھے جاتے تھے بیس تیس بیت سے زیادہ نہ ہوتے تھے پھر ایک ایسا دور شروع ہوا جس میں مراثی مسدس کے طرز پر لکھے جانے لگے اور میر ضمیر و میر خلیق کے زمانہ میں یہ ایک مستقل فن ہو گیا اور آخر میں میر انیس کی طبع رسا نے ترقی دیکر اس کو معراج کمال پر پہونچا دیا۔ اور مرثیہ گوئی کے میدان کو وسیع کر دیا۔ میر صاحب نے مناظر فطرت کے جس حصے پر توجہ کی کمال کر دکھایا مثلاً صبح کا سین انھوں نے اس خوبی سے ناظرین کے سامنے پیش کیا ہی جس سے ظاہر ہوتا ہی کہ شاعر نے صحیفۂ فطرت کو کس قدر گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ کہتے ہیں ؎

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور — دیکھے تو غش کرے ارنی گوی اوج طور
پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور — وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خواں طیور

گلشن خجل تھے وادی مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

اسی مرثیہ کی بیت ہی ؎

طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے سفیر گونج رہے تھے کچھار میں

اس ٹیپ میں میر صاحب نے صبح کی جس کیفیت کو پیش کیا ہی اس کا پورا لطف اسی شخص کو آسکتا ہی جس کو علم الحیوانات تک دسترس حاصل ہی۔ آفتاب کی تمازت کا جو قدرتی اثر انسان حیوان اور جمادات پر ہوتا ہی اس کا بیان جن الفاظ میں فرمایا ہی اس سے بہتر نقشہ کسی دوسرے شاعر کے

قلم سے کھینچنا ناممکن ہے۔ کہتے ہیں ؎

وہ دھوپ کی تیزی غضب لوؤں کا وہ چلنا　　وہ دوپہر اس دشت کی اور دن کا وہ ڈھلنا
ہر ایک بدن سے وہ پسینے کا نکلنا　　اور تن پہ حرارت سے وہ ہتھیاروں کا جلنا
جنگل کے چرندے سبھی جھاڑوں میں پڑے ہیں
اور دھوپ میں پیاسے شہ مظلوم کھڑے ہیں

وہ دھوپ کہ جب برق کے ہرن دھتے ہیں کالے　　اور ہانپتے ہیں شیر زبانوں کو نکالے
گرمی سے دوداوام ہیں منھ آب میں ڈالے　　رہتے ہیں دھریں پاؤں تو پڑ جاتے ہیں چھالے
آہن کی سی شے موم صفت نرم ہوئی ہے
پتھر ہیں چپکتے یہ زمیں گرم ہوئی ہے

ایک موقع پر خوفناک جنگل کا سماں اس طرح بیان کیا ہے ؎

جنگل کی ہوا اور درندوں کی صدائیں　　تھرّاتی تھیں بچوں کو چھپائے ہوئے مائیں
دھڑکا تھا کہ دشت سے نہ جانیں کہیں جائیں　　روتی تھی کوئی اور کوئی پڑھتی تھی دعائیں
گودوں میں بھی راحت نہ ذرا پاتے تھے بچے
جب بولتے تھے شیر تو ڈر جاتے تھے بچے

جس گھر میں اہل بیت اطہار کو یزید نے قید کیا تھا اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے ؎

شکل دل یزید تھا وہ سب مکاں سیاہ　　تاروں کی روشنی کو بھی ملتی تھی راہ
چھایا تھا دل جلی ہوئی انڈوں کا دود آہ　　حجرے سے چشم تر کے نکلتی نہ تھی نگاہ
دیکھے کسی کی شکل کوئی یہ محال تھا
روزن بھی تھا کوئی تو وہ چشم غزال تھا

شب کا تو ذکر کیا ہے کہ لگتا تھا دن کو ڈر　　ظاہر تھے جا بجا حشرات زمیں کے گھر
تھے وقف آشیان ابابیل سقف و در　　نکلا وہ مر کے قید ہوا اس میں جو بشر

گھر تھا اجل کا خانۂ رنج و بلا نہ تھا
برسوں سے واں چراغ کسی شب جلا نہ تھا

سید الشہدا کی سیف زنی کی تعریف میں لکھا ہے ؎

سر گرنے لگے جسم سے چلنے لگی تلوار — چار آئینے میں جا کے نکلنے لگی تلوار
افعی کی طرح زہر اگلنے لگی تلوار — پی پی کے لہو رنگ بدلنے لگی تلوار
پانی نے اثر زہر ہلاہل کا دکھایا
ہر ضرب میں جلوہ حق و باطل کا دکھایا

حضور کا سراپائے مبارک لکھتے ہوئے کس قدر نفیس استعاروں اور تشبیہوں سے کام لیا ہے فرماتے ہیں ؎

وہ ریش پاک اور وہ چہرے کی آب و تاب — نکلا ہے چیر کر شب یلدا کو آفتاب
کچھ جا بجا جو کھل گیا ہے ریش کا خضاب — رخصت ہو رہے ہیں گلے سے شباب
تا وقت عصر اور زمان حیات ہے
اب زندگی میں کوئی نہ دن ہے نہ رات ہے

میدان جنگ کا نقشہ کھینچنے اور یزیدی فوج کے لوگوں کی کیفیت لکھنے میں جو کمال ظاہر کیا ہے اس کا اندازہ اس بند سے ہو سکتا ہے ؎

جنگی وہ رومیوں کے پرے شامیوں کے کل — خوف خدا نہ جن کو نہ اندیشۂ اجل
مکار و اہل نار و دغا باز و پر دغل — شکلیں مہیب دیو سے قد ابروؤں پہ بل
بدخواہ خاندان رسالت پناہ تھے
ایسے جلے ہوئے تھے کہ چہرے سیاہ تھے

علی اکبر کو رن کی اجازت دینے کے موقع پر بی بی زینب کی زبان سے ماں کی فطرتی محبت کا موازنہ پھوپی کی محبت سے کیا ہے وہ قابل ہزار ستایش ہے کہتے ہیں ؎

سچ ہے کہ اُس کی چاہ سے نسبت مجھے کہاں ہوں لاکھ ان کی چاہنے والی وہ پھر ہے ماں
آنکھوں کا نور قلب کی طاقت ہیں جن کی جاں آنچ امتا کی ہے وہ قیامت کہ الاماں

کیا سوچتے ہو صاحبو کچھ تم کو خیر ہے
ماں ہے تو ماں ہے خلق میں پھر غیر غیر ہے

گھوڑے کی تعریف میر صاحب نے اکثر موقعوں پر لکھی ہے لیکن جس طرح ایشیائی شاعر قصیدوں میں اپنے ممدوح کے گھوڑے کی تعریف میں انتہائے مبالغہ سے کام لیکر اپنے کلام کو مبتذل بنا دیتے ہیں اس سے میر صاحب کا کلام مبرّا ہے اور ان کے یہاں بھی مبالغہ ہے لیکن لطف سے خالی نہیں اور اس کی صرف یہ وجہ ہے کہ اس میں بھی اکثر فطرتی مضامین میر صاحب کے قلم سے نکل گئے ہیں مثلاً کہتے ہیں:۔

لکھتا ہے اوہم قلم اب سرعت عقاب نعل اس کے ماہ نو ہیں تو سم رشک آفتاب
پستی میں سیل ہے تو بلندی میں ہے سحاب سرعت میں برق گرم روانی میں جوئے آب

اُڑنے میں اس فرس کو پرندوں پہ اوج ہے
ایک شور تھا قدم نہیں دریا کی موج ہے

سمٹا جما اُڑا ادھر آیا اُدھر گیا چمکا بڑھا جمال دکھایا ٹھہر گیا
تیروں سے اُٹھے برچھیوں سے بے خطر گیا بہم کیا صفوں کو پروں سے گزر گیا

گھوڑوں کا تن بھی ٹاپ سے اس کی نگار تھا
ضربت تھی نعل کی کہ سروہی کا وار تھا

فطری مضامین میں اضطراب استقلال۔ فراق و وصال وفاداری نے ثباتی دنیا۔ انقلاب عالم غرض کوئی مضمون ایسا نہیں ہے جس میں میر صاحب کے قلم نے شیکسپیر اور کالیداس سے زیادہ ڈراما نگاری کی قوت نہ دکھائی ہو اگر یہ قوت میر صاحب کے قلم میں نہ ہوتی تو میر صاحب کو اعلیٰ درجہ کی رزمی شاعر (ایپک پوئٹ[1]) کا مرتبہ حاصل نہ ہوتا۔ میں اس مختصر دیباچہ میں ہر مضمون کے

[1] Epic Poet

بندوں کو مثال میں پیش کروں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائیگی۔ اس لیے میں اس سلسلہ کو ختم کرتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ ناظرین جس وقت ان مراثی کو جو اس جلد اول کے ذریعہ سے ان کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں مطالع فرمائینگے تو وہ خود انصاف سے کہدینگے۔ کہ میر صاحب بلاشبہ فطری شاعر تھے اور ان کی فطرت نگاری دلوں پر ایک خاص اثر ڈالتی ہے اُردو شعرا میں مناظر قدرت کی طرف ان کا میلان طبعی تھا۔ اور فطرت پسند اور فطرت شناس طبیعت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جس چیز کی تصویر کھینچی ہے لاجواب ہے۔ انکا انداز بیان دلکش ہے جس واقعہ کو نظم کیا ہے اس کو ترتیب کے سلسلہ میں ایسا منسلک کیا ہے کہ سبحان اللہ ؎

نظم ہے یہ بادۂ شہوار کی لڑیاں انیس
جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں۔

ایک نئی طرز کی ایجاد سے اُردو شاعری کو فی الواقع آپ نے چار چاند لگا دیے جیسا خود فرما گئے ہیں۔

سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر
مگر ہم نے پلّہ گراں کر دیا
میری قدر کرنے زمین سخن
تجھے بات میں آسماں کر دیا

میر صاحب کے ان اشعار کو شاعرانہ تعلی نہ سمجھنا چاہیئے اس میں بہت کچھ واقعیت موجود ہے اُن کے مراثی پر گہری نظر ڈالنے سے ان کے اس بیان کی کہ ؎

بزم کا رنگ جدا رزم کا میداں ہے جدا
یہ چمن اور ہے زخموں کا گلستاں ہے جدا
فہم کامل ہو تو ہر نامہ کا عنواں ہے جدا
مختصر پڑھ کے رولا دینے کا ساماں ہے جدا

دبدبہ بھی ہو مصائب بھی ہوں توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں رقت بھی ہو تعریف بھی ہو

پورے طور پر تصدیق ہوتی ہے اور بڑے سے بڑے نکتہ چیں کو یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ان کے کلام میں جامعیت کی شان پائی جاتی ہے۔ اور ڈرامانگاری کے اعلیٰ اصول کی پابندی کے ساتھ انھوں نے اُردو زبان کو ایک خاص قسم کی جلا دینے میں کامیابی حاصل کی ہے دیگر شعرا کی نسبت

اُنھوں نے اپنے کلام میں اُردو کے سب سے زیادہ الفاظ خوش سلیقگی اور شائستگی سے استعمال کیے ہیں اور اگر اسی ایک بات کو معیار کمال قرار دیا جائے تو بھی بقول مولانا حالی میر انیس کو اُردو شعرا میں سب سے برتر ماننا پڑے گا۔ مرزا دبیر جن کا ذکر اس مقدمہ میں ایک موقع پر آچکا ہے میر صاحب کے ہمعصر بلکہ مدمقابل مرثیہ گو شاعر گزرے ہیں اور آج بھی ایک گروہ مرزا صاحب کے کلام کو میر صاحب کے کلام پر ترجیح دینے والا ملک میں موجود ہے۔ مولانا شبلی نے اس مضمون پر ایک مستقل کتاب موازنۂ انیس و دبیر لکھ کر اُردو لٹریچر میں ایک مفید اضافہ کیا ہے۔ اس کے بعد دوسری کتاب المیزان لکھی گئی جس میں **موازنۂ انیس و دبیر** کے مصنف کی بعض رایوں پر جو اس نے میر صاحب کے کلام کے متعلق دی ہیں نکتہ چینی کی گئی ہے۔ مولانا آزاد نے تذکرہ آبِ حیات میں مرثیہ گوئی کے ان دونوں پہلوانوں کے متعلق جو فیصلہ کیا ہے وہ یہ ہے:-

"میر انیس صفائی کلام لطف زبان۔ چاشنی محاورہ۔ خوبی بندش حسن اسلوب مناسبت مقام طرز ادا اور سلسلہ کی ترتیب میں جواب نہیں رکھتے مگر مرزا دبیر بھی شوکت الفاظ مضامین کی آمد اس میں جا بجا غم انگیز اشارے اور خونچکاں کنائے، دل گداز انداز کے جو مرثیے کی اصلی غرض ہے بادشاہ تھے"

لیکن ان سب رایوں کے دیکھنے کے بعد بھی ایک غیر جانبدار شخص جو نہ **انیسیوں** میں ہے نہ **دبیریوں** میں وہ صرف اُردو ادب کے گزشتہ موجودہ اور آئندہ حالت پر نگاہ رکھ کر مولانا حالی کی اس رائے سے اتفاق کرنے پر مجبور ہے:-

"میر انیس اُردو شعرا میں سب سے زیادہ برتر تھے" فقط

خاکسار

نظامی عفی عنہ

بدایوں ۲۳ مئی ۱۹۲۶ء

فہرست مراثی

نمبر شمار	مرثیہ کا پہلا مصرعہ	صفحہ
۱	دشتِ وغا میں نورِ خدا کا ظہور ہی	۱
۲	فرزندِ پیمبر کا مدینہ سے سفر ہی	۱۴
۳	سبطِ نبی سے منزلِ مقصد قریب ہی	۳۲
۴	جب کربلا میں داخلہ شاہ دیں ہوا	۴۰
۵	بخدا فارسِ میدانِ تہور تھا حر	۷۵
۶	جب حر کو ملا خلعتِ پرخونِ شہادت	۹۶
۷	دوزخ سے جو آزاد کیا حر کو خدا نے	۱۲۱
۸	جب زلف کو کھولے ہوئے لیلائے شب آئی	۱۴۴
۹	جاتی ہی کس شکوہ سے رن میں حسنؑ کی فوج	۱۷۰
۱۰	جاتا ہی شیر بیشۂ حیدر فرات پر	۱۹۷
۱۱	جس دم حسین دلبرِ شبّر کو رو چکے	۲۱۹
۱۲	جب لشکرِ خدا کا علم سرنگوں ہوا	۲۳۸
۱۳	جب غازیانِ فوجِ حسنؑ نام کر گئے	۲۷۰
۱۴	طے کر چکے حسین جو راہ ثواب کو	۲۹۵
۱۵	اے شمعِ قلم روشنی طور دکھا دے	۳۱۷

نمبر شمار	مرثیہ کا پہلا مصرعہ	صفحہ
۱۶	جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے	۳۳۶
۱۷	جب خاتمہ بخیر ہوا فوجِ شاہ کا	۳۶۵
۱۸	کیا زخم ہے وہ زخم کہ مرہم نہیں جس کا	۳۹۰
۱۹	نمکِ خوانِ تکلم ہے فصاحت میری	۴۱۵
۲۰	نکلی جو رن میں تیغِ حسینی غلاف سے	۴۳۱
۲۱	جب تیغِ یداللہ کھنچی دشت وغا میں	۴۵۰
۲۲	جب قیدیوں کو خانۂ زنداں میں شب ہوئی	۴۶۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرثیہ (۱)

دشت و نما میں نورِ خدا کا ظہور ہے
ذرّوں میں روشنیِ تجلّی طور ہے

اک آفتاب رخ کی ضیا دور دور ہے
کوسوں زمین عکس سے دریائے نور ہے

اللہ رے حسن طبقۂ عنبر سرشت کا
میدانِ کربلا ہے نمونہ بہشت کا

حیراں زمیں کے نور سے ہے رخِ لاجورد
مانندِ کہربا ہے رخِ آفتاب زرد

ہے روکشِ فضائے ارم وادیِ نبرد
اُٹھتا ہے خاک سے تتق نور جائے گرد

حیرت سے حاملانِ فلک اُن کو تکتے ہیں
ذرّے نہیں زمین پہ ستارے چمکتے ہیں

ہے آبِ نہر صورتِ آئینہ جلوہ گر
تاباں ہے مثلِ چشمۂ خورشید ہر بھنور

لہریں بسانِ برق چمکتی ہیں سر بسر
پانی پہ مچھلیوں کی ٹھہرتی نہیں نظر

یہ آب و تاب ہے کہ گہر آب آب ہیں
دریا تو آسمان ہے ستارے حباب ہیں

پرتو فگن ہوا جو رخِ قبلۂ انام
مشہور ہو گئی وہ زمین عرش احتشام

اور سنگریزے دُرِّ نجف بن گئے تمام
صحرا کو مل گیا شرف وادیِ السلام

کعبہ سے اور نجف سے بھی عزت سوا ہوئی
خاکِ اس زمینِ پاک کی خاکِ شفا ہوئی

پھیلا جو نورِ مہرِ امامت دمِ زوال
ذروں سے واں کے آنکھ ملانا ہوا محال

سارے نہالِ فیضِ قدم سے ہوئے نہال
اختر بنے جو پھول تو شاخیں بنی ہلال

پتے تمام آئینۂ نور ہو گئے
صحرا کے نخل سب شجرِ طور ہو گئے

خل تھا زہے حسین کی شوکت زہے وقار
گویا کھڑے ہیں جنگ کو مجنوب کردگار

رخ سے عیاں ہے دبدبۂ شاہ ذوالفقار
ہے نورِ حق جبینِ منور سے آشکار

کیونکر چھپے نہ ماہ دو ہفتہ حجاب سے
چودہ طبق میں نور ہے اس آفتاب سے

یہ روے روشن اور یہ گیسوے مشکفام
یاں شام میں تو صبح ہے اور صبح میں ہے شام

ہالے میں یوں نظر نہیں آتا مہ تمام
قدرت خدا کی نور کا ظلمت میں ہے مقام

زلفوں میں جلوہ گر نہیں چہرہ جناب کا
ہے نصف شب میں آج ظہور آفتاب کا

قرباں کمانِ ابروے مولا پہ جان و دل
گر ماہ نو کہیں تو ہے تشبیہ مبتذل

چشم غزال دشتِ ختن چشم سے خجل
دیکھا جسے کرم سے خطائیں ہوئیں بجل

پتلی بسانِ قبلہ نمانے قرار ہے
گریاں ہیں وہ یہ گردشِ لیل و نہار ہے

رخسار میں ضیا میں قمر سے زیادہ تر
جن پر ٹھہر سکی نہ کبھی شمس کی نظر

ریشِ مخضب اور یہ رخِ شاہ بحر و بر
پیدا ہیں صاف معنی واللیل و والقمر

قرآن سے عیاں ہے بزرگی امام کی
کھائی قسم خدا نے اسی صبح و شام کی

کس منہ سے کیجیے لب جاں بخش کا بیاں
چوسی جنھوں نے احمدِ مختار کی زباں

کیا درِ آبدار ہیں اس دج میں نہاں
گویا کہ موتیوں کا خزانہ ہے یہ دہاں

ذرے زمیں پہ عکس سے سارے چمک گئے
جس وقت یہ کھلے تو ستارے چمک گئے

شمعِ حریم لم یزلی تھا گلوے شاہ
تاریک شب میں جیسے ہویدا ہو نورِ راہ

اے چرخِ بے مدار یہ کیسا ستم ہے آہ
شمشیرِ شمر اور محمدؐ کی بوسہ گاہ

جس پر رسولؐ ہونٹوں کو ملتے ہوں پیار سے
کٹ جائے کربلا میں وہ خنجر کی دھار سے

منظور یاں تھی مدح گلوے شہ امم
یاد آ گئی مگر یہ حدیثِ غم و الم

مسجد میں جلوہ گر تھے رسولِ فلک حشم
ملتے تھے ذکر حق میں لبِ پاک دم بدم

روشن تھے بام و در رخِ روشن کے نور سے
آمنہ بن گئی تھی زمین تن کے نور سے

تھا جو ستوں کہ رکنِ رسالت کا تکیہ گاہ
کرسی بھی اس کی پشت کی تھی ڈھونڈھتی پناہ

تھا جس حصیر پر وہ دو عالم کا بادشاہ
حسرت سے عرش کرتا تھا اس فرش پر نگاہ

اوجِ زمینِ بہشتِ بریں سے دو چند تھا
منبر کا نہ فلک سے بھی پایا بلند تھا

اصحابِ خاص گرد تھے انجم کی طرح سب
تاباں تھا بیچ میں وہ مہِ ہاشمی لقب

سر پر ملک صفات مگس راں تھے دو عرب
جبریلؑ تہ کیے ہوئے تھے زانوئے ادب

خادم بلالؓ و قنبر گردوں اساس تھا
نعلینؐ اس کے پاس عصا اس کے پاس تھا

گیسو تھے وہ مفسرِ واللیل اذا سجا
رُخ سے عیاں تھے معنی والشمس والضحا

وہ ریشِ پاک اور رُخِ سردارِ انبیا
گویا دھرا تھا رحل پہ قرآن کھلا ہوا

اوڑھے سیہ عبا جو وہ عالم پناہ تھا
کعبہ کا صاف حاجیوں کو اشتباہ تھا

پہلو میں بادشاہ کے تھا جلوہ گر وزیر
سردارِ دینؐ علیؑ ولیِ خلق کا امیر

دونوں جہان میں کوئی نہ دونوں کا تھا نظیر
احمد تھے آفتاب تو حیدر مہِ منیر

ظاہر میں ایک نور کا دو جا ظہور تھا
گر غور کیجیے تو وہی ایک نور تھا

مصروفِ وعظ و پند تھے سلطانِ مشرقین
جو گھر سے کھیلنے کھیلتے زہراؑ کے نورِ عین

نانا بغیر دونوں نواسوں کو تھا چین
بڑھ جاتے تھے حسنؑ کبھی آگے کبھی حسینؑ

کہتے تھے دیکھیں کون قدم جلد اٹھاتا ہے
نانا کے پاس پہلے بھلا کون جاتا ہے

وہ گورے گورے چہروں پہ زلفیں ادھر ادھر
کُرتے گلوں میں نور بدن جن سے جلوہ گر

اختر سے وہ چمکتے ہوئے کان کے گہر
رشکِ ہلالِ طوقِ گلے غیرتِ قمر

ہیکل پہ نقش نام خدائے جلیل کے
تعویذ گردنوں میں پر جبرئیلؑ کے

مسجد میں آئے ہنستے ہوئے جب وہ گلبدن
خوشبو سے صحنِ مسجد جامع بنا چمن

تسلیم کو حسینؑ سے پہلے جھکے حسنؑ
خوش ہو کے مسکرانے لگے سرورِ زمن

بڑھ بڑھ کے خم سلام کو چھوٹے بڑے ہوئے
بیٹھے رہے رسولؐ ملک اٹھ کھڑے ہوئے

بیٹوں کو تھا علی کا اشارہ کہ بیٹھ جاؤ
لازم نہیں کہ وعظ میں نانا کو تم ستاؤ

پھیلا کے ہاتھ بولے محمدؐ کہ آؤ آؤ
شبّیرؑ نے کہا ہمیں پہلے گلے لگاؤ

بھائی حسنؑ جو آپ کی گودی میں آئینگے
ہم تم سے نانا جان ابھی روٹھ جائینگے

بولے حسنؑ کہ واہ ہمیں اور کریں پیار
اقرار کر چکے ہیں شہنشاہ نامدار

بولے بچشم نم یہ حسینؑ فلک وقار
دیکھیں تو کون ہوتا ہے کاندھے پہ اب سوار

سب سے سوا جو ہیں سو ہمیں ان کے پیارے ہیں
آگے نہ بڑھیے آپ کہ نانا ہمارے ہیں

بھائی سے تب کہا یہ حسن نے بالتفات
نے وجہ ہم سے روٹھے ہو تم اے مکرمات

نانا ہمارے کیا نہیں سلطان کائنات
ہوتی ہے ناگوار تمہیں تو ذرا سی بات

غصّہ نہ اتنا چاہیے خوش خو کے واسطے
مچلے تھے یونہی بچۂ آہو کے واسطے

یہ سُن کے مُنہ علیؑ کا لگے دیکھنے رسولؐ
ہنسکر کہا یہ دونوں ہیں میرے چمن کے پھول

میں چاہتا ہوں ایک کی خاطر نہ ہو ملول
روئینگے یہ تو گھر سے نکل آئیں گی بتولؑ

ہوئے نہ رنج میرے کسی نورِ عین کو
تم لو حسنؑ کو گود میں میں لوں حسینؑ کو

شبّیرؑ سے پھر اشارہ کیا ہو کے بے قرار
غصّہ نہ کھاؤ پہلے تمہیں کو کریں گے پیار

پھر بولے دیکھ کر سوئے شبّیر نامدار
آ اے حسینؑ آتری باتوں کے میں نثار

چھاتی سے ہم لگائیں گے جان اپنی جانکر
دیکھیں تو پہلے کون لپٹتا ہے آن کر

دوڑے یہ بات سن کے برابر وہ خوش سیر
پاس آئے آفتابِ رسالت کے دو قمر

لپٹے حسینؑ ہنس کے اُدھر اور حسنؑ اِدھر
تھے پانوں زانوؤں پہ تو بالائے دوش سر

نانا کے ساتھ پیار میں دونوں کا ساتھ تھا
گردن میں ایک اُن کا اور اک اُن کا ہاتھ تھا

پھر پھر کے دیکھتے تھے شہنشاہ مشرقین
گہ جانبِ حسنؑ تو کبھی جانبِ حسینؑ

بیٹھے جو زانوؤں پہ وہ زہرا کے نورِ عین
تھا تن کو لطف قلب کو راحت جگر کو چین

جھک کے منہ رسولِ زمن چومنے لگے
اُن کا گلا تو اُن کا دہن چومنے لگے

شبّیر چاہتے تھے کہ چومیں مرے بھی لب
پر کچھ گلے کے بوسوں کا کھلتا نہ تھا سبب

نانا کے منہ کے پاس یہ لاتے تھے منہ کو جب
جھک جھک کے چومتے تھے گلا سیدِ عرب

بھائی کو دیکھ کر جو حسنؑ مسکراتے تھے
غیرت سے اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے

اُٹھے حسین زانوئے احمدؐ سے خشمگیں
غصّہ سے رنگ زرد اور آنکھوں میں آستیں

رُخ پر پسینہ جسم میں رعشہ جبیں پہ چیں
پوچھا کدھر چلے تو یہ بولے کہیں نہیں

گھر میں اکیلے تیوری چڑھائے چلے گئے
دیکھا نہ پھر کے سر کو جھکائے چلے گئے

بیت الشرف میں آئے جو شبّیرِ نامدار
کرتے کو منہ پہ رکھ کے لگے رونے زار زار

دوڑیں یہ کہہ کے فاطمۂ زہرا جگر فگار
ہے ہے حسینؑ کیا ہوا تو کیوں ہے اشکبار

تجھکو رُلا کے غم میں مجھے مبتلا کیا
قربان ہو گئی تجھے کس نے خفا کیا

میرا کلیجہ پھٹتا ہے اے دل ربا نہ رو
زہرا نہ زار جان سے تجھ پر فدا نہ رو

سر میں نہ درد ہو کہیں اے مہ لقا نہ رو
بس بس نہ رو حسینؑ برائے خدا نہ رو

میری طرف تو دیکھو کہ بیتاب ہوتی ہوں
چادر سے منہ کو ڈھانپ کے لو میں ہی روتی ہوں

تو منہ تو کھول اے مرے شبّیرِ خوش خصال
تر ہو گئے ہیں آنسوؤں سے گورے گورے گال

مَل مَل کے پشت دست سے آنکھیں کرو نہ لال
سُلجھاؤں آ ؤ الجھے ہوئے گیسوؤں کے بال

گھر سے گئے تھے ساتھ جدا ہو کے آئے ہو
سمجھی میں کچھ حسن سے خفا ہو کے آئے ہو

تم چپ رہو وہ گھر میں تو مسجد سے پھر کے آئیں
گزری میں کھیل سے مرے بچے کو کیوں رُلائیں

اُن سے نہ بولیو وہ تمھیں لاکھ گر منائیں
لو آؤ جانے دو تمھیں چھاتی سے ہم لگائیں

واری اگر حسنؑ نے رولایا برا کیا
پوچھوں گی کیا نہ میں مرے پیارے نے کیا کیا

بولے حسین ہم تو ہیں اس بات پر خفا
نانا نے چومے بھائی کے ہونٹھ اور مرا گلا

تم اماں جان منہ کو تو سنگھو مرے ذرا
کچھ بوئے ناگوار ہے میرے دہن میں کیا

بھائی کے لب سے اپنے لبوں کو ملاتے ہیں
اب ہم نہ جائینگے ہمیں نانا رلاتے ہیں

منہ رکھ کے منہ پہ بولی یہ زہرا جگر فگار
بوئے گلاب آتی ہے اے میرے گلعذار

چوما اگر گلا تو خفا ہو نہ میں نثار
تم کو زبان چوساتے تھے محبوب کردگار

یہ مشک میں مہک ہے گل یاسمن میں ہے
خوشبو اسی دہن کی تمہارے دہن میں ہے

کہنے لگے حسینؑ یہ ماں سے بچشم نم
کیا جانو تم حسن سے ہمیں چاہتے ہیں کم

یہ کیا انھیں پہ لطف و عنایت ہے دم بدم
معلوم ہو گیا انھیں پیارے نہیں ہیں ہم

رو رو کے جان آج ہم اپنی گوائیں گے
پانی نہ اب پئینگے نہ کھانے کو کھائیں گے

یہ بات سن کے ہو گیا زہرا کا رنگ فق
بولی پسر سے رو کے وہ بنت رسول حق

صدقے گئی کرو نہ کلیجے کو میرے شق
ہے ہے یہ کیا کہا مجھے ہوتا ہے اب قلق

میرا لہو بہے گا جو آنسو بہاؤ گے
کاہے کو ماں جیے گی جو کھانا نہ کھاؤ گے

یہ کہہ کے اوڑھ لی سر پر نور پر ردا
موزے پہن کے گود میں شبیرؑ کو لیا

در تک گئی جو گھر سے وہ دلبند مصطفےٰ
فضہ نے بڑھ کے بوذر سلماں کو دی صدا

پیش نبی حسینؑ کو گود میں لاتی ہیں
ہٹ جاؤ سب کہ فاطمہؑ مسجد میں آتی ہیں

اللہ ری آمد آمد زہراؑ کا بند و بست
ساتوں فلک تھے اوج شرافت سے جس کی پست

احمدؐ کے گرد و پیش سے اٹھے خدا پرست
انساں تو کیا ملک کو نہ تھی قدرت نشست

آئیں تو شاد و شاد رسولؐ زمن ہوئے
گھر میں خدا کے ایک جگہ پنجتن ہوئے

تعظیم فاطمہؑ کو اٹھے سیدالبشر
دیکھا کہ چشم فاطمہؑ ہے آنسوؤں سے تر

خم تھے حسینؑ دوش پہ ماں کے جھکائے سر
تھا اک ہلال مہر کے پہلو میں جلوہ گر

ماں کہتی تھی نہ رو مگر چپ نہ ہوتے تھے
آنکھیں تھیں بند ہچکیاں لیلے کے روتے تھے

گھبرا کے پوچھنے لگے محبوب ذوالجلال
رونا ہے کیوں حسینؑ یہ کیا ہے تمہارا حال

بولیں بتول آج قلق ہے مجھے کمال
رویا ہے یہ حسینؑ کہ آنکھیں ہیں دونوں لال

آتے ہیں ہنستے روتے ہوئے گھر میں جاتے ہیں
شفقت بھی آپ ہی کرتے ہیں آپ ہی رلاتے ہیں

ہاتھوں کو جوڑتی ہوں میں یا شاہ بحر و بر
شفقت کی اُس کے حال پہ ہر دم ہے یہ نظر

رونے سے اس کے ہوتا ہے ٹکڑے مرا جگر
مجھ فاقہ کش غریب کا پیارا ہے یہ پسر

حیدرؑ سے پوچھیے مری عسرت کے حال کو
کس کس دکھوں سے پالا ہے اس نونہال کو

اشک اس کے جتنے ٹپکے ہیں یا شاہِ نیک خو
اُتنا ہی گھٹ گیا ہے مرے جسم کا لہو

روے ہیں پھوٹ پھوٹ کے یہ میرے روبرو
تر ہو گیا ہے آنسوؤں سے چاند سا گلو

دیکھا نہ تھا میں نے جو حال اس کا آج ہے
حضرت تو جانتے ہیں کہ نازک مزاج ہے

شفقت سے آج آپ نے چومے حسنؑ کے لب
بوسہ لیا نہ اُن کے لبوں کا یہ کیا سبب

رُتبے میں دونوں ایک ہیں یا سرورِ عرب
میں سچ کہوں یہ سن کے مجھے بھی ہوا عجب

اس کو جو ہو خوشی تو دل اُس کا بھی شاد ہو
چھوٹے سے چاہیے کہ محبت زیاد ہو

آپ ان کے ناز اُٹھاتے ہیں یا شاہِ بحر و بر
پھر کس سے روٹھیں آپ سے روٹھیں نہ یہ اگر

اکثر انھیں چڑھایا ہے حضرت نے دوش پر
گیسو دئے ہیں ننھّے سے ہاتھوں میں بیشتر

روٹھے تھے یہ سو قدموں پہ سر دھرنے آے ہیں
مُنہ کے نہ چومنے کا گلا کرنے آے ہیں

یہ کہہ کے پھر حسینؑ سے بولیں بچشمِ تر
لو جا کے اب نبی کے قدم پر جھکاؤ سر

آئے حسینؑ ہاتھ جو ننھّے سے جوڑ کر
لے اختیار رونے لگے سیّد البشر

رہ رہ کے دیکھتے تھے علیؑ و بتولؑ کو
نزدیک تھا قلق سے غش آئے رسولؐ کو

تھی آنسوؤں سے ریشِ مبارک تمام نم
فرطِ بکا سے خاک پہ جھکتے تھے دم بدم

گاہے ستون سے لگ کے ہوے رہت گاہ خم
ہر لحظہ اضطراب زیادہ تھا صبر کم

ہو سکتا تھا نہ ضبط شہِ مشرقین سے
روتے تھے بار بار لپٹ کر حسین سے

شبّیرؑ رو کے کہتے تھے نانا نہ روئیے
روئیں گے اب نہ ہم شہ والا نہ روئیے

ملنے لگے گا عرشِ معلّا نہ روئیے
پھٹتا ہے اب ہمارا کلیجا نہ روئیے

سو بار دن میں ہم تو مُنہ اشکوں سے دھوتے ہیں
حضرت ہمارے رونے پہ کو روتے ہیں

گھبرا گئے علیؑ ولی شاہ بحر و بر
کی عرض فاطمہؑ نے جھکا کے قدم پہ سر

بیٹی نثار ہو گئی یا سیّد البشر
کیا وجہ ہی جو آپ ہیں اس طرح نوحہ گر

جلدی بتائیے کہ مجھے تاب اب نہیں
رونا خدا کے دوست کا یہ بے سبب نہیں

حضرت کو علم غیب ہی یا شاہ انس و جاں
آئندہ و گزشتہ کا سب حال ہی عیاں

کیا آئی آج وحی خداوند دو جہاں
ہونا ہی جو حسینؑ پہ مجھ سے کرو بیاں

فاقوں میں کاٹتی ہوں مصیبت جہان کی
کیوں بابا جان خیر تو ہی اس کی جان کی

بولے جگر کو تھام کے محبوب ذوالجلال
تجھ سے سنا نہ جائے گا اے فاطمہؑ یہ حال

کس منہ سے میں کہوں کہ قلق ہی مجھے کمال
زہراؑ شہید ہوں گے تیرے یہ دونوں لال

ماتم کی یہ خبر ابھی جبریلؑ لائے تھے
سارے ملک حسینؑ کے پرسے کو آئے تھے

الماس پی کے ہوئے گا بیجان ترا حسنؑ
یہ وجہ ہی کہ چومتا ہوں اس کا میں دہن

بھر جائے گا کلیجوں کے ٹکڑوں سے سب لگن
ہوگا زمردی ترے اس لال کا بدن

سوئے بہشت جب یہ جہاں سے سدھاریں گے
بدبیش تیر اس کے جنازے پہ ماریں گے

زہرا مجھے کلام کی طاقت نہیں ہی اب
حلق حسینؑ چومنے کا کیا کہوں سبب

اک بن میں تین روز رہیں گے یہ تشنہ لب
کٹ جائے گا گلا یہی خنجر سے ہی غضب

نیزے پہ سر چڑھے گا ترے نور عین کا
گھوڑوں سے روند ڈالیں گے لاشہ حسینؑ کا

روئے خبر یہ کہہ کے جو محبوب ذوالمنن
گھبرا کے منہ حسینؑ کا تکنے لگے حسنؑ

زہراؑ پکاری ہائے لٹے گا مرا چمن
میں مر گئی دہائی ہی یا سرور زمن

یہ کیسی آگ ہی کہ مری کوکھ جل گئی
ہی ہی چھری کلیجے پہ زہراؑ کے چل گئی

فریاد یا نبی شہ ابرار الغیاث
ای مرسلان حق کے مددگار الغیاث

ای بے کسوں کے وارث و سردار الغیاث
ای جز و کل کے مالک و مختار الغیاث

قدرت ہی سب طرح کی شہ مشرقین کو
حضرت سے لونگی اپنے حسنؑ اور حسینؑ کو

کس جرم پر یہ لال مرے قتل ہوں گے آہ
روکر کہا رسولِ خدا نے کہ نے گناہ

کی عرض فاطمہؑ نے کہ اے عرش بارگاہ
بچوں کو میرے کیا نہ ملے گی کہیں پناہ

تلواریں کھینچ کھینچ کے ظالم جو آئیں گے
حضرت نہ کیا نواسوں کو اپنے بچائیں گے

آساں ہی کیا جو قتل کریں گے ستم شعار
کیا شیرِ حق کمر سے نہ کھینچیں گے ذوالفقار

اعدا پہ کیا چلے گا نہ دستِ خدا کا وار
بالوں کو کیا نکھولے گی زہراؑ جگر فگار

ٹکڑے جگر جو ہوے گا مجھ دل دونیم کا
پایہ نہ کیا ہلاؤں گی عرشِ عظیم کا

زہرا سے رو کے کہنے لگے شاہِ نیک خو
بیٹی مجھے ستائیں گے تربت میں کینہ جو

اُس وقت قتل ہوئیں گے یہ دونوں ماں کے رو
دنیا میں جب نہ ہوگا علیؑ اور نہ میں نہ تو

لاشہ پہ بھتیجے کے تو شبیرؑ روے گا
شبیرؑ جب مرے گا تو کوئی نہ ہوے گا

چلائی سر پٹک کے یہ زہرا کہ ہی ستم
پیٹے گا کون تن سے جو نکلے گا اُس کا دم

ماتم کی صف بچھاے گا کون اے شہِ امم
پُرسے کو کون آئے گا اُس کے بچشمِ نم

ہم میں سے ایسے وقت جو کوئی نہ ہوے گا
ہی ہی مرے حسینؑ کو پھر کون روے گا

بچے کی میرے تعزیہ داری کرے گا کون
منہ ڈھانپ ڈھانپ گریہ وزاری کرے گا کون

دریاے اشکِ چشم سے جاری کریگا کون
امداد بعدِ مرگ ہماری کرے گا کون

ہوگا کہاں نبی کے نواسہ کا فاتحہ
شربت پہ کون دیوے گا پیاسے کا فاتحہ

بولے نبی کہ آپ کو زہرا نہ کر ہلاک
فرما چکا ہی مجھ سے یہ وعدہ خدا ے پاک

پیدا کریں گے قوم اک ایسی بروے خاک
جو رات دن رہیں گے اسی غم میں دردناک

بزمِ عزا میں آئیں گے وہ دُور دُور سے
تن خاک سے بنائیں گے دل اُن کے نور سے

ہوگی انھیں سے مجلسِ ماتم کی زیب وزیں
دیں گے انھیں وہ لب کہ رہے جس پہ حسینؑ

آنکھیں وہ دیں گے رونے کو سمجھیں جو فرضِ عین
ہاتھ ایسے غیرِ سینہ زنی ہو جنھیں نہ چین

سامانِ تعزیت کے کبھی کم نہ ہوئیں گے
وہ حشر تک حسینؑ کے ماتم میں روئیں گے

ہوگا عیاں فلک پہ محرم کا جب ہلال
رختِ سیاہ پہنیں گے بر میں وہ خوش خصال

کھولیں گی بی بیاں بھی سب اپنے سروں کے بال
ہر گھر میں ہوگا شور کہ ہے ہے علی کا لال

لیں گے صلہ میں خلد ترے نورِ عین سے
آنسو عزیز وہ نہ کریں گے حسینؑ سے

پیاسا شہید ہوگا جو تیرا یہ دلربا
مومن سبیلیں رکھیں گے پانی کی جا بجا

ہووے گی شاد روحِ شہیدانِ کربلا
بھر بھر کے آبِ سرد پکاریں گے برملا

محبوبِ کبریا کے نواسے کی نذر ہے
پیاسے نہ جائیو کہ یہ پیاسے کی نذر ہے

کہنے لگی نبیؐ سے بتولِ فلک جناب
ہے ہے میں کیا کروں مرے دل کو نہیں ہے تاب

اے بادشاہ کون و مکاں مالک الرقاب
درگاہ حق میں آپ کی ہے عرض مستجاب

کیجے دعا کہ خالقِ اکبر مدد کرے
اللہ یہ بلا مرے بچے کی رد کرے

بیٹی سے رو کے کہنے لگے شاہ کائنات
روح الامین نے مجھ سے تو یہ بھی کہی ہے بات

چاہو تو رد کرے یہ بلا ربِ پاک ذات
لیکن نہ ہووے گی مری امت کی پھر نجات

محبوبِ حق نثار ترے نورِ عین پر
موقوف ہے یہ امر تو قتلِ حسین پر

اللہ رے صبر دخترِ محبوبِ کردگار
امت کا نام سُن کے جھکایا سر ایک بار

خوشنود ہو کے کہنے لگے شاہِ ذوالفقار
صدقے حسنؑ حسینؑ تصدق علیؑ نثار

اس راہ میں نہ مال نہ دولت عزیز ہے
پیارے پسر نہیں ہیں امت عزیز ہے

کہنے لگے حسینؑ سے پھر شاہِ بحر و بر
بتلا مجھے کہ کیا تری مرضی ہے اے پسر

نانا سے بولے چھوٹے سے ہاتوں کو جوڑ کر
امت کے کام آئے تو حاضر ابھی ہے سر

وعدہ کو ہم نہ بھولیں گے گو خرد سال ہیں
جھوٹے نہیں ہیں مخبرِ صادق کے لال ہیں

روتے ہیں آپ کس لیے یا سیدِ امم
راضی ہیں ہم پہ راہِ خدا میں ہوں جو ستم

تلواریں بھی چلیں تو نہیں مارنے کے دم
امت پہ اپنے سر کو تصدق کریں گے ہم

ہم راست گو ہیں بات پہ جس وقت آتے ہیں
کہتے ہیں جو زبان سے وہی کر دکھاتے ہیں

بچپن میں جو زبان سے کہا تھا کیا وہ کام
گردن جھکائے برچھیاں کھایا کیے امام

تینیں علیؑ کے لال کے شانے پہ چل گئیں
مینہ کی طرح برسنے لگے شاہ دیں پہ تیر

دامن پہ تیر جیب پہ تیر آستیں پہ تیر
داغوں سے خون کے خجلتِ بدن لالہ زار تھا

تر تھی لہو میں زلفِ شکن در شکن جدا
درپے تھے نیزہ دار جدا تیغ زن جدا

سیپارہ تھا نہ صدر فقط اُس جناب کا
کرتا تھا وار برچھیوں والوں کا جب پرا

نیزوں میں خوں نبیؐ کے نواسہ کا تھا بھرا
تھیں سختیاں ستم کی شہِ خوش خصال پر

تھے دو ہزار جسم شہ بحر و بر پہ زخم
گردن پہ زخم سینہ پہ زخم اور کمر پہ زخم

گھوڑے پہ گہہ سنبھلتے تھے گہہ ڈگمگاتے تھے
گھوڑے پہ جب سنبھلنے کی مطلق رہی نہ تاب

گرنے لگا جو خاک پہ وہ آسماں جناب
غل تھا کہ خاک پر شہِ کون و مکاں گرا

جلتی ہوئی زمین پہ تڑپنے لگے امام
اُس وقت شمر سے یہ عمرؓ نے کیا کلام

ڈریو نہ سن کے فاطمہ زہرا کی آہ کو

جس وقت رن میں ٹوٹ پڑی شہ پہ فوجِ شام
خون میں قبا رسولؐ کی تر ہو گئی تمام

چھاتی کے پار نیزوں کی نوکیں نکل گئیں
تھرا رہے تھے لگ کے تنِ نازنیں پہ تیر

پہلو پہ تیغ سینہ پہ نیزہ جبیں پہ تیر
شکلِ ضریحِ سینۂ اقدس نگار تھا

مجروح لعلِ لب تھے جدا اور دہن جدا
کٹ کٹ کے ہو گیا تھا ہر اک عضوِ تن جدا

پرزے ورق ورق تھا خدا کی کتاب کا
تینوں سے دم بھی لینے کی مہلت نہ تھی ذرا

شمشیر و تیر و نیزہ و خنجر کے مار را
چلتے تھے سنگ فاطمہ زہرا کے لال پر

ماتھے پہ زخمِ تیر کے تینوں کے سر پہ زخم
اور اس کے ماورا تھے بہتر جگر پہ زخم

غش آتا تھا تو ہر قدم پہ سر کو جھکاتے تھے
ہاتھوں سے باگ چھٹ گئی اور پاؤں رکاب سے

مرقد میں نے قرار ہوئی روحِ بوتراب
بس اب زمیں اُلٹ گئی اور آسماں گرا

بیکس پہ ظالموں نے کیا اور اژدہام
ہاں تن سے جلد کاٹ سر سرورِ انام

گل کر دے شمعِ قبرِ رسالت پناہ کو

یہ سُنتے ہی چڑھائی ستمگر نے آستیں
خنجر کمر سے کھینچ کے آگے بڑھا لعین

تھے قبلہ رو جھکے ہوئے سجدے میں شاہ دیں
لب ہلتے دیکھے شاہ کے آیا وہ جب قریں

سمجھا کہ تشنگی سے جو صدمے گذرتے ہیں
اس وقت بد دعا مجھے شبّیر کرتے ہیں

جھک کر قریب کان جو لایا تو یہ سُنا
حق میں گناہ گاروں کے کرتے ہیں شہ دعا

جاری زبانِ خشک پہ یہ ہی کہ ای خدا
کر حاجتوں کو میرے محبّوں کی تو روا

شیعوں کا حشر روز جزا میرے ساتھ ہو
میرا یہ خوں بہا ہی کہ ان کی نجات ہو

یہ سن کے مستعد ہوا وہ شہ کے قتل پر
نا نور کھا حسینؑ کے سینہ پہ نے خطر

گردن پہ پھیرنے لگا خنجر جو بد گہر
آئی صدا علیؑ کی کہ ہی ہی مرے پسر

زہرا پکاری کچھ بھی نبی سے حجاب ہی
ظالم یہ بوسہ گاہِ رسالت مآب ہی

کیوں ذبح میرے لال کو کرتا ہی نے گناہ
کیوں کاٹتا ہی میرے کلیجے کو روسیاہ

کشتی کو اہلبیتِ نبیؐ کی نہ کر تباہ
میں فاطمہ ہوں عرش ہلے گی میری آہ

ہوے گا حشر قتل جو یہ نے وطن ہوا
یہ مر گیا تو خاتمۂ پنجتن ہوا

آواز اپنی ماں کی یہ زینب نے جب سنی
دوڑی نکل کے خیمہ سے سر پیٹتی ہوئی

دیکھا کہ ذبح کرتا ہی حضرت کو وہ شقی
سر پیٹکر یہ کہنے لگی وہ جگر جلی

ہی ہی نہ تین روز کے پیاسے کو ذبح کر
ظالم نہ مصطفےٰ کے نواسے کو ذبح کر

بانو پکارتی تھی یہ کیا کرتا ہی لعین
پیاسا ہی تین روز سے حیدر کا جانشین

چلّاتی تھی سکینہ کہ جینے کی میں نہیں
بابا کو ذبح کرتا ہی کیوں ای عدوے دین

خنجر نہ پھیر چاند سی گردن پہ رحم کر
بابا کو چھوڑ دے مرے بچپن پہ رحم کر

زخموں سے چور چور ہی زہرا کا یادگار
جس چھاتی پر میں سوتی تھی اس پر ہی تو سوار

بابا کے حلق پر نہ پھرا اب چھری کی دھار
بدلے پدر کے سر کو مرے تن سے تو اتار

سیّد پہ تشنہ لب یہ ستم اس قدر نہ کر
پوتی ہوں فاطمہ کی مجھے بے پدر نہ کر

رو کر بیان یہ کرتی تھی وہ سوختہ جگر
دیکر دہائی اہل حرم پیٹتے تھے سر

کرتا تھا ذبح شہ کو وہاں شمر بد گہر
فرماتے تھے یہ شاہ کہ پیاسا ہوں رحم کر

پانی دیا نہ ہائے نبی کے نواسے کو
جلّاد ذبح کرنے لگا بھوکے پیاسے کو

آخر سر امام امم تن سے کٹ گیا
چلّا کے فاطمہؑ نے یہ زینب کو دی صدا

میدان سے جلد لیکے سکینہ کو گھر میں جا
لے جرم کٹ گیا ترے ماں جائے کا گلا

مارا ظلم شمر نے پیاسے کو جان سے
میں لٹ گئی حسینؑ سدھارے جہان سے

بس اے انیسؔ بزم میں ہے نالہ و فغاں
پوچھ اُن کے دل سے جو ہیں سخن فہم نکتہ داں

حق ہے سُنا نہیں کبھی اس حسن کا بیاں
گویا کہ یہ خلیق کی ہے سر بسر زباں

سچ ہے کہ اس زبان کو کوئی جانتا نہیں
جو جانتا ہے اور کو وہ مانتا نہیں

مرثیہ (۲)

فرزند پیمبر کا مدینے سے سفر ہے
درپیش ہے وہ غم کہ جہاں زیر و زبر ہے
گلرو صفت غنچہ کمر بستہ کھڑے ہیں
آراستہ ہیں بہر سفر سرو قبا پوش
یاران وطن ہوتے ہیں آپس میں ہم آغوش
منہ ملتا ہے رو کر کوئی سرور کے قدم پر
عباسؑ کا منہ دیکھ کے کہتا ہے کوئی آہ!
کہتے ہیں گلے مل کے یہ قاسمؑ کے ہوا خواہ
ہم لوگوں سے شیریں سخنی کون کرے گا
روتے ہیں وہ جو عون محمدؐ کے ہیں ہمسن
اس داغ سے چین آئے ہمیں یہ نہیں ممکن
تم حضرت شبیرؑ کے سایہ میں پلے ہو
ہمجولیوں سے کہتے تھے وہ دونوں برادر
پالا ہے ہمیں شاہ نے ہم جائیں نہ کیونکر
وہ دن ہو کہ ہم حق غلامی سے ادا ہوں
رخصت کے لیے لوگ چلے آتے ہیں باہم
ایسا نہیں گھر کوئی کہ جس میں نہیں ماتم
خدام کھڑے پیٹتے ہیں قبر نبیؐ کے

سادات کی بستی کے اجڑنے کی خبر ہے
گل چاک گریباں ہیں صبا خاک بسر ہے
سب ایک جگہ صورت گلدستہ کھڑے ہیں
عمامے سروں پر ہیں عبائیں سبر دوش
حیران کوئی تصویر کی صورت کوئی خاموش
گر پڑتا ہے کوئی علی اکبرؑ کے قدم پر
اب آنکھوں سے چھپ جائے گی تصویر یداللہ
واللہ دلوں پر ہے عجب صدمۂ جاں کاہ
یہ انس یہ خلق حسنی کون کرے گا
کہتے ہیں کہ مکتب میں نہ جی بہلے گا تم بن
گرمی کا مہینہ ہے سفر کے یہ نہیں دن
کیوں دھوپ کی تکلیف اٹھانے کو چلے ہو
ہاں بھائیو تم بھی ہمیں یاد آؤ گے اکثر
ماموں رہیں جنگل میں تو اپنا ہے وہی گھر
تم بھی یہ دعا مانگو کہ ہم شہ پہ فدا ہوں
ہر قلب حزیں ہے تو ہر اک چشم ہے پرنم
غل ہے کہ چلا دلبر محمدؐ و عالم
روضہ پہ اداسی ہے رسول عربی کے

ہو جب سے کھلا حالِ سفر بند ہو بازار
یہ جنسِ غم ارزاں ہو کہ روتے ہیں دکاندار

خاک اڑتی ہو ویرانیِ منزل کے ہیں آثار
ہر کوچے میں ہو شور کہ ہو ہو شہ ابرار

اب یاں کوئی والی نہ رہا آہ ہمارا
جاتا ہو مدینے سے شہنشاہ ہمارا

تدبیرِ سفر میں ہیں اِدھر سبطِ پیمبرؐ
گھر میں کبھی آتے ہیں کبھی جاتے ہیں باہر

اسباب نکلواتے ہیں عباسِ دلاور
تقسیمِ سواری کے تردد میں ہیں اکبرؑ

شہ کو جنھیں لیجانا ہو وہ پاتے ہیں گھوڑے
خالی ہوا اصطبل چلے آتے ہیں گھوڑے

حاضر درِ دولت پہ ہیں سب یاور و انصار
کوئی تو کمر باندھتا ہو اور کوئی ہتھیار

ہودج بھی کسے جاتے ہیں محمل بھی ہیں تیار
چلاتے ہیں دربان کوئی آئے نہ خبردار

ہر محمل و ہودج پہ گھٹا ٹوپ پڑے ہیں
پردے کی قناتیں لیے فرّاش کھڑے ہیں

عوراتِ محلہ چلی آتی ہیں بصد غم
کہتی ہیں یہ دن رحلتِ زہرا سے نہیں کم

پُرسے کی طرح رونیکا غل ہوتا ہو ہر دم
فرش اُٹھتا ہو کیا بچھتی ہو گویا صفِ ماتم

غل ہوتا ہو ہر سمت جدا ہوتی ہو زینب
ہر اک کے گلے ملتی ہو اور روتی ہو زینب

لے لے کے بلائیں یہی سب کرتی ہیں تقریر
اس گرمی کے موسم میں کہاں جاتے ہیں شبّیرؑ

سمجھاتی نہیں بھائی کو اے شاہ کی ہمشیر
مسلم کا خط آئے تو کریں کوچ کی تدبیر

للہ ابھی قبرِ پیمبرؐ کو نہ چھوڑیں
گھر فاطمہؑ زہرا کا ہو اس گھر کو نہ چھوڑیں

وہ گھر ہو ملک رہتے تھے جس گھر کے نگہبان
کیوں اپنے بزرگوں کا مکاں کرتے ہیں ویران

کوفے کی بھی خلقت تو نہیں صاحبِ ایمان
بی بی پہ مدینے کی تباہی کا ہو سامان

ایک ایک شقی دشمنِ اولادِ علیؑ ہو
شمشیرِ ستم واں سرِ حیدر پہ چلی ہو

اُجڑے گا مدینہ جو یہ گھر ہوے گا خالی
بربادیِ یثرب کی بنا چرخ نے ڈالی

کیا جانیں پھر آئیں کہ نہ آئیں شہِ عالی
حضرت کے سوا کون ہو اس شہر کا والی

زہرا ہیں نہ حیدر نہ پیمبر نہ حسنؑ ہیں
اب اُن کی جگہ آپ ہی یا شاہِ زمن ہیں

گرمی کے یہ دن اور پہاڑوں کا سفر آہ
ان چھوٹے سے بچوں کا نگہبان ہے اللہ

رستے کی مشقت سے کہاں ہیں ابھی آگاہ
ان کو تو نہ لیجائیں سفر میں شہ ذیجاہ

قطرہ بھی دمِ تشنہ دہانی نہیں ملتا
کوسوں تلک اس راہ میں پانی نہیں ملتا

مُنہ دیکھ کے اصغر کا چلا آتا ہے رونا
آرام سے مادر کی کہاں گود میں سونا

جھولا یہ کہاں اور کہاں نرم بچھونا
لکھا تھا اسی سن میں مسافر انھیں ہونا

کیا ہوگا جو میدان میں ہو گرم چلے گی
پھول سے کملائیں گے ماں ہاتھ ملے گی

ان بیبیوں سے کہتی تھی یہ شاہ کی ہمشیر
ہنھوں میں ثیرب سے لیے جاتی ہے تقدیر

اس شہر میں رہنا نہیں ملتا کسی تدبیر
خط پہ خط آئے ہیں کہ مجبور ہیں شبیر

مجھکو بھی ہے سنج ایسا کہ کچھ کہہ نہیں سکتی
بھائی سے جدا ہو کے مگر رہ نہیں سکتی

اماں کی لحد چھوڑ کے میں یاں سے نجاتی
فاقے بھی اگر ہوتے تو غم اس کا نہ کھاتی

بھائی کی طرف دیکھ کے شق ہوتی ہے چھاتی
نے جائے مجھے بات کوئی بن نہیں آتی

ظاہر میں تو مامین لحد سوتی ہیں اماں
میں خواب میں جب دیکھتی ہوں روتی ہیں اماں

ہے روح پہ اماں کے قلق کرتی ہیں زاری
سرہانے میں نے انھیں دیکھا کئی باری

روداد بیاں کر گئی ہیں مجھ سے وہ ساری
فرماتی تھیں بھائی سے خبردار میں واری

غمخوار ہے تو اور خدا حافظِ جاں ہے
نہ باپ ہے سر پر مرے بچے کے نہ ماں ہے

یاد آتی ہے ہر دم مجھے اماں کی وصیت
کچھ جان کی تھی فکر نہ اُن کو دمِ رحلت

آہستہ یہ فرماتی تھیں با صد غم و حسرت
شبیر سدھارے جو سوے وادیِ غربت

اُس دن مری تربت سے بھی منہ موڑیو زینب
اس بھائی کو تنہا نہ کبھی چھوڑیو زینب

اماں کی وصیت کو بجا لاؤں نہ کیوں کر
گھر بھائی سے تھا بھائی نہ ہو تو کہاں گھر

دو بہنیں ہیں ماں جائیاں اور ایک پدر
رسی سے بندھیں ہاتھ کہ بلوے میں کھلیں سر

جو ہو سو ہو بھائی کے ہمراہ ہے زینب
اِس کوچ کے انجام سے آگاہ ہے زینب

یہ کہتی تھی زینبؑ کہ پکارے شہ عادل
تیار ہیں دروازے پہ سب ہودج و محمل

طے شام تلک ہوگی کہیں آج کی منزل
رخصت کرو لوگوں کو بس اب رونے سے حاصل

چلتی ہے ہوا سرد ابھی وقت سحر ہے
بچے کئی ہمراہ ہیں گرمی کا سفر ہے

رخصت کرو اُن کو کہ جو ہیں ملنے کو آئے
کہدو کوئی گہوارۂ اصغرؑ کو بھی لائے

نادان سکینہ کہیں آنسو نہ بہائے
جانے کی خبر میری نہ اصغرا کہیں پائے

ڈر ہے کہیں گھبرا کے دم اس کا نہ نکلجائے
باتیں کرو ایسی کہ وہ بیمار بہل جائے

رخصت کو ابھی قبرِ پیغمبرؐ پہ ہے جانا
کیا جانیے پھر ہو کہ نہ ہووے مرا آنا

اماں کی لحد پر ہے ابھی اشک بہانا
اُس مرقدِ انور کو ہے آنکھوں سے لگانا

آخر تو لیے جاتی ہے تقدیر وطن سے
چلتے ہوئے ملنا ہے ابھی قبرِ حسنؑ سے

سُن کر یہ سخن بانوئے ناشاد پکاری
میں لُٹتی ہوں کیسا سفر اور کیسی سواری

غش ہوگئی ہے فاطمہ صغرا مری پیاری
کس کے لیے کرتے ہیں سب گریہ وزاری

اب کس پہ میں اس صاحبِ آزار کو چھوڑوں
اس حال میں کس طرح سے بیمار کو چھوڑوں

ماں ہوں میں کلیجہ نہیں سینہ میں سنبھلتا
صاحب مرے دل کو ہے کوئی ہاتھوں سے ملتا

میں تو اُسے لے چلتی پہ کچھ بس نہیں چلتا
رہ جاتی جو بہنیں بھی تو دم اس کا بہلتا

دروازے پہ تیار سواری تو کھڑی ہے
پر ابتو مجھے جان کی صغرا کی پڑی ہے

چلاتی تھی کبرا کہ بہن آنکھیں تو کھولو
کہتی تھی سکینہ کہ ذرا منہ سے تو بولو

ہم جاتے ہیں تم اٹھ کے بغلگیر تو ہو لو
چھاتی سے لگو باپ کی دل کھول کے رو لو

تم جن کی ہو شیدا وہ برادر نہ ملے گا
پھر گھر میں جو ڈھونڈو گی تو اکبرؑ نہ ملے گا

ہشیار ہو کیا صبح سے نے ہوش ہو خواہر
اصغر کو کرو پیار کلیجے سے لگا کر

چھاتی سے لگو اُٹھ کے کھڑی روتی ہیں مادر
ہم روتے ہیں دیکھو تو ذرا آنکھ اُٹھا کر

افسوس اسی طور سے غفلت میں رہو گی
کیا آخری بابا کی زیارت نہ کرو گی

سُن کر یہ سخن شاہ کے آنسو نکل آئے
بیمار کے نزدیک گئے سر کو جھکائے

منہ دیکھ کے بانو کا سخن لب پہ یہ لائے
کیا ضعف و نقاہت ہے خدا اس پہ بچائے

جس صاحبِ آزار کا یہ حال ہو گھر میں
دانستہ میں کیونکر اُسے لیجاؤں سفر میں

کہکر یہ سخن بیٹھ گئے سیّد خوش خو
اور سورۂ اسمٰعیل پڑھا تھام کے بازو

بیمار نے پائی گلِ زہرا کی جو خوشبو
آنکھوں کو تو کھولا پہ ٹپکنے لگے آنسو

ماں سے کہا مجھ میں جو حواس آئے ہیں اماں
کیا میرے مسیحا مرے پاس آئے ہیں اماں

ماں نے کہا ہاں ہاں وہی آئے ہیں مری جاں
جو کہنا ہے کہلو کہ یہاں اور ہے ساماں

دیکھو تو ادھر روتی ہیں بی بی شہ ذیشاں
صغرا نے کہا اُن کی محبت کے میں قرباں

وہ کوفہ سا ساماں ہے جو یوں روتے ہیں بابا
کھلکر کہو کیا مجھ سے جدا ہوتے ہیں بابا

یہ گھر کا سب اسباب گیا کس لیے باہر
نے فرش نہ ہے مسندِ فرزندِ پیمبر

داماں سے کیا ہو گیا گہوارۂ اصغر
اُجڑا ہوا لوگو نظر آتا ہے مجھے گھر

کچھ منہ سے تو بولو مرا دم گھٹتا ہے اماں
کیا سبط پیمبرؐ سے وطن چھٹتا ہے اماں

شبیر کا منہ تکنے لگی بانوئے مغموم
صغرا کے لیے رونے لگیں زینب و کلثوم

بیٹی سے یہ فرمانے لگے سیّد مظلوم
پردہ رہا اب کیا تمھیں خود ہو گیا معلوم

تم چھٹتی ہو اس واسطے سب روتے ہیں صغرا
ہم آج سے آوارہ وطن ہوتے ہیں صغرا

اب شہر میں اک دم ہے ٹھہرنا مجھے دشوار
میں پا بہ رکاب اور ہو تم صاحبِ آزار

پھر آتا ہے وہ گھر میں سفر میں جو ہو بیمار
تکلیف تمھیں دوں یہ مناسب نہیں زنہار

غربت میں بشر کے لیے سو طرح کا ڈر ہے
میرا تو سفر رنج و مصیبت کا سفر ہے

لو چلتی ہے خاک اڑتی ہے گرمی کے ہیں ایام
جنگل میں نہ راحت نہ کہیں راہ میں آرام

بستی میں کہیں صبح تو جنگل میں کہیں شام
دریا کہیں حائل کہیں پانی کا نہیں نام

صحت میں گوارا ہے جو تکلیف گزر جائے
اس طرح کا بیمار نہ مرتا ہو تو مر جائے

صغرا نے کہا کھانے سے خود ہی مجھے انکار
پانی جو کہیں راہ میں مانگوں تو گنہگار

کچھ بھوک کا شکوہ نہیں کرنے کی یہ بیمار
تبریدِ فقط آپ کا ہی شربتِ دیدار

گرمی میں بھی رحمت سے گزر جائے گی بابا
آئے گا پسینہ تپ اُتر جائے گی بابا

کیا تاب اگر منہ سے کہوں درد ہی سر میں
اُف تک نہ کروں بھڑکے اگر آگ جگر میں

بھولے سے بھی شب کو نہ کراہونگی سفر میں
قربان گئی چھوڑ نجا و مجھے گھر میں

ہو جانا خفا راہ میں گر روئے گی صغرا
یاں نیند کب آتی ہی جو واں سوئے گی صغرا

وہ بات نہ ہوگی کہ پچھین ہوں مادر
ہر صبح میں پیلوں گی دوا آپ بنا کر

دن بھر مری گودی میں رہینگے علی اصغر
لونڈی ہوں سکینہؑ کی نہ سمجھو مجھے دختر

میں یہ نہیں کہتی کہ عماری میں بٹھا دو
بابا مجھے فضہؑ کی سواری میں بٹھا دو

شہ بولے کہ واقف ہی مرے حال سے اللہ
میں کہہ نہیں سکتا مجھے درپیش ہی جو راہ

کھُل جائے گا یہ راز بھی گو تم نہیں آگاہ
ایسا بھی کوئی ہی جسے بیٹی کی نہ ہو چاہ

ناچار یہ فرقت کا الم سہتا ہوں صغرا
ہی مصلحتِ حق یہی جو کہتا ہوں صغرا

اے نورِ بصر آنکھوں پہ لیکر تجھے چلتا
تو مجھ سے بہلتی مرا دل تجھ سے بہلتا

تپ ہی تجھے اور غم سے جگر ہی مرا جلنا
ضعف کہ دم تک نہیں سینے میں سنبھلنا

جز ہجر علاج اور کوئی ہو نہیں سکتا
دانستہ تجھیں ہاتھ سے میں کھو نہیں سکتا

منہ تکنے لگی ماں کا وہ بیمارِ بصد غم
چتون سے عیاں تھا کہ چلیں آپ موے ہم

ماں کہتی تھی مختار ہیں بی بی فقہ عالم
میرے تو کلیجے پہ چھری چلتی ہی اس دم

وہ درد ہی جس درد سے چارا نہیں صغرا
تقدیر سے کچھ زور ہمارا نہیں صغرا

صغرا نے کہا کوئی کسی کا نہیں زنہار
سب کی یہی مرضی ہی کہ مرجائے یہ بیمار

اللہ نہ وہ آنکھ کسی کی ہی نہ وہ پیار
اک ہم ہیں کہ ہیں سب پہ فدا سب ہیں غمخوار

بیزار ہیں سب ایک بھی شفقت نہیں کرتا
سچ ہی کوئی مردے سے محبت نہیں کرتا

ہمشیر کے عاشق ہیں سلامت رہیں اکبر
اتنا نہ کہا مر گئی یا جیتی ہے خواہر

میں گھر میں پڑی ہوں وہ ہیں صبح سے باہر
وہ کیا کریں برگشتہ ہے اپنا ہی مقدر

پوچھا نہ کسی نے کہ وہ بیمار کدھر ہے
نہ بھائیوں کو دھیان نہ بہنوں کو خبر ہے

کیا اُن کو پڑی تھی جو وہ غم کھانے کو آتے
میں کون جو صورت مجھے دکھلانے کو آتے

ہوتی جو غش چھاتی سے لپٹانے کو آتے
زلفیں جو اُلجھتیں تو سلجھوانے کو آتے

کل تک تو مرے حال پریشاں پہ نظر تھی
تقدیر کے اس پیچ کی مجھکو نہ خبر تھی

مانوس سکینہ سے ہیں عباس و لاور
میں کون ہوں جو میری خبر پوچھتے آکر

سرسبز رہے خلق میں نوباوۂ شبیر
شادی میں بلائیں مجھے یہ بھی نہیں باور

بے دولہنے منہ کو چھپاتے ہیں ابھی سے
میں جیتی ہوں اور آنکھ چراتے ہیں ابھی سے

کس سے کہوں اس دکھ کو میں بیکس و رنجور
بہنیں بھی الگ مجھ سے ہیں اور بھائی بھی ہیں دور

اماں کا سخن یہ ہے کہ بیٹی میں ہوں مجبور
ہمراہی بیمار کسی کو نہیں منظور

دنیا سے سفر رنج و مصیبت میں لکھا تھا
تنہائی کا مرنا مری قسمت میں لکھا تھا

سب بی بیاں رونے لگیں سُن سُن کے یہ تقریر
چھاتی سے لگا کر اُسے کہنے لگے شبیر

لو صبر کرو کوچ میں اب ہوتی ہے تاخیر
منہ دیکھ کے چپ رہ گئی وہ بیکس و دلگیر

نزدیک تھا دل چیر کے پہلو نکل آئے
اچھا تو کہا منہ سے پہ آنسو نکل آئے

بانو کو اشارہ کیا حضرت نے کہ جاؤ
اکبر کو بلاؤ علی اصغر کو بھی لاؤ

آئے علی اکبر تو کہا شاہ نے آؤ
روٹھی ہے بہن تم سے گلے اس کو لگاؤ

چلتے ہوئے جی بھر کے ذرا پیار تو کر لو
لینے انھیں کب آؤ گے اقرار تو کر لو

پاس آن کے اکبر نے کی یہ پیار کی تقریر
کیا مجھ سے خفا ہو گئیں صغرا مری تقصیر

چلانے لگی چھاتی پہ منہ رکھ کے وہ دلگیر
محبوب برادر ترے قربان یہ ہمشیر

صدقے ترے سر سے اتارے مجھے کوئی
بل کھائی ہوئی زلفوں پہ وارے مجھے کوئی

رخساروں پہ سبزے کے نکلنے کے میں صدقے
تمہارے لیے شان سے چلنے کے میں صدقے

افسوس سے ان ہاتھوں کے ملنے کے میں صدقے
کیوں روتے ہو تھام آنکھوں کے ڈھلنے کے میں صدقے

جلد آن کے بھینا کی خبر لیجیو بھائی
بے میرے کہیں بیاہ نہ کر لیجیو بھائی

لکھنا مجھے نسبت کا اگر ہو کہیں سامان
حق دار ہوں میں نیگ کا مہر بھی ہے دھیان

اور مر گئی پیچھے تو رہے دل میں سب ارمان
لے آنا دلہن کو مری تربت پہ میں قربان

خوشنود مری روح کو کر دیجیو بھائی
حق نیگ کا تم قبر پہ دھر دیجیو بھائی

پیارے مرے بھیا مرے مہرو علی اکبرؑ
چھپ جائیں گے آنکھوں سے یہ گیسو علی اکبر

یاد آئے گی یہ جسم کی خوشبو علی اکبرؑ
ڈھونڈھیں گی یہ آنکھیں تمہیں ہر سو علی اکبر

دل سینے میں کیونکر تہ و بالا نہ رہے گا
جب چاند چھپے گا تو اُجالا نہ رہے گا

کیا گزرے گی جب گھر سے چلے جاؤ گے بھائی
کیسے مجھے ہر بات میں یاد آؤ گے بھائی

تشریف خدا جانے کب لاؤ گے بھائی
کی دیر تو جیتا نہ ہمیں پاؤ گے بھائی

کیا دم کا بھروسا کہ چراغ سحری ہیں
تم آج مسافر ہو تو ہم کل سفری ہیں

ہاں سچ ہے کہ بیمار کا بہتر نہیں جانا
صحت سے جو ہیں ان میں کہاں میرا ٹھکانا

بھیا جواب آنا تو مری قبر پہ آنا
ہم گور کی منزل کی طرف ہوں گے روانا

کیا لطف کسی کو نہیں گر چاہ ہماری
وہ راہ تمہاری ہے تو یہ راہ ہماری

مرنا تو مقدم ہے غم اس کا نہیں زنہار
دھڑکا ہے کہ جب ہوں گے عیاں موت کے آثار

قبلہ کی طرف کون کرے گا رخ بیمار
یٰسین بھی پڑھنے کو نہ ہوگا کوئی غمخوار

سانس اُکھڑے گی جس وقت تو فریاد کرونگی
میں ہچکیاں لے لے کے تمہیں یاد کرونگی

ماں بولی یہ کیا کہتی ہے صغرا تجھے قربان
گھبرا کے نہ اب تن سے نکل جائے مری جان

بیکس مری بچی ترا اللہ نگہبان
صحت ہو تجھے میری دعا ہے یہی ہر آن

کیا بھائی جدا بہنوں سے ہوتے نہیں بیٹا
کنبے کے لیے جان کو کھوتے نہیں بیٹا

میں صدقے گئی بس نکرو گریہ وزاری
اصغر مرا روتا ہی صدا اُن کے تمھاری

وہ کانپتے ہاتھوں کو اُٹھا کر یہ پکاری
آ اے مرے ننھے سے مسافر ترے واری

چھٹتی ہی یہ بیمار بہن جان گئے تم
اصغر مری آواز کو پہچان گئے تم

تم جاتے ہو اور ساتھ بہن جا نہیں سکتی
تب ہی تمھیں چھاتی سے میں لپٹا نہیں سکتی

جو دل میں ہی لب پر وہ سخن لا نہیں سکتی
رکھ لوں تمھیں اماں کو بھی سمجھا نہیں سکتی

بیکس ہوں مرا کوئی مددگار نہیں ہی
تم ہو سو تمھیں طاقتِ گفتار نہیں ہی

معصوم نے جس دم یہ سنی درد کی گفتار
اصغر کی طرف ہاتھوں کو لٹکا دیا اک بار

بے بے کے بلائیں یہ لگی کہنے وہ بیمار
جھک جھک کے دکھاتے ہو مجھے آخری دیدار

دنیا سے کوئی دن میں گزر جاے گی اصغر
تم بھی یہ سمجھتے ہو کہ مر جاے گی اصغر

عباس نے اتنے میں پڑیوڑھی سے پکارا
چلنے کے لیے قافلہ تیار ہی آقا

لپٹا کے گلے فاطمہ اصغر کو دوبارا
اُٹھے شہ دیں گھر تہ و بالا ہو سارا

جس چشم کو دیکھا سو وہ پرنم نظر آئی
اک مجلس ماتم تھی کہ برہم نظر آئی

بیت الشرف خاص سے نکلے شہ ابرار
روتے ہوے ڈیوڑھی پہ گئے عترت اطہار

فرماتوں کو عباسؑ پکارے یہ بہ تکرار
پردے کی قناتوں سے خبردار خبردار

باہر حرم آتے ہیں رسولِ دوسرا کے
شقہ کوئی جھک جاے نہ جھونکے سے ہوا کے

لڑکا بھی جو کوٹھے پہ چڑھا ہو وہ اُتر جاے
آتا ہوا دھر جو وہ اُسی جا پہ ٹھہر جاے

نافے پہ بھی کوئی نہ برابر سے گزر جاے
دیتے رہو آواز جہاں تک کہ نظر جاے

مریمؑ سے سواق نے شرف اُن کو دیے ہیں
افلاک پہ آنکھوں کو ملک بند کیے ہیں

عباس علیؑ سے علی اکبر نے کہا تب
ہیں قافلہ سالار حرم حضرت زینب

پہلے ہوں وہ اسوار تو محمل میں چڑھیں سب
حضرت نے کہا ہاں یہی میرا بھی ہی مطلب

گھر میں مرے زہرا کی جگہ بنت علی ہی
میں جانتا ہوں ماں مرے ہمراہ چلی ہی

پہونچی جہیں ناقے کے قریں دخترِ حیدرؑ
خود ہاتھ پکڑنے کو بڑھے سبطِ پیمبرؐ

فضہ تو سنبھالے ہوئے تھی گوشۂ چادر
تھے پردہ محمل کو اُٹھائے علی اکبرؑ

فرزند کمربستہ چپ و راس کھڑے تھے
نعلین اُٹھا لینے کو عباس کھڑے تھے

اِک دن تو مہیا تھا یہ سامانِ سواری
اک روز تھا وہ گرد تھے نیزے لیے ناری

محمل تھا نہ ہودج نہ کجاوہ نہ عماری
نے پردہ تھی وہ حیدرِ کرار کی پیاری

تھے کئی بچوں کے گلے ساتھ بندھے تھے
تھے بال کھلے چہروں پہ اور ہاتھ بندھے تھے

زینت دہِ محمل جو ہوئی دخترِ زہرا
ناقوں پہ چڑھے سب حرمِ سید والا

آنے لگے رہوار کھلا گرد کا پردا
عباسؑ سے بولے یہ شہِ یثرب و بطحا

صدمہ ہے بچھڑنے کا مرے روحِ نبیؐ پر
رخصت کو چلو قبرِ رسولِ عربیؐ پر

ہے قبر پہ نانا کے مقدم مجھے جانا
کیا جانیے پھر ہو کہ نہ ہو شہر میں آنا

اماں کی ہے تربت پہ ابھی اشک بہانا
اُس مرقدِ انور کو ہے آنکھوں سے لگانا

آخر تو لیے جاتی ہے تقدیر وطن سے
چلتے ہوئے ملنا ہے ابھی قبرِ حسنؑ سے

پیدل شہ دیں روضۂ احمدؐ پہ سدھارے
تربت سے صدا آئی کہ آ اے مرے پیارے

تعویذ سے شبیرؑ لپٹ کر یہ پکارے
ملتا نہیں آرام نواسے کو تمھارے

خط کیا ہیں اجل کا یہ پیام آیا ہے نانا
آج آخری رخصت کو غلام آیا ہے نانا

خادم کو کہیں امن کی اب جا نہیں ملتی
راحت کوئی ساعت مرے مولا نہیں ملتی

دُکھ کونسا اور کونسی ایذا نہیں ملتی
ہیں آپ جہاں راہ وہ اصلا نہیں ملتی

پابندِ مصیبت ہوں گرفتارِ بلا ہوں
خود پاؤں سے اپنے طرفِ قبر چلا ہوں

میں اک تنِ تنہا ہوں ستمگار ہزاروں
اِک جان ہے اور درپئے آزار ہزاروں

اِک پھول سے رکھتے ہیں خلش خار ہزاروں
اِک سر ہے فقط اور خریدار ہزاروں

واں جمع کئی شہر کے خونریز ہوئے ہیں
خنجر مری گردن کے لیے تیز ہوئے ہیں

فرمایئے اب جائے کدھر آپ کا شبیرؑ
یاں قید کی ہی فکر اُدھر قتل کی تدبیر

تینغیں ہیں کہیں میرے لیے اور کہیں زنجیر
خونریزی کو کعبہ تلک آپہونچے ہیں بے پیر

مرجاؤں جو پاس اپنے بلا لیجیے نانا
تربت میں نواسے کو چھپا لیجیے نانا

یہ کہہ کے ملا قبر سے شہ نے جو رخِ پاک
ہلنے لگا صدمے سے مزارِ شہ لولاک

جنبش جو ہوئی قبر کو تھرا گئے افلاک
کانپی جو زمیں صحن مقدس میں اُڑی خاک

اُس شور میں آئی یہ صدا روضۂ جد سے
تم آگے چلو ہم بھی نکلتے ہیں لحد سے

باتوں نے تری دل کو مرے کر دیا مجروح
تو شہر سے جاتا ہی تڑپتی ہی مری روح

مے تیغ کیا خنجرِ غم نے ترے مذبوح
ہی کشتی امت پہ تباہی کہ چلا نوحؑ

افلاکِ امامت کا کبھی بدر نہ سمجھے
نے قدر ہیں ظالم کہ تری قدر نہ سمجھے

مارا گیا جس روز سے شبیرؑ مرا پیارا
اُس روز سے ٹکڑے ہی کلیجہ مرا سارا

اب قتل میں ہوتا ہوں ترے ساتھ دوبالا
امت نے کیا پاسِ ادب خوب ہمارا

زہرا کی جو بستی کو اجاڑیں تو عجب کیا
اعدا مجھے تربت سے اکھاڑیں تو عجب کیا

اِس ذکر پہ رویا کیے شہ سر کو جھکائے
واں سے جو اُٹھے فاطمہؑ کی قبر پہ آئے

پائینِ لحد گر کے بہت اشک بہائے
آواز یہ آئی کہ میں صدقے مرے جائے

ہی شور ترے کوچ کا جس دن سے وطن میں
پیارے میں اُسی دن سے پڑی ہوں اس کفن میں

تربت میں جو کی میں نے بہت گریہ وزاری
گھبرا کے علیؑ آئے نجف سے کئی باری

کہتے تھے کہ اے احمدِ مختار کی پیاری
تم پاس ہو تربت ہی بہت دور ہماری

گھر لٹتا ہی کیونکر ہمیں چین آئے گا زہراؑ
کیا ہم سے نہ رخصت کو حسینؑ آئے گا زہراؑ

میں نے جو کہا قبر سے کیوں نکلے ہو باہر
نہ سر پہ عمامہ ہی نہ ہی دوش پہ چادر

فرمایا کہ ماتم میں ہوں اے بنتِ پیمبر
مرنے کو پسر جاتا ہی برباد ہوا گھر

ترسیں گے وہ پانی کو جو نازوں کے پلے ہیں
تلواریں ہیں اب اور مرے بچوں کے گلے ہیں

پھرتا ہی مری آنکھوں میں شبیرؑ کا مقتل
وہ نہرِ فرات اور کئی کوس کا جنگل

وہ بجلیاں تلواروں کی اور شام کا بادل
دریا سے وہ پیاسوں کے ہٹا دینے کی ہلچل

شبیرؑ کے سر پر سے یہ آفت نہ ٹلے گی
دسویں کو محرم کی چھری مجھ پہ چلے گی

سُن کر یہ بیان باپ کا مادر کی زبانی
رو رو کے پکارا اسد اللہ کا جانی

ہاں والدہ سچ ہی نہ ملے گا مجھے پانی
پیاسے ہیں مرے خون کے ظلم کے بانی

بچپن میں کیا تھا مرا ماتم شہِ دیں نے
ماتا کو خبر دی تھی مری روحِ امیںؐ نے

پہلو میں جو تھی فاطمہ کے تربتِ شبرؑ
اُس قبر سے لپٹے بہ محبت شہ صفدرؑ

چلاّئے کہ شبیرؑ کی رخصت ہی برادر
حضرت کو تو پہلو ہوا اماں کا میسّرؑ

قبریں بھی جدا ہیں نہ افلاک ہماری
دیکھیں ہمیں لیجائے کہاں خاک ہماری

یہ کہکے چلے قبرِ حسن سے شہ مظلوم
رہوار جو مانگا تو سواری کی ہوئی دھوم

یاران وطن گرد تھے افسردہ و مغموم
چلاّتے تھے خادم کہ چلا خلق کا مخدوم

خالی ہوا گھر آج رسولِ عربی کا
تابوت اسی دھوم سے نکلا تھا نبیؐ کا

جب اُٹھ گئی تھیں خلق سے مخدومۂ عالم
سر پیٹتے تھے لوگ اسی طرح سے باہم

برپا تھا جنازہ پہ علیؑ کے یہی ماتم
تھا رحلتِ شبرؑ میں محبوں کو یہی غم

بس آج سے نے وارث و والی ہو مدینہ
اب پنجتنِ پاک سے خالی ہو مدینہ

چلاتی تھیں رانڈیں کہ چلی شہ کی سواری
لے گا خبر اب کون مصیبت میں ہماری

آنکھوں سے یتیموں کے دُرِ اشک تھے جاری
مضطر تھے اپاہج ضعفا کرتے تھے زاری

کہتے تھے گدا ہم کو غنی کون کرے گا
محتاجوں کی فاقہ شکنی کون کرے گا

تھانا کے تلک شہر کے اک شورِ قیامت
سمجھاتے ہوئے سب کو چلے جاتے تھے حضرتؑ

رو رو کے وہ کہتا تھا جسے کرتے تھے رخصت
پائیں گے کہاں ہم یہ غنیمت ہی زیارت

آخر تو بچھڑ کر کفِ افسوس ملیں گے
دس بیس قدم اور بھی ہمراہ چلیں گے

قیسیؑ انھیں دے دے کے کہا شہ نے کہ جاؤ
تکلیف بتھیں ہوتی ہے اب ساتھ نہ آؤ

اللہ کو سونپا تمھیں آنسو نہ بہاؤ
پھرنے کے نہیں ہم سے بس اب ہاتھ اٹھاؤ

اُس بیکس و تنہا کی خبر پوچھتے رہنا
یارو مری صغرا کی خبر پوچھتے رہنا

روتے ہوئے وہ لوگ پھرے شاہ سدھائے
جو صاحبِ قسمت تھے وہ ہمراہ سدھارے

کس شوق سے مردانِ حق آگاہ سدھارے
عابد طرفِ خانۂ اللہ سدھارے

اُترے نہ مسافر کسی مخلوق کے گھر میں
عاشق کو کشش لے گئی معشوق کے گھر میں

روشن ہوئی کعبہ کی زمیں نورِ خدا سے
مکہ نے شرف اور بھی پایا شرفا سے

جھک جھک کے ملے سبطِ پیمبرؐ بابا سے
آباد ہوا شہر نمازوں کی صدا سے

خوش ہو کے ہدا خواہ یہ کہتے تھے علی کے
سب باپ کی خو بو ہی نواسے ہیں نبیؐ کے

کعبہ میں بھی اک دن نہ ملا شاہ کو آرام
کوفے سے چلے آتے تھے نامے سحر و شام

اعدا نے گزرنے نہ دیے حج کے بھی ایام
کھولا پسرِ فاطمہؑ نے باندھ کے احرام

عازم طرفِ راہِ الٰہی ہوئے حضرت
تھی ہشتمِ ذیحجہ کہ راہی ہوئے حضرت

جاتے تھے دلِ افسردہ و غمگین شہ ابرار
ہر گام پہ ہوتے تھے عیاں موت کے آثار

قبریں نظر آئیں کسی صحرا میں جو دو چار
فرماتے تھے شہ فاعتبروا یا اولی الابصار

جز خاک نہ ہوئے گا نشاں بھی بدنوں کا
انجام یہ ہی ہم سے غریب الوطنوں کا

احباب کہیں، گھر ہی کہیں، آپ کہیں ہیں
آگے تو زمیں پر تھے پر اب زیرِ زمیں ہیں

خالی ہیں مکاں، آپ نہ خاک مکیں ہیں
جو دور نہ رہتے تھے وہ اب پاس نہیں ہیں

حسرت یہ رہی ہوگی کہ پہونچے نہ وطن میں
کیا منہ کو لپیٹے ہوئے سوتے ہیں کفن میں

باتیں تھیں یہی پاس کی اور در کی تقریر
منزل پہ بھی آرام سے سوتے تھے نہ شبیرؑ

شب کو کہیں اُترے تو سحر کر دیے رہ گیر
جلدی تھی کہ ہو جائے شہادت میں نہ تاخیر

مقتل کا یہ تھا شوق شہ جن و بشر کو
جس طرح سے ڈھونڈھے کوئی معشوق کے گھر کو

ملتا تھا کوئی مردِ مسافر جو سرِ راہ
یوں پوچھتے تھے اس سے بحسرت شہ و سپاہ

ایسا کوئی صحرا بھی ہے اے بندۂ اللہ
اک نہر سوا جس میں ہو چشمہ نہ کوئی چاہ

کیا ملتا ہے اُس دشت میں اور کیا نہیں ملتا
ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں وہ صحرا نہیں ملتا

وہ عرض یہ کرتا تھا کہ سبطِ شہ لولاک
ہے سخت پر اندوہ وہ صحرا تہ افلاک

ہنستا ہوا واں جائے تو ہو جاتا ہے غمناک
سنتا ہوں وہاں دن کو اوڑاتا ہے کوئی خاک

واں راتوں کو آتی ہے صدا سینہ زنی کی
درویش کی ممکن ہے سکونت نہ غنی کی

چلاتی ہے عورت کوئی ہے ہے مرے فرزند
اس دشت میں ہو جائے گا تو خاک کا پیوند

تلواروں سے ٹکڑے یہیں ہونگے ترے لبند
پانی نہیں ہو جائے گا بچوں پہ ترے بند

پیارے ترے تو اسی خاک پہ گھوڑے سے گریگا
ہے ہے نہیں خنجر تری گردن پہ پھرے گا

اک شیر ترائی میں یہ چلاتا ہے دن رات
کٹ جائیں گے یاں ہاتھ مرے لال کے ہیہات

کیا حال کہوں نہر کا اے شاہِ خوش اوقات
پانی تو نہیں شور پہ مشہور ہے یہ بات

طائر بھی دمِ تشنہ دہانی نہیں پیتے
وحشی کبھی واں آن کے پانی نہیں پیتے

اُس جا نہ اترتا ہے نہ دم لیتا ہے رہ گیر
ہے شور کہ اس آب میں ہے آگ کی تاثیر

پیاسوں کے لیے اس کی ہر اک موج ہے شمشیر
اس طرح ہوا چلتی ہے جس طرح چلیں تیر

بجھتی نہیں واں پیاس کسی تشنہ گلو کی
بو آتی ہے اُس نہر کے پانی میں لہو کی

اُس شخص سے یہ کہہ کے چلے قبلۂ عالم
اللہ نے چاہا تو بسائیں گے اُسے ہم

عاشق پہ بلا بعد بلا آتی ہے ہر دم
غم اور بڑھا وصل کا عرصہ جو رہا کم

آفت یہ نئی فوجِ شہنشاہ میں آئی
مسلم کی شہادت کی خبر راہ میں آئی

غربت میں نہ ماتم کی سنائے خبر اللہ
طاری ہوا حضرت پہ عجب صدمۂ جانکاہ

گوندھے ہوئے سر کھول کے پیٹے حرم شاہ
فرماتے تھے شہ سب کو ہے درپیش یہی راہ

ہوگا وہی اللہ کو جو مدِ نظر ہے
آج اُن کا ہوا کوچ کل اپنا بھی سفر ہے

وارث کے لیے زوجۂ مسلم کا تھا یہ حال
محمل سے گری پڑتی تھی کھولے ہوئے بال

روتے تھے بہن کے لیے عباسِ خوش اقبال
وہ کہتی تھی ساتھ آئے تھے چھوٹے مرے دو لال

پوچھو تو کدھر وہ مرے پیارے گئے دونو
فرماتے تھے شبّیر کہ مارے گئے دو نو

محمل تھے سب اُس بی بی کے ہودج کے برابر
تھا شور کہ بیوہ ہوئی شبّیر کی خواہر

گھبرا گئی تھی مسلمِ مظلوم کی دختر
ہر بار یہی پوچھتی تھی ماں سے لپٹ کر

کیوں بیٹھتی ہو کون جدا ہو گیا اماں
غربت میں مرے باپ پہ کیا ہو گیا اماں

اُس دن سے تو اک برہمِ فوج پہ چھایا
کھانا کئی دن قافلہ والوں نے نہ کھایا

رستے میں ابھی تھا اسد اللہ کا جایا
جو چاند محرم کا فلک پر نظر آیا

سب نے مہِ نو لشکرِ شبّیر میں دیکھا
مُنہ شاہ نے آئینۂ شمشیر میں دیکھا

خویش و رفقا چاند کی تسلیم کو آئے
مجرے کو جھکے اور سخن لب پہ یہ لائے

یہ چاند مبارک ہو یداللہ کے جائے
کفار پہ تو فتح اِسی چاند میں پائے

رتبہ مہ و خورشید سے بالا رہے تیرا
تا حشر زمانے میں اُجالا رہے تیرا

حضرت نے دعا پڑھکے یہ کی حق سے مناجات
کر رحم گنہگاروں پہ اے قاضیِ حاجات

سر دینے کا مشتاق ہوں عالم ہے ترقی ات
خنجر مری آنکھوں میں پھرا کرتا ہے دن رات

باقی ہیں جو راتیں وہ عبادت میں بسر ہوں
یہ زیست کے دن تری طاعت میں بسر ہوں

پہونچا دے مجھے جلد بس اے خالقِ افلاک
اُس خاک پہ جس خاک سے ملتی ہے مری خاک

طالب ہے ترے قرب کا سبطِ شہِ لولاک
نے مُلک کی خواہش ہے نہ دربار نہ املاک

بیتاب ہے دل صبر کا یارا نہیں مجھ کو
اب فصل بجز وصل گوارا نہیں مجھ کو

اتنے میں یہ فضہ علی اکبرؑ کو پکاری
لو دیکھ چلیں چاند یداللہ کی پیاری

عادت ہے کہ وہ دیکھتی ہیں شکل تمھاری
آنکھوں کو کیے بند یہ فرماتی ہیں واری

آئے تو رخِ اکبرِ ذیقدر کو دیکھوں
شکلِ مہ نو دیکھ چکی بدر کو دیکھوں

شہ داخلِ خیمہ ہوئے فرزند کے ہمراہ
منہ دیکھ کے یوں کہنے لگی بنتِ یداللہ

یہ چاند ہی کس طرح کا اے فاطمہ کے ماہ
فرمانے لگے رو کے بہن سے شہِ ذیجاہ

سر تن سے مرا اس مہِ پُرغم میں کٹے گا
زینبؑ یہ مہینہ تمھیں ماتم میں کٹے گا

یہ آلِ نبیؐ کی ہی مصیبت کا مہینا
یہ ظلم کا عشرہ ہی یہ آفت کا مہینا

پہونچا ہی غریبوں کی شہادت کا مہینا
آخر ہی بس اب عمر کی مدت کا مہینا

یہ یارِ امانت مری گردن سے اُتر جائے
ہو خاتمہ بالخیر جو سر تن سے اُتر جائے

گردون پہ مہِ نو جو نمایاں ہی یہ ہمشیر
چڑھتی ہی مرے سر کے لیے چرخ پہ شمشیر

اِس چاند میں کٹ جائے گا سب لشکرِ شبیرؑ
نیزہ کوئی کھائے گا کلیجہ پہ کوئی تیر

برچھی کسی جانباز کے پہلو میں لگے گی
شمشیر کسی شیر کے بازو میں لگے گی

خیمہ کو جلا دیں گے لٹے گا زر و زیور
اِس ماہ میں ہوں گے نہ پدر اور نہ مادر

ماؤں سے بپھر چھوڑیں گے بہنوں سے برادر
بیوہ کئی سیدانیاں ہوویں گی مقرر

گھر لیں گے ستمگار جو روئے گی سکینہ
اس ماہ میں بن باپ کی ہووے گی سکینہ

دولہ کوئی ٹاپوں کے تلے ہوئیگا پامال
پیٹے گی کوئی تازہ دلہن کھولے ہوئے بال

تیروں سے کسی ماں کا جگر ہووے گا غربال
نکلے گی کوئی کہتی ہوئی ہائے مرا لال

معصوموں کے سونے کی جگہ ہائیں گی خالی
بچوں سے بھری گودیاں ہوجائیں گی خالی

اس عشرۂ اول میں نہ ہوئیں گے بہن ہم
تاریخِ سفر ہی دہم ماہ محرم

عشرہ یہ وہ عشرہ ہی کہ اے زینبِ پرغم
جس لال کی عاشق ہو وہ ہوجائے گا بیدم

دیکھو گی نہ پھر منہ علی اکبر سے پسر کا
اب نام میں ہوئے گا تمھیں چاند صفر کا

رونے کے لیے حق نے بنائے ہیں تمھیں دن
ان روزوں خوشی ہو یہ کسی کو نہیں ممکن

لیویں گے مرا تعزیہ ہر شہر کے ساکن
اکبرؑ کو جوان روئیں گے معصوموں کو سن

بھولیں ہمیں ایسے نہیں غمخوار ہمارے
ہوئیں گے سیہ پوش عزادار ہمارے

غش ہوگئی سُن کر یہ بیاں زینبِ پُرغم
خیمے میں اُسی رات سے برپا ہوا ماتم

بیدار رہیں صبح تلک بی بیاں باہم
خیموں کو اُکھڑوا کے چلے قبلۂ عالم

آخر وہی صحرا وہی جنگل نظر آیا
کھلی دوسری تاریخ کہ مقتل نظر آیا

اُترے اسی میدانِ بلا خیز میں سرور
استادہ ہوئے خیمۂ ناموسِ پیمبرؐ

صحرا کی طرف دیکھ کے خوش ہوگئے اکبرؑ
دریا پہ ٹہلنے لگے عباسِ دلاور

شہ بولے ہوا نہر کی بھائی تمھیں بھائی
ہاں شبیر ہو دریا کی ترائی تمھیں بھائی

خامہ کو بس اب روک انیسؔ جگرِ افگار
خالق سے دعا مانگ کہ ای ایزدِ غفار

زندہ رہیں دنیا میں شہ دیں کے عزادار
غیر از غمِ شہ اُن کو نہ غم ہو کوئی زنہار

آنکھوں سے مزارِ شہِ دلگیر کو دیکھیں
اس سال میں بس روضۂ شبیر کو دیکھیں

رباعی

جس دن کہ فراقِ روح و تن میں ہوگا
مشکل آنا اس انجمن میں ہوگا

نازاں نہ ہو رخصتِ نوہن کر غافل
اک روز یہی جسم کفن میں ہوگا

رباعی

مرقد میں انیسؔ نہ کفن میں ہوگا
وہ روضۂ سلطانِ زمن میں ہوگا

چلکر گلزارِ کربلا میں ڈھونڈیں
بلبل کا مزار بھی چمن میں ہوگا

رباعی

اختر سے بھی آبرو میں بہتر ہیں یہ اشک
اللہ ہی مشتری وہ گوہر ہیں یہ اشک

آنکھوں سے لگا کے اُس کو کہتے ہیں ملک
گوہر نہیں نورِ چشم کوثر ہیں یہ اشک

رباعی

یکتا گہرِ قلزمِ سرمد ہی حسینؑ
سردارِ امم مثلِ محمدؐ ہی حسینؑ
جب سر کو قدم کیا تو سر کی رہِ عشق
حقا کہ شہیدوں میں سرآمد ہی حسینؑ

رباعی

واحد ہی جو عبدِ نیک نام اس کا ہوں
یکتا ہی جو مداح مدام اُس کا ہوں
پوچھیں گے نکیرین تو کہدوں گا انیسؔ
قنبر کا جو مولا ہی غلام اُس کا ہوں

مرثیہ (۳)

سبطِ نبی سے منزلِ مقصد قریب ہی
آرام گاہِ جانِ محمد قریب ہی

مولد تو دور رہ گیا مشہد قریب ہی
جس جا لحد بنے گی وہ سر حد قریب ہی

جاتے ہیں آپ خلق کی مشکل کشائی کو
آئی ہی کربلا سے اجل پیشوائی کو

ہی شور آمد آمدِ شاہ فلک سریر
فوجوں کی ہر طرف سے چلی آتی ہی بہیر

دعوت کے واسطے ہیں سنانین لیے شریر
حضرت کی پیشکش کو کمانیں ہیں اور تیر

پانی پہ چوکیاں ستم آرا بٹھاتے ہیں
دریا کے گھاٹ برچھیوں سے روکے جاتے ہیں

شقے گئے ہیں شام کے حاکم کے جا بجا
ہر پر گنے سے ہی طلبِ لشکرِ جفا

آکر اترتی جاتی ہیں فوجیں جدا جدا
لیتا ہی جائزہ عمرِ سعد نے حیا

غل ہی کریں گے قتل جو زہرا کے ماہ کو
انعام میں ملے گا دو ماہہ سیاہ کو

تیغیں سلاح خانہ سے نکلی ہیں بے شمار
ہی جا بجا درستیِ اسبابِ کارزار

ہوتے ہیں لیس تیروں کے دستے کئی ہزار
خنجر ہوئے ہیں ذبح کو پیاسوں کے آبدار

نوکیں نکالی جاتی ہیں تیروں کی سان پر
پھل برچھیوں پہ چڑھتے ہیں پرچم نشان پر

وہ سالکِ طریقِ ہدایت ہی شاد شاد
ہی آرزو کہ جلد ملے گوہرِ مراد

بہتے ہیں اشک جوش پہ ہی بحرِ اتحاد
لب پر اسی کا ذکر ہی دل میں اسی کی یاد

معشوق کے سوا کوئی پیشِ نظر نہیں
یہ شوقِ وصل ہی کہ کسی کی خبر نہیں

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی سخت آہ
پائی نہ منزلوں نہ کہیں سایۂ درخت

ڈوبے ہوئے پسینوں میں ہیں غازیوں کے رخت
سونلا گئے ہیں رنگِ جوانانِ نیکبخت

راکب عبائیں چاند سے چہرو پہ ڈالے ہیں
تر نسے ہوئے سمندر بانیں نکالے ہیں

چلتی ہو لوں حرارت خورشید ہو دوچند
مرجھا گئے ہیں نخل ہوا میں ہو یہ گزند

جھیلوں میں ہیں نہ رند درختوں پہ ہیں پرند
ہو دھوپ میں رسولؐ کا فرزند ارجمند

غربت میں بیکسی ہو شہ دیں پناہ پر
سایہ ہو آفتاب کا زہراؑ کے ماہ پر

وہ دن ہیں جن دنوں کوئی کرتا نہیں سفر
صحرا کے جانور بھی نہیں چھوڑتے ہیں گھر

رنج مسافرت میں ہیں سلطان بحر و بر
لب برگ گل سے خشک ہیں چہرہ عرق میں تر

آتی ہو خاک اڑ کے یمین و یسار سے
گیسوے مشک بار اٹے ہیں غبار سے

اہل حرم ہیں محمل و ہودج میں بے قرار
معصوم پانی مانگتے ہیں رو کے بار بار

بانو پکارتی ہو کہ یا شاہ نامدار
گرمی سے جاں لب ہو مرا طفل شیر خوار

کیونکر یہ دکھ اٹھے چھ مہینے کی جان سے
گرمی ہو یا برستی ہو آگ آسمان سے

چلاتی ہو سکینہ کہ اچھے مرے چچا
محمل میں گھٹ گئی مجھے گودی میں لو ذرا

بابا سے کہدو اب کریں خیمہ کہیں بپا
ٹھنڈی ہوا میں لیکے چلو تم پہ میں فدا

سایہ کسی جگہ ہو نہ چشمہ نہ چاہ ہو
تم تو ہوا میں ہو مری حالت تباہ ہو

جب طے ہوئی وہ منزل آفت قریب شام
اس روز ثعلبیہ میں شہ کا ہوا مقام

اکبرؑ نے آن کر کیا پردے کا اہتمام
ناقوں سے اترے آل نبیؐ با صد احترام

ڈوبے ہوے عرق میں سبھوں کے لباس تھے
دل رندھ گئے تھے چاند سے چہرے اداس تھے

اترے رفیق خاص قریب خیام شاہ
کچھ فاصلہ سے گرد و فرو کش ہوئی سپاہ

نکلا حرم سے حضرت خیر النسا کا ماہ
کرسی پہ جلوہ گر ہوا وہ عرش بارگاہ

ہر نخل غیرت شجر طور ہو گیا
صحرا خدا کے نور سے معمور ہو گیا

اس دن بہت اداس تھا زہرا کا یادگار
زردی تھی رخ پہ گیسوؤں پر راہ کا غبار

صحرا پہ گہ نظر تھی کبھی سوے کوہسار
کہتے تھے دیکھ دیکھ کے گردوں کو بار بار

کس کو نہ بے وطن کیا کس پر جفا نہ کی
اے دہر تو نے آہ کسی سے وفا نہ کی

یہ کہہ کے رو رہے تھے شہ دیں کہ ناگہاں
ناقے پہ ایک شخص ہوا دور سے عیاں

عباسؑ سے یہ کہنے لگے شاہ دو جہاں
تم جا کے اس عرب کو بلا لاؤ بھائی جاں

تشویش ہو رسولِ خدا کے حبیب کو
کچھ پوچھنا ہو اُس سے حسینؑ غریب کو

جلدی چلے یہ سُنتے ہی حکم شہ انام
پاس اُس کے جا کے آپنے کی سبقتِ سلام

ناقہ بٹھا کے کود پڑا تب وہ نیک نام
عباسؑ نامور نے یہ اس سے کیا کلام

آیا ہو تو جدھر سے اُدھر ہم بھی جاتے ہیں
اے شخص جلد چل تجھے آقا بلاتے ہیں

دیکھا جو رعب و دبدبہ و شوکت و جلال
دستِ ادب کو جوڑ کے اُس نے کیا سوال

ہو کون شخص آپ کا آقائے خوش خصال
عباسؑ نے کہا کہ رسولِ خدا کا لال

نورِ نگاہِ فاتحِ بدر و حنین ہو
آقا کا میرے اسمِ مبارک حسین ہو

یہ سن کے اشک آنکھوں سے اُس شخص نے بہائے
چھاتی پہ ہاتھ مار کے بولا کہ ہائے ہائے

کیوں اس طرف کو سیّد والا وطن سے آئے
آفت سے نورِ چشمِ علی کو خدا بچائے

سب اہلِ شہر ہیں کوفیوں کو اُن سے بیر ہو
پھر جائیں آپ جانبِ یثرب تو خیر ہو

گھبرا گئے یہ سنتے ہی عباسؑ باوفا
فرمایا اے عرب ترے رونے کی وجہ کیا

مسلم نے بھی یہ حال تو خط میں نہیں لکھا
اُس نے کہا کہ اور ہو کچھ واں کا ماجرا

سب شہر پھر گیا ہو شہ خاص و عام سے
کہنا ہو جو کہوں گا مفصل امام سے

پہونچا وہ جب قریبِ شہنشاہ سرفراز
تسلیم کر کے پانوں پہ رکھا سرِ نیاز

ہاتھ اُس کلے کے ہاتھ میں اُٹھے شہِ حجاز
بولا کنارے جا کے وہ امت کا کارساز

گر نیک ہو سفر تو وسیلہ ظفر کا ہو
آنا ہوا کدھر سے ارادہ کدھر کا ہو

کی عرض اُس نے اے پسرِ سیّد البشر
کوفے کے شہرِ شوم سے آتا ہوں میں ادھر

فرمایا شہ نے ہو تجھے مسلم کی کچھ خبر
رونے لگا وہ مردِ مسافر جھکا کے سر

شہ بولے وجہ کیا جو ترا حال غیر ہو
جلدی بتا کہ میرے مسافر کی خیر ہو

گھبرا کے حال پوچھتے تھے شاہ نامدار
گر گر کے وہ قدم پہ یہ کہتا تھا بار بار

پھر چلیے اب وطن کی طرف بہرِ کردگار
کوفے میں سب ہیں عہد شکن اور ستم شعار

آلِ رسولِ پاک پہ کیا کیا جفا نہ کی
یہ ہیں وہی جنھوں نے علی سے وفا نہ کی

باتوں کو جوڑتا ہوں میں شاہا نجائیے
بہرِ علیؑ و احمدؐ و زہراؑ نجائیے

اُس جا دغا ہی سید والا نجائیے
آقا نجائیے مرے مولا نجائیے

کیا دور ہی جو آ کے عدو سدِّ راہ ہوں
ایسا نہ ہو کہ آلِ محمدؐ تباہ ہوں

بچوں پہ رحم کیجیے یا شاہ انس و جاں
پہونچے نہ ان گلوں کو کہیں صدمۂ خزاں

بچھڑے نہ اِس ضعیفی میں اکبر سا نوجواں
رکھے خدا جہان میں یداللہ کا نشاں

پھولا پھلا رسولِ خدا کا چمن رہے
روشن سدا چراغِ مزارِ حسنؑ رہے

فکر ہی جو آپ کو لکھے ہیں سب نے خط
مطلب یہ ہی کہ یاں تلک آویں کسی نمط

مضمون بھی غلط ہیں عبارت بھی سب غلط
یہ خط نہیں ہیں قتل کی تدبیر ہی فقط

حاکم کا مدعا ہی کہ ظلم و ستم کروں
گر جھوٹ ہو تو ہاتھوں کو اپنے قلم کروں

کوفی تمام مایۂ جور و فساد ہیں
مفسد ہیں بدطریق ہیں بداعتقاد ہیں

تربت میں فاطمہؑ کے رُلانے پہ شاد ہیں
تینیں ادھر ہیں دل سوے ابنِ زیاد ہیں

نے ہمتوں نے کو نسا وعدہ وفا کیا
کیونکر کہوں کہ مسلمِ بیکس سے کیا کیا

پھر بولا سر کو پیٹ کے با صد غم و محن
آقا ہوا شہید وہ مظلوم نے وطن

نیزے پہ سر ہی جسم ہی نے گور بے کفن
اور اب تلک بندھی ہوئی ہی پاؤں میں رسن

تربت نہیں نصیب تنِ پاش پاش کو
گلیوں میں لوگ کھینچتے پھرتے ہیں لاش کو

باقی جو تھا حضور کا غم خوار و خیر خواہ
مسلم نے لی تھی گھر میں اسی دم کے پناہ

کوڑے لگے پہ منہ سے نہ کی اُن نے آہ
مسلم کے ساتھ وہ بھی ہوا قتل نے گناہ

صادق جو تھے وفا میں تو کامل تھے عشق میں
دونوں کے سر روانہ ہوئے ہیں دمشق میں

شہ نے سنا عرب سے جو سارا یہ ماجرا
فرمایا بازگشت ہے سب کی سوے خدا

جو مسلمِ غریب پہ ہونا تھا ہو چکا
باقی ہے کچھ جو ظلم وہ اب ہم پہ ہوئیگا

خواہانِ مرگ سبطِ رسالت مآب ہے
اُن کا جہان سے کوچ مرا پا تراب ہے

یہ بات کہہ کے رونے لگے شاہِ نامدار
وامسلما کہا کئی باری بحالِ زار

فرماتے تھے کہ ہائے مرے یارِ غمگسار
بھائی حسینؑ تیری غریبی پہ ہو نثار

میں جانتا تھا اب مرے لینے کو آؤ گے
اس کی خبر نہ تھی کہ ہمیں چھوڑ جاؤ گے

دوڑے ہوئے جب آئے تم اس شہ کے قریب
مارے گئے وہاں کوئی جس جا نہ تھا جیب

پردیس میں لحد بھی نہ تم کو ہوئی نصیب
کیسا سفر تھا ہائے مرے قاصدِ غریب

تکتے تھے مجکو یاس سے منہ پھیر پھیر کے
کوفی میں لے گئی تھی اجل تم کو گھیر کے

کوفی بدی کریں گے یہ مجکو نہ تھی خبر
شرمندہ ہے حسینؑ تمھیں پہلے بھیجکر

درپیش ہے ہمیں بھی اسی طرح کا سفر
اب ہم بھی آن پہونچے ہیں واں تم گئے جدھر

تُربے بڑے ہیں کشتۂ اول کے واسطے
سبقت تو ہے ضرور ہر اول کے واسطے

اتنے میں روتے روتے جو کچھ آگیا خیال
مسلم کے دونوں بیٹوں کا پوچھا عرب سے حال

اُس نے کہا کہ کیا کہوں اے شاہِ خوش خصال
حارث کے ہاتھ آگئے وہ دونوں نونہال

بے رحم نے یتیموں پہ کیا کیا ستم کیے
بازو بندھے تھے دونوں کے جب مرقلم کیے

آتا تھا شہر کوفہ سے جس دم میں نوحہ گر
حاکم کے آگے جاتے تھے وہ چھوٹے چھوٹے سر

آنکھیں کھلی تھیں چاند سے چہرے تھے خوں میں تر
رخ پہ پڑی لٹکتی تھیں زلفیں ادھر ادھر

ہاتھوں سے آنکا رنشانِ سجود تھے
بے رحم کے طمانچوں سے عارض کبود تھے

فریاد کر کے کہنے لگے سرورِ عرب
خاموش رہ کہ صبر کی طاقت نہیں ہے اب

بندوں کا اختیار ہے کیا جو رضاے رب
دونوں یتیم بھی نہ بچے اُس کے ہے غضب

معلوم تھا کسے کہ تباہی یہ آے گی
ماں اُن کی جب سنے گی تو کیا خاک اُڑائے گی

رو رو کے پوچھا بچوں کی قبروں کا جب پتا
وہ شخص دونوں ہاتھوں سے سر پیٹنے لگا

کی عرض کچھ نہ پوچھیے اے ابن مرتضیٰ
تجہیز کیسی قبر کجا اور کفن کجا

یوں دفن کم ہوا ہے کوئی کائنات میں
خندق میں لاش باپ کی بیٹے فرات میں

یہ سُن کے اُٹھ کھڑے ہوئے حضرت بچشم نم
کہنے لگا وہ مرد عرب چوم کر قدم

اب کس طرف کا قصد ہے اے سرور امم
شہ نے کہا کہ جائیں گے مقتل پہ اپنے ہم

مُنہ کو سنان و تیغ سے موڑا نہ جائے گا
مجھ سے خدا کی راہ کو چھوڑا نہ جائے گا

رخصت ہوا وہ مرد مسافر بصد فغاں
ہنوڑا سے سر کو گھر میں گئے شاہ دوجہاں

آنکھوں سے اشک ریش مبارک پہ تھے رواں
حضرت کو روتے دیکھ کے گھبرائیں بیباں

صدمے سے رنگ بانوئے بیکس کا فق ہوا
زینب زمیں پہ اٹھ کے گری یہ قلق ہوا

کلثوم سر کو پیٹ کے آئی بہن کے پاس
قاسم کی والدہ میں نہ مطلق رہے حواس

تکتی تھی منہ کو شہ کے سکینہ بچشم یاس
سب سے زیادہ زوجۂ مسلم کو تھا ہراس

خیمے سے صحن تک جو گئی جا بجا گری
چہرے سے رنگ اڑ گیا سر پر ردا گری

رونے سے شہ کے ہوش کسی کے نہ تھے بجا
سینوں میں دل دھڑکتے تھے لرزاں تھے دست و پا

کہتی تھی رو کے زوجۂ عباسِ باوفا
باہر سے یاں انھیں تو بلائے کوئی ذرا

پوچھوں تو حال کیوں شہ والا کا غیر ہے
کیا ہو گیا وطن میں تو لوگوں کی خیر ہے

کبرا پکارتی تھی کہ صغرا کی خیر ہو
یارب مریض بیکس و تنہا کی خیر ہو

مسلم کی بیٹی کہتی تھی بابا کی خیر ہو
غربت میں قاصد شہ والا کی خیر ہو

ہے ہے وطن سے آن کے وہ لٹ گئے نہوں
بھائی مرے پدر سے کہیں چھٹ گئے نہوں

کہتی کبھی سکینہ سے رو کر وہ نے قرار
ہے دل میں شہ کے سب سے زیادہ تمھارا پیار

وجہ بکا تو پوچھو بہن تم یہ میں نثار
حضرت تمھی کو دیکھ کے روتے ہیں بار بار

پڑتا ہے دل میں شک مری چھاتی دھڑکتی ہے
رہ رہ کے غم کی آگ جگر میں بھڑکتی ہے

اتنے میں بڑھ کے شاہ سے زینب نے یہ کہا
بھیّا مجھے بتاؤ تو رونے کی وجہ کیا

فرمایا شاہ نے کہ بہن قہر ہو گیا
بیٹوں سمیت قتل ہوا ابنِ عم مرا

مسلم سے کوفیوں نے بڑی بے وفائی کی
گاڑی نہ لاش بھی مرے مظلوم بھائی کی

پیٹو کہ رانڈ ہو گئی عباسؑ کی بہن
رنڈسالہ اس کو دو کہ نہ اُس کو ملا کفن

مارا گیا مرے لیے ہی ہی وہ صف شکن
اب ہم نہ پھر کے جائیں گے ہم سے چھٹا وطن

آ پہونچی فصل فاطمہؑ کے خاک اُڑانے کی
زینب یہ ابتدا ہے مرے مارے جانے کی

سمجھو تم اس خبر کو مرے قتل کی خبر
بانو بھی ساتھ زوجۂ مسلم کے کھولے سر

پُرسے کو آئے زوجۂ عباسؑ نامور
بیکس تھا وہ شریک عزا ہو تمام گھر

رنڈسالہ بی بیاں اُسے جس دم پھنگیں گی
اماں نکل کے قبر سے پُرسے کو آئیں گی

کہدو سکینہ دخترِ مسلم کے پاس جائے
چھاتی کو جب وہ پیٹے تو یہ سر پہ خاک اُڑائے

کبرا برا بر اُس کے زمیں پر پچھاڑیں کھائے
باپ اُس کا مر گیا ہی گلے سے اُسے لگائے

ہم بھی خدا کی راہ میں اب قتل ہوئیں گے
اک دن اسی طرح ہمیں سب ملکے روئیں گے

یہ سن کے چھاتیوں کو لگے پیٹنے حرم
چلائی رو کے زوجۂ مسلم کہ ہی ستم

مارا گیا سفر میں غلامِ شہِ اُمم
فریاد ہی کہ رانڈ ہوئی میں اسیرِ غم

صدمے اجل کے تین دموں پر گزر گئے
وارث بھی مر گیا مرے بچے بھی مر گئے

غل سُن کے آئے خیمے میں عباسِ نامور
دیکھا بہن تڑپتی ہی سر ننگے خاک پر

دل غم سے ٹکڑے ہو گیا رو دے جھکائے سر
بولے قریب آکے خدا پر کرو نظر

سمجھیں گے اُن سے قاتلِ مسلم نظر میں ہیں
پیٹو نہ سر کہ سید و الا سفر میں ہیں

وابستہ جس کے دم سے ہُوا اُس کا ہے خیال
لازم نہیں تمھیں کہ بھرے گھر میں دھو لو بال

ہم سب غلام جس کے ہیں دیکھو تو اُنکا حال
مانگو دعا جہان میں رہے فاطمہؑ کا لال

لازم ہی تم کو صبر کہ دنیا میں نام ہو
اُس کا زہے شرف کہ نثارِ امام ہو

مسلم ہوئے ہراولِ فوجِ شہِ انام
دنیا میں تا قیام قیامت رہے گا نام

کیا نیک کوچ تھا کہ ہوا خلد میں مقام
مخدومۂ جہان انھیں روویں گی صبح و شام

ماں سے سوا شفیق ہیں اور حق شناس ہیں
بچے تمھارے فاطمہ زہراؑ کے پاس ہیں

شوہر تمھارا صاحبِ عزت تھا اے بہن
حُلّے ملے بہشت میں پایا نہ گر کفن

زخموں کے بدلے ہاتھ لگا خلد کا چمن
ہمسایۂ رسولؐ ملا گو چھٹا وطن

راضی علیؑ ہوں شاد خدا کا حبیب ہو
مانگو دعا کہ ہم کو یہ دولت نصیب ہو

مسلم کا خوں جو راہِ خدا میں ہوا سبیل
پہونچا کنارِ کوثر و تسنیم و سلسبیل

تائیدِ ذوالجلال سے رتبہ ہوا جلیل
عاقل کمال تھا پسرِ حضرتِ عقیل

سمجھو نہ یہ سفر کی تباہی میں مر گیا
زندہ ہے وہ جو راہِ الٰہی میں مر گیا

سمجھاتے تھے بہن کو یہ عباس نامور
روتے تھے سر جھکائے ہوئے شاہِ بحر و بر

مسلم کو یاد کر کے حرم پیٹتے تھے سر
بیٹی پکارتی تھی کہ ہے ہے مرے پدر

تم بن ہماری زیست کی صورت بگڑ گئی
بیٹوں کو ساتھ لے گئے بیٹی بچھڑ گئی

شور بکا ذرا نہ ہوا کم تمام رات
سویا نہ کوئی خیمے میں اک دم تمام رات

تڑپا کیے امام دو عالم تمام رات
گھر میں رہا حسینؑ کے ماتم تمام رات

بس اے انیسؔ اب نہیں لکھنے کی تاب ہے
اس آتشِ الم سے کلیجہ کباب ہے

مرثیہ ۴

جب کربلا میں داخلہ شاہ دیں ہوا
دشتِ بلا نمونۂ خلد بریں ہوا

سر جھک گیا فلک کا یہ اوجِ زمیں ہوا
خورشید محو حسن حسینؑ حسیں ہوا

پایا فروغ نیّرِ دیں کے ظہور سے
جنگل کو چاند لگ گئے چہرے کے نور سے

زہرا کے اختروں سے زمیں آسماں ہوئی
غازی جہاں چلے وہ زمیں کہکشاں ہوئی

سب ارضِ پاک غیرتِ باغِ جناں ہوئی
ایسا مکیں ملا کہ رفیع المکاں ہوئی

دامن جو پاک صاف تھا دشتِ مصاف کا
احرام باندھا کعبہ نے اُس کے طواف کا

ہاتف نے دی صدا کہ زہے شانِ کربلا
مختار کائنات ہے مہمان کربلا

پھولوں سے آج بھر گیا دامانِ کربلا
بس اب نواں بہشت ہے بستانِ کربلا

خورشید دین کے فیض سے کیا کیا ترف ملے
روشن ہے جس سے عرش وہ درجے شرف ملے

یہ دشتِ ہولناک کہاں یہ چمن کہاں
جنگل کہاں بتول کے گل پیرہن کہاں

کعبہ کہاں نبیؐ کا یہ دارِ محن کہاں
قبریں کہاں شکستہ دلوں کی وطن کہاں

آئے ہیں ڈھونڈتے ہوئے اس ارضِ پاک کو
سچ ہے کہ خاک کھینچتی ہے اپنی خاک کو

غل تھا چمن چمن کہ بہار آئی اب قریب
باغی جو چین دیں تو یہ ہے موسمِ عجیب

بولی یہ آشیاں سے جدا ہو کے عندلیب
آیا گلِ ریاضِ محمدؐ خوشا نصیب

فخر اُس زمیں کا جس پہ شہ انس و جن رہے
دیکھو خدا کی شان کہ جنگل کے دن پھرے

خوشبو سے اُن گلوں کی ہوا دشت باغ باغ
غنچے کھلے ہرے ہوئے بلبل کے دل کے داغ

پہونچا سرِ فلک پہ ہر اک کوہ کا دماغ
دریا نے بھی حبابوں کے روشن کیے چراغ

خورشید بن گئے طبقے ارضِ پاک کے
تاروں کو گرد کر دیا ذروں نے خاک کے

جنگل میں بن گیا شجر طور ہر درخت
بالیدگی سے ہو گئے ٹکڑے گلوں کے رخت

آئی صدا فلک سے کہ جاگے زمیں کے بخت
اب اس زمیں پہ سوے گا مختارِ تاج و تخت

رفعت کا اُس کی فرش سے غل عرش تک گیا
لو آج خاک کا بھی ستارا چمک گیا

کہتی تھی آسماں سے زمینِ فلک حشم
کیوں آج مرتبے میں زیادہ ہے تو کہ ہم

مجھ پر ہیں وہ جو مُہرِ نبوت پہ تھے قدم
ذرّے سے بھی یہاں تیرے شمس و قمر ہیں کم

اب تو یہ خاکسار بھی کیوان اساس ہے
زیور جو عرش کا تھا وہ سب میرے پاس ہے

پھیلی جو نکہت چمنِ شاہِ بحر و بر
صحرا میں لہلہا گیا سبزہ بھی سر بسر

جلدی ہوا نے جا کے یہ دریا کو دی خبر
آیا تری کچھار میں مختارِ خشک و تر

جب تک وہ بحرِ فیض برائے وضو بڑھے
بڑھ کر قدم تو لے کہ تری آبرو بڑھے

ساحل پہ ہوں گے جلوہ نما امامِ دہر
دریا دلی کا ہو گا تری شور شہر شہر

یہ سُن کے بے قرار ہوئی علقمہ کی نہر
سر کو قدم کیے ہوئے دوڑی ہزار لہر

آمد سُنی جو سبطِ رسالت مآب کی
ساحل سے آنکھ لڑ گئی اک اک حباب کی

بولے فرس کو روک کے شاہِ فلک وقار
منزل پہ ہم پہونچ گئے احسانِ کردگار

آگے نہ اب بڑھائے کوئی یاں سے راہوار
یہ وہ زمیں ہے جس کے لیے دل تھا بیقرار

قربان اس مکانِ سعادت نشان کے
پایا دُرِ مراد بڑی خاک چھان کے

اُترو مسافرو کہ سفر ہو چکا تمام
کوچ اب نہ ہو گا حشر تلک ہے یہیں مقام

مقتل یہی زمین ہے یہی شہرِ امام
اونٹوں سے بار اُتار کے برپا کرو خیام

بستر لگاؤ شوق سے اس ارضِ پاک پر
چھڑکا ہوا ہے آبِ بقا یاں کی خاک پر

مثلِ زمینِ خلدِ مصفّا ہے یہ زمین
ساتوں فلک سے اوج میں بالا ہے یہ زمیں

روئے زمیں پہ عرشِ معلّی ہے یہ زمیں
فردوس کا کھنچا ہوا نقشا ہے یہ زمیں

اس کے مکین نہوں گے پراگندہ نشر میں
بے سر اسی زمین سے ہم اُٹھیں گے حشر میں

مرغوب طبع ہی یہ زمین فلک جناب
سوے گا اس کی خاک پہ فرزند بوتراب

ہی اس طرح یہ ساری زمینوں میں انتخاب
جس طرح ذی شرف ہی ستاروں میں آفتاب

مرنا لکھا ہوا ہی یہیں سرنوشت میں
جائے گا ہاتھوں ہاتھ یہ طبقہ بہشت میں

سجدے کریں گے جس پہ ملک روز زمیں پہ ہی
جس پر کھدا ہی نقش شفا وہ نگیں یہ ہی

بطحا یہ ہی مدینہ ارباب دیں یہ ہی
کعبہ یہ ہی نجف یہ ہی خلد بریں یہ ہی

تھی اس زمین کی قدر رسولان پاک کو
آنکھوں سے سب لگاتے ہیں اس کی خاک کو

ذروں سے اس کے اشرفی مہر زرد ہی
مٹی طلا ہی نسخہ اکسیر گرد ہی

کردے سقر کی آگ کو پانی یہ سرد ہی
کحل بصر ہی دارو ے اندوہ و درد ہی

زندے الم سے بچتے ہیں مردے فشار سے
آنکھوں میں نور آتا ہی اس کے غبار سے

خاک اس کے دل میں ہو جسے خاک سے غبار
مجرم بھی اس کے فیض سے اٹھے گا سرخ رو

پڑ جاے جس کے جسم پہ خاک اس کی ایک بار
سایہ سے اس کے آتش دوزخ کرے فرار

یوں دور ہوں گناہ سب اس نیک بخت سے
پتے خزاں میں گرتے ہیں جیسے درخت سے

کام آے گی لحد میں یہ ہنگام درد یاں
اس خاک سے بنے گا کفن نور کا لباس

تسبیح اس کی قبر میں ہوے گی جس کے پاس
سو سو طرح کی پاے گا راحت وہ حق شناس

فرمائیں گے ملک ارم اس کا مقام ہی
سونے دو چین سے یہ مطیع امام ہی

دیں گے جو اس کی خاک سے لکھا ہوا کفن
میت پہ پھر نہ ہو گا کوئی صدمہ و محن

ڈھانپے گا اس کو چادر رحمت سے ذوالمنن
خوشبو سے ہو گا کنج لحد خلد کا چمن

پھولوں میں خاک پاک کفن کو بسا ے گی
حوروں سے نکہت گل فردوس آے گی

توشہ مسافروں کا یہی اور یہی زاد
یہ خاک آب خضر سے رتبے میں ہی زیاد

طوفان میں اس کو ڈالے گا جو مرد خوش نہاد
لے آے گی ہوا ے موافق بدر مراد

دیکھے گا یاس میں کرم کارساز کو
تھامے گا دست موج سے دریا جہاز کو

اُترا یہ کہہ کے کشتیِ امت کا ناخدا
جتنے سوار تھے وہ ہوئے سب پیادہ پا

حضرت نے مسکرا کے یہ ہر ایک سے کہا
دیکھو تو کیا ترائی ہے کیا نہر کیا فضا

اکبرؑ شگفتہ ہو گئے صحرا کو دیکھ کر
عباسؑ جھومنے لگے دریا کو دیکھ کر

بولے یہ اشک بھر کے شہنشاہِ سربلند
کیوں یہ مقام ہے تمھیں شاید بہت پسند

کی مسکرا کے عرض کہ یا شاہِ ارجمند
بس یاں تو خود بخود ہوئی جاتی ہے آنکھ بند

شیراز یہیں رہیں گے غنایت عرب کی ہے
میں کیا کہوں حضور ترائی غضب کی ہے

گرمی میں ایسی سرد ہوا یا شہِ انام
ہے لیٹنے کی جا یہ زمینِ فلک مقام

مشہور غازریہ ہے شاید اسی کا نام
جی چاہتا ہے یاں سے سرکیے نہ ایک گام

ایسی جگہ بس اب نہ ملے گی کسی جگہ
کیا لطف ہے جو قبر بھی ہووے اسی جگہ

روتے ہوئے وہاں سے بڑھے آپ چند گام
گویا زمیں کی سیر کو اُترا مہِ تمام

انجم کی طرح گرد تھے حیدرؑ کے لالہ فام
شکلیں وہ نور کی وہ تجمل وہ احتشام

زلفیں ہوا سے اُڑتی تھیں ہاتھوں میں ہاتھ تھے
لڑکے بھی بند کھولے ہوئے ساتھ ساتھ تھے

تکنے لگے پہاڑوں کو مسلم کے دونوں لال
پھولوں سے کھیلنے لگے زینب کے نونہال

سبزے سے واں کے ابنِ حسنؑ خوش ہوئے کمال
کی عرض اس زمیں کا ہر ایک گل ہے بے مثال

اے خسروِ زمین یہ جگہ ہے جلوس کی
خوشبو ہے یا نکی خاک میں عطرِ عروس کی

صحرا سے آئے پھر سوئے دریا شہِ امم
الیاس شاد ہو کے پکارے زہے حشم

اُبھریں درود پڑھتی ہوئی مچھلیاں بہم
بولے حباب آنکھوں پہ شاہا ترے قدم

پانی میں روشنی ہوئی حسنِ حضور سے
لے لیں بلائیں پنجۂ مرجاں نے دور سے

ٹھہرے کنارِ نہر جوانانِ ماہرو
دھویا کسی نے رخت کسی نے کیا وضو

گھوڑے جو آئے پیاس بجھانے کنارِ جو
بھر لائے اشک آنکھوں میں شبیرِ نیک خو

کھینچی اک آہ سرد ترائی کو دیکھ کر
ہاتھوں سے دل پکڑ لیا بھائی کو دیکھ کر

بولے یہ ہاتھ جوڑ کے عباسِ نامور
ایذا ہی محملوں میں بہت اہلِ بیت پر
کب سے عماریوں کے ہیں رُخ چھٹے ہوئے
کچھ سوچ کر امام دو عالم نے یہ کہا
پیچھے ہٹے یہ سُنتے ہی عباسِ باوفا
حاضر ہی جاں نثار امامِ غیور کا
بولی یہ سن کے دخترِ خاتونِ روزگار
خشکی ہو یا ترائی چمن ہو کہ سبزہ زار
مختارِ کائنات کے تم نورِ عین ہو
عاقل ہو تم تو نام خدا اے علی کے لال
دریافت کر لو پہلے کسی سے یہاں کا حال
گوشہ ملے ہمیں نہ فضا ہو نہ سیر ہو
آرام کو ترس گئے جب سے چھٹا ہی گھر
یہ آندھیاں یہ گرمی کے ایام یہ سفر
گرمی سے کھیت خشک تھے جنگل اجاڑ تھا
آج اس زمین پر ہمیں لایا ہی آسماں
آقا کی خیریت کی دعا مانگو بھائی جان
دشمن بہت ہیں بادشِ خوش خصال کے
بھائی سے اس زمین کی سنی ہی بہت صفت
جو جو سمن ہیں اُن سے بھی لازم ہی مصلحت
ساحل پہ دشمنوں میں کسی کا عمل نہ ہو

خیمہ کہاں بپا کریں یا شاہ بحر و بر
بچے ہیں نازکی میں گلوں سے زیادہ تر
گرمی کے مارے دم ہیں سبھوں کے رُکے ہوئے
زینب جہاں کہیں وہیں خیمہ کرو بپا
جا کر قریبِ محملِ زینبؑ یہ دی صدا
برپا کہاں ہو خیمۂ اقدس حضور کا
اس امر میں بھلا مجھے کیا دخل میں نثار
ہر جا مسافروں کا نگہبان ہی کردگار
اُترو وہاں جہاں کہ مرے بھائی کو چین ہو
مجھ سے زیادہ بھائی کی راحت کا ہی خیال
واری کسی طرح کا نہ آقا کو ہو ملال
اتو یہی پڑی ہی کہ جانوں کی خیر ہو
کن آفتوں میں پانچ مہینے ہوئے بسر
دن بھر چلے ہیں دھوپ میں جاگے ہیں رات بھر
ایک ایک کوس راہ جبل میں پہاڑ تھا
اب دیکھیے دکھائی ہی تقدیر کیا یہاں
یارب مسافروں کو مبارک ہو یہ مکاں
بھائی بہن نثار ذرا دیکھ بھال کے
ہی وہ امام واقفِ اسرارِ شش جہت
صدقے گئی حبیب سے بھی کر لو مشورت
بھیّا مجھے یہ ڈر ہی کہ رد و بدل نہ ہو

دست ادب کو جوڑ کے اُس شیر نے کہا
تشویش کچھ نہ کیجیے ای بنت مرتضا

ہر چند مصلحت مری کیا اور عقل کیا
لیکن کوئی ترائی سے بہتر نہیں ہی جا

جو مہر فاطمہ میں ہی یہ وہ فرات ہی
گرمی میں قرب نہر کا آبِ حیات ہی

جس سر زمیں پہ دلبرِ زہرا عمل کرے
زہرہ کسی کا کیا ہی جو رد و بدل کرے

مانع وہ ہو جو دینِ نبیؐ میں خلل کرے
کافر ہی جو حسینؑ سے جنگ و جدل کرے

دخل اس میں روم کا ہی نہ سلطانِ شام کا
دنیا کی سب زمیں پہ ہی قبضہ امام کا

حضرت کے حکم کا مترصد ہی جاں نثار
ارشاد یہ ہوا کہ دیا تم کو اختیار

آیا حضورِ سبطِ پیمبرؐ وہ ذی وقار
کی عرض خیمہ نہر پہ کرتا ہی خاکسار

اتریں یہیں یہ مرضیٔ آلِ رسولؐ ہی
بولا وہ بحرِ فیض کہ اچھا قبول ہی

یہ سُن کے خادموں کو پکارا وہ مہ جبیں
فرّاش آکے جلد مصفّا کریں زمین

حاضر ہوں آب پاش محل دیر کا نہیں
یاں ہوگا خیمہ حرم بادشاہ دیں

جلد اُن کو بھیجو لوگ ہیں جو کار و بار کے
لے آؤ اشتروں سے قناتیں اُتار کے

بولے زہیر قین کہ حاضر ہیں سب غلام
بڑھ کر حبیب بھی ہوے مصروفِ اہتمام

کُرسی منگا کے بیٹھ گئے اک طرف امام
رُتبے میں ہوگئی وہ زمین عرشِ احتشام

پرتو فگن تھا نور رسالت مآب کا
سر پر لگا تھا چتر زری آفتاب کا

تھا فکر میں خموش دو عالم کا تاجدار
کھلوا رہے تھے خیموں کو عباسِ ذی وقار

ناگہ اٹھا شمال کی جانب سے اک غبار
رایت سیاہ و سرخ نظر آئے تین چار

مُڑ کر کہا حبیب نے کچھ رنگ اور ہی
بولا کوئی یہ شام کے لشکر کا طور ہی

یک جا ہوے یہ سن کے جوانانِ صف شکن
نکلا ہر اک دلی کی زباں سے یہی سخن

آئے ہیں ملکِ غیر میں ہم چھوڑ کر وطن
تو سب کی خیر کیجیو ای رب ذوالمنن

اعدائے دین کے شر سے حفاظت میں ہم رہیں
ناحق کوئی لڑے بھی تو ثابت قدم رہیں

کہنے لگے پکار کے عباسؑ حق شناس
ہاں ناصرانِ قبلۂ کونین ہا حواس!

دل میں نہ خوف ہو نہ زباں پر کلام ہیں
جینے ہو تو حسینؑ سے ہو قدر داں کے پاس

گر مر گئے تو روضۂ رضواں کی سیر ہے
دونوں طرف مآل تمہارا بخیر ہے

کیا ڈر فشونِ روم ہے یہ یا جنودِ شام
ہم اپنے کام میں ہیں ہمیں کیا کسی سے کام

جو مرد ہیں ہراس کے کرتے نہیں کلام
ہونے دو گرد میں سرخ علم یا سیاہ فام

سرسبز ہیں وہی جو علی کے نشان ہیں
خود جھک کے وہ ملیں گے کہ ہم میہمان ہیں

یہ ذکر تھا کہ بن میں سیاہی سی چھا گئی
ڈنکے کی دشتِ ظلم سے کوسوں صدا گئی

گھوڑوں کے دوڑنے سے زمیں تھرتھرا گئی
جنگی سپاہ گھاٹ کے نزدیک آ گئی

ایک ایک ہیل زور تہمتن شکوہ تھا
ابن رکابِ سبز قدم سرگروہ تھا

بولے ملازموں سے یہ عباسؑ باوفا
دریافت تو کرو کہ ارادہ ہے ان کا کیا

آتے ہی سرکشی یہ طریقہ ہے کونسا
کہدو کہ اہل بیت کے خیمہ کی ہے جا

لازم رسول زادیوں کا احترام ہے
اتریں الگ کہیں یہ ادب کا مقام ہے

کرسی نشین ہے بخت دل سید البشر
آئین خسروی سے یہ واقف نہیں مگر

آتی ہے دوڑ کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے گرد ادھر
کیا ہے جو روکتے نہیں باگیں بخیرہ سر

بھولے ہوئے ہیں اس پہ کہ ہم خاکسار ہیں
شاید ہوا کے گھوڑوں پہ ظالم سوار ہیں

اس فوج کے رئیس نے بڑھ کر کیا کلام
حکم امیر ہے یہیں اترے سپاہِ شام

چھوڑیں گے ہم اسے کہ جو راحت کا ہے مقام
دریا سے ہٹ کے آپ بپا کیجیے خیام

لشکر کشی ہے بادشہِ کائنات پر
کل مورچے سپاہ کے ہوں گے فرات پر

کوفے سے کل جواں ادھر آئے ہیں دس ہزار
رستے میں شام کی ابھی فوجیں ہیں بے شمار

خالی ہیں منزلیں نہ بیاباں نہ کوہسار
شہروں سے پرگنوں سے چلے آتے ہیں سوار

لاکھوں ہیں کوئی قبل کوئی بعد آئے گا
گنتی ملے گی جب پسرِ سعد آئے گا

فوجوں کا جائزہ تھا وہاں ہم چلے تھے جب
گردے میں بیس کوس کے لشکر پڑا تھا سب

دستوں کی روم و شام کے آمد ہر فرد پیش
اس ارض پر نہ ہو جو سمائی تو کیا عجب

یکجے مقام گر کوئی گوشہ جدا ملے
ممکن نہیں کہ نہر پہ خیمے کی جا ملے

ہم گھاٹ روکنے کے لیے آئے ہیں ادھر
ہے آج شب کو داخلۂ شمر کی خبر

سُنتے ہی یہ ترائی میں گونجا وہ شیر نر
تیوری چڑھا کے تیغ کے قبضہ پہ کی نظر

کم تھا نہ ہمہ اسد کردگار سے
نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے

غصے میں رکھ کے دوش پہ شمشیر برق دم
نعرہ کیا اسد نے کہ تم سے ہٹیں گے ہم

گر فوج قاہرہ کی ہے آمد تو کیا ہے غم
گرتا ہے کٹ کے سر وہیں جس جا جمے قدم

بپھریں جو شیر سامنے آتا نہیں کوئی
یہ آنکھ وہ ہے جس میں سماتا نہیں کوئی

دنیا ہو اک طرف تو نہ آئے خیال میں
لاکھوں پہ اپنی تیغ چلی ہے جدال میں

گیتی ہو نے نشاں اگر آئیں جلال میں
ہے سب طرح کا زور محمد کی آل میں

دریا ہے کیا یہ شیر ہٹیں جس کو چھوڑ کے
جب پل بنا دیا در خیبر کو توڑ کے

تم کون ہو حسینؑ ہے مختار خشک و تر
انؑ کے سوا ہے کون شہنشاہ بحر و بر

دیکھو فساد ہوگا بڑھو گے اگر ادھر
شیروں کا یاں عمل ہے تمھیں کیا نہیں خبر

سبقت کسی پہ ہم نہیں کرتے لڑائی میں
بس کہدیا کہ پاؤں نہ رکھنا ترائی میں

دریا تو ابتدا سے ہمارا ہے تم ہو کون؟
اس کا محبّ رسولؐ کا پیارا ہے تم ہو کون؟

اللہ نے زمین کو سنوارا ہے تم ہو کون
ساحل پہ کچھ کسی کا اجارا ہے تم ہو کون؟

ہیہات غصب حق سے پھرے آج تک نہیں
منزل مسافروں کی یہ ہے کچھ فدک نہیں

کیا ابن سعد شوم کی فوج اور کیا ستم
سر لوٹتے پھریں گے بڑھایا اگر قدم

اُترے ہیں آکے فخر سلیماں کے ساتھ ہم
کیا اُن کے مورچے کہ جو ہوں جنو بیٹوں سے کم

کچھ ڈر نہیں چھ لاکھ اگر بدخصال ہیں
ہم بھی کنندۂ در خیبر کے لال ہیں

کیا سر پہ موت آئی ہی بس سامنے سے جاؤ
فوجوں کا ذکر کرکے کسی اور کو ڈراؤ

دعوی ہی کچھ سپاہ گری کا اگر تو آؤ
بیٹا رحیم کا ہوں مجھے غیظ میں نہ لاؤ

تلوار ادھر کبھی کہ ادھر کھیت پڑ گیا
پھر کچھ نہ بن پڑے گا اگر میں بگڑ گیا

ہم شیر ہیں قسم اسد کردگار کی
رکھتے ہیں ناخنوں میں برش ذوالفقار کی

تو کی نہ اصل یاں نہ حقیقت ہزار کی
ٹوکے یہ کیا مجال کسی نابکار کی

گرجیں ابھی تو رعد ہیں برسیں تو ابر ہیں
اک میں نہیں بہت ابھی ایسے ہزار ہیں

چھوڑیں نہ یہ زمین جو گرے سر پہ آسمان
بڑھ کر ہٹا نہیں کبھی اس فوج کا نشاں

جب تک کہ دم میں دم ہی بجائے گی آن بان
ریتی پہ ہم بپا کریں خیمہ خدا کی شاں

مر جائیں وہ جو ساتھ کئی شیر خوار ہیں
فی الواقعی ہم ایسے ہی تقصیروار ہیں

ہم پہلے آئے ہیں کہ تم آئے ہو نا بہ نہر
کیوں غاصبو یہ نہر نہیں فاطمہ کا مہر

چھوڑ آئے ہیں تمھارے بلانے پہ اپنا شہر
کوئی مسافروں پہ یہ کرتا ہی جبر و قہر

اترے ابھی نہیں کہ لڑائی ٹھہر گئی
وعدے وہ کیا ہوئے وہ محبت کدھر گئی

شر اس قدر زمیں پہ تمھارے سروں کی خاک
مٹی ہے لکھے تھے عریضوں میں جو تپاک

ہو تو ترا بہوں کی جگہ یہ زمین پاک
ہوویں گی تربتیں بھی یہیں گر ہوئے ہلاک

تم لوگے کس طرح یہ جگہ ہم کو بھائی ہی
مشہور ہی کہ شیروں کا مسکن ترائی ہی

سوچو تمھیں لوں میں کہ حق دار کون ہی
عالم میں تر و بحر کا مختار کون ہی

ہادی ہی کون سید ابرار کون ہی
ہی بے قصور کون گنہگار کون ہی

لازم ہی تم کو پاس کلام مجید کا
کلمہ نبی کا پڑھتے ہو تم یا یزید کا

پوچھ کس کے گھر سے دین کی دولت ملی تمھیں
صدقہ ہی کس ولی کا جو عزت ملی تمھیں

خوان کرم سے کس کے یہ نعمت ملی تمھیں
ہادی ہوئے جو ہم تو ہدایت ملی تمھیں

پھلتا نہیں نہال حسد پھولتا نہیں
محسن کو اس طرح سے کوئی بھولتا نہیں

ہم تو تمھیں سمجھتے ہیں سیّد کا خیر خواہ
کیا خوب میہمانوں کی دعوت ہے واہ واہ

الفت نہ دِل دہی نہ تعارف نہ رسم و راہ
معصوم سے وہ کونسا ایسا ہوا گناہ

چشمے پہ جنگ فاطمہ کے نورِ عین سے
نامنصفو پھرائے ہو آنکھیں حسینؑ سے

ہر چند خاکسار ہیں فرزندِ بوتراب
پر سرکشی کی ہم سے کسی کو نہیں ہے تاب

کُہنی تک آستیں کو جو الٹیں دمِ عتاب
گردوں میں تھرتھرا کے چھپے قُرصِ آفتاب

آجائے انقلاب کی آفت جہان پر
ہو آسمان زمیں پہ زمیں آسمان پر

ارض و سما کو ہم تہ و بالا کریں ابھی
جو سرکشی کرے اُسے پسپا کریں ابھی

اِس سرزمین کو خون کا دریا کریں ابھی
ساحل تک آئے جو اُسے ٹھنڈا کریں ابھی

بولے کوئی "تو تن سے سر اُس کا جدا کریں
خیمہ بپا نہ ہو تو قیامت بپا کریں

ظالم بگڑ بگڑ کے بڑھے ایک بار سب
بلوہ جو ہو گیا سمٹ آئے سوار سب

نیزے علم کیے ہوئے تھے نیزہ دار سب
باندھے تھے ایک غول ضلالت شعار سب

لیکن ملا نہ سکتے تھے آنکھ اُس دلیر سے
اک شور تھا کہ چھین لو دریا کو شیر سے

بگڑے ابوتمامۂ و سعدِ فلک سریر
تولی زہیر قین نے شمشیر بے نظیر

جوڑا کماں میں ابن مظاہر نے ایک تیر
بولے اسد کہ زجر کے قابل ہیں شیر یہ

عابس کو غیظ لشکرِ بدخو پہ آگیا
غصّے سے بل ہلال کی ابرو پہ آگیا

بولے اُٹھا کے نیزے کو ضرغامۂ دلیر
بس اب سزا میں ان کی مناسب نہیں ہے دیر

بولے شبیب ادھر سے جو نکلے گا ایک شیر
بھاگیں گے سب یہ گھوڑوں کی گوں کو پھیر پھیر

آقا کا ہے یہ پاس کہ ہم دور دور ہیں
کثرت پہ اپنی بھولے ہیں کیا بے شعور ہیں

اُلٹی جناب قاسمِ ذیشان نے آستیں
قبضے پہ ہاتھ رکھ کے بڑھے اکبرِ حسین

بولے پکڑ کے نیچے زینب کے مہ جبین
شیروں سے کیا ترائی کو لیں گے یہ اہلِ کیں

کہیے تو نیزہ بازوں کو ہم دیکھ بھال لیں
تیوری کوئی چڑھائے تو آنکھیں نکال لیں

آگے تھے سب کے حضرت عباسؑ ذی حشم
بڑھ بڑھ کے روکتے تھے دلیروں کو دم بدم

تیغیں جو تولتے تھے اُدھر بانیٔ ستم
کہتے تھے سر نہ ہوگا بڑھایا اگر قدم

لرزہ تھا رعب حق سے ہر اک نابکار کو
روکے تھا ایک شیرِ جری دس ہزار کو

بڑھتا تھا جھومتا ہوا جس دم وہ شیر نر
گرتا تھا کوئی ڈر کے اِدھر اور کوئی اُدھر

تیغیں جو کھنچ گئیں تو ہوا اور شور و شر
گھبرائے اہلِ بیتِ شہنشاہِ بحر و بر

آغوش میں پھوپھی کی سکینہ دہل گئی
غل پڑ گیا کہ گھاٹ پہ تلوار چل گئی

چلّائی رو کے زینبِ ناشاد و نامراد
ہی ہی خبر تو لو کہ یہ کس سے ہوا فساد

غربت زدوں سے کیا سببِ کینہ و عناد
دیکھے کوئی کدھر ہیں شہنشاہ خوش نہاد

ہمشیر کو نثارِ امامِ اُمم کرو
لوگو دعائیں اکبرِ مہرو پہ دم کرو

محمل سے منہ نکال کے فضہ نے یہ کہا
بلوہ کنارِ نہر ہی اے بنتِ مرتضیٰؑ

نیزے بڑھا بڑھا کے ہٹاتے ہیں شقیا
قبضے پہ ہاتھ رکھے ہیں عباسؑ باوفا

کیا جانے کس نے ٹوک دیا ہی دلیر کو
سب دشت گونجتا ہی یہ غصہ ہی شیر کو

زینبؑ پکاریں پیٹ کے نالو بصد ملال
ہی ہی غضب ہوا اگر آیا انھیں جلال

کہدے کوئی کہ اے اسدِ کبریا کے لال
غربت پہ ابن فاطمہؑ کی تم کرو خیال

قربان ہو گئی نہ لڑائی کا نام لو
میں ہاتھ جوڑتی ہوں کہ غصے کو تھام لو

لڑنے کو تیغ میان سے کھینچو گے تم اگر
محمل سے گر پڑوں گی زمیں پر میں ننگے سر

عباسؑ تم تو ساقیٔ کوثر کے ہو پسر
یہ نہر کیا ہی جس کے لیے رنج اس قدر

مر جاؤں گی سفر میں جو بچھڑوں گی بھائی سے
جنگل مجھے پسند ہی گزری ترائی سے

دریا کو روکتے ہیں اگر بانیٔ ستم
جلتی زمین پہ بچوں کو لیکر رہیں گے ہم

غربت زدوں پہ چاہیئے اللہ کا کرم
پھرا دو بس سکینہ کے سر کی تمھیں قسم

ثابت ہوا کسی کو ہماری ولا نہیں
پانی بھی اب نہ دیں تو ہمیں کچھ گلا نہیں

یہ بات کہہ کے رونے لگی خواہرِ امام
کرسی سے جلد اُٹھ کے پکارے شہِ انام
یکساں ہے بر و بحر ہماری نگاہ میں
ہر چند اس میں کوئی تمہارا نہیں قصور
خیر امتحاں کا دن بھی کچھ ایسا نہیں ہے دور
ادنیٰ سے بحث ننگ ہے عالی مقام کا
لے سکتے ہیں ترائی کو تم سے یہ نابکار
جرأت میں تم نہ ایک نہ یہ اہل کیں ہزار
نے آبِ تیغ دم میں یہ ناری خاک ہوں
ہے گرچہ ان کی نے ادبی قابلِ سزا
جنگل ہو یا ترائی ہو ہے ہر جگہ خدا
کرتا ہے عاجزی وہی جو حق شناس ہے
صدقے ترے جلال کے اے میرے آفتاب
تم سے مقابلے کی جہاں میں کسے ہے تاب
یہ کیا ہیں تم تو سدِّ سکندر کو توڑ دو
لازم ہے ان پہ رحم یہ امت ہے میں نثار
ان کے لیے حسنؑ نے کیا جبر اختیار
ہو نوجوان مزاج میں غصہ ہے آپ کے
آؤ تمہیں قسم ہے جناب امیرؑ کی
ہمراہ بیٹیاں ہیں شہِ قلعہ گیر کی
کیا دشت کم ہے صابر و شاکر کے واسطے

عباسؑ اُدھر غضب میں بڑھے سوئے فوجِ شام
بھیا ہمارے سر کی قسم روک لو حسام
غیظ و غضب کو دخل نہ دو حق کی راہ میں
ناحق فساد کرتے ہیں تم سے یہ نے شعور
جانے دو جاہلوں سے یہ تکرار کیا ضرور
بس خامشی جواب ہے ان کے کلام کا
کس پر یہ خشم اے شہِ مرداں کے یادگار
بخشا ہے ہر طرح کا تمہیں حق نے اختیار
گر مُنہ سے اُف کرو تو ابھی جل کے خاک ہوں
پر تم پسرِ رحیم کے ہو بخشد و خطا
مظلوم کو غریب کو غصے سے کام کیا
ہم کو نبیؐ کی روحِ مطہّر کا پاس ہے
یاد آگیا مجھے اسد اللہ کا عتاب
جعفرؑ ہو دبدبے میں شجاعت میں بوتراب
لو ہم کو چاہتے ہو تو دریا کو چھوڑ دو
کرتے تھے مصطفےٰؐ انھیں بیٹیوں کی طرح پیار
دشمن پہ بھی روا کرم شیر کردگار
بیٹا وہ ہے قدم بہ قدم ہو جو باپ کے
بگڑو نہ سرکشی پہ سپاہِ شریر کی
سب سے جدا ہی چاہیے منزل فقیر کی
یہ اہتمام ایک مسافر کے واسطے

تھوڑے سے بستروں کی ہے درکار ہم کو جا
جنگل ہوا تو کیا جو ترائی ہوئی تو کیا

ہے عمر نے ثبات زمانہ ہے نے وفا
آرام کا محل نہیں یہ عاریت سرا

اب وہ کہاں ہیں شہر جنھوں نے بسائے ہیں
سب اس زمین پہ خاک میں ملنے کو آئے ہیں

آقا نے دی جو اپنے سرِ پاک کی قسم
بس تھرتھرا کے رہ گیا وہ صاحبِ کرم

پر تھی شکن جبیں پہ نہ ہوتا تھا غیظ کم
چپ ہو گئے قریب جب آئے شہِ امم

گردن جھکا دی تا نہ ادب میں خلل پڑے
قطرے لہو کے آنکھوں سے لیکن نکل پڑے

تیغ و سپر کو پھینک کے بولا وہ نامور
کہہ دیجیے ان سے کاٹ کے لیجائیں میرا سر

حکمِ خدا ہے حکمِ شہنشاہِ بحر و بر
اب کچھ کہوں زبان سے کیا تاب کیا جگر

میں ہوں غلام آپ کے ادنیٰ غلام کا
آقا مجھے خیال تھا بابا کے نام کا

اُترے گی آ کے نہر پہ اب شام کی سپاہ
پانی بھی ہم پہ بند کریں گے یہ روسیاہ

اس دشت میں نہ اور ہے چشمہ کوئی نہ چاہ
سب قافلہ حضور کا ہو جائے گا تباہ

اس فکر میں غلام کا دل آب آب ہے
پر عینِ مصلحت ہے جو حکمِ جناب ہے

گردن میں ہاتھ ڈال کے حضرت نے یہ کہا
کیوں کاٹتے ہو غیظ سے بھائی یہ کیا کیا

لو اب اٹھا لو تیغ و سپر تم پہ میں فدا
دریا کو تم تو لے چکے اے میرے مہ لقا

وہ شیر ہو کہ دھاک ہے ساری خدائی میں
دیکھو کوئی تمھارے سوا ہے ترائی میں

اس قوم سے نہ رد و بدل چاہیے تمھیں
غصہ نہ برہمی نہ جدل چاہیے تمھیں

قربِ خدائے عزوجل چاہیے تمھیں
جو ہم کہیں اسی پہ عمل چاہیے تمھیں

بھائی جگہ مزاروں کی پہچانتا ہوں میں
جو ہوگا اس زمیں پہ وہ سب جانتا ہوں میں

ہے منکشف امام پہ احوالِ بحر و بر
حق نے کیا ہے واقفِ اسرارِ خشک و تر

صدمہ ہے دل پہ کیا میں کہوں تم سے یہ خبر
قبضہ تمھارا تا بہ قیامت ہے نہر پر

دولت مٹے گی یاں اسدِ کردگار کی
بھیا یہی جگہ ہے تمھارے مزار کی

ہوتا ہی کیا ہزار کہیں ساکنانِ شام
بخشتا ہی تم کو خالقِ اکبر نے یہ مقام

کہتے ہیں اِس زمین پہ ملک کے صبح و شام
یاں ہوگی قبر حضرتِ عباسؑ نیک نام

دیندار گرد قبر کے بستی بسائیں گے
شہروں سے لوگ یاں کی زیارت کو آئیں گے

سچ ہی کہ ہاتھ آپ کے آئی ہی کیا جگہ
پیارے ہمارے بھائی کو بھائی ہی کیا جگہ

ٹھنڈی ہوا میں سونے کو پائی ہی کیا جگہ
کیا سبزہ کیا نفیس ترائی ہی کیا جگہ

لنگر ہو تم نجات کی کشتی کے واسطے
لازم ہی قربِ نہرِ بہشتی کے واسطے

آؤ اب اپنی قبر کی جا ہم تمھیں دکھائیں
مقتل میں نخل بھی نہیں سایہ کہاں سے لائیں

قسمت میں یہ لکھا ہی کہ جنگل کی دھوپ کھائیں
چالیس روز تک نہ کفن اور نہ غسل پائیں

میدان ہو اور لاشِ حسین غریب ہو
بھائی قریب ہو نہ ترائی قریب ہو

عباسؑ آب دیدہ ہوئے سُن کے یہ کلام
بھائی کا ہاتھ ہاتھ میں لیکر چلے امام

فرمایا واں پہونچ کے جو تھا قتل کا مقام
دیکھو حسینؑ ہوگا یہیں قتل تشنہ کام

بھائی مقامِ خیمۂ آلِ عبا ہی وہ
باہر ہی جو نشیب سے تربت کی جا ہی وہ

رونے لگے پکار کے عباسِ نامدار
شہ نے کہا کہ ضبط کرو تم پہ میں نثار

سن پائے گی جو زینبِ بیکس یہ حالِ زار
مرجائے گی تڑپ کے ابھی وہ جگر فگار

مجھ کو بہت خیال ہی زہرا کی جائی کا
مرنا کوئی بہن نہ سنے اپنے بھائی کا

قدموں پہ سر جھکا کے یہ بولا وہ نیک نام
ارشاد یہ تو کیجیے اے قبلۂ انام

پہلے مرے گا آپ سے یہ باوفا غلام
رو کر کہا کہ ہاں یہی ہوگا کلام

مجبوری ہی کہ بھائی کو ہاتھوں سے کھوئیں گے
روؤ گے تم نہ ہم کو ہمیں تم کو روئیں گے

مژدہ یہ سن کے شاد ہوا وہ اسیرِ غم
سجدہ کیا کہ بھائی سے پہلے مریں گے ہم

ریتی پہ آکے گاڑ دیا شیر نے علم
برپا ہوئے خیامِ شہ آسمان حشم

ذرّے نجوم بن گئے سارے زمین پر
اُترے خدا کے عرش کے تارے زمین پر

کھینچا فلک پہ خیمۂ زنگار گوں نے سر
روشن ہوئے کلس کی تجلی سے دشت و در

تار شعاع تھے کہ طنابیں تھیں جلوہ گر
پردا حرم کا تھا کہ قناتیں اِدھر اُدھر

جنگل کا اوج ہو گیا خیمہ کی شان سے
تلہ زمین کا اُٹھ کے ملا آسمان سے

تھا اُس کے ارتفاع میں کرسی کلس جو طور
سکّان عرش دیکھتے تھے فرش کو بنور

شمسے کا اوج تھا خیمے کا دور دور
گویا کہ آسمان کے تلے آسمان تھا اور

سر جا ملا جو شمسۂ کیواں جناب کا
سونا اُتر گیا ورق آفتاب کا

خیمے میں جا چکے جو حرم باصد احترام
ڈیوڑھی پہ آ کھڑے ہوئے عباس نیک نام

کمریں اِدھر کھلیں اُدھر اُتری سپاہ شام
بھائی کو لیکے خیمہ میں داخل ہوئے امام

اُمڈا تھا دل جو سبط نبیؐ کی جدائی سے
زینب لپٹ کے رونے لگی چھوٹے بھائی سے

آنکھوں میں اشک بھر کے یہ کوثر زمن
صدقہ اُتارو کچھ مرے بھائی پہ بہن

تھے دس ہزار مستعد جنگ تیغ زن
جیتا میں زخمی ہوتے جو عباس صف شکن

آزردہ ہیں کہ ہاتھ سے دریا نکل گیا
دیکھو ابھی تلک نہیں ابرو سے بل گیا

لیکر بلائیں کہنے لگی وہ جگر فگار
کیا جی میں آگئی تھی یہ بھیا بہن نثار

محمل میں میں تو سر کو پٹکتی تھی بار بار
صدقے کروں وہ نہر لڑیں جس پہ بار بار

پیارا رہے انھیں جنھیں پانی عزیز ہے
بھیا ہمیں تمھاری جوانی عزیز ہے

منہ رکھ کے منہ پہ بالی سکینہ نے یہ کہا
عاشق کو میرے پھیر کے لایا مرا خدا

روتی تھی میں سنی بھی نہ تم نے مری صدا
بس اب کہیں نہ جایو اچھے مرے چچا

اِس بیکسی میں دلبر زہرا کا کون تھا
آتے نہ تم تو پھر مرے بابا کا کون تھا

کہنے لگی یہ زوجۂ عباس خوش بیان
غصے میں اِن کو کچھ نہیں رہتا کسی کا دھیان

ہر بات میں ہے شیر الٰہی کی آن بان
یہ جان کو بھلا کبھی سمجھے ہیں اپنی جان

آتا ہے غیظ جب تو نہ کھاتے نہ پیتے ہیں
یہ تو فقط حسین کے صدقے میں جیتے ہیں

فرمایا شہ نے بھائی سے اب کھو لیے کمر
زینب نے لے لی ہاتھ سے شمشیر اور سپر

بیٹھے نہ تھے ابھی کہ یہ اکبر نے دی خبر
فوج اور آئی شام سے یا شاہِ بحر و بر

مجمع غضب سپاہ کا دریا کے پاس ہے
شہ نے کہا کہ ہوتے تمھیں کیا ہراس ہے

آخر ہوا وہ دن تو ہوئی رات کو یہ دھوم
آپہونچا لے کے فوج گراں ابنِ سعدِ شوم

اک لاکھ سے سوا ہیں جوانانِ شام ورد م
آفت کی ہے بھیڑ قیامت کا ہے ہجوم

کیسا شمار حصر نہ تھا انتہا نہ تھی
دیکھا جو صبح کو کہیں بستر کی جا نہ تھی

آمد اسی طرح رہی لشکر کی روز و شب
نرغے میں آگیا پسرِ سیّد العرب

گرمی میں ساتویں سے ہوئی شدتِ تعب
پانی مسافروں پہ ہوا بند ہے غضب

مرجھا گیا چمن شہِ گردوں جناب کا
شور آٹھویں سے ہونے لگا آب آب کا

غش تھے نہم کو پیاس سے اطفالِ شاہ دیں
جز آب اشک پانی کا قطرہ کہیں نہیں

تھا دودھ خشک پھٹتی تھی بانوے حزیں
دم توڑتا تھا جھولے میں اصغر سا نازنیں

خندق میں گرد خیمے کے آتش بھڑکتی تھی
باقر تڑپ رہا تھا سکینہ بلکتی تھی

رونے میں وہ پہاڑ سا دن جب ہوا تمام
آئی سیہ بلا کی طرح شامِ تیرہ فام

شب تھی مسافروں کے لیے موت کا پیام
خل تھا کہ ایک رات کے مہمان ہیں امام

ل لو جنابِ فاطمہ کے نورِ عین سے
خالی سحر کو ہوگا زمانہ حسینؑ سے

لکھوں سیاہی شبِ عاشور کا جو حال
دفتر سیاہ ہوں شب دیجور کی مثال

چھایا ہوا تھا ابرِ غم و حسرت و ملال
کھولے تھے اہل بیت محمد سروں کے بال

پیاسوں سے پوچھو رات وہ کیونکر بسر ہوئی
بس مختصر یہ ہے کہ غضب کی سحر ہوئی

گردوں پہ جب بیاضِ سحر کا ورق کھلا
یعنی کتابِ ذکرِ خدا کا سبق کھلا

بزمِ جہاں میں دفترِ نظم و نسق کھلا
ظلمت نہاں ہوئی در باغِ شفق کھلا

پہونچا فلک پہ ماہ کو حکمِ انقلاب کا
موجِ ہوا سے پھول کھلا آفتاب کا

ہونے لگے چراغ نجوم آسماں پہ گل
قرنا پھکی سپاہ عدو میں بجا دُہل

بر پا حسینیوں میں ہوا یاں اذاں کا غل
پڑھنے لگے نماز شہنشاہ جزو و کل

قدسی ہوئے نثار جماعت کی شان پہ
نعرے نمازیوں کے گئے آسمان پر

سجدوں میں یاں جھکے تھے ابھی عابدوں کے سر
فوج ستم میں ہو گئیں صف بندیاں اُدھر

دو چار تیر آگے گرے جب قریب تر
حضرت پہ آکے روک لی عباس نے سپر

کی عرض سرکشی پہ یہ سب فوج شام ہے
فرمایا آپ نے یہ اجل کا پیام ہے

پھر بیٹھے جا نماز پہ شاہ فلک وقار
ثنا نہ کیا محاسن اقدس میں چند بار

سر پر رکھا عمامۂ محبوب کردگار
پہنی قبائے خسرو عالم بہ افتخار

پیدا ہوئے تھے خلق میں رحمت کے واسطے
باندھی کمر شفاعت امت کے واسطے

رخصت کو اہل بیت نبی میں گئے امام
قدموں پہ لوٹنے لگیں سیدانیاں تمام

وہ شور الفراق کا وہ یاس کے کلام
بچے بھی سر پٹکتے تھے لے لے کے شہ کا نام

روتے تھے یوں لپٹے ہوئے سب حسین سے
لیکن کلیجے پھٹتے تھے زینب کے بین سے

روتے تھے ماں کے پہلو میں زینب کے نونہال
پر غم میں بھائی کے اُسے مطلق نہ تھا خیال

گرنے میں تھامتے تھے جو ماں کو وہ خوش خصال
کہتی تھی مرنے جاتا ہے خیر النسا کا لال

قربان جاؤں منہ نہ پھرانا لڑائی سے
ہشیار رہیو بہر خدا میرے بھائی سے

قاسم سے کوئی کہتی تھی اے میرے نوجوان
چھپ جائے گی اب آنکھوں سے ہے ہے حسن کی شان

اِک سو تھا مادر علی اکبرؑ کا یہ بیان
اٹھارھویں برس میں بچھڑتے ہو میری جان

رخصت کو ماں سے آئے ہو زلفیں سنوار کے
چڑھنا جہاد پر مجھے صدقے اُتار کے

دیکھا گیا نہ شاہ سے سیدانیوں کا حال
بس الوداع کہہ کے چلا فاطمہ کا لال

باہر جو آئے روتے ہوئے شاہ خوش خصال
دیکھا کہ فوج سب ہے مسلح پئے جدال

جھک کر سلام غازیوں نے باادب کیا
گھوڑا سوار دشت نبیؐ نے طلب کیا

آیا عجب شکوہ سے شبدیز تیز گام
طاؤس و کبک دیکھتے تھے جلوۂ خرام

دامن قبا کا رکھ کے کمر میں بڑھے امام
عباسؑ نے رکاب کو تھاما بہ احترام

چھوٹی قدم سے میں یہ ہوا غم زمین کو
جبریل جھاڑنے لگے شہپر سے زین کو

حاصل ہوا جو فیضِ قدمبوسی جناب
اللہ رے ضیا مہ نو بن گئی رکاب

روشن تھے بدرسے سمِ اسپِ صباشتاب
ثابت تھا صدرِ زیں سے کہ ہے برجِ آفتاب

انسان تو کیا ہیں دیدۂ انجم بھی بند ہیں
تارِ شعاع موئے ایالِ سمند ہیں

کس اوج سے خدیوِ زمین و زماں چلا
رہوار کیا زمین پہ چلا آسماں چلا

لیکر نشانِ علیؑ ولی کا نشاں چلا
دامن بھرے ہوئے علمِ زرنشاں چلا

اخترنثارِ بخشش سبطِ رسولؐ تھے
دُرّے نہ تھے زمین پہ سونے کے پھول تھے

سادات کے وہ چہروں کی ضو وہ علم کی شان
تکتا تھا اُس زمین کے تاروں کو آسمان

وہ برچھیاں سنبھالے ہوئے ہاشمی جوان
رَن میں نہ مرتے مرتے گئی جن کی آن بان

ہارا اُن کے معرکہ میں ہزاروں پہ چل گئے
قبضے چھٹے نہ ہاتھوں سے اور دم نکل گئے

پہونچے جو اس شکوہ سے وہ غازیانِ دین
گاڑا سپاہِ کفر کے آگے نشانِ دین

اللہ رے جاوۂ قمرِ آسمانِ دین
روشن تھا جس کے نور سے سب خاندانِ دین

افروختہ تھا چہرۂ اقدس جناب کا
شوکت تھی عرش کی تو جلال آفتاب کا

چلوں میں جوڑنے لگے واں تیر اہلِ شر
سینے حسینیوں نے ادھر کر دیے سپر

لشکر سے چند گام بڑھے شاہِ بحر و بر
حجت تمام کی پہ نہ سمجھے وہ بدگہر

مطلق نہ کی تمیز خطا و صواب میں
تیر آئے سرکشوں کی طرف سے جواب میں

عباس نے کہا کہ ہوا پر ہیں یہ شریر
مولا کہاں کلامِ نصیحت کہاں نصیر

خاموش ہیں ادب سے جوانانِ بے نظیر
موقع بس اب ہی جنگ کا ہے آسماں سریر

کیا قدرتِ خدا ہے کہ روباہ شیر ہوں
جب اُن سے چھین لے کوئی دریا تو زیر ہوں

بولے حبیب رحم کی بھی انتہا ہے اب
دیجے رضا جہاد کی یا شاہ تشنہ لب

گزرے ہیں سات روز کہ ہے روح پر تعب
بچوں کو بھوک پیاس میں یہ تیسری ہے شب

کٹ جائیں پیاسے حلق اداسے دین ہو
اب سلسبیل پر کہیں پہونچیں تو چین ہو

فرمایا واں کثیر ہے لشکر یہاں قلیل
اچھا لڑو کہ خالق کونین ہے کفیل

نزدیک اب ہے کوثر و تسنیم و سلسبیل
دے گا مجاہدوں کو خدا رتبۂ جلیل

ہاں انتظار خنجر قاتل ہمیں بھی ہے
درپیش عصر تک یہی منزل ہمیں بھی ہے

یہ سن کے شاد شاد ہوے وہ خوش اعتقاد
رخصت انھیں ملی کہ ملا گوہر مراد

تیغیں پکڑ پکڑ کے جو نکلے تئے جہاد
میدان سے اٹھ گئے قدم لشکر عناد

کس آبرو سے فدیۂ راہ خدا ہوے
سر دے کے سب امام کے حق سے ادا ہوے

نصف النہار تک تھا یہی شور کارزار
مرنے کو یہ چلا وہ تڑپ کر ہوا نثار

رخصت لے کیا تو اسے روے زار زار
جاتے تھے آپ لاش اٹھانے کو بار بار

ایک ایک نے سعادت عقبیٰ حصول کی
دم نکلے سب کے گود میں سبط رسول کی

لوٹنے لگی علی کی بضاعت دم زوال
کام آے رن میں جعفر و مسلم کے نونہال

زینب کے نور عین بھی جب چکے جلال
حضرت کو داغ دے کے سدھارا حسن کا لال

سنسر و لیر قتل ہوے حق کی راہ میں
دو تشنہ کام رہ گئے ساری سپاہ میں

اس وقت تھا عجب شہ دیں پر ہجوم یاس
ڈھلنا وہ دوپہر کا وہ آندھی وہ لو وہ پیاس

لاشے پڑے ہوے تھے عزیزوں کے آس پاس
رو کر فلک کو دیکھتے تھے شاہ حق شناس

اٹھتا تھا درد دل تو قدم لڑکھڑاتے تھے
فرما کے یا علی ولی بیٹھ جاتے تھے

اہل من مبارز کی جو اعدا میں تھی پکار
بھائی کو دیکھتے تھے کنکھیوں سے بار بار

ڈیوڑھی پہ تھا یہ شور کہ باشاہ نامدار
دوڑو چلی جہان سے سکینہ جگر فگار

ہے ہے یہ کیسی آگ لگی ہے زمانے کو
قطرہ نہیں ہے پانی کا منہ میں چوائے کو

گردن جھکائے چپ تھے شہنشاہِ بحر و بر
لب برگِ گل سے خشک تھے رخ آنسوؤں سے تر

صدمے سے ہاتھ ملتے تھے عباسِ نامور
پانی تھا غم سے اکبرِ ذیجاہ کا جگر

تلخی اُن کو زیست کی تھی اُنھیں سر بار و ش تھا
دونوں دلاوروں کو شجاعت کا جوش تھا

بڑھکر چچا سے کہتے تھے اکبر یہ دم بدم
رخصت کو عرض کرتے ہیں شاہِ امم سے ہم

فرماتے تھے اشارے میں عباسِ فی حشم
کہیو نہ کچھ تمھیں سرِ شبیرؑ کی قسم

پہلے فدا وہ ہوگا جو خدمت گزار ہے
مر لے یہ جاں نثار تو پھر اختیار ہے

یہ کہہ کے رکھ دیا قدمِ شاہِ دیں پہ سر
حضرت سمجھ گئے کہ اب انکا بھی ہے سفر

صدمے سے قلب ہل گیا تھرّا گیا جگر
طاقت نے تن سے کوچ کیا جھک گئی کمر

کیا سنبھلے جس پہ ظلم کا یوں آسماں گرے
دل تھام کر زمین پہ امامِ زماں گرے

بھائی کے سر کو چھاتی سے لپٹا کے یہ کہا
بتلاؤ کیا ارادہ ہے اے میرے مہ لقا

دستِ ادب کو جوڑ کے بولا وہ باوفا
پیاسی سکینہ مرتی ہے یا شاہ کربلا

گزرے ہیں تین دن یوہیں اس خشک صفات پر
گر اذن ہو تو پانی کو جاؤں فرات پر

بولے بہا کے اشک امامِ فلک جناب
یہ موت کا پیام ہے بچوں کا اضطراب

صابر ہر اک بلا میں ہے فرزند بوتراب
اچھا یہ ہے صلاح تو کیجے تلاشِ آب

مشتاق آپ دیر سے جنگ و جدل کے ہیں
پانی کہاں کا سب یہ بہانے اجل کے ہیں

کیا اختیار خیر و عنا دیجیے ہمیں
جینے کی کوئی شکل بتا دیجیے ہمیں

ملیے گا اب کہاں یہ بتا دیجیے ہمیں
رو لیں لپٹ کے آپ سے اتنی رضا دیجیے ہمیں

بھائی کی زیست قوتِ بازو کے ہاتھ ہے
پوچھو ہمارے دل سے کہ برسوں کا ساتھ ہے

یہ کہہ کے اس طرح ہوئے شبیرؑ نوحہ گر
روئے جوان پسر کے لیے جس طرح پدر

رخصت کی اہلِ بیت کو بھی ہو گئی خبر
گھبرا کے آئی بالی سکینہ قریب در

چلائی عمو جان اِدھر آ کے جائیے
دیدار آخری مجھے دکھلا کے جائیے

یاں چڑھ چکے تھے گھوڑے پہ عباس حق شناس
آئے صدا بھتیجی کی سنتے ہی رک کے پاس

بولی یہ مشک دے کے سکینہ بدر و یاس
قربان عمو جان بجھا دو ہماری پیاس

پھٹتا ہے دل عطش سے کلیجہ کباب ہے
سقائی کیجیے کہ یہ کارِ ثواب ہے

عباسؑ نے کہا کہ مرا فخر ہے یہ کام
بی بی تمھارے باپ کا ادنیٰ ہوں میں غلام

دی تم نے آبرو مجھے اے دخترِ امام
اب ہو گیا جہان میں بہشتی ہمارا نام

کوثر میں سمجھوں دوش پہ گر مشکِ آب ہو
تم بھی دعا کرو کہ چچا کامیاب ہو

کہہ کر یہ بات باگ اُٹھائی سمند کی
صورت بدل گئی فرسِ سربلند کی

چھل بل ہرن کی تیز پری تھی پرند کی
سرعت بلائیں لیتی تھی ہر جوڑ بند کی

بجلی چمک کے چھپ گئی پارا تڑپ گیا
جنگل میں یوں اڑا کہ چکارا تڑپ گیا

مرکب قدم زمین پہ نہ رکھتا تھا ناز سے
بجلی کو خوف کیا ہے نشیب و فراز سے

چالاکیاں دکھاتا تھا کس امتیاز سے
اُڑتا تھا پر صدا نہ نکلتی تھی ساز سے

راکب وہ ہیں جو فرقِ دو عالم کے تاج ہیں
گھوڑا بھی جانتا ہے کہ نازک مزاج ہیں

وہ تھوتنی وہ ابلی ہوئی انکھڑیاں وہ یال
گویا کھلے تھے حور کے گیسو پری کے بال

وہ جلد وہ دماغ وہ سینہ وہ دم وہ چال
دم میں کبھی ہما کبھی ضیغم کبھی غزال

وہ قصر آسماں پہ بھی جانے میں طاق تھا
دو پر اگر خدا اُسے دیتا براق تھا

گھوڑے کی یہ شگفتہ وہ شوکت سوار کی
تصویر تھی ہوا پہ شہِ ذوالفقار کی

وہ نور وہ چمک علمِ زرنگار کی
خوشبو مہک رہی تھی نسیمِ بہار کی

پنجہ نہ تھا نشانِ ثریا آب کا
تھا فرقِ جبرئیل پہ تاج آفتاب کا

بڑھ کر صدا یہ دیتا تھا اقبال دم بدم
افزوں ترا جلال و بالا ترا حشم

نصرت پکارتی تھی جلو میں قدم قدم
جب تک ہے آفتاب درخشاں رہے علم

مطلب منافقوں کے جو ہیں ملتوی ہیں
یارب ترے حسینؑ کے بازو قوی رہیں

اللہ رے جلالت و شوکت حضور کی
دہشت سے اُٹھ نہ سکتی تھی گردن غرور کی

ہر جا فرسِ شکوہ دکھاتا تھا طور کی
بجلی قدم قدم پہ چمکتی تھی نور کی

ذرّوں کی ضو سے مہرِ جہانتاب زرد تھا
مٹی میں یہ دمک تھی کہ کندن بھی گرد تھا

پہونچا جو اس جلال سے وہ آفتاب دیں
دیکھا سپاہ کو صفتِ شیرِ خشمگیں

گاڑا جو وہ بدن سے علم ہل گئی زمیں
ہٹ ہٹ کے مورچوں سے پکارے یہ اہلِ کیں

غازی ہے صف شکن ہے جری ہے دلیر ہے
ہٹتا نہ تھا ترائی سے جو وہ یہ شیر ہے

گردے کے اپنے سر کی قسم لے نہ جائے شاہ
دریا سے اس جری کو ہٹا سکتی تھی سپاہ

گویا کھڑے تھے تیغ بکف ضیغم الٰہ
کیا قہر کی نگاہ تھی اللہ کی پناہ

پلکوں کی تیزیوں سے یہ کلیجے فگار تھے
جنبش بھوؤں کی تھی کہ سروں کے وار تھے

خود اب تو وہی ہے شہ نے اسے خصمت جدال
دریا کو ایک حملے میں لے گا یہ خوش خصال

اس کا جلال حیدرِ صفدر کا ہے جلال
سرکش جو لاکھ ہوں تو کرے دم میں پائمال

اُس معرکہ میں بس نہ چلا اس کا بھائی سے
دیکھو یہ شیر اب نہ ہٹے گا ترائی سے

یہ سُن کے تہلکہ صفِ اعدا میں پڑ گیا
ٹوٹا یہ مورچہ وہ رسالہ بگڑ گیا

ہر غول میں علم سے علم جھک کے لڑ گیا
جو رہ گیا نشاں وہ خجالت سے گڑ گیا

ہل چل میں چٹکیوں سے جو چلے نکل گئے
اِس صف کے تیر سہم کے اُس صف میں چل گئے

تیغیں کھنچی بپے ہوئے بھاگے جو اہلِ شر
کٹ کر کسی کا ہاتھ گرا اور کسی کا سر

تلواریاں پڑی تھی کسی کی تو واں سپر
برچھی تھی اس شقی کی تو اُس نحس کا جگر

یہ جنگ تھی کہ حشر کوئی جانتا نہ تھا
بیٹے کو باپ خوف سے پہچانتا نہ تھا

گھبرا کے ابن سعد نے لشکر کو دی صدا
چھوڑ آئے مورچوں کو شجاعو یہ کیا کیا

اتنا ہراس نامور و ننگ کی ہے جا
وہ کون تھے علی سے لڑے جو دمِ وغا

سب مل کے روکتے نہیں اس تشنہ کام کو
کھوتے ہو معرکے میں بزرگوں کے نام کو

قاتل تمہارے جد و پدر کا تھا جو دلیر
ہاں غازیو اُسی کا جگر بند ہے یہ شیر

کرتے ہیں رستموں کو زبردستیوں سے زیر
دشمن کو پا کے واہ یہ کم جرأتی ہے دیر

بڑھ بڑھ کے یوں لڑو کہ تہمتن بھی گرد ہو
کُشتگانِ بدر کا بدلہ جو مرد ہو

یہ سن کے سب کو جوشِ حمیت کا آ گیا
ابلیس آ کے راہ ضلالت بتا گیا

پھر ابر فوجِ شام لبِ نہر چھا گیا
شورِ دہل سے رعد کا دل تھرتھرا گیا

جو جو تھے منتشر وہ پرے پھر بہم ہوئے
پھر سب نشان کھل گئے نیزے علم ہوئے

پڑھ کر رجز علیؑ ولی کا پسر بڑھا
گویا نسکار کھیلنے کو شیرِ نر بڑھا

دریائے قہر خالقِ جن و بشر بڑھا
بہرِ نبرد مالکِ فتح و ظفر بڑھا

تڑپا جو خشمِ برق نگاہوں سے گر گئی
آمد خدا کے شیر کی آنکھوں میں پھر گئی

کانپے طبق زمیں کے ہلا چرخِ لاجورد
مانندِ کہربا ہوا مٹی کا رنگ زرد

اُٹھ کر زمین سے بیٹھ گئی زلزلے میں گرد
تیغوں کی آنچ دیکھ کے بھاگی ہوائے سرد

گرمی سے رن کی ہوش اُڑے وحش و طیر کے
شیر اس طرف اُتر گئے دریا کو پیر کے

نکلی اُدھر غلاف سے وہ برق شعلہ ریز
چلنے میں ذوالفقار تھی جس کی زبان تیز

چمکے شرر بھرنے لگی آتش ستیز
گھیرا اجل نے بند ہوئے کوچہ گریز

آیا خدا کا قہر ہر اک رو سیاہ پر
بجلی محیط ہو گئی ساری سپاہ پر

چمکی گری تڑپ کے یکایک ہلا گئی
جو تھے ہوا پہ خاک میں اُن کو ملا گئی

بھڑکی دلوں میں آگ وہ پانی پلا گئی
جوہر دکھا کے فوج کو ہیرا کھلا گئی

دعویٰ تھا خونِ قاسمِ یوسف جمال کا
بولی تیغ نے عوض لیا شبیر کے لال کا

کھا کھا گئی صفوں کو برابر لڑائی میں
ٹھہری نہ نے لہو پیے دم بھر لڑائی میں

ثابت رہے تھے جن کے قدم ہر لڑائی میں
پہلے انھیں کے کاٹ گئی سر لڑائی میں

دو ٹکڑے ہو کے گرتا تھا جو را ہوار سے
یہ اُٹھ کے داد مانگتی تھی ذوالفقار سے

جس غول پر گری نہ رکی نہ تھمی کہیں
اِک دم بھی کی نہ اُس کی برش نے کمی کہیں

چمکی کہیں کسی پہ کسی جا دمی کہیں
فوجوں میں ابتری تھی کہیں برہمی کہیں

کاٹے ہوئے نشان تھے زمین پر پڑے ہوئے
ہر جا تھے ضربِ تیغ کے جھنڈے گڑے ہوئے

جل جل کے آبِ تیغ سے کفار مر گئے
پس پس کے بھاگنے میں جفاکار مر گئے

نامی تھے جتنے سب وہ نمودار مر گئے
دو ہاتھ جب ادھر سے چلے چار مر گئے

غل تھا کہ زلزلے میں زمین آج رن کی ہے
کہتا تھا شیرداں یہ مدد بنجتن کی ہے

جب وار چل گیا سپرِ آہنیں کٹی
دستانہ کٹ کے ہاتھ کٹا آستیں کٹی

مغفر کٹا دو نیم ہوا سر جبیں کٹی
سینے کو لیکے زیں سے جو اتری زمیں کٹی

چورنگ تھا فرس تو دو پارا سوار تھا
اللہ رے منہ کہ تیغ نے جانا خیار تھا

آئی جدھر لہو میں سراسر بھری ہوئی
خالی صفوں میں اور سوا ابتری ہوئی

لے جاں تھا جس پہ سایہ فگن دو پری ہوئی
پھرتی تھی ساتھ ساتھ اجل پڑوری ہوئی

آنچ اُس کی قہر تھی کوئی کیونکر لگ جائے
چھپتی تھی برق بھی کہ ہوا اس کی لگ جائے

لے سر تھا جس کے فرق پہ وہ جاں گزا لگی
اِک آگ تھی کہ خنجرِ گردن میں جا لگی

چار آئینہ پہ ضربتِ قہرِ خدا لگی
کڑیاں کھلیں زرہ کی جب اس کی ہوا لگی

برپا تھا شور چار طرف بھاگ بھاگ کا
پانی اثر دکھاتا تھا لوہے کو آگ کا

پلٹی اُدھر سے جب تو ادھر کا پرا نہ تھا
کاٹے تھے سر پہ فرق برش میں فرا نہ تھا

چھٹکا ہوا تھا سم بدن اُس کا ہرا نہ تھا
خون سب کا پی گئی تھی مگر دم بھرا نہ تھا

سیلِ فنا تھا جنگ میں کاٹ اُس کی دھار کا
دُم خم تھا گھاٹ باڑھ میں سب ذوالفقار کا

گورا وہ ہاتھ اور وہ تلوار کی چمک
تھی صاف تیغ حیدرِ کرار کی چمک

موجوں پہ عکس ڈالتی تھی دھار کی چمک
اُس پار تک پہونچتی تھی اس پار کی چمک

اِک شور تھا کہ آگ لگی کائنات میں
خشکی میں زلزلہ تھا تلاطم فرات میں

بڑھ بڑھ کے چل رہی تھی جو تلوار چار سو
کشتوں کے بڑھتے جاتے تھے انبار چار سو

تھا رن میں گرم موت کا بازار چار سو
پھرتا تھا جھوم جھوم کے رہوار چار سو

تیغ آئی جس پہ اس کا بھی وار اس پہ چل گیا
وہ سر گرا گئی تو یہ لاشہ کچل گیا

ثابت ہو جس پہ زد کوئی ایسی کماں نہ تھی
تیر افگنوں کی خوف سے خالی نشاں نہ تھی

گر میان تھا تو تیغ دم امتحاں نہ تھی
یہ طرفہ بات تھی کہ دہن تھا زباں نہ تھی

جرار سر جھکائے تھے تلوار کی طرح
سرکش خموش تھے لب سوفار کی طرح

جب ضرب کی زمین کے طبق مل کے رہ گئے
سر اڑ گئے گلوں سے گلے مل کے رہ گئے

زخموں کے پھول چار طرف کھل کے رہ گئے
بسمل تڑپ کے سامنے بسمل کے رہ گئے

برہم مزاج لختِ دلِ بوتراب تھا
لاشے الٹ گئے یہ نیا انقلاب تھا

ممکن نہ تھا کہ ایک کو سو میں اماں ملے
مارا انھیں پہ چھپے ہوئے ظالم جہاں ملے

جو نامور بڑے تھے نہ ان کے نشاں ملے
ریتی پہ گر ملے بھی تو لاشے طپاں ملے

کیوں معرکے میں تیغ دو دم سرخرو نہ ہو
ایسی جگہ نہ تھی کوئی جس جا لہو نہ ہو

زہرہ کسی کا آب تھا ڈر سے کسی کا دل
بھائی ٹھہر نہ سکتا تھا بھائی کے متصل

آفت تھی قہر تھی برشِ تیغ جاں گسل
کرتی تھی شکل کو وہ ہیولیٰ سے منفعل

ٹکڑے تھے منہ سڑا تھی یہ اعمالِ زشت کی
ہیئت بدل گئی تھی ہر اک بدسرشت کی

ڈوبے لہو میں گھاٹ ستمگار روک کے
دم بھر نہ رک سکا کوئی اک وار روک کے

جب بھاگنا سپہر کو سیہ کار روک کے
عباس مسکراتے تھے تلوار روک کے

ٹھہرا جہاں لیا وہیں گھوڑے کو پھیر کے
کوئی شکار بچتا ہے پنجے سے شیر کے

وہ تیغ شعلہ زا کی چمک وہ فرس کی جست
رستے کھلے ہوئے نہ صفیں وہ نہ بندوبست

بجلی گری پھرا جو ذرا دستِ حق پرست
غارت وہ مورچہ ادھر آفت ادھر شکست

افسر سے فوج فوج سے افسر چھٹے ہوئے
سب چھاؤنی اجاڑ محلے لٹے ہوئے

ہر اک علم کی چوب ضلالت نشاں کٹی
منہ تیغ کا کٹا تو سناں کی زباں کٹی

ترکش کے تیر قلم ہوئے نیزے سناں کٹی
ٹکڑے ہوئی زرہ کمر پہلواں کٹی

روحوں کے ساتھ تن تھے نہ رد تنوں کے ساتھ
تارِ نفس بھی کٹ گئے تھے گردنوں کے ساتھ

ناری صفوں میں جل گئے جب شعلہ ور ہوئی
چمکی ادھر یہ تیغ تجلی اُدھر ہوئی

شب کو چمن کھلا جو سپہر خون سے تر ہوئی
سر دھڑ سے گر پڑا تو جسد کو خبر ہوئی

چلائی موت صدقے تری کج ادائی کی
بولی نکل کے روح نثار اس صفائی کی

جب سن سے فوج کفر پہ وہ جنگجو چلی
گویا سموم قہر خدا چار سو چلی

بسمل پھڑک کے رہ گئے یوں تند خو چلی
ٹکڑے اُڑا اے ذبح کیا سرخرو چلی

غل تھا برش ہے قہر کی جوہر بلا کے ہیں
دم بھر میں فیصلہ پہ کر شمے قضا کے ہیں

جس کے گلے سے مل کے چلی مر کے رہ گیا
بسمل بھی تیغ تیز کا دم بھر کے رہ گیا

آگے بڑھا کوئی تو کوئی ڈر کے رہ گیا
سکتے میں کوئی منہ پہ نظر کر کے رہ گیا

دو پتلیاں بھی بہر تماشا تلی رہیں
سر کٹ کے گر پڑا مگر آنکھیں کھلی رہیں

کہنی سے دونوں ہاتھ جدا تن سے سر جدا
ہر نخل قد کی شاخ جدا اور ثمر جدا

اس ہاتھ سے جو تیغ تو اُس سے سپر جدا
بھائی سے بھائی اور پسر سے پدر جدا

وہ تہلکے بھی ہول قیامت سے کم نہ تھے
کیا تفرقہ پڑا تھا کہ اعضا بہم نہ تھے

اسوار کو گرا کے سنبھلنے نہ دیتی تھی
لاکھوں میں ہاتھ ایک کا چلنے نہ دیتی تھی

برچھیت کو پرے سے نکلنے نہ دیتی تھی
رستم بھی ہو تو ٹھاٹھ بدلنے نہ دیتی تھی

جو اُس کا کام تھا سو وہ پھرتی کے ساتھ تھا
جس کا قدم بڑھا نہ سپر تھی نہ ہاتھ تھا

اُٹھی چلی سپاہ میں آئی جدا ہوئی
پنجہ جو بچ گیا تو کلائی جدا ہوئی

صف کی جدا پرے کی صفائی جدا ہوئی
پیری جگر میں خوں میں نہائی جدا ہوئی

دم توڑے یا مرے کوئی پروا ذرا نہ تھی
نکلی جو خون میں پیر کے پھر آشنا نہ تھی

چھپتی تھی برق اُس کی چمک دیکھ دیکھ کے
رہ جاتی تھی سما کو سمک دیکھ دیکھ کے

تھرّاتا تھا زمین کو فلک دیکھ دیکھ کے
خورشید کانپتا تھا جھلک دیکھ دیکھ کے

جوہر میں پیچ و تاب تھا زلفوں کے جال کا
بجلی کی زرق برق تھی چم خم ہلال کا

تُلتی تھی سرتنوں سے جدا دیکھ دیکھ کے
کرتی تھی ناز حشر بپا دیکھ دیکھ کے

بیخود تھی آپ اپنی ادا دیکھ دیکھ کے
چشمک قضا کی تھی کہ ذرا دیکھ دیکھ کے

کہتی تھی تیغ گو کہ سروہی کا ہاتھ ہوں
تو میرے دم کے ساتھ ہے میں تیرے ساتھ ہوں

سب سے جُدا تھی تیغ کے چلنے کی قطع راہ
اِس صف کے ہاتھ پاؤں قلم وہ پرا تباہ

خط جا بجا تھے خاک پہ مابین رزم گاہ
کٹ کٹ کے تیغیں کہتی تھیں اللہ کی پناہ

کترا کے لو پھرائی لہو چاٹتی ہوئی
چلتی ہے یہ تو راہ کو بھی کاٹتی ہوئی

گھیرا جو یک بیک غضب کردگار نے
گھوڑے بھگائے فوج ضلالت شعار نے

کھینچا سر آسماں پہ زمیں کے غبار نے
سر پر اُڑائی خاک سیہ روزگار نے

دِن چھپ گیا یہ گرد پڑی روے مہر پر
مٹی کا پُل بندھا تھا محیط سپہر پر

اللہ رے زلزلہ کہ لرزتے تھے دشت و در
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے ڈر ڈر کے جانور

جنات کانپ کانپ کے کہتے تھے الحذر
دنیا میں خاک اڑتی ہے اب جائیں ہم کدھر

اندھیر ہے اٹھی برکت اب جہان سے
لول گیا زمین کا طبق آسمان سے

دریا کی فوج گھاٹ سے جب ہٹ گئی تمام
ساحل تک آئے حضرت عباس نیک نام

نعرہ کیا ترائی تو شیروں کا ہے مقام
وہ زور شور کیا ہوا اے ساکنان شام

تم سب کی کیا بساط ہے دامن کی گرد ہو
ہاں اب ہمیں ہٹاؤ تو جانیں کہ مرد ہو

وہ حکم اور تھا کہ نہ تھی بولنے کی تاب
ریتی پہ کیا سیاہ کی مٹی ہوئی خراب

لاکھوں میں اب تو دے کوئی اس تیغ کا جواب
یوں خاک میں ملاتے ہیں فرزند بوتراب

افسوس ابن سعد ستمگار ٹل گیا
پر خیر کچھ بخار تو دل کا نکل گیا

یہ بات کہہ کے ڈال دیا نہر میں سمند
طاؤس دم اٹھا کے بنا اسپ سربلند

چمکا جو عکس روے علمدار ارجمند
پانی کی آب و تاب ہوئی چاند سے دوچند

دریا کے دل میں تھی جو کدورت وہ دھو گئی
آنکھوں میں مچھلیوں کے چمکا چوند ہو گئی

جلوے جو نہر میں علم سبز نے دکھائے
اک شور تھا کہ خضر علیہ السلام آئے

پانی میں جب کہ شرم سے خورشید ڈوب جائے
پھر آنکھ میں حباب کی کیا آسماں سمائے

ہر سنگ ریزہ نور سے دُر خوش آب تھا
لہریں جو تھیں کرن تو بھنور آفتاب تھا

چھاتی تلک اُس نے پانی کو دیکھا جو ایک بار
گھوڑے کا دل ہوا صفت موج بے قرار

حسرت سے منہ پھرا کے نظر کی سوے سوار
بولے یہ باگ چھوڑ کے عباسِ نامدار

تو پی لے اے فرس کہ بہت تشنہ کام ہے
ہم پر تو اے حسینؑ یہ پانی حرام ہے

گردن ہلا کے کہنے لگا اسپِ تیز گام
نے ذوالجناح مجھ پہ بھی پانی ہے یہ حرام

اُس قوم میں نہیں کہ ڈبو دوں وفا کا نام
آقا ابھی حسینؑ کے بچے ہیں تشنہ کام

مطلب یہ ہے کہ ذکرِ وفا چار سو رہے
تر خشک لب نہ ہوں تو نہوں آبرو رہے

ہر چند تین روز سے ہے پیاس کا وفور
پیتا یہ خانہ زاد بھی پیتے اگر حضور

پر ہے یہ امر آپ کی دریا دلی سے دور
جانیں بچیں صغیروں کی فکر اس کی ہے ضرور

ناموسِ مصطفےٰ میں تلاطم ہے رات سے
اب جلد مشک بھر کے نکلیے فرات سے

بچوں کا حال سن کے لگا دل پہ تیرِ غم
روے لہو کے اشکوں سے عباسِ باکرم

مشکیزہ بھر کے دوش پہ رکھا بچشمِ نم
نکلا پلٹ کے نہر سے شبدیز خوش قدم

بڑھتے ہی بحرِ ظلم کی موجوں میں گھر گیا
سقا نبی کی آل کا فوجوں میں گھر گیا

ہاں راہ روک لو یہ ہوئی چار سو پکار
برچھے اُٹھا اُٹھا کے بڑھے سیکڑوں سوار

ڈھالیں بڑھیں بہم کہ اٹھا ابر کوہسار
تیغیں علم ہوئیں کہ بندھا آہنی حصار

ہلتا تھا چرخ غلغلۂ دار و گیر سے
حلقہ کسی کمان کا نہ خالی تھا تیر سے

کہتا تھا گر زتول کے ایک ایک پہلوان
رکھدو یہ مشک اے اسد اللہ کے نشاں

بڑھ کر جواب دیتے تھے عباس نوجوان
پھیرہ بگاڑ دوں گا سنبھالے رہو زبان

کیا منہ جو مشک لے کوئی جب تک میں ہوں یہاں
اے نے حمیت و مری جان اس کے ساتھ ہو

طفلی سے بھی ہیں اکھیں عہدوں کی آرزو
دونوں امانتیں ہیں یہ اے فوج کینہ جو

اک مشک اک نشان شہنشاہ نیک خو
اس سے جہان میں نام ہو اور اس سے آبرو

گر مر گئے تو رنج و الم لیکے جائیں گے
مختار ان کا جو ہو اسے دیکے جائیں گے

جھپٹے یہ کہہ کے تیغ دو دستی علم کیے
دونوں طرف کے نیزہ خطی قتل کیے

حملے صفوں پہ صورت شیر و رزم کیے
تیغ دو دم سے بند لعینوں کے دم کیے

سن سن پلٹ کے چلنے میں کمریں جھک گئیں
آدھی صفیں تو بچ گئیں آدھی الٹ گئیں

بوچھار یک بیک ہوئی تیروں کی اے غضب
تینیں چلیں عقب سے شریروں کی اے غضب

یہ شکل دو جہان کے امیروں کی اے غضب
بجھنے نہ پائی پیاس صغیروں کی اے غضب

نیزے تھے اور چاند سے پہلو دلیر کے
تیروں نے چھان ڈالا تھا سینے کو شیر کے

زخمی تھے پر فرس کو ڈپٹتے تھے بار بار
چہرے پہ زخم کھا کے جھپٹتے تھے بار بار

بڑھ بڑھ کے غول فوج کے ہٹتے تھے بار بار
تن سر سے پانچ سات کے کٹتے تھے بار بار

دکھلا رہے تھے رنگ علی کی لڑائی کا
اعدا کے خوں سے لال تھا سبزہ ترائی کا

جھکتے علم کو روک کے کہتے تھے بار بار
قوت عطا کرو مجھے یا شیر کردگار

دیتے تھے دم بدم یہ صدا شاہ ذوالفقار
بیٹا ترے تھکے ہوئے بازو کے میں نثار

پانی کے واسطے یہ کبھی رن پڑا نہیں
کاندھے پہ مشک لے کے کوئی یوں لڑا نہیں

واحسرتا وہ فوج کا بلوہ وہ ایک جان
فاقہ وہ تین دن کا وہ سوکھی ہوئی زبان

لڑنے کی فکر مشک کا دھڑکا علم کا دھیان
جی سن سے ہو گیا کہیں کڑکی اگر کمان

چمکی سناں تو روح بدن سے رواں ہوئی
روکا سپر پہ تیر تو خاطر نشاں ہوئی

کھاتے تھے تن پہ زخم کچھ اپنا نہ تھا الم
مضطر تھا مشک کے لیے وہ صاحب کرم

بہتا تھا خون رکابوں میں تھمتے نہ تھے قدم
قوت کو ضعف ضعف کو قوت تھی دم بدم

اعدا ہدف بنائے تھے کینے سے مشک کو
پر یہ جدا نہ کرتے تھے سینے سے مشک کو

تلوار ہاتھ میں علم شاہ دوش پر
ہرنے پہ گاہ مشک رکھی گاہ دوش پر

اک تیغ تیز چل گئی ناگاہ دوش پر
تلوار کیا پہاڑ گرا آہ دوش پر

صدمہ ادھر تو مشک کا جاں خیز تھا
دیکھا جو پھر کے دست مبارک زمین تھا

شانے سے یوں ابل کے بہا خون کہ الاماں
تیورا کے جھومنے لگے عباس نوجواں

مچھلی کی طرح ہاتھ تو ریتی پہ تھا طپاں
لیکن جدا نہ ہوتی تھیں قبضے سے انگلیاں

نے دست ہو گئی تھی جو اس صفدری کے ساتھ
تلوار بھی تڑپتی تھی دست جری کے ساتھ

دہنا تھا ہاتھ تیغ اسی میں تھی ہے ستم
اب تھا ما بائیں ہاتھ میں مشکیزہ و علم

تلواریں دو چلیں جو کمیں گاہ سے بہم
الجھا ہوا وہ ہاتھ بھی بس ہو گیا قلم

کس سے ہٹائیں فوج کو کس سے لڑائیں
بتلا اب کہ حضرت عباس کیا کریں

ڈر سے قریں تو آ نہ سکا کوئی نابکار
پر تیر سب لگانے لگے باندھ کر قطار

اک تیر لگ کے مشک پہ گزرا جگر کے پار
پانی کے ساتھ سینے سے چھوٹی لہو کی دھار

ہے ہے سکینہ کہہ کے فلک پہ نگاہ کی
ہرنے پہ سر پٹک کے بہشتی نے آہ کی

گرز ستم سے شق ہوا ناگہ سر جناب
تھرائے ہونٹ چھٹ گئی انتوں سے مشک آب

فرمایا ہائے دیں گے سکینہ کو کیا جواب
گھوڑے سے تھرتھرا کے گرے مثل آفتاب

تڑپے اٹھے کراہ کے خاموش ہو گئے
منہ رکھ کے خالی مشک پہ بے ہوش ہو گئے

ان کا تو یاں ہے کوچ سنو واں کی خبر
ڈیوڑھی کے پاس بیٹھے ہیں حضرت برہنہ سر

لپٹا ہوا ہے چھاتی سے عباس کا پسر
روتی ہے سر جھکائے سکینہ قریب در

زینب کھڑی ہیں ڈیوڑھی پہ اور دل پہ ہاتھ ہے
بکھرے ہے بال زوجۂ عباس ساتھ ہے

زینب سے عرض کرتی ہی رو کر وہ دل فگار
ہی ہی یہ شور نہر پہ کیسا ہی میں نثار

کچھ دم الجھ رہا ہی نہیں قلب کو قرار
گرتی ہی کانپنے میں ردا سر سے بار بار

خیر اب نہیں ہی خیر کے انداز اور ہیں
بی بی یہ سب ہمارے رنڈاپے کے طور ہیں

کس سے کہوں جو دوڑ کے لائے کوئی خبر
پردا اٹھا کے اب میں نکلتی ہوں ننگے سر

یہ ذکر تھا کہ فتح کے باجے بجے ادھر
دوڑے زمین سے اٹھ کے شہنشاہِ بحر و بر

ماتم میں نوجواں کے دل اندوہ ناک تھا
تلوار ہاتھ میں تھی گریبان چاک تھا

رستے میں لڑکھڑاتے تھے جب ضعف سے قدم
اکبر سنبھال لیتے تھے بابا کو دم بدم

فرماتے تھے تڑپ کے پسر سے شہ امم
جو حال ہو بجا ہی کہ بھائی کا ہی الم

بازو پکڑ کے دلبرِ زہرا کو لے چلو
بیٹا چچا کی لاش پہ بابا کو لے چلو

اک اک قدم پہ ضعف و نقاہت ہی سدِّ راہ
عباسؑ کیا بچھڑ گئے گھر ہو گیا تباہ

جیتے رہے تھے ٹھوکریں کھانے کو آہ آہ
وہ کہتے ہوں گے لاش پہ اب تک نہ آئے شاہ

شق ہو جگر جو صبر اُدھر سے عطا نہ ہو
یارب کسی سے خلق میں بھائی جدا نہ ہو

ٹھہرو کہ پاؤں اب نہیں قابو میں اے پسر
تم ہاتھ تھامتے ہو جھکی جاتی ہی کمر

سینہ لہو ہی دل ہی طپاں چاک ہی جگر
اکبرؑ بتاؤ ہاتھ میں رکھوں کدھر کدھر

لو اتنے بولنے میں بدن سرد ہو گیا
کیا دکھ ہی یہ کہ میں ہمہ تن درد ہو گیا

اس شکل سے ترائی میں پہونچے جو شاہِ دیں
رو کر یہ شہ سے کہنے لگے اکبرؑ حزیں

بابا یہی ہی لاشِ علمدارِ مہ جبیں
گھوڑا کہیں ہی تیغ کہیں ہی علم کہیں

رکھے ہوئے ہیں مشک پہ منہ پیار دیکھیے
شانے کٹے ہیں شانِ علمدار دیکھیے

حضرت پکارے جان بھی ہی جسم زار میں
یا مر گئے تڑپ کے مرے انتظار میں

کی عرض دم تو ہی جسدِ زخمدار میں
پر منہ سے بولتے نہیں کچھ احتضار میں

کیجے ذرا ملاحظہ چہرے کے نور کو
آنکھیں کھلیں ہیں دیکھ رہے ہیں حضور کو

چلائے گر کے لاش پہ شبیر نامدار
بھیّا تمھاری نرگسی آنکھوں کے میں نثار

اِس نزع میں بھی تھا تمھیں بھائی کا انتظار
آنکھیں پھرا کے ڈھونڈھتے ہو ہم کو بار بار

شاید زبان ہی بند جواب کھولتے نہیں
روتے ہوئے ہم آئے تو اب بولتے نہیں

مرجائے گا حسینؑ برادر جواب دو
اے میرے نوجواں مرے صفدر جواب دو

اب جاں بلب ہے سبطِ پیمبرؐ جواب دو
اے نورِ چشمِ ساقیِ کوثر جواب دو

لکنت زبان خشک کو ہے تشنہ کام ہیں
بھیّا تمھارے سر کی قسم ہم تمام ہیں

سُن لو تمھیں دعا ہے سکینہؑ نے کچھ پیام
ایسا نہ ہو کہ یاں چلی آوے وہ تشنہ کام

جنبش ہوئی لبوں کو بھتیجی کا سُن کے نام
کی عرض اب غلام کی رخصت ہے یا امام

قدموں پہ آنکھیں ملنے کو دل بے قرار تھا
مولا کے دیکھنے کا فقط انتظار تھا

منہ رکھ کے منہ پہ کہنے لگے شاہِ خوش خصال
کیوں چپ ہوئے کچھ اور کہو اپنے دل کا حال

ان سوکھے سوکھے ہونٹوں پہ صدقے علی کا لال
بھیّا مدد کو آئے ہیں اب شیرِ ذوالجلال

رُخ کیوں ہے زرد کون سی ایذا گزرتی ہے
کیوں دم بدم کراہتے ہو کیا گزرتی ہے

گودی میں ہے مری دمِ آخر تمھارا سر
اور پاس مفتی جوان بھتیجا ہے نوحہ گر

گزرے گی ہم پہ جو تمھیں اُس کی بھی ہے خبر
سینہ پہ ہوگا تیغ لیے شمرِ بد گہر

شمشیرِ حلقِ خشک پہ چلتی ہے کس طرح
دیکھیں ہماری جان نکلتی ہے کس طرح

یہ بات سن کے نزع میں عباس تھرتھرائے
قطرے لہو کے آنکھوں سے عارض پہ بہہ کے آئے

دو بار سر پٹک کے پکارے کہ ہائے ہائے
پُرخوں دہن حسینؑ کے قدموں کے پاس لائے

ہچکی کے ساتھ موت کا خنجر بھی چل گیا
سر پاؤں پر دھرا رہا اور دم نکل گیا

اکبرؑ نے عرض کی کہ چچا جان مر گئے
جھک کر پکارے شاہ کہ بھیّا کدھر گئے

مُنہ تو اُٹھاؤ خاک سے رخسار بھر گئے
وا حسرتا حسینؑ کو نے آس کر گئے

اب کون دے گا دکھ میں نبی کے پسر کا ساتھ
دم بھر میں تم نے چھوڑ دیا عمر بھر کا ساتھ

اے میرے شیرِ صف شکن اے میرے نوجواں
پاؤں گا تم سا چاہنے والا میں اب کہاں

شیرِ خدا کا آج جہاں سے مٹا نشاں
تم کو حسینؑ جانتا تھا اپنے تن کی جاں

تینوں میں اب سپر نہیں بھائی کی ہوتے ہو
بازو کٹائے شیر سے دریا پہ سوتے ہو

آتے ہی بھا گئی تھی ترائی کی جا تمھیں
اللہ کیا پسند تھی یاں کی ہوا تمھیں

بخشی خدا نے قبر بھی سب سے جدا تمھیں
آخر وہی ہوا کہ جو منظور تھا تمھیں

اتنی جگہ کے واسطے بچھڑے حسینؑ سے
بھیّا ہوائے سرد میں اب سو رہے چین سے

قسمت میں ہو کہ دھوپ ہو جنگل کی وہم
کیا تفرقہ دکھایا ہے گردوں نے ہے ستم

کیا خوب ہو اگر یہیں نکلے ہمارا دم
الفت یہ چاہتی تھی کہ قبریں بھی ہوں بہم

روئیں سرہانے بیٹھ کے جو سوگوار ہوں
ہم دونوں بھائیوں کے برابر مزار ہوں

آئی صدائے حضرتِ خاتونِ روزگار
ہے ہے جہان سے اٹھ گیا ایسا وفا شعار

اے میرے لال تیرے تڑپنے کے میں نثار
میرا سپہر ہے آج سے عباس نامدار

بیٹا بلا میں لاش کی لینے کو آئی ہوں
برسا تمھارے بھائی کا دینے کو آئی ہوں

واری تم اب یہ مشک و علم لیکے جاؤ گھر
ایسا نہ ہو نکل پڑے زینبؑ برہنہ سر

چلّائے تب یہ رو کے شہنشاہِ بحر و بر
اماں کمر تو ٹوٹ گئی جائیں اب کدھر

ہم مر گئے کہ خلق سے بھائی گزر گیا
بازو ہمارا تھامنے والا تو مر گیا

اکبر سے پھر کہا کہ علم خاک سے اٹھاؤ
پر خون بہ مشک خیمۂ عصمت میں لیکے جاؤ

بیوہ ہوئی چچی اسے پرسا دو خاک اڑاؤ
بیٹا چچا کے بچوں کو جا کر گلے لگاؤ

پوچھیں جو سب کہ سبط پیمبر کدھر گئے
کہدیجیو کہ بھائی کے لاشے پہ مر گئے

اکبر یہ سنکے جو روئے بصد بکا
تڑپے اک آہ کر کے شہنشاہِ کربلا

ناگاہ آئی در سے سکینہ کی یہ صدا
بابا میں اب نکلتی ہوں گھر سے برہنہ پا

روتے ہیں آپ کیوں مرے عمّو کدھر گئے
حضرت نے دی صدا کہ جہاں سے گزر گئے

فرما کے یہ زمین سے اُٹھے شاہِ انس و جاں
روکر علم سے باندھ دی وہ مشکِ خوں چکاں

پہونچے سرم سرا کے جو نزدیک ناگہاں
سر پیٹ کے سکینہ نے تب یہ کیا بیان

اندھیر ہی جہان مجھے کچھ سوجھتا نہیں
ہی ہی علم تو آیا ہی میرا چچا نہیں

ڈھونڈوں کہاں میں اے مرے عمو کدھر گئے
مجکو پتا دیا نہ وہاں کا جدھر گئے

دریا سے مشک بھیجدی اور خود گزر گئے
پانی پیا نہ تشنہ دہن کو چ کر گئے

شانے کٹے تھے مشک بھی تیور سے کٹ گئی
وہ کیا کریں ہماری ہی قسمت الٹ گئی

غل پڑ گیا کہ شہ کے علمدار ہائے ہائے
اے نورِ چشمِ حیدرِ کرار ہائے ہائے

اے ابنِ فاطمہؑ کے مددگار ہائے ہائے
اے فوجِ شہ کے جعفر طیار ہائے ہائے

چھوٹے سے ہاتھ رکھ کے دلِ دردناک پر
دے مارا سر کو بالی سکینہ نے خاک پر

حضرت نے لاکے گاڑ دیا صحن میں علم
اور گر پڑے زمین پہ شہنشاہِ باکرم

سب سے کہا کہ جینے نہ دے گا یہ غم
جن سے جدا نہ ہوتے تھے کھوئے ان کو ہم

پوچھو ہمارے دل سے مصیبت جدائی کی
بھائی ہی جانتا ہی محبت کو بھائی کی

بھائی سے ساتھ بھائی کا چھوٹا نہ ہائے حیف
چھوڑا نہ پھل نہ پھول نہ بوٹا نہ ہائے حیف

بازو مرا قوی تھا سو ٹوٹا نہ ہائے حیف
اُمت نے میرے باغ کو لوٹا نہ ہائے حیف

فریاد ہی لعینوں نے ہم پر ستم کیا
تیغوں سے سرو باغِ علی کو قلم کیا

زیرِ علم تھا زوجۂ عباس کا یہ حال
ماتھا بھرا تھا خاک سے بکھرے ہوئے تھے بال

چلاتی تھی یتیم ہوئے میرے دونوں لال
دنیا سے کھو گئے مجھے عباس خوش خصال

ہی ہی علی کا نورِ نظر مجھ سے چھٹ گیا
میں رانڈ ہو گئی مرا اقبال لٹ گیا

ناگہ صدا علی کی یہ آئی کہ اے بہو
زانو پہ تھا مرے سرِ عباسِ نیک خو

آئی ہے تیرے پُرسے کو زہرا کشادہ مو
بی بی بس اب حسینؑ کو رو کر رُلا نہ تو

بھائی کے غم میں لال مراد و مند ہی
اب صبر کر کہ صبر خدا کو پسند ہی

ہاں رو دُو مومنو یہ بُکا کا مقام ہی
تم میں شریک روحِ رسولِ انام ہی

اب رخصتِ حسینِ علیہ السلام ہی
چہلم کی مجلسوں کا بھی آج اختتام ہی

موت آئی تو شریک عزا کون ہوے گا
جو سال بھر جیے گا وہ پھر شہ کو روے گا

آگے تمھارے مرتے جو عباسِ باوفا
پُرسا نہ دیتے سبطِ رسولِ خدا کو کیا

تم سب کو دیکھتے ہیں شہنشاہِ کربلا
زہرا بھی ننگے سر ہی قیامت کرو بپا

سمجھو شریکِ بزمِ شہ مشرقین کو
دے لو جوان بھائی کا پرسا حسین کو

یہ کہہ کے ہاے حضرتِ عباسؑ خاک اڑاؤ
پیٹو سروں کو ہاتھوں سے اور اشک خوں بہاؤ

ہی ہی حسین کہہ کے زمین پر پچھاڑیں کھاؤ
پُرسا پسر کا فاطمہ زہرا کو دیکے جاؤ

کل خاک میں ملائیں گے اُس تشنہ کام کو
رخصت کرو حسینِ علیہ السلام کو

اے نینوا دیار و بے سر و سامان الوداع
اے بنتِ مصطفےٰ کے دل و جان الوداع

اے دو جہاں کے سید و سلطان الوداع
اے شیعیانِ ہند کے مہمان الوداع

آہ و بکا سے ہم کبھی غافل نہ ہوئیں گے
جب تک جئیں گے آپ کی غربت پہ روئیں گے

مولا ضریحِ پاک پہ بلوائیے شتاب
اب ہجر کی انیسؔ کے دل کو نہیں ہی تاب

رہ جاے گی ہوس جو دیارِ یثرب نہ جاے
خاکِ شفا ملے مجھے یا ابنِ بوتراب

اچھی نہیں مریض کو دوری مسیح سے
حسرت یہ ہی کہ روؤں لپٹ کر ضریح سے

رباعی

گھر میں ڈھونڈو نہ انجمن میں ڈھونڈو
مرقد میں نہ ڈھونڈو نہ کفن میں ڈھونڈو

گلزارِ نجف میں مدح خواں ہوگا انیسؔ
بلبل کو جو ڈھونڈو تو چمن میں ڈھونڈو

مرثیہ ۵

بخدا فارسِ میدانِ تہور تھا حُر
ایک دو لاکھ سواروں میں یہ تنہا حُر

نارِ دوزخ سے ابوذر کی طرح حُر تھا حُر
گوہرِ تاجِ سرِ عرش ہو وہ دُر تھا حُر

ڈھونڈھ لی راہِ خدا کام بھی کیا نیک ہوا
پاک طینت تھی تو انجام بھی کیا نیک ہوا

واہ رے طالعِ بیدار زہے عزت و جاہ
حر پہ کیا فضلِ خدا ہو گیا اللہ اللہ

پیشوائی کو گئے آپ شہِ عرش پناہ
خضرِ قسمت نے بتا دی اسے فردوس کی راہ

مدتوں دور رہے جو وہ قریب ایسا ہو
بخت ایسے ہوں اگر ہو تو نصیب ایسا ہو

نار سے نور کی جانب اُسے لائی تقدیر
ابھی ذرہ تھا ابھی ہو گیا خورشیدِ منیر

شافعِ حشر نے خوش ہو کے بجل کی تقصیر
تکیۂ زانوئے شبیر ملا وقتِ اخیر

اوج و اقبال و حشم فوجِ خدا میں پایا
جب ہوا خاک تو گھر خاکِ شفا میں پایا

اللہ اللہ حُرِ صفدر و غازی کا نصیب
جانِ محبوبِ الٰہی جسے فرمائے حبیب

ہجر میں لطف ملاقات کا دوری میں قریب
وہی کام آتے ہیں عمر کے جو ہوتے ہیں نجیب

صدقے ہو جائے اسے عشق ولی کہتے ہیں
اُس کو دنیا میں سعیدِ ازلی کہتے ہیں

آیا کس شان سے کعبہ کی طرف چھوڑ کے دیر
کوئی حضرت کا یگانہ بھی نہ سمجھا اُسے غیر

حق نے لکھ دی تھی جو تقدیر میں قدوس کی سیر
فتنۂ و شر سے بچا ہو گیا انجام بخیر

ذکرِ خیر اُس کے موئے پر بھی ہوئے جاتے ہیں
عملِ نیک ہر اک وقت میں کام آتے ہیں

کفر کی راہ سے کارہ تھا جو وہ نیک طریق
کس بشاشت سے ہوا راہبرِ ایماں کا رفیق

تھے تو لاکھوں پہ کسی کو بھی ہوئی یہ توفیق
خُلقِ طینت میں ہے جس کے وہی ہوتے ہیں خلیق

اوجِ دیندار کو بیدیں کو سدا پستی ہے
اصل جس تیغ کی اچھی ہے وہی کستی ہے

کیوں نہ بالیدہ ہو اس کا چمن جاہ و جلال
جس کو سرسبز کرے خود اسد اللہ کا لال

ہو گیا فاطمہ کے باغ میں آتے ہی نہال
وہ ثمر پائے کہ پہونچے نہ جہاں دست خیال

کھل گیا غنچۂ دل عذر جو منظور ہوئے
صورت برگ خزاں دیدہ گنہ دور ہوئے

حر کہاں اور کہاں احمد مرسل کا خلف
بخت نے ویر سے پہونچا دیا کعبہ کی طرف

دل صفا ہو گیا سینے میں تو پائے بہ شرف
جب کہ آنکھیں ہوئیں حق بیں تو ملا دیں نجف

نیک جو امر ہیں ول پر وہی ٹھن جاتے ہیں
جب خدا چاہے تو بگڑے ہوئے بن جاتے ہیں

وصف حر میں ہو زباں معترف عجز و قصور
آمد آمد کی بہادر کا ستواب مذکور

جب ہوئی مستعد جنگ سپاہ مقہور
مہر افلاک امامت نے کیا رن میں ظہور

غل ہوا جنگ کو اللہ کے پیارے نکلے
ای فلک دیکھ زمیں پر بھی ستارے نکلے

کیا کہوں شان جوانان جنود اللہ
کوئی ہم صورت خورشید کوئی غیرت ماہ

باندھی شیروں نے صف جنگ میں جنگاہ
چمن خلد سے کرنے لگیں حوریں بھی نگاہ

واں لعینوں نے در ظلم و ستم کھولا یا
بڑھ کے عباس نے یاں سبز علم کھولدیا

ہو گئے سرخ شجاعت سے رخ آل نبی
آئی ٹھنڈی جو ہوا بھول گئے تشنہ لبی

رن میں کڑکا ہوا بجنے لگے باجے عربی
یکہ تازوں نے کیا شور مبارز طلبی

اک گھٹا چھا گئی ڈھالوں سے سیہ کاروں کی
برق ہر صف میں چمکنے لگی تلواروں کی

برچھیاں تول کے ہر غول سے خونخوار بڑھے
نیزے ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے اسوار بڑھے

تیر جوڑے ہوئے چلوں میں کمان دار بڑھے
بولے شہ یاں سے ابھی کوئی نہ زنہار بڑھے

اسد حق کے گھرانے کا یہ دستور نہیں
میں نبی زادہ ہوں سبقت مجھے منظور نہیں

یہ سخن کہہ کے مخاطب ہوئے اعدا سے امام
ای سیاہ عرب و روم و ری و کوفہ و شام

تم پہ کرتا ہی حسینؑ آخری حجت کو تمام
پسر مصحف ناطق ہوں سنو میرا نام

سخن حق کی طرف کانوں کو مصروف کرو
شور باجوں کا مناسب ہو تو موقوف کرو

۱۲ جمادی الثانی ۱۲۸۳ھ کو مرزا صاحب کے مکان پر مجلس ہوئی تھی اس کے بعد کی مجلسوں کا حال معلوم نہیں

یہ صدا سنتے ہی خود رک گیا قرنا کا خروش
تھم گیا طبل و نفا کی بھی وہ آواز کا جوش

ہو گیا جوڑ کے ہاتھوں کو جلا عل خاموش
کیا بجاتے کہ بجاتے تھے نہ کسی شخص کے ہوش

چھیڑ نا اُن کو سرودوں کا بھی ناساز ہوا
رعب فرزند نبیؐ سر پہ مہ آواز ہوا

کم ہوا غلغلہ فوج ستم جب یک بار
یوں گہربار ہوے شہ کے لب گوہر بار

صف کشی کس پہ ہی یہ اے سپہ نابکار
قتل سادات کی لشکر میں کیسی ہی پکار

وطن آواروں پہ یہ قرق ہی کیوں پانی کا
کیا زمانے میں یہی طور ہی مہمانی کا

مجھ کو لڑنا نہیں منظور یہ کیا کرتے ہو
تیر جوڑے ہیں جو تم نے تو خطا کرتے ہو

کیوں نبی زادہ پر غربت پہ جفا کرتے ہو
دیکھو اچھا نہیں یہ ظلم برا کرتے ہو

شمع ایماں ہوں اگر سر مرا کٹ جائے گا
یہ مرقع ابھی اک دم میں اُلٹ جائے گا

میں ہوں سردار شباب چمن خلد بریں
میں ہوں خالق کی قسم دوش محمد کا مکیں

میں ہوں انگشتر پیغمبر خاتم کا نگیں
مجھ سے روشن ہی فلک مجھ سے منور ہی زمیں

ابھی نظروں سے نہاں نور جو میرا ہو جائے
محفل عالم امکاں میں اندھیرا ہو جائے

تلزم عزو شرف کا دُر شہوار ہوں میں
سب جہاں زیر نگیں ہی وہ جہاں دار ہوں میں

آج گو مصلحتاً بیکس و ناچار ہوں میں
ورثہ احمد مختار کا مختار ہوں میں

بخدا دولت ایماں اسی دربار میں ہی
سب بزرگوں کا تبرک مری سرکار میں ہی

یہ قبا کس کی ہی بتلاؤ یہ کس کی دستار
یہ زرہ کس کی ہی پہنے ہوں جو میں سینہ فگار

بر میں کس کا ہی یہ چار آئینہ جوہر دار
کس کا رہوار ہی یہ آج میں جس پر ہوں سوار

کس کا یہ خود ہی یہ تیغ دو سر کس کی ہی
کس جری کی یہ کمان ہی یہ سپر کس کی ہی

تنگ آے گا تو رکنے کا نہیں حوصلہ تیر
ایک حملہ میں فنا ہوں گے یہ دو لاکھ شریر

چل سکیں گے نہ تبر مجھ پہ نہ تلوار نہ تیر
کاٹ جاے گی گلے سب کے یہ بُرّاں شمشیر

شیر ہوں تخت دل غالب ہر غالب ہوں
میں جگر بند علیؑ ابن ابی طالب ہوں

مجکو ہوتا نہ اگر بخشش اُمت کا خیال
روک لیتا مجھے رستے میں کس کی مجال

تھام سکتا تھا لجام فرس برق مثال
پوچھ لو دیکھا ہی اُس نے مرے شیروں کا جلال

گفتگو میں سپر اُس کی جو نہ ہم ہو جاتے
ہاتھ اک وار میں پہونچوں سے قلم ہو جاتے

غیظ سے ہاتھ چباتے تھے علی کے دلدار
نیچے تولتے تھے عون و محمدؑ ہر بار

اُگلی پڑتی تھی جگر بند حسنؑ کی تلوار
میں نے جب سر کی قسم دی تو رکے وہ جرار

چلتی تلوار تو جنگل تہ و بالا ہوتا
پھر نہ حُر خلق میں ہوتا نہ رسالا ہوتا

تھا یہ بپھرا ہوا عباسؑ مرا شیر جواں
سینۂ حُر پہ رکھے دیتا تھا نیزے کی سناں

میں یہ کرتا تھا اشارہ کہ نہ اے بھائی جہاں
رحم لازم ہی ہمیں ہم ہیں امام دوجہاں

کچھ تردد نہیں سر تن سے اتارا جاے
کوئی بندہ نہ مرے ہاتھ سے مارا جاے

گرچہ یہ امر نہیں اہل سخا کے شایاں
کہ کسی شخص کو کچھ دے کے کرے منت یاں

پوچھ لو حُر تو ہی موجود عیاں را چہ بیاں
اُسی جنگل میں مع فوج تھا یہ تشنہ وہاں

شور تھا آج چلیں جسم سے جانیں سب کی
منہ کے باہر نکل آئی تھیں زبانیں سب کی

زیست ہر شے کی ہی پانی سے شجر ہو کہ بشر
مجھ سے دیکھا نہ گیا میں تو سخی کا ہوں پسر

میں نے عباس دلاور سے کہا گھبرا کر
مشکوں والے ہیں کہاں اونٹ ہیں پانی کے لدھر

کرم ساقیٔ کوثر کو دکھا دو بھائی
جتنا پانی ہی وہ پیاسوں کو پلا دو بھائی

رہ نہ جاے کوئی گھوڑا کوئی ناقہ بے آب
چھاگلیں جلد منگاؤ مرا دل ہی بے تاب

سقّے مشکیزوں کے منہ کھول کے آ پہونچے شتاب
متوجہ ہوا میں خود کہ وہ تھا کار ثواب

چین آیا نہ مجھے نے انھیں آرام دیے
تھا جو اک جام کا پیاسا اُسے دو جام دیے

تھی یہی فصل یہی دھوپ یہی گرم ہوا
ٹھنڈے پانی پہ گرے پڑتے تھے حُر کے فدا

تشنہ کاموں کا یہ مجمع تھا کہ ملتی نہ تھی جا
سقّے بھر بھر کے کٹوروں کو دیے دیتے تھے صدا

بھائیو آؤ جو پانی کی طلبگاری ہی
چشمۂ فیض حسینؑ ابن علی جاری ہی

آبِ شیریں کا جو دریا ہوا جنگل میں رواں
فرس و اشتر و قاطر رہے تشنہ دہاں

شکر کرنے لگے تر ہو گئی ہر خشک زباں
پانی پی پی کے دعائیں مجھے دیتے تھے جواں

شور تھا ابنِ یداللہ نے جاں بخشی کی
دین و دنیا کے شہنشاہ نے جاں بخشی کی

ایک دن وہ تھا اور اک دن یہ ہے للہ اللہ
کہ اُسی طرح ہمیں پیاس میں پانی کی ہے چاہ

چشمِ اُمید ہو کیا سب نے پھرائی ہے نگاہ
کوئی اک جام بھی بھر کر ہمیں دیتا نہیں آہ

ہر مسلماں پہ نبی زادے کا حق ہوتا ہے
بچے روتے ہیں تو سینہ مرا شق ہوتا ہے

کئی طفل اُن میں ہیں کم سن کہ سوے جاتے ہیں
دم اُکھڑتا ہے مرا جب انھیں غش آتے ہیں

پانی پانی جو وہ کرتے ہیں تو شرماتے ہیں
پاس دریا ہے پہ اک بوند نہیں پاتے ہیں

سچ ہے غربت کی عجب شام و سحر ہوتی ہے
تیسرا دن ہے کہ فاقوں میں بسر ہوتی ہے

شہ کی مظلومی پہ گریاں ہوئی ظالم کی پیاہ
عمرِ سعد نے کی پھر کے رخِ حُر پہ نگاہ

بولا وہ اشہد باللہ بجا کہتے ہیں شاہ
محسن و منعم و آقا ہے مرا یہ ذی جاہ

اُن کے احسان کا کیونکر کوئی منکر ہو جائے
سخنِ حق ہیں جو شک لائے وہ کافر ہو جائے

ایک میں کیا ہوں نہ مانے یہ ہے احساں ان کا
ابرِ رحمت ہیں خطا پوش ہے داماں ان کا

مشکِ تر پر ہے کرم خلق میں یکساں ان کا
اے خوشا حال جو غربت میں ہو مہماں ان کا

جنتی ہے جسے حاصل یہ شرف ہوئے گا
جو اُدھر ہو گا خدا اُس کی طرف ہوئے گا

یہ ابھی ہاتھ اُٹھا کر جو دعا فرمائیں
جتنے عالم کے گنہگار ہیں بخشے جائیں

حق سے جس شے کے طلبگار ہوں فوراً پائیں
جام کوثر یہیں فردوس سے حوریں لائیں

مثلِ خورشید ہے روشن وہ شرف ان کا ہے
یہ وہ بندے ہیں کہ اللہ پہ حق جن کا ہے

ان سے قطرہ کوئی مانگے تو گہر دیتے ہیں
ہیں سخی ابنِ سخی بات پہ سر دیتے ہیں

پیٹ سائل کا بھی فاقوں میں یہ بھر دیتے ہیں
یاں تو زر دیتے ہیں فردوس میں گھر دیتے ہیں

اپنے مجرم کی گنہگار کی امید ہیں یہ
ذرّہ پرور جنھیں کہتے ہیں خورشید ہیں یہ

حُر سے گھبرا کے یہ بولا عمرِ سعدِ شریر
اپنے حاکم کا نہ کچھ ذکر نہ تعریف امیر

سُن چکا ہوں میں کہ مضطر ہی کسی باتوں سے
نہ وہ آنکھیں نہ وہ چتون نہ وہ تیور نہ مزاج

تخت بخشا ہی محمدؐ کے نواسے نے کہ تاج
کون سا باغ تجھے شاہ نے دکھلایا ہی

کیا کسی حور کا دکھلاوا یا حضرت نے جمال
قصر یاقوت میں پہنچا جو ترا رنگ ہی لال

دفعتاً حق نمک کو بھی فراموش کیا
میں جہاں دیدہ ہوں سب مجھ کو خبر ہی تیری

ہونٹ بھی خشک ہیں اور چشم بھی تر ہی تیری
راہ میں کچھ جو سلوک اور نوازش کی ہی

خیر منی نہ رہے گا یہ قصور اور فتور
حاکمِ شاہ ہی جابر وہ سزا دے گا ضرور

سب تری قوم کے سر تن سے جدا ہوئیں گے
نفع اُس امر میں کیا جس میں ہی مردم کا ضرر

شجرِ قامتِ سرور پہ جو ڈالے گا نظر
الفتِ زلف سے بھی پیچ میں تو آئے گا

بدر پیشانیِ سرور کا جو ہی سر میں خیال
سب میں ہو جائے گا انگشت نما مثلِ ہلال

عشقِ رخسار میں رتبہ ترا گھٹ جائے گا
منہ پہ کہتا ہوں کہ چہرہ ترا کٹ جائے گا

یہ تو ہی صاف طرفداریِ شہ کی تقریر
اللہ اللہ یہ اوصاف یہ مدح شبیرؑ

الفت شاہ ٹپکتی ہی تری باتوں سے
سیدھی باتوں میں بگڑنا یہ نیا طور ہی آج

جن کو سمجھا ہی غنی دل میں وہ خود ہیں محتاج
کہیں کوثر کے تو چھینٹوں میں نہیں آیا ہی

مل گیا سایۂ طوبےٰ کہ جوانی ہی نہال
کون سے میوۂ شیریں پہ ٹپکتی ہی رال

کیا تجھے باوۂ تسنیم نے بے ہوش کیا
قرۃ العینِ محمدؐ پہ نظر ہی تیری

جسم خالی ہی اِدھر جان اُدھر ہی تیری
تو نے فرزندِ خدا سے سازش کی ہی

لکھیں گے عہدۂ اخبار پہ جو ہیں مامور
گر تجھے دار پہ کھینچے تو کچھ اُس سے نہیں دور

زن و فرزند گرفتارِ بلا ہوئیں گے
آنکھیں نکلیں گی محبت سے جو دیکھے گا اُدھر

سر چڑھے گا ترا برچھی پہ یہ ہی اس کا ثمر
خال رخ دیکھا تو گھر خال سے لگ جائے گا

تو اسی ماہ میں نقصاں ترا ہووے گا کمال
تیرِ شمشیر ہی ابرو کی محبت کا وبال

خوف کس بات کا پیاسوں سے یہ تھرانا کیا
لب پر ہر مرتبہ بیکس کی ثنا لانا کیا

ننگ کی بات ہی دشمن کی طرف جانا کیا
ہو نبی یا کہ وصی جنگ میں شرمانا کیا

ابھی لیجائیں جو شبیر کا سر ہاتھ لگے
خلد ہم اس کو سمجھتے ہیں کہ زر ہاتھ لگے

حُر پکارا کہ زبان بند کر او نا ہموار
قابلِ لعن ہی تو اور وہ تیرا سردار

ابنِ زہرا ہی جگر بند رسولِ مختار
میرا کیا مُنہ جو کروں مدحِ امامِ ابرار

اک زمانہ صفتِ آلِ عبا کرتا ہی
آپ قرآن میں خدا اُن کی ثنا کرتا ہی

وصف ایسوں کا زباں پر کوئی کیونکر لائے
تین سو آیہ ہوں تعریف میں جن کی آئے

کسی انساں نے یہ دنیا میں ہیں رُتبے پائے
اپنا محبوب و ولی جس کو خدا فرمائے

الفتِ آل میں مرے تو خوش اقبالی ہی
سنگ ہی اُن کی محبت سے جو دل خالی ہی

اسفلوں سے ہی محبت تجھے اے سفلہ مزاج
خاک پا اُس کا ہوں میں ہی جو سرِ عرش کا تاج

جس کو کاندھے پہ محمد کے ملی ہی معراج
میرے آقا سا سخی کون ہی کونین میں تاج

کیوں ترے سامنے مُکروں کہ نہیں بخشتا ہی
ہاں مجھے شاہ نے فردوس بریں بخشتا ہی

باغ جو مجھ کو دکھایا اُسے کیا جانے گا تو
راحتِ روح ہی جس باغ کے ہر پھول کی بو

مجھ کو اللہ نے بخشی ہیں وہ حوریں محشر
کہ جنھیں تیرے فرشتوں نے نہ دیکھا ہو کبھو

نام کوثر کا نہ لے تو مجھے جوش آتا ہی
اُنھیں چھینٹوں سے تو نے ہوش کو ہوش آتا ہی

عترتِ دینِ شرف کون و مکاں ہی شبیر
جان زہرا کی محمد کی زباں ہی شبیر

سنگ پانی ہو وہ اعجاز بیاں ہی شبیر
جان کیوں ہو نہ اُدھر جانِ جہاں ہی شبیر

مہرباں ہوں تو ابھی عقدہ کشائی ہووے
وہ نہ بخشیں تو خدا تک نہ رسائی ہووے

کیا میں اور دوست مرے کیا ہیں مری کیا ہی عیال
جب کہ آفت میں پھنسی احمدِ مختار کی آل

واں کی املاک و بضاعت کا ہو کیا مجھ کو خیال
یاں ہوئی جاتی ہی سادات کی کتنی پامال

گھر کا اب دھیان نہ بچوں کا الم ہی مجھکو
خانہ بربادیِ شبیر کا غم ہی مجھکو

دولتِ حاکمِ دوں پر ہی ترا وار و مدار
دارِ دنیا سے تعلق نہیں رکھتے دیندار

کیا مجھے دار پہ کھینچے گا وہ ظالم غدار
خوابِ غفلت ہی اُسے میرا ہی طالع بیدار

کسی سردار نے یہ اوج نہ پایا ہوگا
دارِ طوبےٰ کا مرے فرق پہ سایا ہوگا

ہی سرافراز سدا عاشقِ پیشانیِ شاہ
سجدے کیجے کہ ہی بیت الحرموں کی بیت اللہ

عشق آنکھوں کا ہی مردم کے لیے نورِ نگاہ
ہی وہ یوسف جسے ہو مصحفِ رخسار کی چاہ

عاشقِ لب کو خدا لعل و گہر دیتا ہی
وہ دہن چشمۂ کوثر کی خبر دیتا ہی

خالِ رخسار نہیں گوئے سعادت ہی یہ
مجھ سے مجرم کے لیے مہرِ شفاعت ہی یہ

ہوں جو آشفتۂ گیسو تو عبادت ہی یہ
بخدا سلسلۂ بخششِ امت ہی یہ

شبِ معراجِ رسولِ دو جہاں سمجھا ہوں
اُس کے ہر تار کو میں شانۂ جاں سمجھا ہوں

وصفِ دنداں میں رہے جس کی زبان گوہر بار
موتیوں سے دہن اُس شخص کا بھر دے غفار

شوق میں سیبِ ذقن کے جسے آئے نہ قرار
حور غرفوں سے دکھائیں اُسے رنگِ رخسار

دم بدم چاہنے والوں کے لہو گھٹتے ہیں
یہ گلا وہ ہی گلے جس کے لیے کٹتے ہیں

صدقے اُس سینہ پہ ہیں عاشقِ صافی سینہ
خاک اُس دل پہ جو اُس سینے سے رکھے کینہ

عکسِ نما ہی تو جہان میں ہر ہی آئینہ
اس کا عاشق ہو تو ہوں کور کی آنکھیں بینا

فیض پاتا ہی وہ جس دل میں وہ لا ہوتی ہی
چشم کو اُن کی زیارت سے جلا ہوتی ہی

پاؤں یہ وہ ہیں کہ اِن پاؤں کی جو ہاتھ لگائے
تو سرِ دست سرافرازیِ کونین وہ پائے

گردِ نعلینِ مبارک جو اثر اپنا دکھائے
تو تیا ہوئے جل کھل جواہر شرمائے

صدقے کر دیں گے سر اِن پاؤں پہ ہم ایسے ہیں
دوشِ احمد پہ رہے جو یہ قدم ایسے ہیں

عملِ خیر سے بہکا نہ مجھے او ابلیس
یہی کونین کا مالک ہی یہی رائس رئیس

کیا مجھے دے گا ترا حاکم ملعون خسیس
کچھ ترود نہیں کہدے کہ لکھے پرچہ نویس

ہاں سوئے اِن شہنشاہِ عرب جاتا ہوں
لے ستمگر جو نجاتا تھا تو اب جاتا ہوں

کہہ کے یہ ڈاب سے غازی نے نکالی تلوار
سرخ آنکھیں ہوئیں ابرو پہ بل آئے اک بار

تن کے دیکھا طرفِ فوجِ امامِ ابرار
پاؤں رکھنے لگا بن بن کے زمیں پر رہوار

غل ہوا سیدِ والا کا ولی جاتا ہے
لو طرفدارِ حسین ابنِ علی جاتا ہے

حُر نے نعرہ کیا یا حیدرِ صفدر مدد ے
وقتِ امداد ہے یا فاتحِ خیبر مدد ے

روحِ زہرا مدد ے نفسِ پیمبر مدد ے
بندۂ آل ہوں یا خواجۂ قنبر مدد ے

تنِ تنہا ہے غلام اور بہت اظلم ہیں
آئی آواز کہ اے حُر ترے حامی ہم ہیں

مل گئی راہِ خدا واہ رے اقبال ترا
پاک عصیاں سے ہوا نامۂ اعمال ترا

جرم ماضی ہوے سب عفو خوشا حال ترا
جلد جا جلد کہ شائق ہے مرا لال ترا

مرد ہے جس کی یہ ہمت یہ ارادہ ہوے
ہاں برادر تری توفیق زیادہ ہوے

منتظر ہیں ترے سب فوجِ حسینی کے جوان
ور فردوس پہ مشتاق کھڑا ہے رضواں

راہ تکتی ہیں تری دیر سے حورانِ جناں
شور کوثر پہ ہے شبیر کا مہماں ہے کہاں

فوجِ قدسی تری ہمت کی ثنا کرتی ہے
فاطمہ آج ترے حق میں دعا کرتی ہے

تو بہشتی ہے یہ کافر ہیں کنشتی اے حُر
مٹ گئی سب ترے اعمال کی زشتی اے حُر

دیکھ اب صورتِ حورانِ بہشتی اے حُر
کس تلاطم میں بچی ہے تری کشتی اے حُر

غضبِ اللہ کا شبیر کی ناراضی ہے
پنجتن تجھ سے ہیں راضی تو خدا راضی ہے

اور بالیدہ ہوا سن کے یہ مژدہ وہ ہزبر
دلِ بیتاب پکارا کہ نہیں طاقتِ صبر

اب تو اس فوج میں اک دم کی بھی تعویق ہے جبر
قعرِ دوزخ ہے مسلمان کے لیے صحبتِ گبر

ہاں اٹھا باگ جو شیدائے شہِ عالی ہے
فوجِ اللہ و نبی میں تری جا خالی ہے

سن کے یہ باگ جو لی اسپِ سبکتاز اڑا
ڈر سے رنگِ عمرِ شعبدہ پرواز اڑا

کیا اڑا رخش کہ طاؤس بصد ناز اڑا
دی پرندوں نے یہ آواز کہ شہباز اڑا

باغِ زہرا میں نسیمِ سحری جاتی ہے
غل تھا دربارِ سلیمان میں ہدہد ہی جاتی ہے

لم تغن الان صفحہ ۳

کیا دو تین رسالوں نے تعاقب ہر چند
حُر کا ہاتھ آنا تو کیسا نہ ملی گرد سمند

کٹتے تھے شرم سے دو کے کہ جو دوڑے تھے کمند
یہ چھلاوا تھا کہ آندھی یہ فرس تھا کہ پرند

کیا سبک سوے چمن بادِ بہاری پہونچی
ہم یہیں رو گئے واں حُر کی سواری پہنچی

ہاں ہوئے علمِ امامت سے شہِ دیں آگاہ
ہنس کے عباس سے فرمایا کہ اے غیرتِ ماہ

مرے لشکر کی طرف ہے رخِ حُر ذی جاہ
سب سے کہدو کہ نہ روکے کوئی اُس شخص کی راہ

جاؤ لینے کو عجب رتبہ شناس آتا ہے
مرا مہمان مرا عاشق مرے پاس آتا ہے

ذکر یہ تھا کہ صدا دور سے آئی اک بار
الغیاث اے جگر و جانِ رسولِ مختار

مجرم ایسا ہوں کہ عصیاں کا نہیں جس کے شمار
عفو کر عفو کرا ے چشمۂ فیضِ غفار

پار دریائے خطا سے مری کشتی ہو جائے
دوزخی بھی ترے صدقے سے بہشتی ہو جائے

کئی روزوں سے تلاطم میں ہوں اے شاہِ زمن
مدد اے نوحِ غریباں مرا بیڑا ہے تباہ

دست و پا گم ہیں کچھ ایسے کہ نہیں سوجھتی راہ
شور کرتا ہوں کہ تبلا کو کوئی جائے پناہ

ابرِ رحمت کی طرف جا یہ صدا دیتے ہیں
سب ترے دامنِ دولت کا پتا دیتے ہیں

ترے دامن کے نثار اے مرے آقائے جلیل
رحم کر رحم کہ شرمندہ ہے یہ عبدِ ذلیل

دل خنک ہوئے جو نکلے کوئی کوثر کی سبیل
جان آجائے جو مولا ترے دو عالم ہوں کفیل

نہ وزیروں میں یہ ہمت نہ شہنشاہ میں ہے
سب مرے درد کا درماں تری درگاہ میں ہے

خلق میں آپ کے والد کے کرم ہیں مشہور
بات میں بخش دیئے سیکڑوں بندوں کے قصور

مجھ سے ہیں باگ پکڑ لینے پہ آزردہ حضور
بخش دیجے تو کرم سے نہیں کچھ آپ کے دور

یہ تو کیونکر کہوں میں لائقِ تعزیر نہیں
مگر اسود سے زیادہ مری تقصیر نہیں

اے مددگار و معین الضعفا اور کنی
اے خبر گیر گروہِ غربا اور کنی

پانوں لغزش میں ہیں اے دستِ خدا اور کنی
ہاتھ باندھے ہوں میں اے عقدہ کشا اور کنی

دیجیے حُر کو سندِ نار سے آزادی کی
آیئے جلد خبر لیجیے فریادی کی

مرے اعمال میں ہر چند سراسر ہے بدی
ہوں گنہگارِ خدائے ازلی و ابدی

آپ ہیں مالکِ سرکار جنابِ احدی
ای خداوندِ جہاں خذ بیدی خذ بیدی

جو تہی دست ہیں تکتے ہیں شہنشاہ کا ہاتھ
آپ کا ہاتھ زمانے میں ہے اللہ کا ہاتھ

ایک یہ خستہ تن اور درد جہاں لاکھ حریف
ای سلیمان کہیں پامال نہ ہو مورِ ضعیف

چھوڑ کر آپ کی سرکار کہاں جائے خفیف
کیجئے اب نظرِ لطف کہ ہوتا ہے خفیف

ہوں سرافراز جو اتنا ہی کرم ہو جائے
نام قنبر کے غلاموں میں رقم ہو جائے

استغاثہ یہ کیا حُر نے جو بادیدۂ نم
جوش میں آگیا اللہ کا دریائے کرم

خود بڑھے ہاتھوں کو پھیلا کے شہنشاہِ امم
حُر کو یہ ہاتفِ غیبی نے صدا دی اُس دم

شکر کر سبطِ رسول الثقلین آتے ہیں
لے بہادر ترے لینے کو حسینؑ آتے ہیں

حُر نے دیکھا کہ چلے آتے ہیں بہ بدل شبیرؑ
دوڑ کر چوم لیے پائے شہِ عرش سریر

شہ نے چھاتی سے لگا کر کہا ای بانوقیر
میں نے بخشی مرے اللہ نے بخشی تقصیر

میں رضامند ہوں کس واسطے مضطر ہے تو
مجھ کو عباسؑ و علی اکبرؑ کے برابر ہے تو

کس کے کیوں باندھا ہے ہاتھوں کو میں سنتا ہوں خجل
سہل کر دیں اُسے گر اور کوئی ہو مشکل

بھائی آ مجھ سے بغلگیر تو ہو کھول کے دل
غافر و راحم و توّاب ہے ربِ عادل

جرم سب محو کیے حق نے ترے دفتر سے
آج پیدا ہوا گویا شکمِ مادر سے

حُر پکارا بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ یا شاہ
قابلِ عفو نہ تھے بندۂ آثم کے گناہ

مجھ سے گمراہ کو اک آن میں مل جا یہ راہ
سب ہے صدقہ انھیں قدموں کا خدا ہے گواہ

مہر و ذرہ پہ جو ہو نیّرِ تاباں ہو جائے
آپ جس مور کو چاہیں وہ سلیماں ہو جائے

کون مقداد تھے سلمانؓ و اباذرؓ تھے کون
آپ فرمائیں کہ عمّارِ دلاورؓ تھے کون

شورِ عالم میں جو ہے مالکِ اشتر تھے کون
ای خداوندِ جہاں حضرتِ قنبر تھے کون

اِنھیں قدموں کا تصدق تھا کہ ممتاز ہوئے
اسی سرکار کے خلعت سے سرافراز ہوئے

شہ نے فرمایا کہ خالق کی عنایت ہے سبب
اس مسبب کی عنایت کے یہ سارے ہیں سبب
اپنے کیسے سے نہ وام اور ورم دیتے ہیں
لاکھ ہاتھ اُس کے ہیں دینے کے وہ ایسا ہے جواد
رزق وہ حوصلۂ حرص سے دیتا ہے زیاد
وہ غنی ہے کہ ہے محتاج زبانہ اُس کا
جس قدر اُس سے طلب کیجیے خوشنود ہے وہ
ہاتھ پھیلائے جو سو بار تو موجود ہے وہ
پرورش جرم پہ بھی صبح و مسا ہوتی ہے
کہہ کے یہ ساتھ لیے حر کو چلے شاہ امم
راس و چپ قاسم و اکبر تھے زہے شان و حشم
دور سے اہل خطا تیر جو برساتے تھے
لائے اس عزت و حرمت سے جو مہماں کو امام
شہ نے فرمایا مناسب ہے کوئی دم آرام
فاتحہ پڑھ کے شہ شیر و سپر باندھی ہے
ہے بہت شمر و عمر سے مجھے لڑنے کی اُمنگ
لشکر شام سے پیہم چلے آتے ہیں خدنگ
لیکن ایسا نہ ہو بچہ کوئی بے جان ہو جائے
شہ نے فرمایا کہ دشوار ہے فرقت تیری
وا دریغا ہوئی کچھ ہم سے نہ خدمت تیری
آج رتبہ ترا اے لیل شہدا میں ہوگا

دے کسی شخص کو بندے میں یہ مقدور ہے کب
وہی منعم وہی محسن وہی رازق وہی رب
جب وہ خالق ہمیں دیتا ہے تو ہم دیتے ہیں
ہم اُسے بھولیں تو بھولیں اُسے ہر وقت ہے یاد
شکر معبود کا اس پر بھی نہیں کرتے عباد
کبھی خالی نہیں ہوتا ہے خزانہ اُس کا
صاحب جود ہے وہاب ہے محمود ہے وہ
بخش دیتا ہے کہ ہم عبد ہیں معبود ہے وہ
یاں سے ہوتی ہے خطا واں سے عطا ہوتی ہے
ہاتھ میں ہاتھ تھا مہمان کا اللہ رے کرم
سر پہ کھولے ہوئے تھے حضرت عباس علم
رفقا سایہ میں ڈھالوں کے لیے آتے تھے
بولے عباس کمر کھول اب اے نیک انجام
عرض کی حُر نے کمر خلد میں کھولے گا غلام
آج اس عزم پہ خادم نے کمر باندھی ہے
ایک ہی وار میں دونوں کو کروں گا چور نگ
شاہزادوں کی سپر ہوں کہ عبادت ہے یہ جنگ
پہلے یہ تازہ غلام آپ پہ قرباں ہو جائے
مجکو مر کر بھی نہ بھولے گی محبت تیری
خیر فردوس میں ہو جائے گی دعوت تیری
شب کو تو صحبت محبوب خدا میں ہوگا

تجھ پہ مخفی نہیں مفتم سے جو کچھ ہے مرا حال
راہیں ہر سمت کی روکے ہوئے ہیں اہلِ ضلال

قحط پانی کا ہے اس دشت میں گندم کا ہے کال
نانِ جو کا بھی ہے ملنا کسی قریہ میں محال

سب کو ایذا عوض آب و غذا ملتی ہے
دودھ اصغر کو نہ عابد کو دوا ملتی ہے

حُر نے رو کر سرِ تسلیم جھکایا بہ ادب
شہ نے رومال رکھا آنکھوں پہ رونے لگے سب

جب چڑھا گھوڑے پہ وہ عاشقِ سلطانِ عرب
شاہ بولے کہ عجب وقت پھنسا ہائے غضب

دم بدم یاں سے جو آوازِ بکا جاتی تھی
گریۂ آلِ محمد کی صدا آتی تھی

حُر چلا فوجِ مخالف پہ اُڑا کر توسن
چوکڑی بھول گئے جس کے نگاہ سے ہرن

وہ جلال اور وہ شوکت وہ غضب کی تن و فن
ہاتھ میں تیغ سپر دوش پہ بر میں جوشن

دوسرے دوش پہ شملے کے جو بل کھاتے تھے
کاکلِ حور کے سب پیچ نکلے جاتے تھے

زور بازو کا نمایاں تھا بھرے شانوں سے
دستِ فولاد دبایا جاتا تھا دستانوں سے

برچھیوں اُڑتا تھا دب دب کے نرس رانوں سے
آنکھ لڑ جاتی تھی دریا کے نگہبانوں سے

خود رومی کی جو ضو تابہ فلک جاتی تھی
چشمِ خورشید میں بجلی سی چمک جاتی تھی

نیزۂ حر کی سناں پر نہ ٹھہرتی تھی نگاہ
تھا بہ ظاہر کہ نکالے ہے زبان مارِ سیاہ

قبضۂ تیغ پہ رکھے تھا سرِ عجز پناہ
آفتابی وہ سپر جس سے خجل گردۂ ماہ

قدر اندازوں کو جانوں کے ادھر لالے تھے
تیر ترکش کے نہ تھے آگ کے پرکالے تھے

رن میں جب شہ کی طرف سے حرِ دیندار آیا
کس بشاشت سے اُڑاتا ہوا رہوار آیا

غل ہوا سید مظلوم کا غمخوار آیا
جاں نثارِ خلفِ حیدرِ کرار آیا

تتقِ نور سرِ راہ نظر آتا ہے
جلوۂ قدرتِ اللہ نظر آتا ہے

آنے جانے کا بہادر کے کروں کیا مذکور
پہلے کچھ اور ہی جلوہ تھا پر اب اور ظہور

اے خوشا رتبۂ فیضِ قدمِ پاک حضور
غل تھا آتا ہے ملک پہنے ہوئے خلعتِ نور

صحبتِ اہلِ دلِ دل کو جلا کرتی ہے
مس کو اک آن میں اکسیر طلا کرتی ہے

واہ کیا فیض ہی سرکارِ شہ عالم میں
ذرہ خاک کو خورشید کیا اک دم میں

نور یہ حور میں دیکھا نہ بنی آدم میں
یہ وہی حُرِ جری ہی جو ابھی تھا ہم میں

تن ہی خوشبو رسِ گلرنگ تر و تازہ ہی
خاک نعلینِ مبارک کی عجب غازہ ہی

مہر ذرّہ ہی جہاں چہرۂ روشن ایسا
چاندنی جس سے کرے کسبِ ضیا تن ایسا

حرز ہو بازوے داؤد کا جوشن ایسا
ہوش پریوں کے اُڑے جاتے ہیں سن ایسا

گلشنِ دہر میں لو بادِ بہاری آئی
قاف میں غل ہی سلیمان کی سواری آئی

حُر پکارا کہ بجا کہتے ہو لاشک لاریب
دامنِ حضرتِ شبیر نے ڈھانپے مرے عیب

دولتِ دیں سے نہ دامن مرا خالی ہی عجیب
بارک اللہ کی دیتا ہی صدا ہاتفِ غیب

فیض پاکر پئے شمشیر زنی آیا ہوں
یاں سے محتاج گیا واں سے غنی آیا ہوں

مجھکو خورشید کیا نورِ خدا کی صنو نے
نور بخشا پسرِ فاطمہؑ کے پرتو نے

بخت پائے ہیں سکندر کے غلامِ نو نے
گنج وہ لایا ہوں دیکھا جو نہ تھا خسرو نے

دور دورہ رہا آج سے میرا ہی زمانہ میرا
کبھی خالی نہیں ہوے گا خزانہ میرا

رخِ روشن کو مرے تکتے ہو کیا حسرت سے
مل کے آیا ہوں منہ اپنا قدمِ حضرت سے

نور وہ ہی جسے دیکھیں نظرِ غبت سے
وائے وہ لوگ جو محروم ہیں اس دولت سے

مجھ کو بھی دیکھ کے بیدار نہیں تم ہوتے ہو
ہی غضب آنکھیں تو کھولے ہو مگر سوتے ہو

جانِ سلطانِ رسالت کو غنیمت جانو
پسرِ شاہِ ولایت کو غنیمت جانو

نورِ خالق کی زیارت کو غنیمت جانو
قمرِ برجِ امامت کو غنیمت جانو

ساتھ اس کے برکت خلق سے اُٹھ جائیگی
پھر جو ڈھونڈھو گے یہ دولت نہ ہاتھ آئیگی

ایک سیّد کے مٹا دینے میں ہی کونسا نام
اس ہوا پر ہو کہ بجھ جاے چراغِ اسلام

گر ہو دانا تو کہو بد ہی کہ نیک کلام
خوش نما کب ہی وہ تسبیح نہ ہو جس میں امام

شکرِ احسانِ جنابِ احدی کرتے ہیں
پیشوا سے کہیں پیرو بھی بدی کرتے ہیں

یہ سخن سُن کے پکارا پسرِ سعدِ شریر
ہاں طرفدار شہ دیں پہ چلیں نیزہ و تیر

لیے حربوں کو بڑھا فوج کا انبوہ کثیر
فاتحہ پڑھ کے جواں مرد نے کھینچی شمشیر

محرکا منہ سرخ ہوا فوجِ ستم زرد ہوئی
شعلۂ تیغ سے بجلی کی چمک گرد ہوئی

رعد تھرّا گیا نعرے جو سُنے ضیغم کے
استخواں کانپ گئے زیرِ زمیں رستم کے

تھا وبالا ہوئیں لشکر کی صفیں جم جم کے
برقِ شمشیر سے ڈر ڈر کے فرس بھی چمکے

نوبتِ جنگ نہ آئی تھی کہ دل ٹوٹ گئے
بیقیس گر گئیں ہاتھوں سے نشان چھوٹ گئے

چھیڑ کر باگ فرس کو جو ذرا گرمایا
غیظ میں آن کے گھوڑا بھی غضب کف لایا

شیر سا فوج مخالف پہ جھپٹ کر آیا
روند ڈالا اُسے دم میں جسے سرکش پایا

اُس کا قاتل تھا جو دشمن شہ عالی کا تھا
کاٹ ہر نعل میں شمشیرِ ہلالی کا تھا

حشر برپا تھا کہ تیغِ حُر فیجاہ چلی
آگ برسانے کو بجلی سوے جنگاہ چلی

کس کرشمہ سے وہ لیلیٰ ظفر راہ چلی
گہہ بڑھی گاہ پھری گاہ ٹھہری گاہ چلی

زخم سینوں کے گریباں کی طرح پھٹتے تھے
چال کیا تھی کہ ہزاروں کے گلے کٹتے تھے

کیں صفیں صاف مگر منہ کی صفائی نہ گئی
کج ادائی کو بچھوڑا وہ لڑائی نہ گئی

کاٹ چھانٹ اور وہ لگاوٹ دکھائی نہ گئی
سیکڑوں خون کیے اور کہیں آئی نہ گئی

شور تھا برق پڑی جلوہ گری نکلی ہے
جان لینے کو اجل بن کے پری نکلی ہے

جس طرف دیدۂ جوہر سے نظر کرتی ہے
پل نہ گزرے کہ صفیں زیر و زبر کرتی ہے

چشم ہر چند کہ تیلی کو سپر کرتی ہے
ہے وہ طرار کہ آنکھوں میں یہ گھر کرتی ہے

اُس کے افسوں سے جو ساحر ہوا جل جاتا ہے
سحر پر یوں کا اسی طرح سے چل جاتا ہے

پھونکے بجلی کو یہ اُس آگ کی ہے پر کالا
کاٹ جائے تو کبھی لہر نہ لے پھر کالا

برچھیاں چل گئیں اُس پر جسے دیکھا بھالا
آگیا دام میں جس شخص پہ ڈورا ڈالا

اُس کے پانی میں کف مار سیہ گھولا ہے
باڑھ ہے یا ملک الموت نے منہ کھولا ہے

آئی جس غول پہ لاشوں سے زمیں پاٹ گئی
دست و پا صدر و کمر گردن و سر کاٹ گئی

چاٹ ایسی تھی لہو کی کہ صفیں چاٹ گئی
دیکھی تینوں کی جدھر باڑھ اسی گھاٹ گئی

جس پہ جاتی تھی نہ نے جان کسے پھرتی تھی
ایک بجلی تھی مگر لاکھ جگہ گرتی تھی

گل نئے پھولے جو برچھی پہ لگا پھل اُس کا
زور دکھلاتا تھا ہر ضرب میں کس بل اُس کا

ڈھیر تھا خاک پہ کاٹا ہوا جنگل اُس کا
جوڑ بڑھا جنگ میں قصہ ہوا فیصل اُس کا

شور تھا دیکھیے کیونکر یہ بلا ٹلتی ہے
اِس قدر جلد تو سیفی بھی نہیں چلتی ہے

جنگ میں تیغ کو دعوا تھا کہ یکتا ہوں میں
سُرا تھا یا تھا یہ گھوڑے نے کہ عنقا ہوں میں

چرخ کہتا تھا کہ یارب تہ و بالا ہوں میں
برق کہتی تھی کہ تلوار ہے یہ یا ہوں میں

کس میں ہے یہ جو تڑپ برق میری ہے
تیغ کرتی تھی اشارا یہ چمک میری ہے

نہ تھمی سنگ سے وہ اور نہ رُکی آہن سے
ہاتھ اُڑا دیتی تھی پہونچوں سے تو سر گردن سے

نہ اُٹھی اُس کی کڑی ضرب کسی جوشن سے
چل گئی باد مخالف جدھر آئی سن سے

جوش طوفاں کا دکھا کر وہ خوش سلوب گئی
خوں کے دریا میں ہر اک کشتی تڑپ ڈوب گئی

کثرتِ جوہر ذاتی سے وہ گو جال میں تھی
پر تڑپ صورت ماہی ہی ہر حال میں تھی

بھی چمکانے میں بجلی تو پری حال میں تھی
کبھی مغفر میں کبھی سر میں کبھی ڈھال میں تھی

کہیں دم لینے کی مہلت تھی نہ سنبھل کے لیے
تھی جگر کے لیے برچھی تو چھری دل کے لیے

صید کرنے کو جدھر صورتِ شہباز آئی
لاکھ تڑپا وہ نہ بے جان لیے باز آئی

غل ہوا شہپرِ شاہین کے تلے قاز آئی
اُڑ گیا طائرِ دل اور نہ آواز آئی

گرچہ قبضے میں لیے تھی اُسے پر چھوڑ دیا
تھا بس صیدِ زبوں کاٹ کے سر چھوڑ دیا

آب نے آتشِ سوزاں کا اثر دکھلایا
تاب نے مرگِ مفاجات کا گھر دکھلایا

باڑھ نے جادۂ صحرائے سقر دکھلایا
گھاٹ نے آئینۂ فتح و ظفر دکھلایا

تیغ کہتی تھی درِ فتح کی مفتاح ہوں میں
قول قبضہ کا یہ تھا قابضِ ارواح ہوں میں

خم وہ پایا تھا کہ شرما ے ہلال مہ عید
حُر کے ہاتھ آ گئی تھی گلشنِ جنت کی کلید

برش ایسی تھی کہ کٹ کٹ گئی سب فوجِ یزید
جامۂ کفر کے پرزے بھی ہوے قطع بُرید

نہ بچا تارِ نفس خلق میں جینے کے لیے
چاک زخموں کے فقط رہ گئے سینے کے لیے

کئی حملے کیے پیہم جو کمانداروں پہ
چل گئے تیر ملامت کے جفا کاروں پہ

چٹکیاں سب کی دھری رہ گئیں تلواروں پہ
رخ پھرا تھا کہ گری برق ستمگاروں پہ

جل کے خرمن ہوا یوں خاک کہ خوشہ نہ ملا
کشمکش میں کہیں چھپنے کو بھی گوشہ نہ ملا

تیرہ فوجِ ستمگار تھے دیکھے بھالے
دم میں اُس شیرِ نیستاں نے قلم کر ڈالے

گرچہ تھے جان لڑاے ہوے لڑنے والے
آفتِ مرگ کو سر سے کوئی کیونکر ٹالے

جب سواروں کے پرے جنگ کو تن جاتے تھے
بند سب ناخنِ شمشیر سے کھل جاتے تھے

الفِ گرز کو کر دیتی تھی ہر ضرب میں دال
تھی نئی آمد و رفت اور نئی طرح کی چال

کبھی برچھی کی انی تھی تو کبھی تیر کی بھال
کبھی تلوار کبھی خنجرِ براں کبھی ڈھال

ضرب کو روک کے دشمن کو فنا کرتی تھی
دم بدم فوجِ ستمگر بھی ثنا کرتی تھی

شور تھا آگ ہے تلوار میں یا پانی ہے
جل بجھے کشتیِ تن خون میں طوفانی ہے

ضرب میں فرد ہے یہ زور میں لاثانی ہے
کہتا تھا حُر یہ فقط قوتِ ایمانی ہے

زور تھا مجھ میں نہ ایسا نہ دعا کی طاقت
سب ہے یہ سبطِ پیمبر کی دعا کی طاقت

کہہ کے یہ فوج میں پھر تشنہ جگر ڈوب گیا
ورطۂ قلزمِ آفت میں گہر ڈوب گیا

لشکرِ شام کے بادل میں قمر ڈوب گیا
کشمکش تھی کہ عرق میں گلِ تر ڈوب گیا

تھا کبھی شیر سا بپھرا ہوا شمشیروں میں
کبھی نیزوں کے نیستاں میں کبھی تیروں میں

گہہ چھپا اور کہے نکلا وہ مہ برجِ شرف
گہے اس صف میں در آیا گہے رومی صف

گہے دریا کے کنارے گہے صحرا کی طرف
گہے نعرہ تھا کہ صدقے ترے یا شاہِ نجف

جتنے مجروح تھے دم اُن کے نکل جاتے تھے
شیر بھی نام علیؑ سن کے دہل جاتے تھے

نخل تھرّاتے تھے سب گونج رہا تھا جنگل
سر کی جاتی تھی زمیں رن کی غضب تھی ہلچل

کوند جاتی تھی سروں پر جو وہ شمشیرِ اجل
منہ کے بھل گرتا تھا کوئی تو کوئی سر کے بھل

حشر برپا تھا سواروں پہ فرس لوٹتے تھے
دو پہ چار ایک پہ دو پانچ پہ دس لوٹتے تھے

بڑھ کے فرماتے تھے عباسؑ زہے عزّ و جاہ
بارک اللہ کی دیتا تھا صدا دلبرِ شاہ

کہتے تھے ابنِ حسنؑ واہ حُرِ غازی واہ
شاہ ہر ضرب پہ فرماتے تھے ماشاءاللہ

اپنی جاں بازی کا غازی جو صلہ پاتا تھا
مُسکراتا ہوا تسلیم کو جھک جاتا تھا

حیف جھکنے میں لعینوں نے جو فرصت پائی
سامنے چھوڑ کے سب فوج عقب سے آئی

لاکھ خونریز اُدھر اور اِدھر تنہائی
باگ گھوڑے کی پھراتا تھا کہ برچھی کھائی

آگیا موت کے پنجہ میں نہ کچھ دیر لگی
فرق پر گرز لگا دوش پہ شمشیر لگی

سینہ غربال ہوا تیر چلے اعدا کے
رکھ دیا شیر نے قربوس پہ سر تھوڑا کے

علی اکبرؑ نے یہ حضرت سے کہا چلّا کے
گر ہو ارشاد تو مہمان کو بچاؤں جا کے

خادمِ حضرتِ زہرا و علیؑ گرتا ہے
خاک پہ اب وہ سعیدِ ازلی گرتا ہے

شاہ رونے لگے یہ سُنتے ہی مہمان کی خبر
ہو گئی آنسوؤں سے ریشِ مبارک تر

علی اکبرؑ سے کہا تم ابھی ٹھہرو دلبر
حُر کی امداد کو ہم جائیں گے اے نورِ نظر

کس سے اس وقت کہوں میں جو قلق مجھ پر ہے
لاش اُٹھاؤں گا کہ مہمان کا حق مجھ پر ہے

عرض کی حضرتِ عباسؑ نے جاتا ہے غلام
جوشِ رقت میں کہا شہ نے نہیں اے گلفام

میری الفت میں ہوا قتل حُرِ نیک انجام
دوستی کیسے جو برے وقت میں ہم آئے نہ کام

اُس پہ جب سخت گھڑی ہو گی تو کام آویں گے
لاش کیا قبر میں مہمان کی ہم جاویں گے

اُس کے لاشے پہ نہ جائیں یہ مروت سے ہے دور
اُس سے ہم شاد ہوئے وہ بھی تو ہو کچھ مسرور

قصرِ خلد اُس کو دکھائیں کہ ہوئے عفو قصور
سرخرو جاتا ہے دنیا سے وہ خالق کے حضور

ایسا ذی رتبہ کوئی خلق میں کم نکلے گا
میرے مہماں کا مری گود میں دم نکلے گا

یہ سخن کہہ کے چلے رن کو جناب شبیرؑ
واں گرا خاک پہ گھوڑے سے حرِ با توقیر

دیکھ کر شاہ کو آتے ہوئے بھائی کے پیر
پہونچے لاشے پہ امام دو جہاں وقتِ اخیر

چمن ہستی مہمان کو اجڑتے دیکھا
ایڑیاں خاک پہ زخمی کو رگڑتے دیکھا

گر کے لاشے کے برابر یہ پکارے سرور
مرے مہمان، مددگار و معین و یاور

گرز کیا تجکو لگا ٹوٹ گئی میری کمر
گر پڑا گھوڑے سے اور آہ نہ کی مجھ کو خبر

دوست کے ہجر میں کب دوست کو چین آیا ہے
کھول دے چشم کو بھائی کہ حسینؑ آیا ہے

واہ رے حُر جری میں تری ہمت کے فدا
اس کو کہتے ہیں محبت اسے کہتے ہیں وفا

ہے یہ بیکس ترا شرمندۂ احساں بخدا
بس یہی بھائی بھی کرتے ہیں جو کچھ تو نے کیا

حق تعالیٰ چمن خلد میں گھر دے بھائی
اس ریاضت کا خدا تجکو ثمر دے بھائی

حُر کو چونکا کے حبیب ابن مظاہر نے کہا
آپ نے تاب ہیں اے حُر جری ہوش میں آ

دیکھ دیدارِ جگر بندِ جناب زہراؑ
کوچ درپیش ہے یہ وقت نہیں غفلت کا

دم رکا ہے تو اشارے سے وصیت کر لے
نزع میں نورِ الٰہی کی زیارت کر لے

کسی آقا نے کبھی کی ہے یہ توقیر غلام
دیکھ تو رحم ترے واسطے روتے ہیں امام

بھائی فرماتے ہیں شفقت سے شہِ عرش مقام
اے خوشا حال خدا سب کا کرے نیک انجام

حشر تک خلق میں یہ ذکرِ غم انگیز رہا
تو تو بچپن کے غلاموں سے بھی تہجیز رہا

نیم وا چشم سے حُر نے رخِ مولا دیکھا
زیرِ سر زانوئے شبیرؑ کا تکیا دیکھا

مسکرا کر طرفِ عالم بالا دیکھا
شہ نے فرمایا کہ اے حُر جری کیا دیکھا

عرض کی حسنِ رخِ حور نظر آتا ہے
فرش سے عرش تلک نور نظر آتا ہے

باغِ فردوس دکھاتا ہے مجھے اپنی بہار
صاف نہریں ہیں رواں جھوم رہے ہیں اشجار

شاخ سے میری طرف بڑھتے ہیں میوے ہر بار
حوریں لاتی ہیں جواہر کے طبق بہرِ نثار

ہے یہ رضواں کی صدا دھیان کدھر تیرا ہے
دیکھا اے شاہ کے مہمان یہ گھر تیرا ہے

مجکو لینے چلے آتے ہیں فرشتے یا شاہ
ملک الموت بھی کرتا ہی محبت کی نگاہ

خلد سے شیر خدا نکلے ہیں اللہ اللہ
لو برآمد ہوے شبّر بھی پدر کے ہمراہ

ننگلے سر احمدِ مختار کی پیاری آئی
دیکھیے آپ کے نانا کی سواری آئی

قبلہ رو کیجیے لاشہ مرا اے قبلہ دیں
پڑھیے لیس کہ اب ہی یہ دمِ باز پسیں

کوچ نزدیک ہی اے بادشہِ عرش نشیں
لیجیے تن سے نکلتی ہی مری جانِ حزیں

بات بھی اب تو زباں سے نہیں کی جاتی ہی
کچھ اُڑھا دیجیے مولا مجھے نیند آتی ہی

کہہ کے یہ گود میں شبیر کے لی انگڑائی
آیا ماتھے پہ عرق چہرے پہ زردی چھائی

شہ نے فرمایا ہمیں چھوڑ چلے کیوں بھائی
چل بسے حُر جری پھر نہ کچھ آواز آئی

طائرِ روح نے پرواز کی طوبا کی طرف
پتلیاں رہ گئیں پھر کر شہ والا کی طرف

لاش اُٹھا کر شہِ دیں خیمہ کے در پر آئے
پانوں مہماں کے سنبھالے علی اکبر آئے

غل ہوا خیمۂ عصمت میں کہ سر وا آئے
پیچھے پردے کے حرم کھولے ہوے سر آئے

دخترِ فاطمہؑ ساماں عزا کرنے لگی
فضّہ پردے کے اُدھر آ کے بکا کرنے لگی

شاہ چلّاے کہ اے زینب و ام کلثوم
ہم بھی مظلوم ہیں مہمان بھی ہوا ہی مظلوم

ماں ہی یاں اس کی نہ خواہر پہ تمھیں ہی معلوم
کون لاشے پہ کرے نالہ و فریاد کی دھوم

اجر ہوگا تمھیں اشکوں سے جو منہ دھوؤ گی
اُس کو یوں روؤ کہ جس طرح مجھے روؤ گی

کہہ دو کبرا سے کہ ماتم کے لیے کھول دے سر
روے ناوان سکینہؑ اسے عمو کہہ کر

جاں گزا بین کرے بانوے تفتیدہ جگر
ہم اُدھر لاش پہ ماتم کریں تم روؤ اُدھر

غل ہی فریاد کا آوازِ بکا آتی ہی
سُن لو اماں کے بھی رونے کی صدا آتی ہی

میری جانب سے کہو لاش پہ آئیں سجّادؑ
بعد مرنے کے ہو تا روح مرے دل کی شاد

یہ وصیت مری شیعوں کو سدا رکھیں اسے یاد
نام حُر سن کے کریں آہ و فغاں و فریاد

جس عزا خانہ میں وہ تعزیہ میرا رکھیں
اُس کا ماتم بھی اسی بزم میں برپا رکھیں

دوست کے دوست کا غم دوست سدا کرتے ہیں
حق محبت کا وفا دار ادا کرتے ہیں

فاتحہ دیتے ہیں سامان عزا کرتے ہیں
غیر مرجاتا ہے گھر میں تو بکا کرتے ہیں

تھا یہ وہ دوست کہ جان اس پہ فدا ہوتی ہے
فاطمہؓ اپنا پسر کہہ کے اُسے روتی ہے

سن کے یہ شور ہوا حُرِ دلاور ہے ہے
ای مددگارِ جگر بندِ پیمبر ہے ہے

خوں میں سب تر ہے ترا روئے منور ہے ہے
تشنہ و بیکس و مظلوم کے یاور ہے ہے

اِدھر آنا تھا کہ تیری اجل آئی بھائی
گھر میں سادات کے دعوت بھی کھائی بھائی

بس انیسؔ اب یہ دعا مانگ کہ ای رب عباد
لکھنؤ کے طبقے کو تو سدا رکھ آباد

رونے والے شہ والا کے رہیں خلق میں شاد
اُن کے سایہ میں برومند ہوان کی اولاد

عشرۂ ماہ عزا نالہ کشی میں گزرے
سال بھر شہ کے غلاموں کو خوشی میں گزرے

رباعی

افسوس زمانے کا عجب طور ہوا
کیوں چرخ کہن آہ نیا دور ہوا

بس یاں سے کہیں اور چلو جلد انیسؔ
اب یاں کی زمین اور فلک اور ہوا

رباعی

مال و زر و افسر و حشم ملتا ہے
ممکن ہے نگیں طبل و علم ملتا ہے

عنقا گو گرد سرخ پارس اکسیر
یہ سب ملتے ہیں دوست کم ملتا ہے

مرثیہ ۶

جب حُر کو ملا خلعت پرخونِ شہادت
جنت میں گیا رالیضِ گلگونِ شہادت

مستوجبِ رحمت تھا وہ مفتونِ شہادت
جان بیچ کے پایا دُرِ مکنونِ شہادت

نے سر دیے ہرگز یہ مہم سر نہیں ہوتی
ہاتھ آئی وہ دولت جو میسّر نہیں ہوتی

یہ مرتبہ نے شکر گزاری نہیں ہوتا
یہ اوج بجز رحمت باری نہیں ہوتا

نے فیض یہ چشمہ کبھی جاری نہیں ہوتا
کم قدر کا پلہ کبھی بھاری نہیں ہوتا

راحت بھی اُٹھائی ہے جب آنے ارلے ہیں
غواص کو اکثر دُرِ شہوار ملے ہیں

غل تھا کہ یہ اچھوں کی رفاقت کا ثمر ہے
جنت گلِ زہراؑ کی محبّت کا ثمر ہے

ایمان فقط نخل ولایت کا ثمر ہے
سرسبزیِ حُر باغِ ریاضت کا ثمر ہے

مولا جسے چاہیں وہ گناہوں سے بری ہو
کھیتی یہ ہر اول کی ہے کیونکر نہ ہری ہو

اک جا تھے حُر و شمر یہ عالم میں ہے مشہور
کیا شانِ خدا ہے کہ یہ مغفور وہ مقہور

وہ ہوتا ہے جو ہوتا ہے اللہ کو منظور
انسان رہے حق کی طرف اپنے بمقدور

دولت کو نہ حشمت کو نہ آرام کو دیکھے
آنکھیں وہی رکھتا ہے جو انجام کو دیکھے

اللہ کے محبوب کے دربار میں پہونچا
سرور کے یداللہ کی سرکار میں پہونچا

نے رنج و خلش گلشنِ نے خار میں پہونچا
وہ نار میں یہ خلد کے گلزار میں پہونچا

مالک نے لیا اُس کو اسے شاہِ عرب نے
رحمت نے اسے گھیر لیا اس کو غضب نے

رویا اسے زہرا کا پسر واہ ری قسمت
زانوئے حسینؑ اور وہ سر واہ ری قسمت

طوبیٰ کے تلے خلد میں گھر واہ ری قسمت
دنیا سے یہ رحمت کا سفر واہ ری قسمت

کیا جلد گیا سوئے ارم دارِ فنا سے
سوکھا جو پسینہ بھی تو جنت کی ہوا سے

خواہش یہ ہر اک حور کی تھی حُر ادھر آئے
یہ صاحبِ اقبال و تہوّر ادھر آئے

لہراتا تھا کوثر بھی کہ یہ دُر ادھر آئے
فرماتے تھے حیدر یہ بہادر ادھر آئے

مشتاق ملاقات کے سب چھوٹے بڑے تھے
محبوب خدا ہاتھوں کو پھیلائے کھڑے تھے

فرماتی تھی زہرا مرے غمخوار کو لاؤ
جلدی مرے پیارے کے مددگار کو لاؤ

تعظیم سے تکریم سے سردار کو لاؤ
لاؤ مرے آگے حُرِ دیندار کو لاؤ

پایا نہ کفن واں تو یہاں شاد کروں گی
میں حلّۂ جنّت اُسے امداد کروں گی

حوروں کا وہ میووں کے طبق سامنے لانا
در پردہ وہ اشارے کہ ہماری طرف آنا

کوثر ہی وہ تسنیم ہی گر پیاس بجھانا
اس قصرِ جواہر سے کہیں اور نہ جانا

جو کہ وہ کریں فخر ہی خدمت شہدا کی
ہم سب ہیں کنیزیں پسرِ شبّر خدا کی

حقا کہ یہ رتبہ شہ ذی جاہ نے بخشا
ایمان کا شرف فاطمہؑ کے ماہ نے بخشا

طالب تھا وہ جس کا وہی اللہ نے بخشا
بخشا اُسے خالق نے جسے شاہ نے بخشا

جنت ادھر آئی جدھر آیا قدم اُن کا
کر دیتا ہی انساں کو فرشتہ کرم اُن کا

اے حُرِّ دلاور تری تقدیر کے صدقے
رتبے کے فدا عزّت و توقیر کے صدقے

مہماں کے تصدّق شہ دلگیر کے صدقے
اُس صحبت ذی قدر کی تاثیر کے صدقے

ناکام کا یوں کام ملاقات میں بن جائے
برسوں کا جو بگڑا ہو وہ اک بات میں بن جائے

اب یاں سے رقم کرتا ہی یوں راوی صادق
جب قتل ہوا حُر سا مددگار موافق

پھر فوج پہ برسانے لگے تیر منافق
مر جانے پہ اک دل ہو سب شاہ کے عاشق

ایک ایک سے پہلے تھا خریدار اجل کا
سرکٹ رہے تھے گرم تھا بازار اجل کا

یوں جاتے تھے میدانِ شہادت میں وہ جرّار
جس طرح کہ بچھڑی ہوئی بلبل سے گلزار

خود روکتے تھے فرق پہ جب آتی تھی تلوار
باران کرم جانتے تھے تیروں کی بوچھار

برچھی جو لگی نخلِ شہادت میں پھل آیا
جان آگئی جس وقت پیام اجل آیا

زخموں کو عطائے صمدی جانتے تھے وہ
آثار کو لطف احدی جانتے تھے وہ

جینے کو مقدر کی بدی جانتے تھے وہ
مرنے کو حیات ابدی جانتے تھے وہ

سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ محمد کی ثنا تھی
دو روز کی پیاس اُن کے لیے آبِ بقا تھی

قربانِ تو لائے حبیب ابن مظاہر
یکساں صفتِ مہر ہیں باطن و ظاہر

عصیاں سے بری طیب و پاکیزہ و طاہر
جاں باز جہاں دیدہ فنِ جنگ سے ماہر

سر ملتا تھا پیری سے قدر امت میں خم تھا
اس پر بھی کچھ آگے ہی جوانوں سے قدم تھا

رعشا تھا کہ قابو میں نہ تھے دست نکو کار
پر ایک میں محکم تھی سپر ایک میں تلوار

جب شہ کی طرف تیر لگاتے تھے ستمگار
یہ بڑھ کے اُسے روکتے تھے سینے پہ ہر بار

بھائی مرے پاس آؤ یہ فرماتے تھے حضرت
جب تیر انھیں لگتا تھا تڑپ جاتے تھے حضرت

جب ایسے فقیروں کا پرا ہو گیا خالی
بھرتا تھا دم سرور دو کونین کا والی

پھرتا تھا کوئی مولا کا نہ ہمدم نہ موالی
لاشوں کو لگاتے تھے گلے سرورِ عالی

بے تاب تھے اس طرح ہر اک دوست کے غم میں
جیسے کوئی رقا ہو برادر کے الم میں

لاشوں کے اُٹھانے سے نہ پائی تھی فراغت
جوتوں کے نیزوں کو بڑھے اہل شقاوت

مولا کے جگر گوشوں نے کیا عزم شہادت
لٹنے لگی زہرا و محمد کی بضاعت

سیدانیوں کا دودھ جو پی پی کے پلے تھے
جلادوں کی تلواریں تھیں اور اُن کے گلے تھے

لاکھوں سے لڑے حضرت عباس کے بھائی
حملوں میں دکھائی شہ مرداں کی لڑائی

سب شانِ پدر بیٹوں نے جعفر کے دکھائی
مسلم کی جو میراث تھی فرزندوں نے پائی

لاکھوں میں پھرا اس شان سے شاہِ دو جہاں تھے
دو طفل جلو میں فقط اور تین جواں تھے

دو طفل وہ جو تین شب و روز کے پیاسے
زینب کے پسر شیر الٰہی کے نواسے

خود اپنی شہادت کے طلب گار خدا سے
بے تاب کہ کیوں رہ گئے پیچھے شہ ذی جاہ سے

جینے کی ہماری جو خبر پائیں گی اماں
لاشے بھی نہ پائیں گی کہ منگوائیں گی اماں

قاسمِ حسنِ سبز قبا کا مہ تاباں
عباسِ علی چشم و چراغِ شہ مرداں

ہم شکلِ نبی نورِ نگاہِ شہِ ذی شاں
زینبؑ کے پسر جعفر و زہراؑ کے دلِ جاں

تاباں نظر آتا تھا قمر پاس قمر کے
پانچوں یہ جری چاند تھے شبیرؑ کے گھر کے

ایک ایک جری ملکِ شجاعت کا شہنشاہ
بچپن میں اولوالعزم کہ اَلعظمۃ للہ

ذی قدر سرافراز و فائق دل آگاہ
شیر اُن کی نظر دیکھ کے بن جاتے تھے روباہ

پیدا یہ تہور سے کہ لاکھوں میں تو کیا ہیں
دعویٰ تھا ہر اک کو کہ ہمیں شیرِ خدا ہیں

کھولے ہوئے رایت کوئی توڑے ہوئے شبیر
نے تاب کہ تلوار کے چلنے میں ہو کیں دیر

فاقوں میں زبردست کہ لاکھوں سے نہ ہوں زیر
بیشے میں پلے جو اسد اللہ کے وہ شیر

جز سجدۂ حق سر کبھی اُن کے نہ جھکے تھے
قبلۂ عالم کا ادب تھا جو رکے تھے

اِس وقت عجب غم تھا شہ جن و بشر کو
نہ روح کو راحت تھی نہ آرام جگر کو

کھو سکتے تھے بھائی کو نہ اکبرؑ سے پسر کو
نہ عون و محمد کو نہ شبرؑ کے قمر کو

میوے تھے سب اک باغ کے پھولے ایک چمن کے
وہ بھائی کا بیٹا تھا یہ بیٹے تھے بہن کے

فرماتے تھے موت آئے تو چھٹ جاؤں الم سے
یارب مرا گھر ہے انھیں جرّاروں کے دم سے

بچھڑیں نہیں ان سے یہ جدا ہوں نہ ہم سے
کٹ جائے گلا جلد کہیں تیغِ دو دم سے

ہاتھوں سے یہ محبوب گنوائے نہیں جاتے
داغ اب ترے بندے سے اُٹھائے نہیں جاتے

آگاہ ہوا شورِ مبارز طلبی کا
پھر قصد لعینوں نے کیا ترکِ ادبی کا

منہ سُرخ ہوا غیظ سے ہم شکلِ نبی کا
رایت بھی بڑھا فوجِ رسولِ عربی کا

حیدرؑ کے نواسوں کی بھی ابرو پہ بل آیا
چھوٹا تو یہ بگڑا کہ پرے سے نکل آیا

گھبرا کے پکارے جو اُسے سیدِ ابرار
بس پھر کے گرے پاؤں پہ آقا کے وہ جرار

کی عرض بصد عجز کہ اے کل کے مددگار
ہم دونوں غلام اب ہیں اجازت کے طلبگار

نے تاب ہیں دل جان لڑائی میں لٹی ہے
اے نورِ خدا ذرّہ نوازی کی گھڑی ہے

مرنے کو اگر بیٹے گئے قاسمؑ و اکبرؑ
یا شاہ ہمیں دودھ نہ بخشیں گی مادر

شبّر کی وہ تصویر یہ ہم شکل پیمبرؐ
تو فیر اسی میں ہے کہ ہم صدمے ہوں ان پر

مالک ہیں خداوند ہیں سردار ہیں دونوں
ہم ان کے بزرگوں کے نمک خوار ہیں دونوں

بسمل جو ہوئے مسلمِ مظلوم کے پیارے
ہم خیمے میں جا سکتے نہیں شرم کے مارے

اماں نے کہا ہوگا کہ اب تک نہ سدھارے
جانوں کو بچاتے ہیں جگر بند ہمارے

قاصر ہیں جو توفیرِ شہادت نہیں ملتی
کیا جانیں اسے وہ کہ اجازت نہیں ملتی

حضرت پہ ہے روشن جو ہمارا ہے ارادہ
رسن کم ہیں پہ ہمت ہے جوانوں سے زیادہ

نانا تو علیؑ جعفرِ طیار سے دادا
ہم ڈھونڈھتے ہیں صبح سے فردوس کا جادہ

شیروں کی طرح بیشۂ حیدر میں پلے ہیں
تلواروں سے ہم کھیل کے اس گھر میں پلے ہیں

وہ تیغ کے مالک ہیں تو مختار ہیں ہم بھی
دادا کی طرح مرنے پہ تیار ہیں ہم بھی

نانا تھے جو کرار تو جرار ہیں ہم بھی
سردے کے شہادت کے طلبگار ہیں ہم بھی

ہے جوشِ دعا عمر کے پیمانے بھرے ہیں
ہم صبح سے سر نذر کو ہاتھوں پہ دھرے ہیں

ہم آپ سے مرنے کے لیے جا نہیں سکتے
زخمِ تبر و تیر و سناں کھا نہیں سکتے

نے حکم جو مطلب ہے اُسے پا نہیں سکتے
آداب سے کچھ لب پہ سخن لا نہیں سکتے

پیچھے رہے اوروں سے یہ تقدیر ہماری
ہاتھ آپ کے ہے عزت و توقیر ہماری

ہم دونوں غلام اکبر و اصغر کے ہیں یا شاہ
الفت کو بس اب دل سے اُٹھا دیجیے للّٰلہ

اماں کا تو نازک ہے مزاج آپ ہیں آگاہ
بنتِ اسدِ حضرتِ باری ہیں وہ ذی جاہ

پوچھیں گی خفا ہو کے تو کیا اُن سے کہیں گے
آزردہ ہوئیں وہ تو کہیں کے نہ رہینگے

عورت ہیں پہ خو بو شہ مرداں کی ہے ساری
شب کو بھی یہ فرمایا تھا ہم سے کئی باری

تم یہ نہ سمجھو کہ میں عاشق ہوں تمھاری
بھائی سے مجھے جان نہ اولاد ہے پیاری

کس کام کے پھر سر جو تصدق نہ کروگے
تب دودھ میں بخشوں گی جو عزت سے مروگے

یہ کہہ کے جو رونے لگے زینب کے جگر بند
حضرت نے کہا میں ہوں بہر حال رضامند

کھوئے ہیں کسی بھائی نے ہمشیر کے فرزند
کس منہ سے کہوں آہ کہ ہو خاک کے پیوند

تنہائی کا دکھ فاطمہ کا لال سہے گا
لاشے کے اٹھانے کو بھی کوئی نہ رہے گا

اکبر کو تو ہمشیر نے میں نے تمھیں پالا
ماموں سے جدا ہوتے ہو جب ہوش سنبھالا

اب کون ہے غربت میں مرا تھامنے والا
دل کا کوئی ارمان بھی تم سے نہ نکالا

دس سال بھی پورے نہیں دونوں کے سنوں میں
دنیا سے اجل لیچلی شادی کے دنوں میں

دونوں سے یہ فرما کے ادھر روتے تھے شبیرؑ
چپ بیٹھی تھی اندر میں ادھر شاہ کی ہمشیر

سر زانو پہ تھا فکر میں اور لب پہ یہ تقریر
محجوب کیا بیٹوں نے ہے ہے مری تقدیر

میں جانتی تھی پہلے اجازت دہی لیں گے
اس کی نہ خبر تھی کہ دغا وقت پر دیں گے

آتا ہے دمِ صبح سے یاں لاشے پہ لاشا
اُن کے لیے اوروں کی لڑائی ہے تماشا

پائی نہ اجازت یہ سخن خوب تراشا
باتیں ہیں یہ ساری مجھے باور نہیں حاشا

رکتے ہیں دلاور کہیں روکے سے کسی کے
وہ سب بھی تو پیارے تھے حسین ابن علی کے

بانو نے کہا دونوں کی عمریں ہیں ابھی کیا
نہ گھر سے وہ نکلے نہ کوئی معرکہ دیکھا

میدان کی رضا دیتے نہ ہوں گے شہ والا
آزردہ نہ ہوں آپ یہ غصے کی نہیں جا

سن لیجیے گا رن میں جو کچھ کام کریں گے
حیدر کے نواسے ہیں بڑا نام کریں گے

فرمایا کہ ہاں جو مجھے تقدیر دکھائے
جی جاؤں گی مر کر جو وہ میدان سے آئے

کیوں شاہ سے رخصت کا سخن لب پہ نہ لائے
کیا جانیے کس فکر میں ہیں وہ مرے جائے

جو چاہیں کریں بیٹوں کے قابل میں کہاں ہوں
اب وہ مرے فرزند نہیں دونوں کی ماں ہوں

یہ ذکر تھا قصہ جو خبر لے کے یہ آئی
فریاد کہ اب لٹتی ہے زینب کی کمائی

لو میرے خوزادوں نے رضا جنگ کی پائی
اے بنتِ علیؑ رو رہے ہیں آپ کے بھائی

بچے بھی شریکِ شہدا ہوتے ہیں لوگو
دو بھانجے ماموں سے جدا ہوتے ہیں لوگو

فضہ سے یہ سننا تھا کہ بس رونے لگے سب
اور خاک پہ سجدے کو جھکیں حضرت زینب

فرمایا کہ صد شکر بر آیا مرا مطلب
عزت مرے بچوں کی تیرے ہاتھ ہے یارب

بہتر ہے جو لڑنے کو وہ پیارے گئے دونوں
یہ خوشخبری آئے کہ مارے گئے دونوں

بچے ہیں لڑائی کے نہیں رنگ سے واقف
نیزے کے نہ تلوار کے ہیں ڈھنگ سے واقف

فوجوں سے نہ آگہ نہ فنِ جنگ سے واقف
دونوں میں نہیں ایک بھی چوروں سے واقف

بوٹا سے ہیں قد بھی نہیں کچھ ایسے بڑھے ہیں
گھوڑوں پہ تو وہ پہلے پہل آج چڑھے ہیں

دہ سالہ و نہ سالہ تھے نکلے جو وطن سے
بو دودھ کی آتی ہے ابھی ان کے دہن سے

بچے مرے کم زور ہیں فاقوں کے محن سے
دھڑکا ہے کہ گھبرا کے چلے آئیں نہ رن سے

محسوب ہوں فاقوں میں ولی ابن ولی کے
تو ان کی مدد کر کہ نواسے ہیں علیؑ کے

بانو نے کہا دیکھ لو پھر اُن کو بلا کر
فرمایا نہیں آئیں گے خود برچھیاں کھا کر

اصرار کیا سب نے تو گردن کو جھکا کر
فرمایا کہ اچھا کوئی کہہ آئے یہ جا کر

صد قے گئی کچھ کام ہے یاں آ کے سدھارو
جاتے ہو تو شکلیں مجھے دکھلا کے سدھارو

فضہ گئی اور خیمے میں لائی انھیں ہمراہ
آئے صفت مہر لرزتے ہوئے دو ماہ

قدموں پہ گرے ہاتھوں کو جوڑے جو وہ ذیجاہ
لپٹا کے گلے کہنے لگی بنتِ ید اللہ

ماموں پہ فدا ہوتے ہو میں تم پہ فدا ہوں
لو آؤ کہ میں اب تو نہ غصے نہ خفا ہوں

چھوٹے نے کہا جوڑ کے ہاتھوں کو کہ مادر
ہر دم تھے اسی فکر میں ہم دونوں برادر

جاتا تھا وہاں ایک کے بعد ایک دلاور
ہر دوست سے مل ملکے گلے روتے تھے سرور

کس سے کہیں آقا پہ جو کچھ رنج و تعب تھا
اس وقت میں رخصت طلبی ترکِ ادب تھا

لاشوں کا وہ آنا وہ ہجومِ الم و یاس
جرات نہ پڑی عرض کی تھے گرچہ بہت پاس

آزردہ نہ ہوں آپ ہمیں تھا یہی وسواس
جب بڑھتے تھے ہم رکتے تھے حضرت عباس

جوڑے ہیں کبھی ہاتھ کبھی گرد پھرے ہیں
راضی ہوئے جب پاؤں پہ اس وقت گرے ہیں

خوش ہو کے کہا مانے کہ شاباش دلیرو
اب دیر نہیں خوب سدھارو مرے شیرو

ہاں چاہیئے منہ نیزہ و خنجر سے نہ پھیرو
دو شیر ہو ملکر عمر و شمر کو گھیرو

تو فقیر تمھاری ہو مری ناموری ہو
سر دونوں کے لاؤ تو ہیں جانوں کہ جری ہو

داد اکو جو پوچھو تو علمدارِ پیمبر
ہاتھوں کے عوض جن کو خدا نے دیئے دو پر

نانا سا تو عالم میں نہ تھا کوئی دلاور
کرار کی جرأت تو سنی ہوگی مکرر

یوں سب ہیں پہ سرتاج دلیروں کے تمھیں ہو
ماں صدقے گئی شیر تو شیروں کے تھمیں ہو

اس گھر کے بزرگوں کا چلن تیغ زنی ہے
جو فقر میں کرتا ہے سخاوت وہ غنی ہے

کیا شہرۂ خیبر شکنی بت شکنی ہے
جو بات پہ مرتے وہ سخاوت کا دھنی ہے

بودے کی کہاں آنکھ کہاں مرد کے تیور
چھپتے نہیں لاکھوں میں جو انمرد کے تیور

ہمراہ کوئی واں سے نہیں لاتا ہے رتبہ
جو نام پہ مرتا ہے وہی پاتا ہے رتبہ

سر بیچ کے ذیقدر کو ہاتھ آتا ہے رتبہ
ہٹتا ہے قدم بڑھ کے تو گھٹ جاتا ہے رتبہ

مر کر نہ ہٹے قابلِ احسنت وہی ہے
جو کھیت میں سرسبز ہو ساونت وہی ہے

دریا کی طرف پیاس میں تکتے نہیں غازی
گر شیر بھی جھپٹے تو سرکتے نہیں غازی

تلواروں میں آنکھوں کو جھپکتے نہیں غازی
بجلی بھی گرے گر تو جھجکتے نہیں غازی

آفت میں جو اُن کے بجا ہوتے ہیں پیارو
جراروں کے تیور ہی جدا ہوتے ہیں پیارو

تیروں کی مہم بات میں سر کرتے ہیں صفدر
آقا کے دلِ پاک میں گھر کرتے ہیں صفدر

تلواروں میں سینوں کو سپر کرتے ہیں صفدر
عزت پہ بزرگوں کی نظر کرتے ہیں صفدر

دم ہونٹوں پہ آئے تو شجاعت نہیں جاتی
مرنے پہ بھی چہرے کی بشاشت نہیں جاتی

نانا نے تمھارے درِ خیبر کو جو توڑا
مانندِ سپر ہاتھ سے اُس در کو نچوڑا

ہر وار میں بچتا تھا نہ اسوار نہ گھوڑا
خالی ہوا جب قلعہ تو منہ جنگ سے موڑا

تھراتے تھے کفار تزلزل میں زمیں تھی
تھا زور تو یہ اور غذا نانِ جویں تھی

جب دستِ یداللہ میں تیغ دوسر آئی
بس قبضۂ قدرت میں یکایک ظفر آئی

چھٹے یہ اِدھر فوج پہ نصرت اُدھر آئی
بعد آپ پھرے فتح کی پہلے خبر آئی

پڑھتے ہیں وہ کلمہ جو مسلماں ہمے دیکھے
اب تک تو سر اُٹھتے نہیں کفارِ عرب کے

خندق کی وَغا عمرو سیہ کار کی وہ دھم
تھرّاتا تھا تلوار سے جس کی عرب و روم

رد کر کے جو حربوں کو بڑھا خاصۂ قیوم
جھپٹا اسد آہو پہ یہ سب کو ہوا معلوم

اِک ضرب میں نہ گرز نہ مغفر تھا نہ سر تھا
خندق کے اِدھر لاش سرِ نخس اُدھر تھا

جس وقت ظفر یاب ہوئے حیدرِ کرّار
اِک ہاتھ میں سر عمرو کا اور ایک میں تلوار

فرمایا نبی نے یہ بہ اعلان و بہ تکرار
افضل ہی دو عالم کی عبادت سے یہ اک وار

سر فتح کا تھا پاؤں پہ خالق کے ولی کے
جبریل امیں چومتے تھے ہاتھ علی کے

واری یوہیں تم بھی مرے کام آؤ تو جانوں
آقا کی اطاعت کو بجا لاؤ تو جانوں

اِن چھاتیوں پر زخمِ سناں کھاؤ تو جانوں
لڑ بھڑ کے جب اس فوج سے مر جاؤ تو جانوں

جرّار ہو سب حال سے محرم ہیں تمہارے
مجکو بھی ہے دھڑکا ہی کہ سن کم ہیں تمہارے

ماں صدقے گئی گھاٹ پہ دریا کے نجانا
پانی کی طرف پیاس میں گھبرا کے نجانا

ساحل پہ کبھی سرد ہوا پا کے نجانا
صابر ہو تو رہواروں کو گرما کے نجانا

ایسے تو نہیں جو تجھے محجوب کروگے
میں دودھ نہ بخشوں گی جو پیاسے نہ مروگے

جس پانی کو ترسے اسداللہ کا پیارا
کیوں جاؤ اُدھر نہر پہ کیا کام تمہارا

عاقل کے لیے کافی و وافی ہی اشارا
گر آپ بقا ہو تو مناسب ہی کنارا

وہ کام ہو جس کام میں کوثر پہ گزر ہو
دم بھر کے لیے کیوں عرقِ شرم میں تر ہو

بھائی کسی ہنگام میں بھائی کو نہ چھوڑے
دونوں میں کوئی عقدہ کشائی کو نہ چھوڑے

جرات کو جلالت کو لڑائی کو نہ چھوڑے
ہمت کو مروّت کو بھلائی کو نہ چھوڑے

جو امر کہ مشکل ہی وہ دشوار نہ ہوگا
اک دل ہوے جب دو تو کوئی چار نہ ہوگا

اِک بھائی لڑے بڑھ کے جو ہاتھ ایک کا تھک جائے
بلوا جو پھرُ اس پر ہو تو یہ بہر کمک جائے

ہاتھوں میں صفائی ہو کہ سبل بھی پھرک جائے
گر صف ہو تو لپسا ہو پرا ہو تو سرک جائے

حملوں میں سب انداز ہوں خالق کے ولی کے
پہچان لیں وہ سب کے نواسے ہیں علی کے

نیزوں کی طرف چھاتیاں تانے ہوئے جانا
ہاں تیروں کی بارش میں سپر منہ پہ نہ لانا

ہنس ہنس کے میں قربان گئی برچھیاں کھانا
لازم ہے وہ ہمت کہ معرّف ہو زمانا

اس جنگ کا چرچا سحر و شام رہے گا
دنیا میں اگر تم نہ رہے نام رہے گا

دونوں نے کہا ہوگا یہی فضل خدا سے
کیا بات ہے جیتے ہیں تو مر جائیں گے پیاسے

ہم اور نہیں کوئی۔ علی کے ہیں نواسے
غافل نہ رہیں آپ غلاموں کی دعا سے

کچھ ہم سے نہ تلوار سے نہ ڈھال سے ہوگا
جو ہوگا وہ سب آپ کے اقبال سے ہوگا

ارشاد نہ حضرت کا بجا لائیں تو مجرم
بھولے سے بھی دریا کی طرف جائیں تو مجرم

ڈر جائیں تو نے وقر جو ہٹ جائیں تو مجرم
بڑھ بڑھ کے نہ شمشیر و سناں کھائیں تو مجرم

مر جائیں گے دنیا میں سدا کون جیا ہے
دودھ آپ کا ہم دونوں غلاموں نے پیا ہے

جیتے ہیں تو نے صف شکنی ہم نہ رہیں گے
مجبور ہیں سینوں میں اگر دم نہ رہیں گے

سر کاٹیے گا پاؤں جو محکم نہ رہیں گے
لڑکے ہیں جوانوں سے مگر کم نہ رہیں گے

جینا کسی صورت ہمیں مطلوب نہیں ہے
اب کیا کہیں خود اپنی ثنا خوب نہیں ہے

چھوٹے تو ہیں کیا منہ سے بڑی بات نکالیں
ان سینوں پہ رکھائے کوئی سو تیروں کی بھالیں

سیدانیاں ایسی جنھیں آغوش میں پالیں
تلواروں میں دیکھیں گے وہی سینوں پہ ڈھالیں

ہم جینے پہ مرتے نہیں مرنے کو جیے ہیں
سینے ہمیں کس واسطے خالق نے دیئے ہیں

مختار رہیں یوں آپ مرادیں کہ خفا ہوں
ہوتے ہیں مکدّر کہیں دل جن کے صفا ہوں

وہ نام پہ کیوں کر نہ مریں جو شرفا ہوں
تب دقت ہے غصّہ کا جو وعدے نہ وفا ہوں

کیا زیست پھر اُن کی جنھیں ماں باپ نہ بخشیں
تیور بھی جو میلے ہوں تو دودھ آپ نہ بخشیں

ایسے تو نہیں ہم جو شجاعت نہ دکھائیں
سب نام کریں اور ہمیں جرات نہ دکھائیں

نانا کی اگر شان و جلالت نہ دکھائیں
مصحف کی قسم آپ کو صورت نہ دکھائیں

خندق ہو تو لاشوں سے زمیں پاٹ کے مرجائیں
تینیں نہ چلیں گر تو گلا کاٹ کے مرجائیں

جب کہہ چکے یہ جوشِ شجاعت میں وہ گلرو
آنکھوں سے ٹپکنے لگے رخساروں پہ آنسو

لپٹا کے گلے کہنے لگی زینب خوشخو
اللہ یہ غصہ ہے کہ بل کھاتے ہیں گیسو

لڑنا ہے تمھیں فوج سے مطلوب لڑو گے
لو رو دئے نہ معلوم ہوا خوب لڑو گے

صدقے میں ارادوں کے مرے شیر جوانو
اے بے وطن و فاقہ کش و تشنہ دہانو

اب غیظ سے تھرّاؤ نہ کہنا مرا مانو
ماں کہتے تھے پیار سے تم خادمہ جانو

یہ فصل لڑائی کی نہیں کھیل کے دن ہیں
مَیں اس لیے کہتی ہوں کہ چھوٹے ابھی سن ہیں

شبیر اُس کے ہو تم شیر ہے جو بنتِ اسد کا
سر جس نے کیا معرکہ صفین و اُحد کا

دنیا میں بڑا نام ہے تم دونوں کے جد کا
ماں صدقے گئی وقت ہے ماموں کی مدد کا

ایک ایک جری شش سِتم لاشوں سے بھر دے
اللہ تمھیں لشکرِ اعدا پہ ظفر دے

لو بخشدیا دودھ سدھارو مرے پیارو
لجھے ہوئے گیسو تو سنوارو مرے پیارو

میلی ہے یہ پوشاک اُتارو مرے پیارو
دولھا تو بنالوں مرے پیارو مرے پیارو

خوش ہونگی میں تب گھوڑوں پہ جس آج چڑھو گے
شادی ہے بڑی آج کہ پروان چڑھو گے

فرما کے یہ دونوں کے چہروں کی بلائیں
اور تھام کے بازو کو پڑھیں آپ دعائیں

فرمایا کہ رخصت جنھیں ہونا ہو وہ آئیں
لو بی بیو سب آؤ تو بچے مرے جائیں

رن میں یہ برات اپنی کھانے کو چلے ہیں
دونوں دولھنیں بیاہ کے لانے کو چلے ہیں

سب بیبیاں آئیں جو کلیجوں کو سنبھالے
تسلیم کو جھک جھک گئے وہ نازوں کے پالے

جس وقت چلے خیمے سے وہ گیسوؤں والے
رنگ گئی ماں خاک عزا فرق پہ ڈالے

ڈیوڑھی سے جو دونوں دلہن نکل آئے
نزدیک تھا یہ ماں کا کلیجہ نکل آئے

خیمے سے برآمد ہوئے زینب کے جو دلبر
دیکھا کہ حسین ابن علی روتے ہیں در پر

بس جھک گئے تسلیم کو حضرت کی وہ صفدر
منہ کر کے سوئے چرخ پکارے شہ بے پر

یہ وہ ہیں جو آغوش میں زینب کی پلے ہیں
بچے بھی تری راہ میں مرنے کو چلے ہیں

کہکر یہ سخن دونوں کو گھوڑوں پہ چڑھایا
دونوں نے شرف پایۂ معراج کا پایا

بجلی کا سب انداز سمندوں نے دکھایا
دوڑے کہ دکھائی نہ دیا دھوپ میں سایا

ثابت نہ ہوا ایک پہ کیا ہو گئے دونوں
جنگل کو جو دیکھا تو ہوا ہو گئے دونوں

ایک ایک سے جاندار گراں قدر سبک رو
وہ جست وہ کاوے وہ طرارے وہ دواد و

کیلوں کی وہ تابش وہ ہر اک نعل کا پرتو
تاروں میں دکھاتے تھے چمک چار مہ نو

اک چاند تھا وہ جسم تو سن کا نشاں تھا
بالائے زمیں عالم بالا کا سماں تھا

شکلیں بھی پری جرات و سرعت کے علاوا
دو گام تھا جن کے لیے سو کوس کا دھاوا

قد ایک سے شکل ایک سی اور ایک سا کاوا
یکشت میں بجلی وہ رواروی میں چھلاوا

شوخی میں یہ آہو تھا اگر طیر تھا وہ بھی
یہ بادیہ پیما تو فلک سیر تھا وہ بھی

ہاں کبک تو یہ رنگ یہ انداز دکھائے
قائل ہوں جو طاؤس یہ پرواز دکھائے

جانیں جو پری چال میں یہ ناز دکھائے
آہو یہ طرارے یہ تگ و تاز دکھائے

ہوگا وہی لاریب تصور ہمیں جو ہے
دعویٰ ہے تو آئیں یہی میدان یہی گو ہے

تھم تھم کے بھی چلنے میں سب انداز ہوا کا
لڑنے میں سماں برق کا اڑنے میں ہما کا

پائے انھیں مقدور یہ کب پیک صبا کا
نہ وہم کا واں دخل نہ فہم شعرا کا

یہ عجز ہے تعریف جو کرتا نہیں کوئی
باندھیں کسے مضموں تو ٹھہرتا نہیں کوئی

یوں ذہن میں آتے ہی نکل جاتے ہیں سن سے
جس طرح نسیم آکے نکل جائے چمن سے

جرات میں فزوں شیر سے سرعت میں ہرن سے
آگاہ ہیں وہ جرات و سرعت کے چلن سے

نعل ان کے سر و ہی سے چلے فوج ستم پر
پڑتے تھے قدم دونوں کے دلدل کے قدم پر

گھوڑوں کو اُڑاتے ہوئے پہونچے جو بہادر
فوجِ ستم آرا ہوئی سب غرقِ تحیّر

اک شور ہوا کونسے دریا کے ہیں یہ در
لڑکے ہیں یہ اللہ رے اقبال و تہور

کیا جانیے کیا نام ہیں اِن کے اب و جد کے
تیور سے یہ پیدا ہی کہ بچے ہیں اسد کے

پیشانیاں خورشیدِ جہانتاب سے بہتر
رخسارۂ رنگین گلِ شاداب سے بہتر

دانتوں کی صفا گوہرِ نایاب سے بہتر
چہروں کا عرق موتیوں کی آب سے بہتر

ابرو نہیں پیشانیِ ذی قدر کے نیچے
ہیں دو مہ نو ہالے سے اک بدر کے نیچے

حیران ہیں عدو حسن پہ اور دونوں کے سن پر
ابرو وہ کمانیں ہیں کہ قرباں ہیں سپر پر

آنکھیں وہ کہ پریوں کی نظر پڑتی ہے جن پر
گیسو ہیں کہ سایہ کیا ہی رات نے دن پر

گیسو و رُخ خوں میں بھرے رنج کی جا ہی
دو بدلیں چار شش و پنج کی جا ہی

آنکھوں کی سیاہی پہ فدا نرگسِ شہلا
یہ عینِ شجاعت ہی کہ ہی معرکہ پہلا

ہیں پختنی دل کبھی ان کا نہیں دہلا
نے تیغوں کے کھیلے کوئی بچہ نہیں بہلا

تلوار چلی پھر گئی چتون جدھر ان کی
غصّے میں سروہی سے سوا ہی نظر ان کی

دِل بر ہیں دلیروں کے حسینوں کے حسیں ہیں
گویا یہ دہن خاتمِ قدرت کے نگیں ہیں

شیریں سخن اس طرح کے عالم میں نہیں ہیں
یہ طرفہ حلاوت ہی کہ باتیں نمکیں ہیں

جملے ہیں وہی صاف وہی شرط و جزا ہی
تقریر میں سب مصحفِ ناطق کا مزا ہی

شرمندہ ہی شمشاد بھی قد معتدل ایسے
رکھ دیتے ہیں سینوں کو سنانوں پہ دل ایسے

مختوم ہیں خط خال کے نقطے سجل ایسے
دیکھے ہیں کسی چشم کی پتلی نے تل ایسے

سطریں ہیں یہ سب گیسوؤں کے بال نہیں ہیں
مہریں یہ خطِ حسن پہ ہیں خال نہیں ہیں

وہ چاند سے سینے کہ وفا کا ہی گھر اُن میں
عدل و کرم و صنعت و علم و ہنر اُن میں

شیروں کا ہی بیشہ کہ دل اُن میں جگر اُن میں
اسرار جنابِ احدی کے گہر اُن میں

خود جن میں ہو دریا یہ سفینے نہیں دیکھے
اس طرح کے سینے تو کسی نے نہیں دیکھے

مضمون ہیں سر دست یہ ہاتھوں کی ثنا کے
ناخن ہیں ہیں دونوں کے ہنر عقدہ کشا کے

قبضے پہ اگر ہاتھ رکھیں غصے میں آ کے
دم بھر میں ہلا دیں طبقے ارض و سما کے

ہے کونسا سرکش جو یہاں پست نہیں ہے
ان سے کوئی دنیا میں زبردست نہیں ہے

بت کعبہ سے جن سب نے نکالے یہ وہی ہیں
رُکتے نہیں جن لوگوں کے بھالے یہ وہی ہیں

ہے فتح و ظفر جن کے حوالے یہ وہی ہیں
خیبر کے جو ہیں توڑنے والے یہ وہی ہیں

پروانے ہیں شمع حرم لم یزلی پر
قبضہ انھیں لوگوں کا ہے شمشیر علی پر

فوجیں نہیں ٹھہریں یہ جہاں جم کے لڑے ہیں
ہاتھ ان کے تو فولاد کے پنجے سے کڑے ہیں

چھوٹے ہیں جو اس گھر کے وہ جرار بڑے ہیں
دیکھو یہ کہ بپھرے ہوئے دو شیر کھڑے ہیں

یہ پانوں ہٹاتے نہیں ہیں جنگ پہ چڑھ کر
سر کٹنے پہ بھی گرتے ہیں تو کھیت سے بڑھ کر

ناگاہ یہ بڑھ کر پسر سعد پکارا
اے شیر دلو نام و نسب کیا ہے تمھارا

تلواریں پکڑ کر یہ پکارے وہ دل آرا
خالق نے ہمارے لیے دنیا کو سنوارا

خورشید زمیں تاج سر عرش بریں ہیں
پہلا یہ شرف ہے کہ غلام شہ دیں ہیں

دادا ہے شہنشاہ دو عالم کا مددگار
سردار جہاں فخر عرب جعفر طیار

وہ شقہ طراز علم احمد مختار
آلودہ رہی خون میں جس شیر کی تلوار

ہاتھوں کے عوض حق سے سر دست لیے ہیں
اللہ نے پر ان کو زمرد کے دیے ہیں

نانا اسد اللہ مددگار دو عالم
دیندار نمودار جہاندار دو عالم

سلطان قضا منتظم کار دو عالم
سرتاج فلک جنیۂ دستار دو عالم

سب امر الٰہی عمل کی میزان میں تلے تھے
عقدے وہ ہوئے حل جو کسی سے نہ کھلے تھے

بازوئے نبی دست خدا نفس پیمبر
طیب و زکی و طاہر و پاکیزہ و اطہر

لشکر شکن و بت شکن و فاتح خیبر
سرتاج عجم میر عرب حیدر صفدر

اصنام سے کیا خانۂ حق پاک کیا ہے
گہوارے میں اژدر کا دہن چاک کیا ہے

وہ رعب کہ شیروں کو بھی عبرت ہوئی جس سے
وہ حکم کہ خورشید کو رجعت ہوئی جس سے

وہ زور کہ ایمان کو قوت ہوئی جس سے
وہ ضرب بنا کفر کی غارت ہوئی جس سے

دیکھے اُسے آگاہ جو حیدر سے نہیں ہے
بہتر کوئی شاہد در خیبر سے نہیں ہے

کانپا کیا روم و عرب اک تیغ دوسر سے
گزری سر مرحب سے تو عنتر کی کمر سے

دینداروں کو امن اُس نے دیا فتنہ و شر سے
ضرب اُس کی نہ روکی گئی جبریل کے پر سے

کیا کیا نہ بدل جائے گا کیا کیا نہ مٹے گا
پر حشر تک اُس ضرب کا سکہ نہ مٹے گا

اللہ رے اوج و شرف و عزت و مقدار
دشمن کو بھی تھا فضل میں جس کے نہیں انکار

خالق کا ولی احمد مرسل کا مددگار
خاک کفِ پا سرمۂ چشم اولوالابصار

پاتے ہیں اشارے میں شفا کور و کر اُس سے
بینا ہے وہی جس کو ہے چشم نظر اُس سے

ہم دونوں نواسے ہیں اُسی فیض رساں کے
فرزند ہیں ہم شیر شہ کون و مکاں کے

دکھلائیں گے جوہر تمھیں تیغ دو زباں کے
بڑھ بڑھ کے الٹ دیں گے پرے فوج گراں کے

تم یہ نہ سمجھنا کہ یداللہ نہیں ہیں
ہم شیر تو ہیں گر اسداللہ نہیں ہیں

سن کر یہ رجز فوج کے سردار پکارے
ای قوم یہ شبیر کے ہیں بھانجے پیارے

تابندہ ہیں افلاک شرافت کے ستارے
ہاں بھر لے طلا سے وہ سپر جو انھیں مارے

حیدر کی طرح صاحب شمشیر ہیں دونوں
لڑکا انھیں سمجھے نہ کوئی شیر ہیں دونوں

یہ سُن کے کیا سب نے لڑائی کا سر انجام
کھلنے لگے ہر صف میں علمہائے سیہ فام

برچھی کہیں چمکی کہیں جمدھر کہیں صمصام
بدلی کی طرح جھوم کے آئی سپہ شام

یوں آتے تھے سب ٹوٹ کو فوج آتی ہے جیسے
پیچوں صفیں یوں آتی تھیں موج آتی ہے جیسے

اُس شور میں عباس کھڑے تھے وہ دلاور
پروا تھی نہ مطلق کہ یہ فوج آتی ہے کس پر

کہتا تھا بڑے بھائی سے چھوٹا کہ برادر
دیکھیں تو ذرا آپ قریب آگیا لشکر

وہ کہتا تھا تکیہ ہے عنایات احد پر
آنے دو اجل ان کو لیے آتی ہے زد پر

آتا ہی شکار آپ سے جس دم طرفِ شیر
دانستہ وہ کرتا ہی جھپٹنے میں ذرا دیر

جاتے ہیں کہاں اب تو یہ آئے نہ شمشیر
جس جا ہیں صفیں ہوتے ہیں لاشوں کے وہیں ڈھیر

کھل جائے گا جب نیمچے کھینچیں گے کمر سے
عرصہ فقط اتنا ہی کہ سبقت ہوا دھر سے

تھوڑے میں اُبل پڑتے وہ جوہر میں تہ ظرف
جب گرم ہوا مہر درخشاں تو کہاں برف

سر جائے پہ آئے نہ شجاعت پہ کوئی حرف
اس نخوت سے عمر اپنے بزرگوں کی ہوئی صرف

ہاتھ اپنا چلے گا تو جگہ پا کے چلے گا
ٹھوکر وہی کھائے گا جو گھبرا کے چلے گا

تقریر ادھر یہ تھی کہ تیر آئے اُدھر سے
پیغام و غا لیکے سفیر آئے اُدھر سے

سب موت کے حلقے میں اسیر آئے اُدھر سے
دو بچوں پہ دو لاکھ شریر آئے اُدھر سے

اس بھیڑ پہ بھی بند تھے دہشت سے دم اُن کے
بڑھ بڑھ کے ہٹے جاتے تھے پیچھے قدم اُن کے

بچھی لیے انبوہ سواروں کا جب آیا
شہزادوں نے رانوں میں سمندوں کو دبایا

اک شور ہوا غیظ رحیموں کو اب آیا
وہ نیمچے بجلی سے جو چمکے غضب آیا

آخردہ جری لخت دل ضیغم دیں تھے
سر تھے صف اول کے کہیں ہم کہیں تھے

بس پھر تو دھنسے فوج میں وہ شیر درندہ
تلواروں سے ڈر ڈر کے چھپے مردوں میں زندہ

آہو سے بھی چالاک تھے اسپان دوندہ
مرنے میں جو بجلی تھے تو اڑنے میں پرندہ

مانندِ براق نبوی عرش سما تھے
گھوڑے نہ کہو اوج سعادت کے ہما تھے

مارا انھیں چن چن کے جو تھے فوج میں چیدہ
رہواروں سے پامال تھے سر لے بریدہ

باہم تھے کمانداروں سے دونوں جو کشیدہ
بدکیش و خطاکار تھے سب زخم رسیدہ

سہمے ہوئے تھے تیر کہ آفت تھی جہاں پر
پیکاں نہ سرے پر تھا نہ چلہ تھا کماں پر

خالی تھی جو یہ صف تو پریشان وہ پرا تھا
جنگل ستم ایجادوں کی لاشوں سے بھرا تھا

رنگ اُڑ گئے تھے چہروں سے لشکر یہ ڈرا تھا
تھرّاتا تھا وہ ہاتھ جو قبضے پہ دھرا تھا

ڈر سے نہ بڑھاتے تھے جو سرکش قدم اپنے
تینیں بھی نیاموں میں چُراتے تھے دم اپنے

وہ مرگیا تلوار اُٹھا کر جسے ڈانٹا
اِس نخل کو تلوار سے کاٹا اُسے چھانٹا

کلھائے جراحت کو عجب حسن سے بانٹا
نکلی نہ کوئی شاخ نہ اُبھا کوئی کانٹا

ابتک یہ ہوا باغِ جہاں میں نہیں دیکھی
غل تھا کہ بہار ایسی خزاں میں نہیں دیکھی

تلوار نے چھوٹے کی نیا رنگ دکھایا
ضربِ اسد اللہ کا سب ڈھنگ دکھایا

حیرت ہوئی وہ زور و دمِ جنگ دکھایا
راکب کو بھی مرکب کو بھی چورنگ دکھایا

ایسا کوئی طفلی میں نمودار نہ ہوگا
ہاتھ ایسا تو جعفر کا بھی طیار نہ ہوگا

وہ نیمچا اور پھول سی وہ نرم کلائی
سب جس سے ہویدا ید بیضا کی صفائی

وہ انگلیاں جن میں ہنرِ عقدہ کشائی
ضیغم کے بھی پنجے نے یہ قوت نہیں پائی

زور ایسا جہاں کوہ سبک ہاتھ کے تل سے
ضرب ایسی کہ پوچھے کوئی جبریل کے دل سے

وہ شیروں سے بچکر ستم ایجاد کدھر جائے
گر منہ پہ چڑھے یہ تو سر تخت اُتر جائے

خالی بھی جو وے وار تو پھر خون ہیں جائے
بس زیست اسی میں ہے کہ تلوار سے مرجائے

بزدل جو ہے کیونکر وہ دلیروں سے بچے گا
بھاگے گا تو کیا صید یہ شیروں سے بچیگا

کس میں تھی ضیا نیچوں کی ضو کے برابر
گویا کہ مہ نو تھا مہ نو کے برابر

بجلی نہ چمک سکتی تھی یہ تو کے برابر
سر خاک پہ گر پڑتے تھے سو سو کے برابر

بچتا تھا نہ وہ نوک بھی جا لگتی تھی جس کو
رہ جاتا تھا وہ جل کے ہوا لگتی تھی جس کو

کاٹی جو سپر فرقِ جفا جو پہ نہ ٹھہری
منہ پہ نہ رُکی ساعد و بازو پہ نہ ٹھہری

چار آئینۂ ظالمِ بد خو پہ نہ ٹھہری
دشمن کی زرہ کاٹ کے پہلو پہ نہ ٹھہری

کہا زور تھا کیا ضربتِ شمشیر نکو تھی
گھوڑے کی بھی گردن سی اک اڑ میں دو کھی

بھالوں میں جو تیغوں کو سنبھالے نظر آئے
افسر نظر آئے نہ رسالے نظر آئے

ریتی پہ طپاں برچھیوں والے نظر آئے
ہر صف کی جگہ خون کے تھالے نظر آئے

غل تھا کہ رن ایسا کبھی پٹتے نہیں دیکھا
بچوں کو اس انداز سے لڑتے نہیں دیکھا

چار آئے جو لڑنے کو تو اک دل ہوئے دونوں
ٹھہرے نہ ہٹے نہ متامل ہوئے دونوں

گرما کے فرس جنگ پہ مائل ہوئے دونوں
چاروں سے یہ فرما کے مقابل ہوئے دونوں

شش شد نہیں ہوتے جو شجاعت کے دھنی ہیں
تم چار ہو ہم دو ہیں مگر پنجتنی ہیں

یہ سُنتے ہی بچوں پہ جھپٹ کر وہ چل آئے
غصّے سے دلیروں کے بھی ابرو پہ بل آئے

لشکر نے یہ جانا کہ وہ بچکر نکل آئے
آنا تھا کہ چاروں تہ تیغ اجل آئے

احسنت کا برپا ہوا غل چرخ بریں پر
ٹکڑے جو گنے چار کے تھے آٹھ زمیں پر

کیا ذکر بھلا آٹھ کا یا چار سروں کا
کشتوں کے جو پشتے تھے تو انبار سروں کا

گنتا ہوا ابتو ہمیں دشوار سروں کا
اِک مینہ سا برس جاتا تھا ہر بار سروں کا

تھم سکتے نہ تھے پاؤں کسی عربدہ جو کے
کٹتی تھی زمیں رن کی ڈریروں سے لہو کے

اعدا تھے دم جائزہ ہر بار ندارد
منشی کے قلم ہاتھ علمدار ندارد

پیدل نظری فوج کے اسوار ندارد
دو آئے تو دو چار تھے پھر چار ندارد

یوں فوج کے دفتر کو اُلٹتے نہیں دیکھا
یوں چہرے پہ چہرہ کبھی کٹتے نہیں دیکھا

یہ تھک کے جو ٹھہرا تو وہ لشکر میں در آیا
رستے کو تڑپتے ہوئے لاشوں سے بھر آیا

یہ ڈوب گیا جب وہ اُدھر سے ادھر آئے
اِک چاند تہ خاک چھپا اک نظر آیا

ہٹ جائے گا لشکر تو یہ خود چڑھ کے لڑیں گے
چھوٹے ہیں مگر بھائی سے کچھ بڑھ کے لڑیں گے

جانبازیاں دکھلاتے تھے میداں میں وہ جانباز
دل تھامے ہوئے دیکھتے تھے شاہ سرافراز

قاسم کا سخن تھا کہ علی کا ہے سب انداز
فرماتے تھے اکبر یہ لڑائی ہے کہ اعجاز

بڑھتے تھے کبھی گاہ سرک جاتے تھے عباس
جب وار وہ کرتے تھے پھڑک جاتے تھے عباس

ہر بار صدا دیتے تھے اے کیسوؤں والو
گیا کہنا ہے پھر بڑھ کے یہی ہاتھ نکالو

رہوار بڑھے جاتے ہیں باگوں کو سنبھالو
حلقہ ہے کڑی آنکھ زرہ پوشوں پہ ڈالو

اب ہٹنے کی مہلت مری جاں ان کو نہ دینا
منت بھی کریں گر تو اماں ان کو نہ دینا

ہاں شیروں کے شیروں کا یہی کام ہی شبیرو
بس آج لڑائی میں بڑا نام ہی شبیرو

پنجے میں تمہارے سپہِ شام ہی شبیرو
تم دونوں کا جد صاحبِ صمصام ہی شبیرو

اک شمس تو اک برجِ شرافت کا قمر ہی
ماں کس کی ہی بیٹی تو پدر کس کا پسر ہی

شہ کہتے تھے بچے ہیں ابھی ان سے کہاں تک
لاکھوں سے لڑے دونوں یہ طاقت تھی جہاں تک

دو روز سے پانی نہیں پہونچا ہی وہاں تک
اب پھیر کے کوئی انھیں لے آئے یہاں تک

سیراب بھی یہ تشنہ دہاں ہونے نہ پائے
ہی ہی مرے گھر میں یہ جواں موئے نہ پائے

سیدانیاں دروازوں پہ تھیں کھولے ہوئے سر
اصغر کو لیے کاپتی تھی بانو نے پر

فضہ تھی پریشاں کیے موخیمے کے باہر
پردے سے لگی کہتی تھی یہ شاہ کی خواہر

بتلا مجھے بچے مرے کیا کرتے ہیں دونوں
وہ کہتی تھی لاکھوں سے وغا کرتے ہیں دونوں

وہ رخ پہ نظر آتے ہیں اڑتے ہوئے گیسو
وہ نیچے بجلی کی طرح گرتے ہیں ہر سو

ڈھالیں لیئے وہ بھاگتے پھرتے ہیں جفا جو
وہ ابر میں چھپ چھپ کے نکل آتے ہیں مہ رو

بہتا ہی لہو چھاتیوں سے چور ہیں دونوں
کس طرح پکاروں کہ بہت دور ہیں دونوں

زینب نے کہا دونوں ہیں یکجا کہ جدا ہیں
کی عرض یہ رو کر کہ نہیں ایک ہی جا ہیں

لاکھوں ہیں عدو اور وہ دو ماہ لقا ہیں
منہ نہر سے پھیرے ہوئے سرگرمِ وغا ہیں

دم خوف سے سینے میں سملتا نہیں ابتو
ہی ہی مجھے چھوٹا نظر آتا نہیں ابتو

یہ سنتے ہی ڈیوڑھی سے ہٹیں حضرتِ زینب
فرمایا کہ بچوں کا مرے خاتمہ ہی اب

اب کچھ نہیں وسواس برآیا مرا مطلب
لو بی بیو مل کر صفِ ماتم پہ چلو اب

بچے مرے داخل ہوئے خیلِ شہدا میں
سجدہ تو کروں شکر کا درگاہِ خدا میں

یہ ذکر تھا جو طبل بجا فتح کا ناگاہ
چلائے حرم لٹ گئی بنتِ اسد اللہ

سجدے کو سوئے قبلہ جھکیں زینبِ ذی جاہ
دوڑے طرفِ دشت غارو تے ہوئے شاہ

تلواریں علم قاسم و عباس لیے تھے
ہمشکل نبی چاک گریبان کیے تھے

عباس نے غصّے میں لعینوں کو ہٹایا
بجلی سے بھی کچھ بڑھ کے گرا تیغ کا سایا

پسپا ہوئے کفّار کوئی تاب نہ لایا
شبّیر نے لاشوں کو تڑپتا ہوا پایا

آلودۂ خوں دو مہِ کامل نظر آئے
گودی کے لیے خاک پہ بسمل نظر آئے

سر تا بہ قدم چور تھے زخموں سے تنِ زار
انگڑائیاں لینے سے رگیں کھنچتی تھیں ہر بار

پیکانِ سہ پہلو تھے کئی چھاتیوں کے پار
تلواریں تھیں قبضوں میں مگر ہاتھ تھے بیکار

لب پر یہ سخن تھا شہِ والا نہیں آئے
دم ہونٹوں پہ آئے مگر آقا نہیں آئے

لاشوں کے قریب آکے پکارے شہِ صفدر
ای بھائی تجھ موجود ہی یہ بیکس و بے پر

یہ گرم زمیں اور یہ گل سے تنِ انور
ریتی سے اُٹھا کر مرے زانو پہ رکھو سر

ماموں سے عجب وقت میں منہ موڑ رہے ہو
کن انکھوں سے دیکھوں ہیں کہ دم توڑ رہے ہو

ای عونؑ و محمدؑ یہ جفا تم نے اُٹھائی
ابدائے عطش سب سے سوا تم نے اُٹھائی

راحت مرے گھر میں نہ ذرا تم نے اُٹھائی
کیا کیا نہ صعوبت بخدا تم نے اُٹھائی

مانع جو ہوئی ماں سو یہ سیم پھر نہیں دیکھا
اِس عمر میں تم سا کوئی صابر نہیں دیکھا

ای شیر جوانو مجھے طاقت تھی تمھیں سے
ای تیز زبانو مجھے طاقت تھی تمھیں سے

ای مرتبہ دانو مجھے طاقت تھی تمھیں سے
ای تشنہ دہانو مجھے طاقت تھی تمھیں سے

ساتھ اپنے جہاں سے مجھے لیتے نہ گئے تم
کاندھا مرے تابوت کو دیتے نہ گئے تم

اکبرؑ نے کہا عونؑ کے بازو کو ہلا کر
بھیّا تمھیں چلاتے ہیں شہ اشک بہا کر

ماموں کو پکارے بھی نہ تم چھپیاں کھا کر
باتیں شہ والا سے کرو ہوش میں آکر

لو گھر میں چلو بی بیاں سب غش میں پڑی ہیں
سر ننگے پھوپھی خیمے کی ڈیوڑھی پہ کھڑی ہیں

خم ہو کے یہ چھوٹے کو علمدار پکارے
ای تشنہ دہن ای مرے جانی مرے پیارے

کیا منہ میں زباں اینٹھ گئی پیاس کے مارے
چونکو کہ عجب حال ہی ماموں کا تمھارے

ہاتھوں کو ذرا جوڑ کے کچھ بات تو کر لو
بیٹا شہ والا سے ملاقات تو کر لو

سُن کر یہ صدا ہوش میں آئے وہ دلاور
سر رکھ دیے گھبرا کے شہِ دیں کے قدم پر

اٹکے تھے جو اکھڑے ہوئے دم سینوں کے اندر
دو ہچکیاں لیں دونوں صغیروں نے برابر

فردوسِ معلّٰی کے مسافر ہوئے دونوں
کروٹ بھی نہ بدلی تھی کہ آخر ہوئے دونوں

گودی میں موئے وہ جنھیں آغوش میں پالا
آنکھیں تھیں لہو اور جگر تھا تہ و بالا

بسمل کی طرح گر کے جو تڑپے شہِ والا
عباس نے تھاما علی اکبر نے سنبھالا

رقّت کا تھا یہ جوش کہ تھرّاتے تھے شبیر
ہر مرتبہ لاشوں سے لپٹ جاتے تھے شبیر

عباس نے کی عرض یہ بادیدۂ خونبار
خیمے سے نکل آئیں نہ سیدانیاں یکبار

لے چلیے اُنھیں خیمے میں اب یا شہِ ابرار
بہتر ہے کہ ماں دیکھ لے فرزندوں کا دیدار

لاشے جو نہ جائیں گے تو غم کھائیں گی زینب
یہ قبر میں سوئے تو کہاں پائیں گی زینب

یہ سنتے ہی لاشے شہ والا نے اُٹھائے
خیمے کے قریں دونوں کو روتے ہوئے لائے

غل تھا کوئی جلدی صفِ ماتم کو بچھائے
لو آئے شہنشاہ کی شبیر کے جائے

چھوٹے کو علی اکبر دلگیر لیے ہیں
اک لاش کو خود گود میں شبیر لیے ہیں

زینب نے کہا کیوں مجھے وسواس نہ آئے
ہے ہے علی اکبر اُسے کیوں گود میں لائے

لو گو مرے پیارے نے بڑے رنج اُٹھائے
صدقے یہ پھوپھی لاش کے لے آنے کے جائے

دو روز سے وہ سر و رواں تشنہ دہاں ہے
اس بوجھ کی طاقت مرے بچے میں کہاں ہے

اِن دونوں نے گر جان گنوائی تو گنوائی
بن بیاہے مرے لال نے کیوں لاش اُٹھائی

میں ماں ہوں نہ صائب مجھے یہ بات نہ بھائی
اکبر مری اٹھارہ برس کی ہے کمائی

دِل سے نہ یہ داغِ الم و یاس مٹے گا
صدقہ اب اتاروں گی تو وسواس مٹے گا

بانو نے کہا کونسی وسواس کی ہے جا
ہمشکلِ نبی لاشوں کو لائے تو ہوا کیا

شق ہوتا ہے مظلوموں کی غربت پہ کلیجا
ہے ہے وہ کوئی غیر تھے اے دخترِ زہرا

گھر تک کوئی واماندوں کو پہونچا نہیں دیتا
بھائی کوئی کیا بھائی کو کاندھا نہیں دیتا

ان دونوں کے عاشق تھے علی اکبرِ گلرو
چھوڑا نہ انھوں نے بھی کبھی بھائی کا پہلو

ایسا نہیں غم کہ تھمیں آنکھ سے آنسو
بس تلخ ہوئی زندگیِ اکبرِ خوشخو

کل تک تھے بہم آج اکیلے ہوئے دونوں
بھائی بھی وہ جو ساتھ کے کھیلے ہوئے دونوں

دونوں تھے اسی بھائی کے آرام کے طالب
جانے وہی جس شخص پہ گذریں یہ مصائب

وسواس کا یہ کونسا ہنگام ہے صاحب
بیجاں ہوئے ہے ہے علی اکبر کے مصاحب

ساتھ اب کوئی جوڑے ہوئے ہاتھ رہے گا
شہزادہ کو نین اُسے کون کہے گا

ناگاہ شہِ عرش نشیں لاشوں کو لائے
غل پڑ گیا لو سرورِ دیں لاشوں کو لائے

تھم کر صفِ ماتم کے قریں لاشوں کو لائے
ہمشیر تھیں جس صف میں وہیں لاشوں کو لائے

دونوں کا لٹانا تھا کہ غش کر گئی زینب
ہر بی بی پہ ثابت یہ ہوا مر گئی زینب

ہوش آیا تو اکبر سے کہا راہ میں کو سمجھاؤ
ہے ہے نہ کرو صاحبو اک لحظہ ٹھہر جاؤ

عباس کی زوجہ سے یہ بولیں کہ ادھر آؤ
کیا روتی ہو کپڑے علی اکبر کے بدلواؤ

بانو ہیں کدھر آہ یہ کیا نے خبری ہے
سب خوں سے مرے لال کی پوشاک بھری ہے

حضرت سے کہا آپ کو ایذا ہوئی یا شاہ
کس طرح لڑے دونوں غلامانِ ہوا خواہ

حضرت نے کہا مدح میں قاصر ہے زباں آہ
زینب مجھے یاد آ گئی جنگ اسد اللہ

نانا کی طرح دونوں نواسوں نے وغا کی
بچوں کی نہ تھی جنگ یہ قدرت تھی خدائی

تینوں میں یہ تیزی یہ صفائی نہیں دیکھی
یہ ضرب یہ پھرتی یہ لڑائی نہیں دیکھی

شیروں کی یہ پر زور کلائی نہیں دیکھی
اللہ اس میں یہ چل یہ دہائی نہیں دیکھی

صفین و جمل میں بھی رن ایسے نہ پڑے تھے
تم پوچھ لو عباس تو نزدیک کھڑے تھے

عباس نے کی عرض زباں لاؤں کہاں سے
جو کر گئے یہ لال وہ ہے بیاں سے

لڑتے تھے اسی طرح علی فوج گراں سے
افسوس کہ یوں اٹھ گئے یہ شیر جہاں سے

تلواریں جب اُن کی مجھے یاد آتی ہیں بھینا
دو جلباب آنکھوں میں چمک جاتی ہیں بھینا

کیا عرض کروں ہائے محمد کی لڑائی
گویا کہ یہ دیکھے ہوئے تھا جد کی لڑائی

بس صاف تھی صفین کی سرحد کی لڑائی
غل تھا کہ یہ ہی بازوے احمد کی لڑائی

رن پر جو چڑھا ہو وہی جانے کہ یہ کیا تھا
دنیا میں علی آج جو ہوتے تو مزا تھا

یہ سنتے ہی سرخی سی رخ زرد پہ آئی
حضرت سے کہا آپ کا صدقہ ہی یہ بھائی

کونین میں عزت مرے دلبندوں نے پائی
اب شاد ہوئی ان سے ید اللہ کی جائی

آقا مجھے پیار آتا ہی اقبال پہ ان کے
بیکس ہیں خدا رحم کرے حال پہ ان کے

فرما کے یہ لیں اُن کی بلائیں کئی بار ی
شانوں کو ہلا کر کے یہ آہستہ پکاری

کرتے ہیں امام دوجہاں مدح تمھاری
یہ کیا ہی جو تسلیم کو اُٹھتے نہیں واری

صدقے گئی یہ نیند ہی یا غش میں پڑے ہو
بیٹھے ہیں حسین ابن علی اُٹھ تو کھڑے ہو

کچھ آج ہی غفلت عجب ای نیند کے ماتو
باعث ہی یہ بچپن کا سب ای نیند کے ماتو

چونکو مری خاطر سے اب ای نیند کے تو
پھر سو ہو آتی ہی شب ای نیند کے ماتو

پھر کیا ہی جو بچپن کے یہ انداز نہیں ہیں
گردن ہی کہیں ہاتھ کہیں پاؤں کہیں ہیں

اب ضبط کی طاقت نہیں اماں کو سنبھالو
انگڑائیاں لو رات کرو نیند کو ٹالو

سینے میں اُلجھتا ہی دم ای گیسوؤں والو
واری مجھے خدمت کے لیے پاس بلالو

میں ہوں گی تو راحت سے تمھیں یاس نہ ہوگی
کیا گزرے گی منزل پہ جو ماں پاس نہ ہوگی

پہلا تو سفر اور نئے لوگ نئی راہ
کس طور سے گزریں گی یہ تاریک نشیبیں آہ

صدقے گئی رستے سے بھی تم تو نہیں آگاہ
پہونچائے تمھیں خیر سے فردوس میں اللہ

پُر ہول ہی رستہ مجھے تشویش بڑی ہی
قربان ہوں ماں قبر کی منزل بھی کڑی ہی

ٹوکے کوئی رستے میں تو ڈریو نہ مرے جان
ہاں کلمۂ توحید پڑھے جایو ہر آن

اقرار نبوت میں فصاحت کا رہے دھیان
دلبند ہو تم تین اماموں کے میں قربان

کہنا کہ ملازم ہیں ولی ابن ولی کے
ہم آتے ہیں لشکر سے حسین ابن علی کے

ای عون خبردار مرے چھوٹے پسر سے
شب کو یہ اکیلا کبھی نکلا نہیں گھر سے

رستے سے نہ واقف ہے نہ غربت کے سفر سے
محروم رہونگی میں سدا خیر و خبر سے

واماندوں پہ ظاہر ہو یہ وہ بھید نہیں ہے
ای وائے خط آنے کی بھی امید نہیں ہے

بچوں کے بین ہائے غضب اور سفر ایسا
لائے گا خبر کون کہاں نامہ بر ایسا

برباد نہ ہو یوں کوئی آباد گھر ایسا
نظروں سے نہ پوشیدہ ہو شمس و قمر ایسا

کس ناز و نعم سے یہ خوش اقبال پلے تھے
قبروں کے لیے ہائے مرے لال پلے تھے

اب کون مرے پہلوؤں میں سوئے گا بچّہ
تڑپے گا کلیجا مرا دل روئے گا بچّہ

یہ داغ تو دنیا سے مجھے کھوئے گا بچّہ
دن جا کے شب آئے گی تو کیا ہوئے گا بچّہ

راحت کسی کروٹ کسی پہلو نہ ملے گی
مرجاؤں گی زلفوں کی جو خوشبو نہ ملے گی

دنیا کو نہ دیکھا تھا کہ موت آگئی تم کو
خیمے سے نکلتے ہی اجل پا گئی تم کو

ماں صدقے ہو جنگل کی ہوا بھا گئی تم کو
ای گل بدنو کس کی نظر کھا گئی تم کو

ہے ہے مجھے پوشاک شہانی نہ دکھائی
صدقے گئی اماں کو جوانی نہ دکھائی

مرتے ہوئے پانی بھی نہ مانگا مرے ڈر سے
پیاسے سوئے فردوس سدھارے مرے گھر سے

نے آب تھے اس عمر میں چوبیں پہر سے
دیکھا بھی نہ دریا کو توجہ کی نظر سے

سہواً جو پڑی آنکھ تو منہ موڑ لیا ہے
ڈرتے تھے کہ اماں نے ہمیں منع کیا ہے

غصے ہوئی تھی تم پہ میں واری مجھے بخشو
ماں اب نہیں لونڈی ہوں تمھاری مجھے بخشو

لب پر سخن عذر ہیں جاری مجھے بخشو
صدمے سے غشی ہوتی ہے طاری مجھے بخشو

میں بھی تو یہ جانوں کہ دل افسردہ نہیں ہیں
لو کہدو بس اتنا کہ ہم آزردہ نہیں ہیں

یہ کہہ کے جو چھاتی پہ دوہتڑ کئی مارے
سینہ ہوا شق ہاتھ بھی نیلے ہوئے سارے

ہمشکلِ نبی پاؤں پہ گر کر یہ پکارے
بس والدہ اب روئیو لاشے پہ ہمارے

اب پیاس میں آب دم شمشیر پئیں گے
بھائی نہ رہے خلق میں ہم بھی نہ جئیں گے

گھبرا کے وہ مخدومۂ عالم یہ پکاری
مرجائے یہ ناشاد بلا لیکے تمہاری

بن بیاہے ہو تم لاشوں کے پاس آئی ہو ناری
تم روؤ گے اس ڈر سے میں کرتی نہیں زاری

باتوں میں بھی کچھ بین کے پہلو نہیں نکلے
آنکھوں سے مری دیکھ لو آنسو نہیں نکلے

فرما کے یہ غش ہو گئیں اور پھر ہوئیں ہشیار
پوچھا کہ کدھر ہے علی اکبر مرا دلدار

بانو نے کہا شاہ سے بادیدۂ خونبار
اب فرقِ بصارت میں بھی ہے یاشہِ ابرار

ابکی جو غش آیا تو گزر جائیں گی زینب
لیجائیے لاشے نہیں مرجائیں گی زینب

یہ ماتمِ اولاد ہے کیونکر اسے ٹالیں
مرجائیں جنھیں دل کی طرح گود میں پالیں

اکبر کی سنیں یا جگر و دل کو سنبھالیں
در آتی ہیں اک قلب میں دو تیروں کی بھالیں

بالائے جگر خنجرِ بیداد پھرے ہیں
دو غم کے پہاڑ ایک ضعیفہ پہ گرے ہیں

یہ سنتے ہی لاشوں کو اٹھانے لگے سرور
رانڈیں صفِ ماتم سے اٹھیں کھولے ہوئے سر

بانو نے کھڑے ہو کے ادھر روک لی چادر
چلائی سمجھکر شہ مظلوم کی خواہر

ٹھہرو ابھی کیوں داغ دیے جاتے ہو لوگو
ہے ہے مرے بچوں کو لیے جاتے ہو لوگو

دیکھا نہیں جی بھر کے ابھی بیٹوں کا دیدار
دونوں کی بلائیں مجھے لے لینے دو اکبار

چھوٹے کو بھی چھاتی سے لگائے یہ دل افگار
مادر سے مکدر نہ ہوں یہ آئنہ رخسار

گھر میں مرے کاہے کو پھر آئیں گے جا کے
دینے دو کفن دونوں کو زہرا کی ردا کے

در تک گئیں لاشوں سے لپٹنے کو کھلے سر
پر رانڈوں نے جانے نہ دیا خیمے کے باہر

چلائیں درِ خیمہ کے پردے کو اٹھا کر
گاڑو گے کہاں بھائیوں کو اے علی اکبر

ڈر ہے کہ خفا مجھ سے مرے لال نہ ہو جائیں
صدقے گئی لاشے کہیں پامال نہ ہو جائیں

یہ وقت نہیں طول کا خاموش انیس اب
جتنے ہیں سخن فہم وہ عاشق ہیں ترے سب

ہر دم ہے عنایاتِ محمد کرم رب
اب جلد وہ حاصل ہو جو کچھ ہے ترا مطلب

یہ حسن فصاحت ہے یہ شیریں سخنی ہے
پیری میں جواں ہے تو فقیری میں غنی ہے

مرثیہ (۷)

۴

دوزخ سے جو آزاد کیا حر کو خدا نے
کھلوا دئے فردوس کے در عقدہ کشا نے

زانو پہ رکھا سر کو امام دوسرا نے
اعلیٰ کیا ادنیٰ کو بزرگوں کی دعا نے

سب جس کے طلبگار تھے جنت میں وہ دُر تھا
حوران جناں گرد تھیں لو پیچ میں حر تھا

چرچا تھا کہ مہمانِ حسین آتا ہے دیکھو
دنیا سے بصد زینت زیں آتا ہے دیکھو

مولائے شہ بدر و حنین آتا ہے دیکھو
شہدائے رسول الثقلین آتا ہے دیکھو

دم نکلا ہے گودی میں شہنشاہِ زمن کے
سونگھو اسے خوشبو ہے یہ زہرا کے چمن کی

اللہ کے لشکر کا ہراول ہے یہ غازی
بعد اس کے ہیں سب کشتۂ اول ہے یہ غازی

خاکِ قدمِ احمدِ مرسل ہے یہ غازی
رتبے میں ملائک سے بھی افضل ہے یہ غازی

اس پر نظرِ لطفِ شہنشاہ بجف ہے
آنکھیں ہم اگر فرش کریں عین شرف ہے

اللہ کی درگاہ کا مقبول ہے یہ بھی
مقبول نہ کیونکر ہو کہ مقتول ہے یہ بھی

مجرم پہ کرم شاہ کا معمول ہے یہ بھی
گلدستۂ اسلام کا اک پھول ہے یہ بھی

نیکوں سے بدی دہ نہیں کرتا جو بھلا ہے
مرجھا کے یہ پھولا ہے خزاں ہو کے پھلا ہے

کیا اصل تھی اس نخل کی اور کیا ثمر آیا
اللہ کی قدرت یہ کہاں تھا کدھر آیا

لو شام کا بھولا ہوا وقتِ سحر آیا
تلواروں کی دریا سے سلامت اتر آیا

نیزوں کو عصا تیغوں کو پُل کر دیا اس نے
آتش کو چمن خار کو گل کر دیا اس نے

کس لشکرِ بدخو سے بگڑ کر نکل آیا
دو لاکھ ستمگاروں سے لڑ کر نکل آیا

تنہا ہوا تلوار پکڑ کر نکل آیا
نیزہ تھا کہ ہر قلب میں گڑ کر نکل آیا

کعبہ کی طرف دیر میں گر دیر سے پہونچا
شر نے اسے روکا تھا مگر خیر سے پہونچا

حوروں کے وہ چہرے وہ صنایع دُرِ دنداں
کوئی متبسم کوئی حیران کوئی خنداں

باتوں کی ملاحت لبِ شیریں سے دوچنداں
سن پائیں تو جا جا کریں ہونٹوں کو سخنداں

سودا ہو پری دیکھ لے گر حور کی آنکھیں
سورج کی چمک چاند کا منہ نور کی آنکھیں

ہاتوں پہ وہ کوثر کے چھلکتے ہوئے ساغر
پانی وہ سبک اور وہ لچکتے ہوئے ساغر

شیشے وہ بلوریں وہ چمکتے ہوئے ساغر
وہ مشک کی خوشبو وہ مہکتے ہوئے ساغر

پژمردہ اگر غنچۂ خاطر ہو تو کھل جائے
برسوں نہ لگے پیاس گر اک جام بھی پائے

وہ نرگسی آنکھیں وہ اُن آنکھوں کے اشارے
اُٹھ سایۂ طوبےٰ سے چل اب گھر ہیں ہمارے

دیکھ اس طرف اے حضرتِ شبیر کے پیارے
ساماں ہیں مہیا ترے آرام کے سارے

سیراب ہو گر مے سے اگر تشنہ دہن ہے
وہ کوثر و تسنیم ہے یہ نہرِ لبن ہے

حوریں کریں شوقیہ سخن واہ ری قسمت
مشتاق ہو جنت کا چمن واہ ری قسمت

سرگود میں لیں شاہِ زمن واہ ری قسمت
بھائی کہیں حضرت کی بہن واہ ری قسمت

مرنا وہ کہ عالم کے خبر گیر سرہانے
پہلو میں علی حضرتِ شبیر سرہانے

اللہ ری وفائے رفقائے شہِ ذی جاہ
دل سینوں میں لبریز ولائے شہِ ذی جاہ

سر دیتے تھے ہنس ہنس کے برائے شہِ ذی جاہ
کرتے تھے سفر چیں کے پائے شہِ ذی جاہ

دنیا کی نہ جانب ہیں نہ دریا کی طرف ہیں
مرتے ہوئے آنکھیں شہِ والا کی طرف ہیں

مرنے پہ کسے تھا کمر ایک ایک سے پہلے
کر دیتا تھا سینہ سپر ایک ایک سے پہلے

دیتا تھا بصد شوق سر ایک ایک سے پہلے
کرتا تھا دلِ شہ میں گھر ایک ایک سے پہلے

دشوار اُنھیں زیست کی ایک ایک گھڑی تھی
کوثر سے نظر خلد سے جاں اُن کی لڑی تھی

ایماں شہِ والا کی ولا جانتے تھے وہ
مرجانے کو توعینِ وفا جانتے تھے وہ

جینے کو ہوس دم کو ہوا جانتے تھے وہ
فاقوں کے بیاں کو بھی گلا جانتے تھے وہ

کچھ فرقِ اطاعت میں وہ ناکام نہ لائے
پانی کا زبانوں پہ کبھی نام نہ لائے

وہ ابن مظاہر کہ حسینوں میں جو تھے فرد
دنیا میں کسے ملتے ہیں اس طرح کے ہمدرد

اعدا کے لیے تیغ ہلالی دم ناورد
پیری میں اولوالعزم بڑھاپے میں جوانمرد

سب چھوٹے مگر دامن حضرت نہیں چھوڑا
مرنے پہ بھی اب تک در دولت نہیں چھوڑا

جب دے چکے سب غیر عزیزوں کی طرح سر
نذر جاں ہوئے دو ایلچی شاہ کے دلبر

مرنے پہ کمر باندھتے تھے قاسم نے پر
کہتی تھی جھکائے ہوئے سر شاہ کی خواہر

ہے سخت عجب دونوں کی دانائی سے مجکو
ان بیٹوں نے محجوب کیا بھائی سے مجکو

سب جاتے ہیں اور رن کی وہ خصوصت نہیں لیتے
مرجانے کی ماموں سے اجازت نہیں لیتے

سیدسے سرافرازی کا خلعت نہیں لیتے
سر دے کے جو ملتی ہے وہ دولت نہیں لیتے

پانی نہ ملے گر دم آخر نہ ملے گا
کہدے کوئی ایسا تمھیں دن پھر نہ ملے گا

کم عمر ہیں عزت کی وہ کیا بات کو جانیں
سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ پھرائے ہیں نہ مانیں

ہے ہے انھیں شبیر سے پیاری ہوئیں جانیں
پچتائینگے روئیں گے نہ کہنا مرا مانیں

اب تیر جگر گوشۂ زہرا پہ چلیں گے
جب وقت نکل جائے گا پھر ہاتھ ملیں گے

وہ نام پہ مرتے ہیں جو ہیں عاقل و ہوش
سب دل میں کہیں گے کہ ہے جنگ سے روپوش

موقع ہو تو گویا کہیں رہتے بھی ہیں خاموش
کیا جان کا پھر دھیان شجاعت کا ہو جب ہوش

فرق اُن کے تہوّر میں کسی طور نہیں ہے
باعث یہ لڑکپن کا ہے کچھ اور نہیں ہے

یہ ذکر تھا نوشاہ جو روتے ہوئے آئے
ماں نے جو پوچھا تو سخن لب پہ یہ لائے

اب جاتے ہیں لڑنیکو پھوپی جان کے جائے
اُن بھائیوں سے پہلے نہ ہم خوں میں نہائے

اب بھی ہمیں پیغام اجل آ نہیں جاتا
یوں روتے ہیں شبیر کہ دیکھا نہیں جاتا

زینب نے کہا میری مراد آئی سدھاریں
تینوں میں گوارا ہوں مرے دودھ کی دھاریں

دشمن جو ہوں فرزند علی کے انھیں ماریں
لڑنے پہ چڑھیں شمر کا سر تن سے اتاریں

یہ کس کا لہو دیکھ کے وہ جوش میں آئے
جب مر چکے دو بھائی تو وہ ہوش میں آئے

خیمہ میں یہ باتیں تھیں کہ آئے وہ دلاور
دیکھا کہ الگ بیٹھی ہوئی روتی ہے مادر

ساتھ اپنے انھیں لے کے گئی بانو مضطر
کی عرض کہ چھاتی سے لگا لو انھیں خواہر

یہ نور نظر لایق الطاف و عطا ہیں
تقصیر ہوئی کیا جو حضور ان سے خفا ہیں

منہ پھیر کے کہنے لگیں یہ شاہ کی ہمشیر
غیرت کی ہے جا غیر تو ہوں فدیہ شبیر

شکوہ ہے مقدر کا کچھ ان کی نہیں تقصیر
منہ پھیریں وہ مقتل سے جو ہوں صاحب شمشیر

انصاف تو کیجے مجھے کیونکر نہ گلا ہو
وہ پہلے نہ بیدم ہوں لہو جن میں ملا ہو

حر کون تھا اور کون تھا ابن قین بجلی
ہے عرش تلک جن کے ستاروں کی تجلی

کیونکر ہو بھلا مادر مضطر کو تسلی
مقتل میں یہ کوتاہیاں گھر میں یہ تعلی

آفت ہے لگانے ہی جو ہمت نہ کریں گے
یہ کس نے کہا تھا کہ ہمیں پہلے مریں گے

فرزند حسن مرنے کو جالیں تو یہ جائیں
عباس علی خون میں نہالیں تو یہ جائیں

ہمشکل نبی برچھیاں کھالیں تو یہ جائیں
لاشے ابھی شہزادوں کے آلیں تو یہ جائیں

کھلتا نہیں کچھ جوش شجاعت انھیں کیوں ہے
حضرت تو سلامت ہیں عجلت انھیں کیوں ہے

کیوں روتے ہیں کیا چھن گئی سر سے مرے چادر
خالی ابھی ہونے دیں محمد کا بھرا گھر

وقت آئے تو دکھلائیں گے تلواروں کے جوہر
جرات میں وہ جعفر ہیں شجاعت میں یہ حیدر

جب کوئی نہ ہوئے گا تو یہ جنگ کریں گے
کیا عیب ہے پہلے نہ مرے بعد مریں گے

تلواروں میں دم عشق کا بھرتے ہیں وفادار
سر دینے میں سبقت کہیں کرتے ہیں وفادار

موقع ہو تو دنیا سے گزرتے ہیں وفادار
سردار سے پہلے کہیں مرتے ہیں وفادار

خنجر دل زہرا پہ جو چل لیں تو سدھاریں
ماں خیمے سے سر ننگے نکل لے تو سدھاریں

میں سمجھی تھی پہلے ہی یہ ڈھونڈیں گے بہانا
کچھ منہ کا نوالہ نہیں تلواروں کا کھانا

لازم تھا اسی وقت انھیں خیمے میں آنا
سچ ہے کہ وفاداروں سے خالی ہے زمانا

جس تیغ میں تاثیر زبانوں میں نہیں ہے
غیروں میں اب الفت ہے گانوں میں نہیں ہے

کم عمر ہیں بچے ہیں یہ کیا وقت کو جانیں
رُخ زرد ہیں لب خشک ہیں سوکھی ہیں زبانیں

واں تیغوں میں تابش ہے کڑکتی ہیں کمانیں
جو نام پہ مرتے ہیں وہ دے دیتے ہیں جانیں

مذکور بزرگانِ خوش اوقات تو رہ جائے
جانیں نہ رہیں گر نہ رہیں بات تو رہ جائے

ماں کو تو سبک کر چکے کنبے کی نظر میں
میں لٹ گئی اس رنج و مصیبت کے سفر میں

پوچھے کوئی ان سے کہ یہ کیوں آئے ہیں گھر میں
کھولیں اسے باندھیں ہیں جو ہتیار کمر میں

فوجوں میں یہی طور تھے خالق کے ولی کے
لونا ہے اس پر کہ نواسے ہیں علیؑ کے

توڑ آئے ہوں خیبر سے کسی در کو تو کہہ دیں
مارا ہو جو مرحب سے دلاور کو تو کہہ دیں

ناکوفہ بھگا آئے ہوں لشکر کو تو کہہ دیں
خوشنود کیا ہو جو برادر کو تو کہہ دیں

چپ کیوں ہیں جو نصرت کی خبر لیکے پھرے ہیں
کیا شام کے سردار کا سر لیکے پھرے ہیں

یہ ذکر تھا جو خیمہ میں داخل ہوئے شبیر
دیکھا کہ ہیں بیٹوں سے خفا زینبِ دلگیر

فرمایا شکایت کے سخن کیجو نہ ہمشیر
ملتے ہیں کسے ایسے پسر صاحبِ توقیر

تلواروں میں ہر دم مرے قدموں پہ جھکے تھے
شبیرِ دلاور مرے روکے سے رُکے تھے

افلاکِ شجاعت کے یہی دو ہیں شہنشاہ
رکھتے انھیں پردے میں جو ہوتے اسد اللہ

پوچھے کوئی مجھ سے تمھیں قدر ان کی نہیں آہ
تم تو شہِ مرداں کی جلالت سے ہو آگاہ

ہلتی تھی زمیں غیظ سے خالق کے ولی کے
یہ اور کی چتون نہیں تیور ہیں علی کے

مالک ہو تم ان دونوں سے بگڑو کہ خفا ہو
بہتر ہے وہ غصہ جو مناسب ہو بجا ہو

ایسے ہیں کہ حق دودھ کا ان سے نہ ادا ہو
میں کیا کروں دونوں کا مرنا تمھیں چاہو

سمجھا کہ میں ہاتوں سے انھیں کھو دوں گی زینب
جب یہ نہ ملیں گے تو بہت روؤں گی زینب

کس طرح میں اس دولتِ بیدار کو کھوتا
جیتا میں جو ان میں سے کوئی پاس نہ ہوتا

موت آتی تو سر دے کے میں اس دشت میں سوتا
روتے یہ مری لاش پہ میں ان کو نہ روتا

کچھ بس نہیں چلتا جو اجل آتی ہے زینب
موت ان کو مرے گھر سے لیے جاتی ہے زینب

وہ داغِ جگر سوز ہیں ہمشیر کروں کیا
بچوں کے بچا لینے کی تدبیر کروں کیا

کرتی ہے اکیلا مجھے تقدیر کروں کیا
رُکتے نہیں یہ صاحبِ شمشیر کروں کیا

صدمہ اُسے ہوتا ہے زیادہ جسے روکوں
مشکل ہے مجھے کس کو رضا دوں کسے روکوں

زینب نے کہا آپ الم ان کا نہ کیجیے
طالب ہیں تو بہتر ہے اجازت انھیں دیجیے

قربان ہیں سب بھانجے ہوں یا کہ بھتیجے
گر دھیان ہے میرا تو قسم رونے کی لیجیے

بیٹے بھی فدا آپ پہ ہیں میں بھی فدا ہوں
دیر اتنی ہوئی کیوں میں اسی پر تو خفا ہوں

تھرّا کے وہ بولی کہ ہماری نہیں تقصیر
قسمت میں خجالت تھی نہ یاور ہوئی تقدیر

فرمایا شجاعت کے منافی ہے یہ تقریر
مسلم کے پسر کا ہے کو تھے صاحبِ شمشیر

جاتے ہوئے کس دوست کو آقا نے نہ روکا
روکا تمھیں اُن کوشہ والا نے نہ روکا

جو مرد ہیں پہلے وہی مرجاتے ہیں پیارو
آزردہ تھی پر خیر خوشی اب ہوں سدھارو

صدقے گئی اُلجھی ہوئی زلفیں تو سنوارو
واری یہ تمنّا ہے کہ سر ماموں پر وارو

سر دیکے جسے پاتے ہیں وہ راہ یہی ہے
صدقے گئی شادی ہے یہی بیاہ یہی ہے

پوشاک بدل کر جو سجے جنگ کے ہتیار
غل تھا کہ چلے شاہ کی ہمشیر کے دلدار

مجرے کو جھکے ماں کے جو وہ آئنہ رخسار
سینے میں تڑپنے لگا زینب کا دلِ زار

فرمایا ادا سر سے کرو حق شہ دیں کا
لو جاؤ مبارک ہو سفر خلدِ بریں کا

فوجوں کو مرے دودھ کی تاثیر دکھانا
دادا کی طرح جوہرِ شمشیر دکھانا

مظلومیتِ حضرتِ شبیر دکھانا
تن تن کے یداللہ کی تصویر دکھانا

تلوار اگر لاکھ چلیں سر نہ فرو ہو
جو سامنے آجائے وہ اک ضرب میں دو ہو

حیدر کی شجاعت کا معرّف ہے زمانا
فوجوں پہ اُسی دبدبہ وشاں سے جانا

ہنس ہنس کے تم اُن چھاتیوں پر چھریاں کھانا
جرأت کے منافی ہے سپر چہرے پہ لانا

ظلمت ہو قمر پر یہ سزاوار نہیں ہے
جو منہ کو چھپاتا ہے وہ رو دار نہیں ہے

بلوہ ہو تو پروانہ رہے بھائی پہ بھائی
مثل جسد و روح نہ دم بھر ہو جدائی

دکھلائیو ان چھوٹے سے ہاتوں کی صفائی
جانیں جو لڑاؤ گے تو سر ہو گی لڑائی

گر مر گئے تو قبر بھی عزت بھی ملے گی
میں دودھ بھی بخشوں گی شہادت بھی ملے گی

دم ہونٹوں پہ آجائے اگر پیاس کے مارے
غش کھا کے جو گر یو بھی تو دریا کے کنارے

پانی کو ترستے رفقا مر گئے سارے
یہ آبِ رواں بند ہے ماموں پہ تمھارے

تلواریں ہیں موجوں کی روانی نہ سمجھنا
دریا ہے لہو کا اسے پانی نہ سمجھنا

کی عرض یہی ہوئے گا اے مادرِ غمخوار
کیا بات ہے جیتے ہیں تو مرنا نہیں دشوار

اِس پیاس میں صابر ہیں غلامانِ وفادار
دریا کو نظر بھر کے جو دیکھیں تو گنہگار

دیجے گا سزا فرقِ اطاعت میں گر آئے
پھر دیکھیں نہ منہ آپ جو رُخ تک سپر آئے

یہ کہتے ہوئے خیمے سے صفدر نکل آئے
اِک بُرج سے دو چاند برابر نکل آئے

رومال رکھے آنکھوں پہ اکبر نکل آئے
شبیر بھی روتے ہوئے باہر نکل آئے

قدموں پہ جھکے وہ جو شہنشاہ زمن کے
کس جبر سے رخصت کیا بیٹوں کو بہن کے

شرما کے کہا جاؤ خدا حافظ و ناصر
شمشیر و سناں کھاؤ خدا حافظ و ناصر

اب دل کو نہ تڑپاؤ خدا حافظ و ناصر
چھاتی سے لگو آؤ خدا حافظ و ناصر

ناشاد و پُر ارمان مرے گھر سے چلے ہو
گھوڑوں پہ چڑھالوں میں کہ گودی میں پلے ہو

تھامے جو رہے بازوؤں کو قاسم و اکبر
گھوڑوں پہ چڑھے زینب ناشاد کے دلبر

الفت سے چلے ساتھ علمدارِ دلاور
تب کہنے لگے جوڑ کے ہاتھوں کو وہ صفدر

کچھ فوجِ شقاوت نہیں دور آپ ٹھہر جائیں
آقا پہ مصیبت ہے حضور آپ ٹھہر جائیں

فرمایا کہ دل سینے میں ٹھہرے تو میں ٹھہروں
دو زخم نہ ہوں دل پہ جو گہرے تو میں ٹھہروں

دریا سے ہٹا لوں جو یہ پہرے تو میں ٹھہروں
پانی نہ ہوں تم گاروں کے زہرے تو میں ٹھہروں

لازم ہے کہ جاؤں تو صفیں توڑ کے جاؤں
زینب سے کہوں کیا جو تمھیں چھوڑ کے جاؤں

جھکنے لگے گھوڑوں سے جو وہ آئنہ رخسار
مغموم پھرے حضرتِ عباسِ علمدار

تیغوں میں چلے جنس شہادت کے طلبگار
باگیں جو اُٹھائیں تو ہوا ہو گئے رہوار

ساتھ اُن کے ہزیمت میں گشت میں پہنچے
اُڑتے ہوئے طاؤس چمن دشت میں پہنچے

یوں آئے کہ جس طرح نسیمِ چمن آئے
گھوڑے تھے کہ دو آہوئے چین و ختن آئے

سونا لائے ہوئے دھوپ میں گل پیرہن آئے
فوجوں میں ہوا شور کہ وہ صف شکن آئے

شبیر آتے ہیں لشکر سے ولی ابن ولی کے
حضرت نے صدا دی کہ نواسے ہیں علی کے

دو صاعقہ لشکر پہ چمکتے ہوئے آئے
شعلے تھی کہ آندھی میں لپکتی ہوئے آئے

دو شیر صف جنگ کو تکتے ہوئے آئے
دو گل تھے ہوا پر کہ مہکتے ہوئے آئے

تھا شور کہ ہوش اُڑتے ہیں یاں کبک دری کے
گھوڑے نہیں جھونکے ہیں نسیمِ سحری کے

وہ گردنیں گھوڑوں کی وہ سم اور وہ سینے
غل تھا کہ یہ سینے کبھی دیکھے ہیں کسی نے

چاروں وہ قدم اور وہ رکابوں کے قرینے
کرسی کے یہ پائے ہیں تو ہیں عرش کے زینے

سرعت میں ہوا راہ جبل و بحر و صراط ایک
بلقیس کا تخت ایک سلیماں کی بساط ایک

آہو ہیں کہ سرگرم تگ و دو ہیں زمیں پر
دو شیر مہیائے روا رو ہیں زمیں پر

نعل اِن کے نہیں آٹھ مہ نو ہیں زمیں پر
کیلیں نہ کہو اختر پرضو ہیں زمیں پر

طاؤس میں جلوہ ہے یہ یہ چال نہیں ہے
پریوں کے کھلے بال ہیں یہ یال نہیں ہے

کیا دونوں کو اسپانِ سبکتاز ملے تھے
جانبازوں کو رہوار بھی جانباز ملے تھے

فتراک نہیں تھے پرِ پرواز ملے تھے
زینب کے لیے ساز خدا ساز ملے تھے

شیروں کا بھی یہ رعب دمِ جنگ نہیں ہے
رستم کا کمر بند ہے یہ تنگ نہیں ہے

غصّہ میں جو ہر بار ٹھہر جاتے ہیں چل کے
آنکھوں نے نیا حسن دکھایا ہے اُبل کے

اِس طرح قدم خاک پہ رکھتے ہیں سنبھل کے
گر ہاتھ میں ہو جام لبالب تو نہ چھلکے

ہر گام پہ اُڑ جانے کو تیار ہیں دونوں
بچوں کی سواری سے خبردار ہیں دونوں

زینوں پہ جو ہیں عرشِ الٰہی کے ستارے
جب پٹریاں جمتی ہیں تو بھرتے ہیں طرارے

خوش فہم ہیں ایسے کہ سمجھتے ہیں اشارے
ہیں شاہسوار آپ یداللہ کے پیارے

کم سن ہیں یہ مرنے پہ کمر باندھے ہوئے ہیں
کس حسن سے رہواروں کے سر باندھے ہوئے ہیں

ہر چند ہیں دونوں کے رکابوں سے جدا پاؤں
منہ ملتی ہیں قدموں پہ رکھتی جو ہوا پاؤں

ہیں راہ روِ جادۂ تسلیم و رضا پاؤں
کیا ران ہی کیا باگ ہی کیا ہاتھ ہی کیا پاؤں

شوکت جو دکھاتے ہیں سمندوں کو بڑھا کر
حضرت نے سکھایا ہی یہ کاندھوں پہ چڑھا کر

وہ برق یہ صرصر وہ چھلاوہ یہ پری ہی
وہ آہو صحرا ہی تو یہ کبک دری ہی

سرعت جسے کہتے ہیں وہ رگ رگ میں بھری ہی
ہر گام نئی چال نئی جلوہ گری ہی

نعل اُن کے کہیں برق ہیں شمشیر کہیں ہیں
آہو کہیں چلتے ہیں کہیں شیر کہیں ہیں

گھوڑے ہیں کہ طاؤس شہادت کے چمن کے
باریک وہ جلدیں کہ خجل پھول سمن کے

گردن کے مہ نو سے وہ ٹوٹے ہوئے منکے
گھونگٹ میں بھی پیدا ہیں سب انداز دلھن کے

دونوں کے پسینے میں بھی سب عطر کی بو ہی
رفتار میں گرمی یہ پریزادوں کی خو ہی

وہ شان وہ اجلال وہ شیروں کی نگاہیں
نعرے جو کیے بند ہوئیں امن کی راہیں

دعوے کہ فنا کر دیں ابھی ہم جسے چاہیں
ہمت وہ کہ جو منہ سے کہیں اُس کو نباہیں

فوجوں کو بھگایا ہی تو ہم بڑھکے تھمے ہیں
سرکے نہیں جب کھیت میں یہ پاؤں جمے ہیں

فوجوں کی صفائی جو نہ دیکھی ہو تو دیکھو
لشکر میں دُہائی جو نہ دیکھی ہو تو دیکھو

ہاں قلعہ کشائی جو نہ دیکھی ہو تو دیکھو
بچوں کی لڑائی جو نہ دیکھی ہو تو دیکھو

یہ منہ کبھی تینوں سے پھرائیں نہ پھریں گے
مرتے ہوئے دن میں قدم بڑھ کے گریں گے

تم سب میں شجاعت کا دھنی جو ہو وہ نکلے
بدخواہ امامِ مدنی جو ہو وہ نکلے

آمادۂ شمشیر زنی جو ہو وہ نکلے
سر دفترِ لشکر شکنی جو ہو وہ نکلے

تنہا نہیں اسکتی تو فوجیں بہم آئیں
کیوں دیر ہی گر تم نہیں بڑھتے تو ہم آئیں

تم لاکھ ہو ہم دو ہیں یہ راضی ہیں رضا پر
لاکھوں ہوں تو کیا ہیں نظر اپنی ہے خدا پر

کھل جائیں نشان چوب لگے طبلِ غنا پر
جلدی ہے کہ صدقے ہوں امامِ دوسرا پر

دیر اب نہ کرو جان لڑائی میں لڑی ہے
ہم پیاسے ہیں دو روز کے اور دھوپ کڑی ہے

یہ ذکر ابھی تھا کہ خدنگ آئے اُدھر سے
شمعوں کی طرح اڑ کے پتنگ آئے اُدھر سے

سر ہنگ و جفا جو پئے جنگ آئے اُدھر سے
یا فسے جو بڑھے لعل تو سنگ آئے اُدھر سے

ڈھالیں تھیں ہم گرز بھی ہاتوں میں تلے تھے
نیزے بھی لچکتے تھے پھریرے بھی کھلے تھے

کڑکیں وہ کمانیں کہ ہوا فوج کا کڑکا
تیغوں کی سفیدی تھی کہ تھا نور کا تڑکا

گہ بجھ گیا خورشید کا شعلہ کبھی بھڑکا
ہر دل کو ہلا دیتا تھا سر کٹنے کا دھڑکا

نعرے تھے کہ حیدر کے دلیروں سے وغا ہے
گھوڑے بھی بھڑکتے ہیں کہ شیروں سے وغا ہے

دانتوں میں شجاعانِ عرب ڈاڑھیاں دابے
وہ صورتیں خونخوار وہ گھوڑے وہ رکابے

وہ گرد میں وہ سر تھے کہ معکوس قرابے
وہ آگ کے پتلے تھے تو شبدیز شتابے

خوں آلِ محمد کا بہایا تھا انھیں نے
سادات کے خیموں کو جلایا تھا انھیں نے

قبضوں پہ ادھر ہاتھ سلح شوروں نے ڈالے
تیر آئے کمانوں سے بڑھے ظلم کے بھالے

یاں بیچ شیروں نے نیاموں سے نکالے
فوجوں پہ چلے شاہ کی آغوش کے پالے

اِک برق گری لشکرِ بدخو کی صفوں پر
دو شیروں نے حملہ کیا آہو کی صفوں پر

تر بھر ہوا لشکر وہ صف اس جا تھی نہ اُس جا
آفت تھی نہ کس صف میں قیامت تھی نہ کس جا

ہل چل ہوئی دو شیر گئے فوج میں جس جا
لشکر میں یہ تھا شور کہ دنیا ہے نجس جا

سمجھے تھے کہ شبیر کا سر ہاتھ لگے گا
جانیں تو چلیں اب کسے زر ہاتھ لگے گا

اے سیفِ زبان تازہ لڑائی مجھے دکھلا
اے تیغِ علی قلعہ کشائی مجھے دکھلا

شمشیرِ طلاقت کی صفائی مجھے دکھلا
اے ذہنِ رسا اپنی صفائی مجھے دکھلا

پشتی کو ہے موجود وہ صفدر جو علی ہے
پھر کھینچ وہ تلوار جو سربار چلی ہے

یا شیرِ خدا سیفِ دو دم دیجیے مجکو
یا شاہِ نجف طبل و علم دیجیے مجکو

سر بر نہ ہو لشکر وہ حشم دیجیے مجکو
میداں جو نچھوڑے وہ قلم دیجیے مجکو

نیزے سپہِ شام کے ہٹتے نظر آئیں
سب فوج کے چہرے ابھی کٹتے نظر آئیں

کوثر کا بھرا جام پلا دیجیے مولا
بالائے ولا اور ولا دیجیے مولا

ہر غنچۂ خاطر کو کھلا دیجیے مولا
شمشیرِ فصاحت کو جلا دیجیے مولا

میں وہ نہیں یا خلق میں اوصاف نہیں ہے
مدّت سے جو ہوں چپ تو زباں صاف نہیں ہے

گو پیر ہوں پر زورِ جوانی ہے ابھی تک
سوکھے ہوئے دریا میں روانی ہے ابھی تک

دندان نہیں پر تیز زبانی ہے ابھی تک
قبضے میں وہ تیغِ صفہانی ہے ابھی تک

جوہر ہے وہی باڑھ وہی گھاٹ وہی ہے
کہنہ تو ہے شمشیر مگر کاٹ وہی ہے

تصویرِ پریشانیِ کفار دکھا دوں
غیظ و غضبِ حیدرِ کرار دکھا دوں

جعفر کو ابھی جنگ پہ تیار دکھا دوں
ہر بند پہ چلتی ہوئی تلوار دکھا دوں

رخ سب قدر اندازوں کے پھرتے نظر آئیں
سرداروں کے سر خاک پہ گرتے نظر آئیں

نیزے شہزادوں کے چلتے ہیں خبردار
لو بانیوں سے ناگ نکلتے ہیں خبردار

رنگ افعی خونخوار بدلتے ہیں خبردار
لو مارِ سیہ زہر اگلتے ہیں خبردار

جل جاتا ہے وہ آنچ ذرا لگتی ہے جس کو
پڑ جاتے ہیں نیل اُن کی ہوا لگتی ہے جن کو

دو ناگ ہیں پُر زہر کہ لہراتے ہیں سر پر
گہہ پاؤں پہ آتے ہیں کبھی جاتے ہیں سر پر

نکلے جو زمیں سے تو جگہ پاتے ہیں سر پر
چاٹا ہے لہو گرم ہوا کھاتے ہیں سر پر

کچھ پڑھ کے بھی پھونکے گا جو ماری تو جلے گا
اعجاز ہے ان پر کوئی افسوں نہ چلے گا

نے مثل و عدیل ایک تو یکتائے زماں ایک
اُن باغیوں پہ بادِ سموم ایک خزاں ایک

اِک آتشِ جاں سوز ہے اور آبِ رواں ایک
گھاٹ ایک برش ایک چمک ایک زباں ایک

میان اس کا الگ ہے تو غلاف اس کا جدا ہے
اک جان وہ و قالب اُسے کہیے تو بجا ہے

نصرت کا وہ یہ فتح کے گنجینہ کا مشتاق
ایمان کا وہ دین کے آئینہ کا مشتاق

وہ سر کا یہ چار آئینہ میں سینہ کا مشتاق
جوینده وہ دم کا یہ لہو پینے کا مشتاق

وہ تیر کے دل سے نکل آیا یہ جگر سے
جوشن سے اُسے لاگ اسے بُیر سپر سے

وہ نیمچے خالی نہ کبھی جا کے پھر آئے
اعدا کا لہو خاک پہ برسا کے پھر آئے

گہہ سن سے گئے اور کبھی لہرا کے پھر آئے
دم لیکے لہو پیکے صفیں کھا کے پھر آئے

مخدوش جو راہیں تھیں وہ شفاف ہوئی ہیں
کیا ہاتھ منجھے ہیں کہ صفیں صاف ہوئی ہیں

وہ ہاتھ وہ اُن چھوٹی سی تلواروں کا پرتو
چلنے میں جو بجلی تو ٹھہرنے میں مہ نو

سرپٹ میں وہ یک رنگی اسپان سبکرو
دو ہاتھ جدھر چل گئے سر اڑ گئے سو سو

چلتی تھی غضب تیز ہوا دشت بلا میں
کیا چیز تھی پتے تمر اڑتے تھے ہوا میں

تیروں کو جو چلوں میں کماندار نے جوڑا
تیر آئے تو بدکیشوں نے منہ سہم کے موڑا

دونوں نے بزرگوں کے طریقے کو نہ چھوڑا
صف ایک نے الٹی تو پرا ایک نے توڑا

تلواروں کی گھاٹوں میں شنا ور رہے دونو
موجیں بھی جو آئیں تو برابر رہے دونو

گر برق کہوں برق میں یہ تاب کہاں ہی
پانی میں روانی ہی پہ یہ آب کہاں ہی

آئینہ میں جوہر ہی پہ یہ داب کہاں ہی
آتش ہی تو آتش میں بھلا آب کہاں ہی

خم ہی پہ دم ایسا تو مہ نو میں نہیں ہی
ایسی تو چمک مہر کی پرتو میں نہیں ہی

ٹوٹی ہوئی صف عہد شکن دیکھ کے بھاگے
حیدر کی لڑائی کا چلن دیکھ کے بھاگے

نامرد فراق سر و تن دیکھ کے بھاگے
بپھرے ہوئے شیروں کو ہرن دیکھ کے بھاگے

دریا پہ بھی ڈر سے کوئی پہرا نہیں جاتا
بھاگڑ میں یہ ہی شور کہ ٹھہرا نہیں جاتا

بڑھکر سپر اس بھائی نے کاٹی تو سر اس نے
زخمی کیا دشمن کا دل اس نے جگر اس نے

صدر اس نے کیا چاک تو کاٹی کمر اس نے
دکھلائے علی کے چلن اس نے ہنر اس نے

مطلب تھا کہ نہ عمر کو نہ زید کو چھوڑیں
دو شیر جب ایسے ہوں تو کب صید کو چھوڑیں

کیا دخل جو قابو میں سوار آ کے نکل جائے
کیا تاب جو گھوڑا کوئی چمکا کے نکل جائے

جز کنجِ لحد اور کہیں امن نہیں تھا
یہ شوکتِ اسپانِ سبکرو نہیں دیکھی
گردوں پہ یہ تنزیرِ مہ نو نہیں دیکھی
کالا تھا جو دن دھوپ بھی سیماب میں تھی
تھا شور کہ دریا یہ روانی نہیں رکھتا
خنجر کوئی یہ تیز زبانی نہیں رکھتا
جد ان کا اٹھاتا تھا پیمبر کے علم کو
بہتے ہوئے دریا کی روانی ہے انھیں میں
بجلی کی طرح شعلہ فشانی ہے انھیں میں
موجوں کا طلاطم ہے کہ ذوجیں لبِ جو کی
بہتے ہوئے دریا کا بھی کیا زور گھٹا ہے
مقتل میں برستا ہے لہو زور گھٹا ہے
ڈوبی ہوئی ہے خوں میں پڑی فوج عدو کے
سینوں کو سناں سے ملا دیتے ہیں دونوں
آئینۂ نصرت کو جلا دیتے ہیں دونوں
یوں مرتے ہیں کرتے ہیں برائی جو بھلوں سے
نے دست تھا نیزوں کو ادھر جس نے اٹھایا
ضرب اس پہ چلی فوج میں سر جس نے اٹھایا
کیسے قدر انداز خطا کار کہاں کے
ترکش تھا نہ چلّہ تھا نہ گوشے تھے کماں کے

کیا جان جو بھالڑ میں جگہ پا کے نکل جائے
کیا منہ ہے جو تلوار کوئی کھا کے نکل جائے

پٹکا جسے ریتی پہ وہ پیوند زمیں تھا
یہ جست یہ سرعت یہ تگ و دو نہیں دیکھی
چلتی ہوئی تلواروں میں یہ ضو نہیں دیکھی
لشکر کی سیاہی شب مہتاب ہوئی تھی
یہ کاٹ کسی تیغ کا پانی نہیں رکھتا
ایک ایک وہ یکتا ہے کہ ثانی نہیں رکھتا
یہ چھین کے لے جائینگے لشکر کے علم کو
یاں کند ہیں سب تیز زبانی ہے انھیں میں
جو آگ کو بھڑکائے وہ پانی ہے انھیں میں
ٹاپو ہے وہ لاشوں کا یہ ندی ہے لہو کی
ڈھالوں کی سیاہی ہے کہ گھنگور گھٹا ہے
تلواریں برستی ہیں سلح شور گھٹا ہے
بوچھار سروں کی ہے ڈریری میں لہو کے
ہر ضرب میں گیتی کو ہلا دیتے ہیں دونوں
پانی انھیں تیغوں کا پلا دیتے ہیں دونوں
تھا زہر ہلاہل کہ اترتا تھا گلوں سے
جان اس کی گئی زخم جگر جس نے اٹھایا
پہونچے سے اڑا ہاتھ تبر جس نے اٹھایا

چھوٹا تھا بڑے بھائی سے خونریز زیادہ
کچھ ہاتھ بھی کچھ نیچہ بھی تیز زیادہ

سرخیز زیادہ شر انگیز زیادہ
اُس گھوڑے سے گھوڑا بھی سبک خیز زیادہ

حیدر کی شجاعت بھی جلالت بھی غضب بھی
غصّہ بھی تہور بھی برادر کا ادب بھی

بڑھ آئے کلیں سے جو کماندار سمٹ کر
پہونچے وہیں شہزادوں کے ہوا ہو سمٹ کر

تھرّاتے تھے ڈر سے جو خطا کار سمٹ کر
چلّے بھی اُتر جاتے تھے ہر بار سمٹ کر

سرکٹ گئے اب شکل کہاں امن و اماں کی
نیزوں کے نہ وہ نخل نہ شاخیں تھیں کماں کی

سر ایک سے لڑنے میں دو چند ایک نے کاٹے
تیر ایک نے اور نیزوں کے بند ایک نے کاٹے

سب حلقہ گیر آئے کمند ایک نے کاٹے
قلموں کی طرح پائے سمند ایک نے کاٹے

جانباز یاں دیکھیں کہ جگرداری کو دیکھیں
جعفر ہوں تو ان ہاتھوں کی یاری کو دیکھیں

باندھا کسی برچھیت نے نیزے کا اگر بند
وا کر دیا بس ناخن تدبیر سے ہر بند

نعرہ تھا کہ ہم عقدہ کشا کے ہیں جگر بند
کھولیں اُسے خیبر سا اگر ہو کوئی در بند

بھولے ہو تم اس پر کہ تنومند نہیں ہیں
یہ ہاتھ کسی معرکہ میں بند نہیں ہیں

تلواروں میں ہر دم سپر کاہ کی تھا ایک
اک ہوتا تھا نے تاب جو ہوتا تھا جدا ایک

رہواروں میں تھا ایک سے چالاک سوا ایک
چلنے میں ہوا ایک تو اُڑنے میں ہوا ایک

دیکھا انھیں جس نے تو ہوئے ہوش گم اُس کے
نعل اس کے نہ لگتے تھے زمیں پر نہ سُم اُس کے

غل تھا کہ نہ دیکھی تھی وغا آج تک ایسی
آفت کسی لشکر پہ نہ ڈالے فلک ایسی

دوزخ کے بھی شعلوں میں نہ ہوگی لپک ایسی
زائل ہوئی جاتی ہے بصارت چمک ایسی

آفت تھی قیامت تھی اُسے یاد سے رکیں
دو بجلیاں گرتی ہیں برابر کسے روکیں

وہ غل عربی باجوں کا تیغوں کی وہ جھنکار
قرنا کی صدا وہ کہ ہلے گنبد دوار

کالی وہ گھٹا شام کے لشکر کی دھواں دھار
بڑھ بڑھ کے یہ کرکیٹ صدا دیتے تھے ہر بار

ہاں آج نمود سپہ شام کا دن ہے
اے لشکر یو نام کرو نام کا دن ہے

اے فوجِ ظفر موج کے جرار جوانو
دو شیر کے بچے ہیں یہ ہشیار جوانو

یہ وقت کے ہیں جعفرِ طیار جوانو
لشکر کے نشانوں سے خبردار جوانو

پونہچے بھی یہ کاٹیں گے مڑوڑیں گے علم کو
پنجہ جو بڑھایا تو نہ چھوڑیں گے علم کو

جس غول پہ جس صف پہ چلے نیمچے ان کے
نے جان ہوئے وہ دار چلے دونوں پہ جنکے

کشتہ کیا گنتی کی سواروں کو جو گن کے
تھرانے لگے دانتوں میں سب دابکے تنکے

فوجیں وہ کہاں اور کہاں تشنہ دہاں وہ
دو لاکھ کے لشکر میں یہ غل تھا کہ اماں دو

یہ کہتے تھے لشکر کا نشاں دو تو اماں دیں
دنیا کی محبت پہ نہ جان دو تو اماں دیں

ہاں صلح کی حضرت کو زباں دو تو اماں دیں
اصغر کو جو یہ آبِ رواں دو تو اماں دیں

خونِ پسرِ سعد بہا دو تو رکیں ہم
ہاں شمر کا سر کاٹ کے لا دو تو رکیں ہم

بتلا دو ہمیں خوئی خونخوار کدھر ہے
شیث ابن ربعی سا جفاکار کدھر ہے

ارزق جسے کہتے ہیں وہ مکار کدھر ہے
کیوں حرملۂ سرکش و غدار کدھر ہے

ہم نیمچہ چمکا کے بڑھاتے ہیں فرس کو
یاں بھیجو میدان میں سنان ابن انس کو

تھراتے ہیں سن سن کے یہ نعرے وہ جفا جو
ڈھالوں میں چھپا تھا پسرِ سعدِ سیہ رو

کہتا تھا کہ ان بچوں میں ہے شیر کی خو بو
ٹکڑے مرے کر دیں گے اگر پائیں گے قابو

آفت میں مدد گار ہو رنجوں سے بچاؤ
یارو مجھے ان شیر دلوں کے پنجوں سے بچاؤ

یہ سنتے ہی سب شام کا بادل اُمنڈ آیا
اک دل کا ہٹانا تھا کہ اک دل اُمنڈ آیا

اک ظلم کا دریا سوئے مقتل اُمنڈ آیا
تیروں کا بیستاں تھا کہ جنگل اُمنڈ آیا

پاس آکے لڑا ایک نہ اُس فوجِ عدو میں
نہلا دیا بوچھار نے تیروں کی لہو میں

زخمی ہوئے جب شیر تو لشکر میں در آئے
آفت ہوئی برپا غضب آیا جدھر آئے

وہ نیمچے جب سن سے کسی غول پر آئے
ہاتھ اُٹھ کے گئے واں تو اُدھر کٹ کے سر آئے

دونوں کے فرس ابر کہیں برق کہیں تھے
دستانے کہیں خود کہیں فرق کہیں تھے

شیروں نے دل اُس فوجِ بدائیں کے توڑے
گویا کہ پرے خیبر و صفّین کے توڑے

ہاتھ آیا تو باز و کسی نے دین کے توڑے
جھنجلائے تو لشکر کے نشان چھین کے توڑے

چھینٹیں بھی اُدھر خون کی نہروں کی اُڑیں
کیا دھجیاں علموں کے پھریروں کی اُڑیں

بیٹھیں تھیں پسِ پردہ اِدھر زینبِ ناچار
چہرہ تھا کبھی زرد کبھی سرخ تھے رخسار

نے تابی میں غصّہ سے یہ فرماتی تھیں ہر بار
تو دیکھ تو پہونچے ہیں کہاں تک مرے دلدار

کھائے ہیں ابھی زخم نہ گھوڑوں سے گرے ہیں
معلوم یہ ہوتا ہے کہ فوجوں میں گھسے ہیں

نکلی جو عصا تھام کے وہ خیمے کے باہر
خم تھی کمر اور مُنہ عرقِ شرم سے تھا تر

چلنے میں قدم کانپتے تھے ضعف سے تھر تھر
ہلتا تھا ضعیفی کے سبب سے سرِ انور

کیوں کر یہ نہو خادمۂ آلِ عبا تھی
برقع نہ عصا بہ نہ قبا بہ نہ ردا تھی

شہزادوں کی سب معرکہ آرائی بھی دیکھی
جرات بھی جلالت بھی توانائی بھی دیکھی

دانائی بھی غربت بھی شکیبائی بھی دیکھی
جانبازی بھی مظلومی بھی تنہائی بھی دیکھی

شیروں کو لہو میں بھی نہاتے ہوئے دیکھا
آگے جو بڑھیں تیر بھی کھاتے ہوئے دیکھا

روتی ہوئی خیمے میں جو آئی وہ دل افگار
زینب نے کہا قتل ہوئے کیا مرے دلدار

کی عرض نہیں تو ابھی لڑتے ہیں وہ جرّار
آفت ہے بپا بھاگتے پھرتے ہیں جفا کار

وہ کونسا یکتا ہے جو چور نگ نہیں ہے
سب کہتے ہیں طوفان ہے یہ جنگ نہیں ہے

نے سُر سے کرتے ہیں جسے پاتے ہیں وہ دونوں
سب ہٹتے ہیں جب تیغ چمکاتے ہیں دونوں

ڈھالوں کی گھٹا میں کبھی گھر جاتے ہیں دونوں
لڑ بھڑ کے کبھی صاف نکل آتے ہیں دونوں

کس چشم کی پتلی میں وہ کاوا نہیں پھرتا
یوں پھرتے ہیں گھوڑے کہ چھلاوا نہیں پھرتا

لاکھوں تو بلائیں ہیں وہ بچے کسے ٹالیں
تلواریں اِدھر ہیں تو اُدھر نیزوں کی بھالیں

زرہوں پہ نہ چار آئینہ نہ ہاتھوں میں ڈھالیں
مہلت نہیں جو سینوں سے تیروں کو نکالیں

تلواروں میں بھائی کی سپر ہوتا ہے بھائی
بہتا ہے جو بھائی کا لہو روتا ہے بھائی

قایم رہے ان بھائیوں کی خلق میں جوڑی
ہل چل تھی اُدھر باگ عدو خرش کی موڑی

اُلٹا جو پڑا اس نے تو صف اُس نے بھی توڑی
چھوٹے نے کوئی بات علی کی نہیں چھوڑی

تیور وہی آواز وہی آن وہی تھی
نعرے وہی تو قیر وہی شان وہی تھی

ساونت ہیں اُن اپنے خوزادوں کی میں واری
حملوں میں ہے شوکت اسداللہ کی ساری

تلواریں بھی اُن نیچوں سے ہو گئیں آری
خود غیرتِ گلشن تو فرس باد بہاری

بچے کہیں اس شان سے توسن پہ چڑھے ہیں
میں نے تو یہ جانا کہ علی رن پہ چڑھے ہیں

چھایا ہوا تھا چار طرف شام کا بادل
میں تھی وہیں لڑنے کے لیے آئے جو دو ویل

تلواریں علم ہاتوں میں تھیں بزوں پر بل
نعروں سے فلک گونج اُٹھا ہل گیا جنگل

ایک ایک کی آنکھیں تھیں کہ دو ساغرِ خوں تھے
کچھ مرحب و انتر سے بھی دل بڑھیں فزوں تھے

تینیں وہ کہ منہ لوہے کی ڈھالوں سے نہ موڑیں
نیزے وہ قیامت کہ دلِ کوہ کو توڑیں

ہم پنجہ ہو رستم تو کلائی کو مروڑیں
حملہ کریں جس پر نہ سلامت اُسے چھوڑیں

ہر دم تھا اشارہ پسرِ سعد لعیں سے
اِک نیزے میں دونوں کو اُٹھا لیتے ہیں زیں سے

تلوار اُٹھا کر جو چلے عونِ دلاور
چھوٹے نے کی عرض بڑے بھائی سے بڑھ کر

لِلّٰہ نہ فرمایئے تکلیف برادر
آئے ہیں تو جاتے ہیں کہاں اب یہ ستمگر

لڑلیں اگر ان دونوں کو لڑنے کی ہوس ہے
بھیا یہ غلام آپ کا ان کے لیے بس ہے

بی بی وہ جلالت مجھے بھولے گی نہ وہ شان
اے شیر کے بچے تری ہمت کے میں قربان

بھائی نے جو خاطر سے کہا خیر مرے جان
گھوڑے کا اُٹھانا تھا کہ بس لے لیا میدان

دکھلا دیئے انداز و غا سے اب وجد کے
غل تھا کہ غزال آ گئے پنجے میں اسد کے

اِک ضرب میں ہاتھ اس کے اُڑا تو سر اُس کا
اِس نخل کی شاخیں تھیں ثمر دار ثمر اُس کا

ٹکڑے تھا دل اُس کا تو لہو تھا جگر اُس کا
دم سینے سے نکلا اِدھر اُس کا اُدھر اُس کا

دم بھر میں نہ غرہ تھا نہ شورش رہی سر میں
ساتھ آئی تھی اور ساتھ گئی قعرِ سقر میں

سن کر یہ بیان شاد ہوئیں زینب خوش خو
پھر جوش محبت سے رہا دل پہ نہ قابو

ہر بی بی سے ارشاد کیا پونچھ کے آنسو
میدان سے سر کے نہیں ابتک مرے گلرو

لاکھوں سے لڑے تشنہ دہن کام کیا ہے
سنتی ہوں کہ چھوٹے نے بڑا نام کیا ہے

سب بی بیاں بولیں کہ یہ ہے آپ کا اقبال
اُن دونوں کا سوچو تو ابھی کیا ہے سن و سال

پرواہ رہی تو قیر نہ ہے حشمت و جلال
فرمایا کہ ہاں صاحب غیرت ہیں مرے لال

بھائی کے سوا مجکو نہیں فکر کسی کی
عزت سے وہ مرجائیں میں طالب ہوں اسی کی

یہ ذکر ابھی تھا کہ صدا رونے کی آئی
دروازے سے اکبر نے یہ آواز سنائی

لوٹی گئی ہے ہے پھوپی اماں کی کمائی
مارے گئے دو ساتھ کے کھیلے ہوئے بھائی

روتے ہوئے عباس بھی ہمراہ گئے ہیں
خود لاشیں اُٹھانے کے لیے شاہ گئے ہیں

یہ سنتے ہی قبلے کی طرف جھک گئیں زینب
سجدے سے اُٹھیں جب تو کہا شکر ہے یارب

طالب تھی میں جس کی وہ بر آیا مرا مطلب
سب مٹ گئے دھڑکے کوئی تشویش نہیں اب

لٹنے سے محمد کی کمائی کو بچالے
سب قتل ہوں پر تو مرے بھائی کو بچالے

کس منہ سے ترا شکر کروں بار خدایا
تو نے مرے دو بچوں کو پروان چڑھایا

گر بیاہ فلک نے نہ دکھایا نہ دکھایا
جو رتبۂ اعلائے شہادت ہے وہ پایا

عالم میں جو دکھ ان کے لیے میں نے بھرے ہیں
تو رحم کر ان پر کہ یہ مظلوم مرے ہیں

فضہ کی صدا آئی کہ اے بیٹھنے والو
سب مل کے اٹھے میرے خزانوں کو سنبھالو

روتی ہیں کہاں بانوئے عالم کو بلا لو
لوٹا گیا گھر خاک عزا بالوں پہ ڈالو

قتل سے حسین ابن علی لائے ہیں لاشے
سیدانیوں ڈیوڑھی پہ چلو آئے ہیں لاشے

در تک گئی ناموس نبی کھولے ہوئے سر
لاشوں کو لیے خیمے میں داخل ہوئے سرور

اک لاش کو لائے تھے علمدار دلاور
لپٹائے تھے چھوٹے کو گلے سے شہ صفدر

جنبان تھی زمیں غل تھا یہ فریاد و بکا کا
ہلتا تھا کلس خیمۂ شاہ شہدا کا

ماتم تھا کہ برباد یہ گھر ہو گیا ہی ہی
زہرا کے نواسوں کا سفر ہو گیا ہی ہی

کس کی نظرِ بد کا گزر ہو گیا ہی ہی
یہ چاند ہر اک خون میں تر ہو گیا ہی ہی

تقدیر میں سر پیٹنا تھا نوحہ گری تھی
خالی ہوئی وہ گود جو بچوں سے بھری تھی

لاشوں کو شہِ دیں صفِ ماتم پہ جو لائے
سب اہلِ حرم پیٹتے روتے ہوئے آئے

زینب نے نہ فریاد کی نہ اشک بہائے
بیٹھی رہیں سر زانوئے اقدس پہ جھکائے

لب خشک تھے منہ زرد مژہ اشکوں سے تر تھی
نہ اپنی نہ بھائی کی نہ لاشوں کی خبر تھی

بانو جو قریب آئی تو بولی یہ وہ مغموم
بی بی مجھے کچھ آنکھوں سے ہوتا نہیں معلوم

کس جا علی اکبر ہیں کدھر ہیں شہِ مظلوم
کس کی خبر آئی ہی کہ ماتم کی ہی یہ دھوم

پردیس میں جینے سے کسے یاس ہوئی ہی
یہ کونسی ماں بیٹیوں سے ایسے آس ہوئی ہی

عرصہ ہوا بچوں کو مرے نیں سدھارے
کیا جانیے سر ماموں پہ وارے کہ نہ وارے

دھڑکا ہی کہ کمسن ہیں بہت وہ مرے پیارے
دریا پہ کہیں جا نہ پڑیں پیاس کے مارے

سر دے کے پھریں دھوم ہو ثابت قدمی کی
میں دودھ نہ بخشوں گی جو لڑنے میں کمی کی

بولے یہ بصد درد علی اکبرِ ذی شان
حاضر ہی یہ محبوب غلام اے پھوپی اماں

شبیر پکارے کہ بہن میں ترے قربان
زندہ تھا سحر تک مگر اب میں ہوا بے جان

فوجوں کو بھگایا ہی ہزاروں سے لڑے ہیں
یہ عون و محمد ہیں جو نے جان پڑے ہیں

ہوش آگیا زینب کو صدا بھائی کی سن کر
کی عرض یہ سب آپ کا صدقہ ہی برادر

خوشنود ہیں آقا تو رضامند ہی مادر
لو بخشدیا دودھ انھیں یا شہِ صفدر

یہ آپ پہ قربان ہوئے راہِ خدا میں
نام ان کے خدا عرش پہ لکھے شہدا میں

حضرت نے کہا رو لو گلے ان کو لگا کر
اب پاس تمھارے نہیں یہ آئیں گے جا کر

پانی نہ پیا نزع میں بھی برچھیاں کھا کر
رخصت ہوئے ماموں کو لبِ خشک دکھا کر

کس سے کہوں جیسے یہ وفادار پسر تھے
دم نکلے تو دونوں کے مُنہ پاؤں پہ سر تھے

بانو نے رکھے زانوئے زینب پہ سر اُن کے
جو بی بیاں تھیں آ گئے منہ کو جگر اُن کے

زینب نے جو کی جھک کے رخوں پر نظر اُن کے
دکھلائی دیئے چاند سے منہ خوں میں تر اُن کے

رخسار بھی مجروح تھے اور ہونٹ بھی کٹے تھے
شانے تھے جدا چاند سے بازو بھی کٹے تھے

منہ چھاتیوں پہ رکھ کے یہ ناشاد پکاری
آرام میں ہو یا ہو غشی پیاس کی طاری

ہوتا ہے بیان شوکت و ہمت کا تمھاری
تسلیم کرو قبلۂ کونین کو واری

سمجھی میں کہ باعث ہے یہ بیداریِ شب کا
پیارے یہ طریقہ نہیں ارباب ادب کا

تعریف امام دوسرا کرتے ہیں اوٹھو
عباسِ علمدار ثنا کرتے ہیں اوٹھو

ہمشکلِ نبی مدح و ثنا کرتے ہیں اوٹھو
سب لوگ نہ اُٹھنے کا گلا کرتے ہیں اوٹھو

آقا سے مصیبت میں جدا ہو نہیں جاتے
صدقے گئی یوں جنگ کے دن سو نہیں جاتے

تم تو کہیں یوں رات کو غافل نہیں سوتے
پانی نہیں کاہے سے یہاں چہروں کو دھوئے

اب تم نہ ملو گے جو کوئی جان بھی کھوئے
قسمت میں یہ لکھا تھا کہ ماں لاشوں پہ روئے

سردے کے مرے حق سے ادا ہو کے پھرے ہو
سمجھی میں کہ ماموں پہ فدا ہو کے پھرے ہو

اخسنت مرے صف شکنو نیک خصالو
گل پیرہنو تشنہ لبو گیسو دالو

غش آتا ہے پیارو مجھے اُٹھ کے سنبھالو
لو چھوٹی سی باہیں تو گلے میں مرے ڈالو

مظلوم ہو دربار میں عادل کے سدھارو
جاتے ہو تو اماں کے گلے مل کے سدھارو

پیارو تم اکیلے کبھی نکلے نہیں گھر سے
رستے سے نہ واقف نہ صعوباتِ سفر سے

راہیں بھی وہ خالی نہیں جو خوف و خطر سے
جو خاصۂ باری ہیں وہ تھراتے ہیں ڈر سے

اس خوف سے راتوں کو نہ سوتے تھے محمد
جب موت کا ذکر آتا تھا روتے تھے محمد

بھولی نہیں اب تک مجھے نے تابیِ حیدر
دم بھر شبِ ضربت کو نہ تکیہ پہ رکھا سر

دالان سے جاتے تھے کبھی حجرے کے اندر
روتے ہوئے حجرے سے کبھی آتے تھے باہر

اُٹھتی تھی جب آواز بکا آتی تھی مجکو
اعضا کے لرزنے کی صدا آتی تھی مجکو

میں عرض یہ کرتی تھی کہ یا شاہِ خوش انجام
کیا ہے کہ نہ لیٹے نہ کیا آپ نے آرام

فرماتے تھے کس طرح نہ تھرّائے یہ ناکام
سرکار سے آیا ہو جسے موت کا پیغام

وہ کون ہے اعمال کا دھڑکا نہیں جس کو
درپیش ہے وہ راہ کہ دیکھا نہیں جس کو

بیٹی میں ہزاروں سے رہا معرکہ آرا
مرحب کو تہ تیغ کیا عمر کا مارا

تھا بیر علم آگ سے دوزخ کا کنارا
کو دا میں تو لشکر تہ و بالا ہوا سارا

کلمہ تھا مرے ڈر سے زبانوں پہ جنوں کی
ہر ضرب میں بن جاتی تھی جانوں پہ جنوں کی

کس سے کہوں جو آج مجھے خوف ہے طاری
جو ہڈیاں ہیں تن میں کھلی جاتی ہیں ساری

مجرم کے لیے قبر کی منزل بھی ہے بھاری
وہ تنگ مکان رحم کرے خالقِ باری

لب کھل نہیں سکتے ہیں زباں ہل نہیں سکتی
کروٹ بھی بدلنے کو جگہ مل نہیں سکتی

قہار کی جانب سے جو ہیں حکم پہ معمور
نرمی و ترحم نہیں اُن لوگوں کا دستور

بیزار بدی سے عمل خیر سے مسرور
نہ رفق و مدارانہ رعایت اُنھیں منظور

آنکھیں وہ دکھائیں گے جو خاتوں رہو گا
واقف نہیں کیا پوچھیں گے اور کیا میں کہوں گا

ہی ہی وہی رستہ تھیں درپیش ہی پیارو
تم مرد ہو جرّار ہو ہمّت کو نہ ہارو

اب آنکھوں سے چھپ جاؤ گے ہی عرض کے تارو
بچّو مجھے منزل کا پتا دے کے سدھارو

دیرانی میں یا گلشن ہستی میں رہو گے
تم آج کی شب کونسی بستی میں رہو گے

تجویز ہے قبروں کی کہاں میں نہیں آگاہ
غربت میں مروگے یہ نہ تھی مجکو خبر آہ

یہ دہر ہے بے مہر یہ دنیا ہے گزرگاہ
جاتا ہے تہی دست گدا ہو کہ شہنشاہ

ماموں کی نہ تقصیر نہ کچھ اس میں ہے ماں کی
قبریں بھی ملیں گی وہیں ہے خاک جہاں کی

یہ پھول سے تن اور وہ سر تیز سنانیں
وہ تیر قیامت کے غضب کی وہ کمانیں

گل برگ سے ہونٹوں پہ ہیں خشکیدہ زبانیں
نکلیں کہو کیونکر تن مجروح سے جانیں

رخ زرد ہیں اور خاک سے گیسو بھی اٹے ہیں
مرتے سوئے تڑپے ہو کہ سب زخم پھٹے ہیں

کیا تھی خبر اس کی کہ جدا ہوؤ گے ۔ بچو
میں روؤں گی اور تم نہ مجھے روؤ گے بچو

پردیس میں دنیا سے مجھے کھوؤ گے بچو
تڑپوں گی میں اور قبر میں تم سوؤ گے بچو

بیداری میں گزرینگے کہ سونے میں کٹیں گے
اب زیست کے دن مجھ کو رونے میں کٹیں گے

اب جینے سے اماں کا بھی دل سیر ہی پیارو
جیتی ہوں پہ قسمت کا مرے پھیر ہی پیارو

تم مر گئے دنیا مجھے اندھیر ہی پیارو
کیا جانیں مری موت میں کیا دیر ہی پیارو

ہی کونسی دولت جسے کھونے کو رہی ہوں
معلوم نہیں اب کسے رونے کو رہی ہوں

اب دھیان مرا شام و سحر کون رکھے گا
الفت کی محبت کی نظر کون رکھے گا

پردیس میں اب ماں کی خبر کون رکھے گا
جھک جھک کے مرے پاؤں پہ سر کون رکھے گا

سب ہونگے مگر گود کے پالے نہ ملیں گے
اب تم سے مجھے چاہنے والے نہ ملیں گے

ہر سال بہار آئے گی کھل جائینگے سب گل
سرسبز جوانانِ چمن ہونگے بالکل

سبزہ کہیں ہوگا کہیں نسرین کہیں سنبل
وہ سرد ہوا میں وہ خوش الحانیِ بلبل

دنیا کے نہ بستانِ فرحناک میں ہوگے
گل باغ میں تم زیرِ زمیں خاک میں ہوگے

حضرت کو لڑائی کے پیام آتے ہیں اٹھو
خیمے کی طرف ساکنِ شام آتے ہیں اٹھو

لو تیرِ ستم سوئے امام آتے ہیں اٹھو
جرار بڑے وقت میں کام آتے ہیں اٹھو

جلدی سے قباؤں کو پہنتے ہوئے نکلو
شمشیر و سپر تھام کے تنتے ہوئے نکلو

تاریکیِ میں واری تمھیں نیند آئے گی کیونکر
شب ہوگی تو بچوں کو یہ ماں پائے گی کیونکر

ماں دل بیتاب کو سمجھائے گی کیوں کر
واں تک مرے رونے کی صدا جائے گی کیونکر

نکلوں جو تجسس کو تو بیجا نہیں واری
ماں ہوں مرا پتھر کا کلیجا نہیں واری

تم دونوں نے جاں اپنے بھائی پہ واری
شرمندۂ احسان ہی یہ کھ درد کی ماری

کس منہ سے شہیدو میں کروں شکر گزاری
ماں پہلے تھی پر آج سے لونڈی ہوں تمھاری

بہتر ہوا۔ گر مجھ پہ چھری چل گئی پیارو
کچھ تو مرے بھائی کی بلا ٹل گئی پیارو

اِس دائی نے کی تھی گلہ آمیز جو تقریر
اُس وقت نہ تھی ہوش میں یہ بیکس و دلگیر

منظور یہ تھا پہلے ہو تم فد یہ شبیر
شرمندہ ہوں محجوب ہوں بخشو مری تقصیر

روتے تھے کہ اماں میں خفا ہونے کی خو ہی
گھر کا تھا کلیجہ مرا اس غم سے لہو ہی

چلتے ہوئے منظور تلافی تھی میں قربان
رونے میں کچھ اس کا نہ رہا تجکو ذرا دھیان

لو صدقے گئی جوڑتی ہوں ہاتھ میں اس آن
نانی سے شکایت مری کیجو نہ مری جان

سمجھی تھی کہ فوجِ شہ والا میں رہو گے
کیا جانتی تھی آج نہ دنیا میں رہو گے

جنگل میں قیام آج کہاں ہوگا بتاؤ
ماں صدقے مقام آج کہاں ہوگا بتاؤ

دن تمکو تمام آج کہاں ہو گا بتاؤ
بستر سرِ شام آج کہاں ہو گا بتاؤ

ہموار زمیں شب کے بچھونے کو ملے گی
کیسی ہے زمیں جو تمھیں سونے کو ملے گی

ہمراہ نہ تکیے ہیں نہ راحت کا بچھونا
دو بھائی ہو تم ایک جگہ رات کو سونا

معلوم ہے چھوٹے کا مجھے چونک کے رونا
صدقے گئی غافل مرے بچے سے نہ ہونا

نے ماں کے سحر رونے میں ہو جاتی ہے اس کو
پہلو مرا ملتا ہے تو نیند آتی ہے اس کو

ٹکڑے تھے کلیجے یہ بیان درد کا سن کر
اک حشر تھا سیدانیاں سب پیٹتی تھیں سر

بانو نے کہا قبلۂ کونین سے اُٹھ کر
مرجائے گی ماں لاشوں کو لے جائے باہر

فرزند کا غم خالقِ عالم نہ دکھائے
اللہ کسی ماں کو یہ ماتم نہ دکھائے

اکبر سے کہا تم پھوپی اماں کو سنبھالو
عباس کدھر ہیں انھیں باہر سے بلالو

شہزادی کو غش آیا ہے اے پیٹنے والو
ہے ہے نہ کرو خاک عزا سر پہ نہ ڈالو

پردہ ہو کہ لاشے نہ اٹھاتے ہوئے دیکھے
ماں خیمہ سے بچوں کو نہ جاتے ہوئے دیکھے

کیا لاشوں کے جانے کا کہوں حال میں آہ
در تک گئے سب پیٹتے روتے حرمِ شاہ

اللہ ہی زینب کی مصیبت سے ہے آگاہ
گذرے کسی مادر پہ نہ یہ صدمۂ جانکاہ

بالائے زمیں عرش کے تاروں کو نہ دیکھا
غش سے جو کھلی آنکھ تو پیاروں کو نہ دیکھا

مرثیہ ۸

جب زلف کو کھولے ہوئے کیلاشب آئی
پردیس میں سادات پہ آفت عجب آئی

فریادِ کناں روح امیر عرب آئی
غل تھا کہ شبِ قتل شہِ تشنہ لب آئی

سادات کو کیا کیا غمِ جانکاہ دکھائے
رات ایسی مصیبت کی نہ اللہ دکھائے

کاغذ پہ لکھے کیا قلم اس شب کی سیاہی
ہی چار طرف جس کی سیاہی سے تباہی

مرغانِ ہوا بر میں طپاں بحر میں ماہی
تربت سے نکل آئے تھے محبوبِ الٰہی

فریاد کا تھا شور رسولانِ سلف میں
یثرب میں تزلزل تھا اداسی تھی نجف میں

صدمے سے ہوا رنگِ رخِ ماہ جو کافور
اختر بھی بنے مردمکِ دیدۂ نے نور

غم چھا گیا راحت دلِ عالم سے ہوئی دور
تصویرِ الم بن گئی جنت میں ہر اک حور

کہتے تھے ملک رات نہ ہوگی اب ایسی
تاروں نے بھی دیکھی تھی نہ تاریک شب ایسی

شمعِ طربِ محفلِ عالم تھی جو خاموش
تھی رات بھی شبیر کے ماتم میں سیہ پوش

کیا غم تھا کہ شادی تھی ہر اک لب کو فراموش
ہر چشم کو تھا غم میں سمندر کی طرح جوش

مضطر تھے علی اشکوں سے منہ دھوتی تھی زہرا
مقتل تھا جہاں شاہ کا دل روتی تھی زہرا

تھا خانۂ غم خیمۂ شاہنشہِ والا
آندھی یہ پریشاں تھی کہ دل تھا تہ و بالا

مشعل نہ ٹھہرتی تھی نہ شمعوں کا اجالا
خیمہ بھی اندھیرے میں نظر آتا تھا کالا

خاک اڑتی تھی منہ پر حرمِ شیرِ خدا کے
تھا چین جبیں فرش بھی جھولوں سے ہلا کے

جنگل کی ہوا اور درندوں کی صدائیں
تھراتی تھیں بچوں کو چھپائے ہوئے مائیں

دھڑکا تھا کہ دہشت سے نہ جانیں کہیں جائیں
روتی تھی کوئی اور کوئی پڑھتی تھی دعائیں

گودوں میں بھی راحت نہ ذرا پاتے تھے بچے
جب بولتے تھے شیر تو ڈر جاتے تھے بچے

بچوں کے بلکنے پہ حرم کرتے تھے زاری
غش ہو گئی تھی بالی سکینہ کئی باری

چلاتی تھی رو رو کے وہ شبیر کی پیاری
یا حضرت عباس چلی جان ہماری

افسوس کہ پانی کا تو قطرہ نہیں گھر میں
اور آگ لگی ہے مرے ننھے سے جگر میں

تھی سب سے سوا بنت علی مضطر و بیتاب
فق ہو گیا تھا شام سے منہ صورت مہتاب

مژگاں سے رخ پاک پہ تھی بارش خونناب
تلوار کلیجے پہ چلے جب تو کہاں تاب

اک کرب تھا بسمل کی طرح جان حزیں پر
اٹھتی تھی کبھی اور کبھی گرتی تھی زمیں پر

کہتی تھی کبھی آج پیمبر نہیں ہے ہے
حال اپنا دکھاؤں کسے حیدر نہیں ہے ہے

بیٹی پہ فلک ٹوٹا ہے مادر نہیں ہے ہے
شبیر مصیبت میں ہے شبر نہیں ہے ہے

دیکھا نہ سنا یہ جو ستم آج ہے لوگو
نازوں کا پلا پانی کو محتاج ہے لوگو

در پیش ہے کل فوج ستمگر سے لڑائی
یاں تھوڑے سے پیاسے ہیں اُدھر ساری خدائی

لے سروئے رن سے نہ پھرے گا مرا بھائی
ہو جائے گی حیدر کے بھرے گھر کی صفائی

اس غم سے سدا اشکوں سے منہ دھوتی تھیں اماں
کل رن میں ہے جس دن کے لیے روتی تھیں اماں

تھے دوسرے خیمے میں اُدھر سبط پیمبر
دربار میں حاضر تھے رفیقان دلاور

اک پہلو میں قاسم تھے اور اک پہلو میں اکبر
اکبر کے ادھر لخت دل زینب مضطر

شبیر محبت سے سخن کرتے تھے سب سے
عباس علی سامنے بیٹھے تھے ادب سے

سرگرم تھے مر جانے پہ سب شاہ کے انصار
عباس سے یہ کہتا تھا وہ کل کا مددگار

تم رہیو ذرا خیمۂ ناموس سے ہشیار
ڈر ہے نہ کرے نے ادبی لشکر کفار

بیدینوں کو راحت مری منظور نہیں ہے
شب خوں جو اُدھر سے ہو تو کچھ دور نہیں ہے

یہ ذکر ابھی تھا کہ یکایک خبر آئی
اے چاند ید اللہ کے شب دو پہر آئی

حضرت کو ستاروں کی جو گردش نظر آئی
دل یاد خدا کرنے لگا چشم بھر آئی

فرمایا بڑا اجر ہے بیداری شب کا
اے تشنہ لبو وقت ہے یہ طاعت رب کا

اب عمر بھی آخر ہی نمازیں بھی ہیں آخر
نے توشہ پہونچتا نہیں منزل پہ مسافر

ہر وقت ہی ربِ دو جہاں حاضر و ناظر
اجر اُن کا مضاعف ہیں جو ہیں صابر و شاکر

مشکل نہ کسی رنج کو سمجھے نہ بلا کو
بندہ وہی بندہ ہی جو بھولے نہ خدا کو

نام اُس کا رہے ورد سفر ہو کہ حضر ہو
موجود سمجھ لے اُسے جنگل ہو کہ گھر ہو

سجدے ہی کرے دکھ میں کہ راحت میں سر ہو
تسبیح میں شب ہو تو نمازوں میں سحر ہو

عشق گل تر ظلم کے خاروں میں نہ بھولے
معشوق کو تلواروں کی دھاروں میں نہ بھولے

چومے لبِ سوفار جو سینے پہ لگیں تیر
دم عشق کا بھرتا رہے زیرِ دمِ شمشیر

زخموں کو یہ سمجھے کہ بلا گلشن توقیر
تکبیر کا نعرہ ہو زباں پر دمِ تکبیر

کٹنے میں رگوں کے نہ صدا آہ کی نکلے
ہر رنگ میں بوالفت اللہ کی نکلے

شہ نے سخن معرفتِ حق جو سنائے
اشک آنکھوں میں ہر عاشقِ صادق کے بھر آئے

کچھ پیاس کا شکوہ بھی زباں پر نہیں لائے
سجدے وہیں لاکے دلیروں نے بچھائے

تکبیریں ہوئیں لشکرِ اللہ و نبیؐ میں
سب محو ہوئے یادِ جنابِ احدی میں

تسبیح کہیں تھی کہیں سجدے کہیں زاری
تھا صوتِ حسن سے کوئی قرآں کا قاری

کرتا تھا کوئی عرض کہ یا حضرتِ باری
اب صبح کو عزت ہی ترے ہاتھ ہماری

حرمت سے شریکِ شہدا کیجیو یارب
تو حوصلۂ صبر عطا کیجیو یارب

ہم ہیں ترے محبوب کے پیارے کے مددگار
مرنے کے لیے آئے ہیں یاں چھوڑ کے گھر بار

یہ بندۂ بیکس ہی مصیبت میں گرفتار
کر رحم کہ ہی ذات تری راحم و غفار

فاقوں کے سبب جسم کی طاقت میں کمی ہی
تجھ سے طلبِ قوتِ ثابت قدمی ہی

بیکس ہیں مسافر ہیں وطن دور ہی گھر دور
ہفتم سے ہمیں گھیرے ہی یہ لشکرِ مقہور

تیروں سے ہوں غربال کہ تیغوں سے بدن چور
احمد کے نواسے سے جدائی نہیں منظور

پھر منہ کسے دکھلائیں جو سردار کو چھوڑیں
کیونکر ترے مقبول کی سرکار کو چھوڑیں

لہ ۱۲ کھلا کے مراد فتح کے ہے

مردوں کے لیے ننگ ہے تلواروں سے ڈرنا
راحت ہو کہ ایذا یہیں جینا ہیں مرنا

تو چاہے تو مشکل نہیں کچھ سر سے گزرنا
اے کل کے مددگار مدد جنگ میں کرنا

فاقوں میں ہزاروں سے وفا ہو تو مزا ہے
کچھ حق نمک ہم سے ادا ہو تو مزا ہے

کرتے تھے مناجات اُدھر یاور و انصار
پڑھتے تھے نمازِ شب اودھر سیدِ ابرار

تھی نیتِ تسبیح بتولِ جگر افگار
آوازِ بکا خیمے سے آنے لگی یک بار

اکبر سے اشارہ کیا مڑ کر کہ یہ کیا ہے
کی عرض پھوپی جان کے رونے کی صدا ہے

یوں تو کئی راتوں سے وہ ہیں مضطر و بیتاب
راحت کی نہ صورت ہے نہ آرام کا اسباب

غش میں جو ذرا بند ہوئے دیدۂ پُرآب
روتی ہوئی چونکی ہیں ابھی دیکھ کے کچھ خواب

نعلین کہیں چادرِ پر نور کہیں ہے
اُس وقت سے بسمل کی طرح چین نہیں ہے

سب بیبیاں ہیں روتی ہیں بچوں کو لیے پاس
اک اک کو اندیشہ ہے اک اک کو ہے وسواس

جو پوچھتا ہے وجہ تو کہتی ہیں بصد یاس
لو گو مجھے شبیر کے بچنے کی نہیں آس

مانگو یہ دعا غیب سے بیکس کی مدد ہو
صدقے کرو مجھ کو کہ بلا بھائی کی رد ہو

اُن کا تو یہ احوال ہے اماں کا یہ عالم
اشکوں کی جھڑی آنکھوں سے تھمتی نہیں اک دم

اصغر کی بھی ہے فکر سکینہ کا بھی ہے غم
شش ماہ کا بچہ بھی ہوا جاتا ہے بیدم

گودی میں اُٹھائیں کسے یا اسکو سنبھالیں
دو روز کے فاقے میں وہ کس کس کو سنبھالیں

رو آتی ہیں عابد کے سرہانے کبھی جا کر
گہوارۂ اصغر پہ کبھی گرتی ہیں آ کر

قرآن کی ہوا دیتی ہیں غش میں اُسے پا کر
بہلاتی ہیں بیٹی کو کبھی اشک بہا کر

وہ کہتی ہے تا صبح یونہیں روؤں گی اماں
بابا ہی جب آوینگے تو میں سوؤنگی اماں

بتلاؤ شہ جن و بشر کیوں نہیں آتے
اب رات بہت کم ہے پدر کیوں نہیں آتے

آزردہ ہیں کچھ مجھ سے ادھر کیوں نہیں آتے
کیا آج وہیں سوئیں گے گھر کیوں نہیں آتے

اب پیاسوں کی فریاد بھی بابا نہیں سنتے
حضرت مرے رونے کی صدا کیا نہیں سنتے

روکر علی اکبر نے جو کی شہ سے یہ تقریر
پڑھتے ہوئے تسبیح گئے حضرت شبیر

دیکھی جو نہ تھی دیر سے وہ چاند سی تصویر
قدموں پہ محبت سے گری دوڑ کے ہمشیر

بیتاب جو پایا بہت اس تشنہ دہن کو
شبیر نے لپٹا لیا چھاتی سے بہن کو

فرمایا بہن تم نے بنایا ہے یہ کیا حال
نہ سر پہ عصابہ ہے نہ چادر ہے نہ رومال

ماتھا ہے بھرا خاک سے بکھرے ہوئے ہیں بال
بیٹو نہیں جیتا ہے ابھی فاطمہؑ کا لال

دم تن سے مرا گھٹ کے نکل جائے گا زینب
رو لیجیو جب رونے کا وقت آئے گا زینب

جیتا ہوں میں اور آہ ابھی سے یہ تلاطم
یہ کرب یہ دکھ درد یہ زاری یہ تظلم

ہوتے ہیں مرے ہوش و حواس آج ہیں گم
خنجر کے تلے دیکھو گی کس طرح مجھے تم

بس صبر کرو جی سے گزر جائینگے بچے
تڑپو گی تم اس طرح تو مر جائینگے بچے

تلوار کسی نے ابھی تولی نہیں مجھ پر
سینہ ابھی تیروں سے مشبک نہیں خواہر

گردن پہ کسی نے ابھی پھیرا نہیں خنجر
مر جائے گا بھائی تمھیں ثابت ہو کیونکر

ہر چند کہ ساعت نہیں ٹلتی ہے قضا کی
بچ جاؤں تو کیا دور ہے قدرت سے خدا کی

زینب نے کہا خوش ہوں میں میری اجل آئے
بھائی تمھیں اللہ اس آفت سے بچائے

خالق مجھے عابد کی یتیمی نہ دکھائے
بھائی کی بلا لیکے بہن خلق سے جائے

وسواس طبیعت کو بہلنے نہیں دیتا
مجبور ہوں دل مجھ کو سنبھلنے نہیں دیتا

آتا ہے سکینہ کی یتیمی کا مجھے دھیان
ہر وقت بھرا گھر نظر آتا ہے ویران

سمجھانے سے کچھ دل جو بہلتا ہے میں قربان
پھر جاتا ہے آنکھوں کے تلے موت کا سامان

بازو مرے کٹنے کو ترستا ہے کوئی
سر پر سے ردا چھینے لیے جاتا ہے کوئی

منہ ڈھانپ کے بستر پہ جو سو جاتی ہوں دم بھر
تو چاک گریباں نظر آتے ہیں پیمبر

اماں کبھی چلاتی ہیں یوں کھولے ہوئے سر
بیٹی نہ بچے گا ترا مظلوم برادر

کیا لیٹی ہے بستر پہ کدھر دھیان ہے زینب
شبیر اسی رات کا مہمان ہے زینب

یہ ذکر ابھی تھا کہ سکینہ نے پکارا
سونا تو گیا آپ کے ہمراہ ہمارا

میں جاگتی ہوں اور جہاں سوتا ہے سارا
گردوں پہ چمکنے نہ لگے صبح کا تارا

نیند آئی ہے بیٹی کو سلا جائیے بابا
بس ہو چکیں باتیں اب ادھر آئیے بابا

حضرت نے کہا میں تری آواز کے قربان
اللہ تم اب تک نہیں سوئی ہو مری جان

غربت میں کہاں راحت و آرام کا سامان
بن باپ کے تم کو تو نہیں چین کسی آن

اچھی نہیں عادت یہ نہ رویا کرو بی بی
پہلو میں کبھی ماں کے بھی سویا کرو بی بی

کیا ہوئے جو ہم گھر میں کسی شب کو نہ آئیں
مجبور ہوں ایسے کہ تمھیں چھوڑ کے جائیں

تم پاؤ نہ ہم کو نہ تمھیں ہم کہیں پائیں
بی بی کہو پھر چھاتی پہ کس طرح سلائیں

جنگل میں بہت قافلے لٹ جاتے ہیں بی بی
برسوں جو رہے ساتھ وہ چھٹ جاتے ہیں بی بی

جب عمر تھی کم ہم بھی چھٹے تھے یونہیں ماں سے
سوتے تھے لپٹ کر یونہیں خاتونِ جناں سے

کوچ اُن کا ہوا سامنے آنکھوں کے جہاں سے
ماتم سے ملیں وہ نہ بکا سے نہ فغاں سے

یہ داغ یہ اندوہ و الم سب کے لیے ہیں
ماں باپ زمانے میں صدا کس کے جیے ہیں

رستہ وہ اجل کا ہے کہ ہوتا ہی نہیں بند
کوچ آج پدر کا ہے تو کل جائے گا فرزند

ہوتا ہے قلق فرقتِ اولاد میں وہ چند
کیا زور ہے بندے کا جو مرضی خداوند

جو آئے ہیں دنیا میں وہ سب کوچ کریں گے
اس زیست کا انجام یہی ہے کہ مریں گے

یہ کہتے تھے حضرت کہ صدا آئی اذاں کی
گلدستۂ اسلام پہ بلبل نے فغاں کی

اک دم میں بہار اور ہوئی باغِ جہاں کی
تلوار چلی گلشنِ انجم پہ خزاں کی

مہتاب ہوا گم فلکِ نیلو فری سے
پھولا گلِ خورشید نسیمِ سحری سے

گرمی کی سحر اور وہ پھولوں کا مہکنا
مرغانِ چمن کا وہ درختوں پہ چہکنا

انجم کا وہ چھپنا کبھی اور گاہ چمکنا
وہ سرد ہوا اور وہ سبزے کا لہکنا

اُس دشت میں روتی تھی جو شبنم شہ دیں پر
تھا موتیوں کا فرش زمرد کی زمیں پر

جلوہ وہ دم صبح کا وہ نور کا عالم
دلچسپ صدا نوبت و شہنا کی وہ باہم

سُرخی وہ شفق کی اُفق چرخ پہ کم کم
وہ گل کے کٹوروں پہ ورافشانی شبنم

خشکی میں بھی سردی سے ترائی کا سماں تھا
پر مالکِ گلزارِ جناں تشنہ وہاں تھا

لشکر میں اِدھر مورچے بندی کی ہوئی دھوم
یاں فرض ادا کرنے لگے عاشقِ قیوم

پیچھے تو جماعت تھی اور آگے شہ مظلوم
صف بستہ ملائک ہیں یہی ہوتا تھا معلوم

سب ساجد و راکع تھے شہنشاہ کے ہمراہ
تاباں تھے بہتّر مہِ نو ماہ کے ہمراہ

خیمہ تھا فلک آپ قمر دوست ستارے
تارے بھی وہ تارو کہ فلک جن پہ اُتارے

خم ہو گیا تھا پیرِ فلک شرم کے مارے
کہتی تھی زمیں اوج ہے طالع کو ہمارے

خورشید نہیں روشنیِ نیّرِ دیں ہے
خود عرش کو دھوکا تھا یہ میں ہوں کہ زمیں ہے

جو صف ہے وہ اک طرح ہے قرآنِ مبیں کی
دیوار ہے قبلہ کی طرف کعبۂ دیں کی

کیا خوب جماعت ہے یہ اربابِ یقیں کی
افلاک کی زینت ہے تو رونق ہے زمیں کی

کس طرح شہنشاہ سے وہ فوج جدا ہو
مشکل ہے کہ دریا سے کہیں موج جدا ہو

اُس دم تھی یہ آواز پسِ پردۂ قدرت
اے قدسیو دیکھو مرے بندوں کی عبادت

نہ پیاس کا شکوہ ہے نہ فاقوں کی شکایت
یہ زہد یہ تقوے یہ اطاعت یہ ریاضت

کونین میں یہ صاحبِ اقبال و شرف ہیں
عالم ہوں کہ ان لوگوں کے دل میری طرف ہیں

کس عجز سے آگے مرے حاضر ہیں یہ بندے
دیکھو مرے محبوب کے ناصر ہیں یہ بندے

مظلوم ہیں بیکس ہیں مسافر ہیں یہ بندے
تھوڑے نہ ہوں کس طرح کہ شاکر ہیں یہ بندے

صادق ہیں ولی سے مرے ان سب کو ولا ہے
ان کا وہ صلہ ہے جو رسولوں کو ملا ہے

پرسش نہ لحد میں نہ حساب ان کے لیے ہے
یہ لائقِ رحمت ہیں ثواب ان کے لیے ہے

موتی سے جو ہے صاف وہ آب ان کے لیے ہے
میں جن کا ہوں ساقی وہ شراب ان کے لیے ہے

اس نخلِ ریاضت کے ثمر ان کو ملیں گے
جو عرش کے نیچے ہیں وہ گھر ان کو ملیں گے

فارغ جو صلوٰۃِ سحری سے ہوئے دیندار
پوشاک پہننے کو اُٹھے سیّدِ ابرار

فرمانے لگے حضرتِ عبّاس علمدار
ہاں غازیو اب تم بھی سجو جنگ کے ہتھیار

قرباں تمھیں ہونا ہی محمدؐ کے پسر پر
کمروں کو کسو گلشنِ جنّت کے سفر پر

آمادۂ شر لشکرِ کفّار ہی کل سے
ہونا ہی تمھیں آج ہم آغوشِ اجل سے

درپیش ہی جنگ و جدل اس فوج کے دل سے
آقا بھی کوئی دم میں نکلتے ہیں محل سے

ہاں صف شکنو وقت ہی نصرت کی دُعا کا
کھُلتا ہی پھریرا علمِ فوجِ خدا کا

ہم لوگ اسی روز کے مشتاق ہیں کب سے
اب ہوگی مُلاقات شہنشاہِ عرب سے

سیدانیاں تم سب کو دُعا دیتی ہیں شب سے
صف باندھ کے آؤ درِ دولت پہ ادب سے

فردوس میں نانا سے حضور آج ملیں گے
کوثر پہ تمھیں خلعتِ نور آج ملیں گے

اِس مژدہ کو سُنتے ہی مسلّح ہوئے غازی
اصطبل سے آنے لگے جرّاروں کے تازی

شیرِ صفِ جنگاہ تھا اک ایک نمازی
نعرے تھے کہ قربانِ شہنشاہِ حجازی

ڈیوڑھی پہ شگفتہ تھا چمن خلدِ بریں کا
خیمے میں تلاطم تھا وداعِ شہِ دیں کا

تھے گردِ حرم بیچ میں وہ عاشقِ حق تھا
مانندِ سحر رنگ ہر اک بی بی کا فق تھا

بانوئے دو عالم کا جگر سینے میں شق تھا
زینب یہ تڑپتی تھی کہ حضرت کو قلق تھا

شبیر کے پہلو سے نہ ہٹتی تھی سکینہ
بڑھتے تھے تو دامن سے لپٹتی تھی سکینہ

شہ کہتے تھے بی بی ہمیں اب جانے دو گھر سے
سینہ مرا شق ہوتا ہی لپٹو نہ پدر سے

وہ کہتی تھی سایہ جو یہ اُٹھ جائے گا سر سے
ہی ہی میں تمھیں ڈھونڈھ کے لاؤں گی کدھر سے

بیٹی کا سوا آپ کے کوئی نہیں بابا
شب بھر میں اسی خوف سے سوئی نہیں بابا

سمجھاتے تھے حضرت کہ میں صدقے مری پیاری
میداں سے ابھی آئیں گے ہم تو کئی باری

وہ کہتی تھی میں آپ کی مظلومی کے واری
ساماں نظر آتا ہی یتیمی کا ہماری

درپیش لڑائی نہیں گر فوجِ شقی سے
کیوں آپ سفارش مری کرتے تھے پھوپی سے

اب آپ کے جانے سے تو ثابت ہی نہ آنا
کیوں کہتے تھے زینب سے چھاتی پہ سُلانا

بانو مرے پیچھے نہ سکینہ کو رُلانا
پانی جو میسّر ہو تو پیاس اس کی بجھانا

بہلائیو جب رو کے مجھے یاد کرے گی
تڑپوں گا لحد میں جو یہ فریاد کرے گی

میں سُنتی تھی عابد سے جو کچھ کی تھی وصیت
اِس گھر کی تباہی کی خبر دیتے تھے حضرت

ہی ہی یہ مری عمر یہ صدمہ یہ مصیبت
لیلو مجھے ہمراہ گوارا نہیں فرقت

ساتھ آپ کے جاؤں گی جس دم رسن و رسن سے
کوئی مری گردن تو نہ باندھے گا رسن سے

نادان کی اِن باتوں پہ گھر روتا تھا سارا
ماتم میں کسی دل کو نہ تھا صبر کا یارا

حضرت کو بھی فرقت تھی نہ بیٹی کی گوارا
ڈیوڑھی تک اُسے گود سے اپنی نہ اُتارا

جس دم وہ چھٹی جیتے ہی جی مر گئے شبیر
کس درد سے روتے ہوئے باہر گئے شبیر

جس دم درِ دولت پہ امیرِ امم آیا
پیٹے یہ حرم گھر میں کہ ہونٹوں پہ دم آیا

تسلیم کو اسلام کا لشکر بہم آیا
کس صولت و اقبال و حشم سے علم آیا

جاتی تھی لچکنے میں ضیا عرش تک اُس کی
خورشید کو پنجے میں لیے تھی چمک اُس کی

آپس میں یہ کہتے تھے رفیقانِ دلاور
دیکھیں یہ ہما سایہ فگن ہوتا ہی کس پر

اکبر کے تو ہی نام پہ سالاری لشکر
عبّاس کو دینگے شہِ دیں منصبِ جعفر

اِک عشق ہی اُس شیر سے سلطانِ اُمم کو
بھائی کو کبھی دیکھتے ہیں گاہ علم کو

زینب کے پسر مشورہ کرتے تھے یہ باہم
کیوں بھائی علم لینے کو ماموں سے کہیں ہم

تائید خدا چاہیے گو عمر میں ہیں کم
عہدہ تو ہمارا ہی یہ آگاہ ہی عالم

واقف ہیں سبھی حیدر جعفر کے شرف سے
حق پوچھو تو حقدار ہیں ہم دونوں طرف سے

دادا بھی علمدار ہی نانا بھی علمدار
ہم اپنے بزرگوں کے ہیں منصب کے طلبگار

کہتا تھا بڑا عرض کا موقع نہیں زنہار
ہیں بادشہِ کون و مکاں مالک و مختار

عہدہ تو بڑا یہ ہی کہ ماموں پہ فدا ہوں
چپکے رہو اماں نہ کہیں کس کے خفا ہوں

مطلب علم سے نہ چشم سے ہمیں کچھ کام
مٹ جائیں نشاں بس یہی عمدہ ہے یہی نام

پیر ہوں نثارِ قدم شاہِ خوش انجام
عزت رہے بھائی یہ دعا ہے سحر و شام

آقا جسے چاہیں علم فوج خدا دیں
مشتاق اجل ہیں ہمیں مرنے کی رضا دیں

روتی تھی جو پردے کے قریں زینب دلگیر
سب اُس نے مفصل یہ سُنی بیٹیوں کی تقریر

غصہ سے یہ کہنے لگی وہ صاحبِ توقیر
دونوں کو اشارے سے بُلا لے کسی تدبیر

کچھ کہنا ہے سن لیں اُسے فرصت انھیں گر ہو
عباسؑ نہ دیکھیں نہ شہ دیں کو خبر ہو

کہتی تھی زینب کہ خود آئے وہ نکو کار
چھوٹے سے یہ فرمانے لگیں زینبِ نا چار

کیا باتیں ابھی بھائی سے تھیں اے مرے دلدار
اس وقت میں ہو کون سے منصب کے طلبگار

سمجھے نہ کہ مادر عقب پردہ کھڑی ہے
گھر لُٹتا ہے میرا تمھیں منصب کی پڑی ہے

اللہ بڑا عزم کیا باندھ کے تلوار
بچو تمھیں ایسا نہ سمجھتی تھی میں زنہار

دیکھو ابھی تم دونوں سے ہو جاؤنگی بیزار
کچھ کہیو نہ ماموں سے خبردار خبردار

کیا دخل تمھیں امر میں سلطانِ اُمم کے
دیکھونگی نہ پھر منہ جو گئے پاس علم کے

کچھ اور ہی تیور ہیں علم نکلا ہے جب سے
تم کون ہو جو آگے بڑھے جاتے ہو سب سے

استادہ ہو جا کر عقب شاہ ادب سے
عہدہ ہے یہ جس کا مجھے معلوم ہے شب سے

اس امر میں خاطر نہ کریں اور کسی کی
میں خوش ہوں بجا لائیں وصیت کو علیؑ کی

دو روز سے بھائی پہ مرے ظلم و ستم ہے
تم فکر علم میں ہو مجھے سخت الم ہے

چھوٹے سے ہیں قد سن بھی تمھارا ابھی کم ہے
کھیل اس کو نہ سمجھو یہ محمدؐ کا علم ہے

ہرگز نہ ابھی کچھ شہِ ذی جاہ سے کہنا
کہنا بھی تو رخصت کے لیے شاہ سے کہنا

مانا کہ پہنچتا ہے تمھیں منصبِ جعفر
آقا کی غلامی سے ہے عہدہ کوئی بڑھ کر

چھوٹا مرا بھائی بھی ہے بیٹوں کے برابر
عاشق کا تو عاشق ہے برادر کا برادر

بگڑوں گی گاہ گر کسی اسلوب کرو گے
عباسؑ سے کیا تم مجھے محجوب کرو گے

زینب نے عتابانہ جو کی اُن سے یہ گفتار
یوں کہنے لگے جوڑ کے ہاتوں کو وہ دلدار

شاہوں سے غلاموں نے بھی کی ہے کبھی تکرار
مالک ہیں جسے چاہیں عُلم دیں شہِ ابرار

رخصت کے لیے تیغ و سپر باندھے ہوئے ہیں
ہم صبح سے مرنے پہ کمر باندھے ہوئے ہیں

زینب نے کہا لیکے بلائیں کہ سدھارو
بس اب مرا دل شاد ہوا ای مرے پیارو

ماں صدقے گئی سر قدمِ شاہ پہ وارو
ہو عید مجھے گر عمر و شمر کو مارو

یہ وقت ہے امدادِ امامِ ازلی کا
دے چھوٹے سے ہاتھوں میں خدا زور علی کا

صدقے گئی سن لو کہ میں کہتی ہوں جتا کر
تم پہلے فدا کیجیو سر شہ کے قدم پر

میدان میں زخمی ہوئے گر قاسمؑ و اکبرؑ
پھر تم مرے فرزند نہ میں دونوں کی مادر

جب دل ہوا ناراض تو فرزند کہاں کے
کس کام کے وہ لال جو کام آئیں نہ ماں کے

اُن میں سے اگر رن کی طرف ایک سدھارا
زہرا کی قسم مُنہ نہ میں دیکھونگی تمھارا

جس وقت سنونگی کہ سر اُن دونوں پہ وارا
اُس وقت تمھیں ہوگا مرا دودھ گوارا

بیجاں ہوئے بعد اُن کے تو ماتم نہ کروں گی
دیکھو جو مروگی بھی تو ناراض مروں گی

ہیں دونوں بھتیجے مرے پیارے مرے محبوب
تم اُن پہ تصدق ہو یہی ہے مجھے مطلوب

جینا نہیں بہتر کسی صورت کسی اسلوب
دے سر دیئے دودھ اپنا میں بخشوا تمھیں خوب

ایذا جو اُٹھاؤ گے تو راحت بھی ملے گی
جب آئینگی لاشیں تو یہ دولت بھی ملے گی

دیکھو کہے دیتی ہوں خبردار خبردار
جیتے جو رہے دودھ نہ بخشوں گی میں زنہار

شیروں کے یہ ہیں کام کھچے جس گھڑی تلوار
رکھ دیویں گلا بڑھ کے تہِ خنجرِ خونخوار

توڑی ہیں صفیں جنگ میں جب کھیت پڑے ہیں
جنات کے لشکر سے علی یونہیں لڑے ہیں

اعدا کو مرے دودھ کی تاثیر دکھاؤ
اجلالِ حسنؑ شوکتِ شبیر دکھاؤ

جعفر کی طرح جوہرِ شمشیر دکھاؤ
تن تن کے یداللہ کی تصویر دکھاؤ

خورشیدِ امامت سے قرابت میں قریں ہو
تم شیر ہو شیروں کے حسینوں کے حسیں ہو

جعفر سے نمودار کے دلبر ہو دلیرو
حیدر سے دلاور کے دِلاور ہو دلیرو

جرّار ہو کرّار ہو صفدر ہو دلیرو
ضرغام ہو ضیغم ہو غضنفر ہو دلیرو

تیروں سے جوانوں کے جگر توڑ کے آؤ
خیبر کی طرح کوفے کا در توڑ کے آؤ

خندق کی لڑائی کی طرح جنگ کو جھیلو
بچّے اسد اللہ کے ہو جان پہ کھیلو

تیغوں میں دھنسو چھاتیوں سے تیروں کو ریلو
کوفے کو تہِ تیغ کرو شام کو لے لو

دو اور جِلا آئینۂ تیغ عرب کو
لو روم کو قبضہ میں تو قابو میں حلب کو

خاقاں کا رہے تخت نہ قیصر کا رہے تاج
ہاں غازیو چین و حبش و زنگ سے لو باج

چڑھنا ہی لڑائی پہ جواں مردوں کو معراج
گیتی تہ و بالا ہو وہ تلوار چلے آج

یوں آئینہ چار آئنہ پہنے ہوئے بر میں
جس طرح علی بعدِ ظفر آئے تھے گھر میں

میلے نہ ہوں تیور یہ سپاہی کے ہُنر ہیں
جس کے ہیں بس اُس کے ہیں جدھر ہیں بس اُدھر ہیں

گہ عطر میں ڈوبے ہیں گہے خون میں تر ہیں
صحبت میں مصاحب ہیں لڑائی میں سپر ہیں

وہ اور کسی سے نہ جُھکینگے نہ جُھکے ہیں
عزّت میں نہ فرق آئے کہ سر بیچ چکے ہیں

یہ سُن کے جو نکلے وہ جری خیمے سے باہر
کس پیار سے مُنہ دونوں کا تکنے لگے سرور

اکبرؑ نے یہ کی عرض کہ اے سبطِ پیمبرؐ
تیار ہے سب قبلۂ کونین کا لشکر

جلدی ہے لڑائی کی اُدھر فوجِ ستم کو
ارشاد جسے ہو وہ بڑھے لیکے عَلَم کو

شہ بولے کہ عباس دلاور کو بُلاؤ
پیارے مرے محبوب برادر کو بُلاؤ

عاشق کو مددگار کو یاور کو بُلاؤ
جلدی مرے حمزہ مرے جعفر کو بُلاؤ

یہ اوج یہ رُتبہ یہ حشم اُس کے لیے ہے
زیب اُس سے عَلَم کی ہے عَلَم اُس کے لیے ہے

سب تکنے لگے صورتِ عبّاسِ فلک جاہ
نازاں ہوا خود اوج پہ اپنے علمِ شاہ

یعنی مرا حامل ہے نشانِ اسد اللہ
بالیدہ تھا پرچم تو پھریرا تھا ہوا خواہ

جاں آگئی تھی سنتے ہی اس خوش خبری کو
پنجہ بھی اشارے سے بُلاتا تھا جری کو

خوش ہو کے یہ عمو کو پکارے علی اکبرؑ
جلد آیئے یاد آپ کو فرماتے ہیں سرور

حاضر ہوا جوڑے ہوئے ہاتھوں کو وہ صفدر
ارشاد کیا شہ نے علم بھائی کو دے کر

رکھیے اسے کاندھے پہ یہ ہے آپ کا عہدہ
لو بھائی مبارک ہو تمھیں باپ کا عہدہ

بوسہ دیا عباسؑ دلاور نے علم پر
تسلیم کی اور رکھ دیا سر شہ کے قدم پر

کی عرض کہ قربان اس الطاف و کرم پر
سو سر ہوں تو صدقے ہیں شہنشاہِ اُمم پر

ادنیٰ جو ابھی تھا اُسے اعلیٰ کیا مولا
قطرے کو ترے فیض نے دریا کیا مولا

اس چتر فلک قدر کا سایا مرے سر پر
اس دھوپ میں ہوگا یہ پھریرا مرے سر پر

یہ ابر مرے سر پہ یہ طوبا مرے سر پر
قایم رہیں لاکھوں برس آقا مرے سر پر

سلطانِ دو عالم کی غلامی کے صلے ہیں
سب اوج یہ نعلین اُٹھانے سے ملے ہیں

حضرتؑ نے کہا رو کے یہ کیا کہتے ہو پیارے
حاضر ہی اگر جان بھی کام آئے تمھارے

حصّہ یہ تمھارا تھا سو پہونچا تمھیں بارے
مالک ہو تمھیں ہم تو ہیں اب گور کنارے

تھا دل میں جو کچھ وہ نہ بخدا ہو نہیں سکتا
بھائی ترا حق مجھ سے ادا ہو نہیں سکتا

یہ کہہ کے بڑھے سرورِ دیں جانبِ توسن
ہتھیار لگائے ہوئے پہنے ہوئے جوشن

اسوار ہوئے آپ جو گردان کے دامن
اللہ دی ضیا خانۂ زیں ہو گیا روشن

وہ پانوں کا بوں کے لیے باعثِ ضو تھے
خورشید کے قدموں کے تلے دو مہِ نو تھے

رانوں کے اشارے سے لگا کودنے شبدیز
اسوار کے دل کا تھا اشارا اُسے مہمیز

گرنے کے جو شبیر نے تازی کو کیا تیز
اعدا پہ چلا غول سواروں کا جلو ریز

ایک ایک جوانِ عربی رشکِ ملک تھا
اللہ کے لشکر کا علم سر بہ فلک تھا

کیا فیض سواری تھا کہ زر ریز تھی سب راہ
طالع تھا اُدھر مہر اِدھر تھا علمِ شاہ

مابین دو خورشید تھی فوجِ شہِ ذی جاہ
پنجہ پہ تجلی تھی کہ اللہ ہی اللہ

بالا تھی چمک مہرِ منور کی چمک پر
ضو اُس کی زمیں پر تھی ضیا اُس کی فلک پر

لہ شبدیز نام اسپ حسین رضی اللہ عنہ و دیگر نیز بود کہ رنگش سیاہ بود و اول کسے کہ نام اسپ خود شبدیز نہاد خسرو پرویز بود کہ نام اسپ او شبدیز بود و بعد ازو ہر کہ اسپ سیاہ داشت شبدیز نام نہاد ۱۲

۲ مہمیز تسمہ یا چرمہ کہ بر پاشنہ موزہ سوار می بندد تا بدان اسپ را بتازاند و بدان ہر دو پہلو اسپ را بزند ۱۲

ایک ایک جواں تیورِ جنگی کو سنوارے
نیزوں کی چمک اور وہ سمندوں کے طرارے

جعفر کے جگر بند ید اللہ کے پیارے
رستم سے ہر اک جنگ کرے شیر کو مارے

سیّاف ہو مرحب سا تو شمشیر سے ماریں
ارجن سے کماندار کو اک تیر سے ماریں

کمسن کئی لڑکوں کا جدا غول تھا سب سے
سوئے بھی نہ تھے ولولۂ جنگ میں شب سے

روکے ہوئے باگوں کو شہِ دیں کے ادب سے
اعدا کی طرف دیکھتے تھے چشمِ غضب سے

ہتھیار جو باندھے تھے تو کیا تن پہ کھلے تھے
سب بیچ تولے ہوئے مرنے پہ تلے تھے

وہ چاند سے مُنہ اور وہ گورے بدن اُن کے
شرمندہ ہوں غنچے بھی وہ نازک دہن اُن کے

یوسف کی طرح عطر فشاں پیرہن اُن کے
مر کر وہی کپڑے ہوئے آخر کفن اُن کے

کیا حسنِ عقیدت تھا عجب دل کے جواں تھے
آقا پہ فدا ہونے کو سب ایک زباں تھے

عمریں تو کم و بیش پہ سب گیسوؤں والے
اِک غول میں تھے چاند کئی اور کئی ہالے

ذی مرتبہ سیدانیوں کے گود کے پالے
غنچہ تھا وہ سب اکبرِ گلرو کے حوالے

اُن تازہ نہالوں میں نمودار یہی تھے
اُس گلشنِ یکرنگ کے مختار یہی تھے

مقتل کو جو پُرنور کیا عسکرِ دیں نے
دیکھا طرفِ چرخ حقارت سے زمیں نے

اونچا نہ کیا سر فلکِ ماہ جبیں نے
کی فرش چپ سے نظرِ عرشِ بریں نے

اُٹھ اُٹھ کے چمک اپنی دکھانے لگے ذرّے
خورشید کے پہلو کو دبانے لگے ذرّے

کھولا جو پھریرے کو علمدارِ جری نے
لوٹے گلِ فردوس نسیمِ سحری نے

تاروں کو اُتارا فلکِ نیلوفری نے
پرچم جو کھلا کھولدیئے بالِ پری نے

عیسےٰ نے پکارا کہ نثار اس کے حشم کے
خورشید نے منہ رکھدیا پنجہ پہ عَلَم کے

ترتیبِ صفِ فوج کا جس دم ہوا اعلام
باندھی علی اکبر نے صفِ لشکرِ اسلام

ظاہر جو ہوئی شانِ جوانانِ گل اندام
کوفہ کے نشان جھک گئے کانپی سپہِ شام

اللہ ری شوکت شرفا و نجبا کی
اسلام کا لشکر تھا کہ قدرت تھی خدا کی

لہ شمشیرزن

ناگاہ بجا طبل بڑھا لشکرِ سفاک
تا چرخ گیا غلغلۂ کوس شغب ناک

فریاد سے قرنا کی ہلا گنبدِ افلاک
تھرا گیا آوازِ دہل سے کرۂ خاک

نوبت تھی زبس قتلِ امامِ مدنی کی
صاف آتی تھی شاخوں سے صدا سینہ زنی کی

واں شور تھا باجوں کا اِدھر نعرۂ تکبیر
ایک ایک جری جھومتا تھا تول کے شمشیر

ناگاہ سوئے فوجِ خدا آنے لگے تیر
عباس علمدار نے دیکھا رُخِ شبیرؑ

کی عرض کہ لڑنے کو شریر آتے ہیں مولا
کیا حکم ہے اب پیاسوں پہ تیر آتے ہیں مولا

شہ نے کہا شرم آتی ہے کیا حکم میں دوں آہ
ہفتاد و دو تن یاں ہیں اُدھر لشکرِ گمراہ

غازی نے یہ کی عرض کہ اے کل کے شہنشاہ
شبیرستانِ علی ہیں تو وہ روباہ

لاکھوں ہوں تو کیا ڈر ہے شجاعانِ عرب کو
اقبال سے آقا کے بھگا دیتے ہیں سب کو

فرمایا کہ فاقے سے ہے سارا مرا لشکر
پانی نہیں ملتا کہ لبِ خشک کریں تر

بہتر ہے اگر پہلے کٹے تن سے مرا سر
غازی نے کہا شیر گر سنہ ہیں یہ صفدر

حملوں سے الٹ دیں گے پرے فوجِ عدو کے
بھوکے ہیں یہ زخموں کے یہ پیاسے ہیں لہو کے

حضرت نے کہا خیر لڑو فوجِ ستم سے
معلوم ہے سب آج جدا ہوویں گے ہم سے

دنیا سے نہ مطلب ہے نہ کچھ جاہ و حشم سے
کٹ جائے گا اپنا بھی گلا تیغِ دودم سے

مقبول ہیں وہ جو مری امداد کریں گے
اس جنگ کو بھی لوگ بہت یاد کریں گے

جس دم یہ سنی قبلۂ کونین کی گفتار
جانباز بڑھے فوج سے چلنے لگی تلوار

تھے پیاسوں کے حملے غضب حضرتِ قہار
چوٹی کے جواں بھاگ گئے پھینک کے ہتھیار

کون آنکھ ملا سکتا تھا شیروں سے عرب کے
جب کہتے تھے نعرے قدم اُٹھ جاتے تھے سب کے

لڑتا تھا غضب ایک کے بعد ایک وفادار
دن چڑھتا تھا یاں گرم تھا واں موت کا بازار

سر بیچتے تھے جنسِ شہادت کے طلبگار
بڑھ بڑھ کے خریدار پہ گرتا تھا خریدار

لیں پہلے ہم ایک ایک کی جاں اس پہ لڑی تھی
عقبےٰ کا جو سودا تھا تو قیمت بھی کڑی تھی

لہ سال بیسی خورد ۱۲ ۔ ۱۲ عقبےٰ بیسی خورد ۱۲ ۔ ۱۲ سال بیسی آرزہ ۱۲ ۔ ۱۲ عقبےٰ بیسی خورد ۱۲ ۔ ۱۲ سال دہ آنا ۱۲

آیا جو عزیزوں کے لیئے موت کا پیغام
فرزندوں نے جعفر کے بڑے رن میں کیئے نام

اولادِ عقیل آچکی شبیرؑ کے جب کام
لڑنے کو گئے مسلم بیکس کے گل اندام

تھا حشر بپا ندیاں بہتی تھیں لہو کی
بچوں نے الٹ دی تھیں صفیں فوجِ عدو کی

لشکر میں تلاطم تھا غضب چلتی تھی تلوار
بیتاب تھے یاں زینب ناشاد کے دلدار

مُنہ دیکھ کے حضرت کا یہی کہتے تھے ہر بار
ہم جائیں گے بعد اُن کے سوئے لشکرِ کفّار

جی جائیں جو مولا ہمیں مرنے کی رضا دیں
ایسا نہ ہو قاسم کو حضور اذن و عا دیں

کچھ اُن سے کہا چاہتے تھے سرورِ ذیشان
جو غل ہوا مارے گئے مسلم کے دل و جاں

لاشے بھی اودھر آچکے جب خون میں غلطاں
پھر ہاتھوں کو جوڑا کہ ملے رخصتِ میداں

شہ نے کہا یہ داغ تو دشوار ہی ہم پر
اُن دونوں نے سر رکھ دیئے ماموں کے قدم پر

حضرت نے کہا ماں سے بھی ہو آئے ہو رخصت
کیا کہتے ہو لٹوا دوں میں ہمشیر کی دولت

ما یہ ہو تمھیں اُس کا تمھیں اُس کی بضاعت
چھوٹے نے یہ حضرت سے کہا تھام کے رقت

چھوٹے نہیں ہم آپ ابھی پوچھ لیں سب سے
اماں تو رضا دے چکی ہیں مرنے کی شب سے

بچوں نے جو کی جوڑ کے ہاتھوں کو یہ تقریر
اُن دونوں کا مُنہ دیکھ کے رونے لگے شبیرؑ

فرمایا چھوڑا تا ہی تمھیں بھی فلکِ پیر
اچھا میں رضامند ہوں جو مرضیِ ہمشیر

وہ سیدۂ پاک نواسی ہی نبی کی
فیاض کی ہمشیر ہی بیٹی ہی سخی کی

یہ سُن کے جھکے آخری تسلیم کو دو ماہ
خورشید کے آگے مہِ نو بن گئے دو ماہ

کی سوئے فلک دیکھ کے شبیرؑ نے اِک آہ
دو شیر چلے گھوڑوں پہ چڑھ کر سوئے جگاہ

ماں ڈیوڑھی سے چلائی کہ رخصت ہو مبارک
سرکارِ شہنشاہ سے خلعت ہو مبارک

سلطانِ دوعالم نے مخلّع کیا واری
تم جاتے ہو یا جاتی ہی دولہ کی سواری

پروان چڑھے ختم ہوئیں شادیاں ساری
لو در سے لیتی ہوں بلائیں میں تمھاری

صدقے گئی بیزوں کو ہلاتے ہوئے جاؤ
شکلیں مجھے پھر پھر کے دکھاتے ہوئے جاؤ

تسلیم کو گھوڑوں سے جھکے دونوں وہ گلرو
دل ماں کا یہ اُمڈا کہ ٹپکنے لگے آنسو

باگیں جو اُٹھائیں تو فرس بن گئے آہو
پھر دیکھنے پائی نہ انھیں زینبِ خوشخو

میداں کی طرف یاس سے ماں بہگئی تک کے
پنہاں ہوئے بدلی میں ستارے سے چمک کے

میدان میں عجب شان سے وہ شیر نر آئے
گویا کہ بہم حیدر و جعفر نظر آئے

غل پڑ گیا حضرت کی بہن کے پسر آئے
افلاک سے بالائے زمیں دو قمر آئے

یوسف سے فزوں حسن گراں مایہ ہے اُن کا
یہ دھوپ بیاباں میں نہیں سایہ ہے اُن کا

وہ چاند سے مُنہ اور وہ گیسوئے معنبر
وہ بدر سے رُخسار زہے قدرتِ داور

سب شان یداللہ کی سب شوکتِ حیدر
چتون وہی غصہ وہی سارے وہی تیور

یہ دبدبہ کس صاحبِ شمشیر نے دیکھا
دیکھا جسے معلوم ہوا شیر نے دیکھا

تن تن کے جو شان اپنی دکھاتے تھے وہ ذیجاہ
چھاتی سے لگا لیتے تھے دونوں کو یداللہ

شمشاد سے قامت نہ دراز اور نہ کوتاہ
کھیلے ہوئے تیغوں میں فنِ جنگ سے آگاہ

ناخن میں دلیروں کے سب اللہ ازوغا تھے
بچے تھے مگر بچۂ ضرغامِ خدا تھے

تھے حسن میں ان دونوں کے آئینہ رو ایک
پیشانی و ابرو و سر و صدر و گلو ایک

شان ایک شکوہ ایک رنگ ایک تو بو ایک
دل ایک جگر ایک جسد ایک لہو ایک

اور ان سا کوئی غرب سے تا شرق نہیں ہے
دو ٹکڑے ہیں اک سیب کے کچھ فرق نہیں ہے

پڑھنے لگے اشعارِ رجز جب وہ دلاور
اللہ ری فصاحت فصحا ہو گئے ششدر

ہر بیت تھی دشمن کے لیے تیغِ دو پیکر
ہر مصرعِ برجستہ میں تھی تیزیِ خنجر

دے کون جواب اُن کا کہ دم بند تھا سب کا
واں قافیہ تھا تنگ شجاعانِ عرب کا

اظہارِ نسب میں جو محمد کا لیا نام
سب پڑھنے لگے صلِ علیٰ صاحبِ اسلام

آگے جو بڑھے نامِ علی لیکے وہ گلفام
دل ہل گئے تھرانے لگا روم سے تا شام

جعفر کا جو کچھ ذکر کیا بعد علی کے
مجرے کو علم جھک گئے سب فوجِ شقی کے

آغاز تھا ذکر شرف حضرت شبیرؑ
ڈنکے پہ اُدھر چوب لگی چلنے لگے تیر

اُس وقت بڑے بھائی سے کی چھوٹے نے تقریر
تلوار علم کیجیے اب کس لیے تاخیر

کہیے تو جدا ہو کے ستمگاروں پہ جائیں
اسواروں پہ ہم آپ کما ندار وں پہ جائیں

فرمایا بڑے بھائی نے ہنس کر نہیں بھائی
تم جان ہو دشوار ہی دم بھر کی جدائی

ہو جاتی ہے اک آن میں ہر صف کی صفائی
کر دیتے ہیں سر کون سی ایسی ہے لڑائی

بازو ہوں قوی ہاتھ سے گر ہاتھ نہ چھوٹے
سر تن سے اُتر جائے مگر ساتھ نہ چھوٹے

نانا کی طرح فوج پہ حملے کریں آؤ
تلواروں میں تن تن کے چلو چھپیاں کھاؤ

ان چھوٹے سے ہاتھوں کا ہمیں زور دکھاؤ
ہم سینہ سپر تم پہ ہوں تم ہم کو بچاؤ

ہم شیروں پہ ستم کا بھی مُنہ پڑ نہ سکے گا
جب دو ہوئے اکدل تو کوئی لڑ نہ سکے گا

چھوٹے نے کہا جوڑ کے ہاتھوں کو کہ بہتر
بس کھینچ لیے نیمچے دونوں نے برابر

دو بجلیاں کوندیں کہ لرزنے لگا لشکر
نیزوں کے نیستاں میں در آئے وہ غضنفر

برباد کیا رَو میں سواروں کو دبا کے
رہوار بھی اسوار سمیت گھوڑوں پہ ہوا کے

اِن چھوٹی سی تلواروں کے تھے کاٹ نرالے
تھیں کُہنیاں پہنچوں سے جدا ہاتھوں سے بھالے

مسل اپنی جمائے تھے جو بیمثل رسالے
تھے جائزہ اُن سب کا یہی دیکھنے والے

ناز اپنے ہنر پر تھا شجاعانِ عرب کو
نیزوں کو قلم کر کے ندار د کیا سب کو

موت آئی اِدھر نیمچے دونوں جدھر آئے
جب ہاتھ بڑھا پانوں پہ کٹ کٹ کے سر آئے

گہ سینے تک آئے تو کبھی تا کمر آئے
خالی نہ پھرے جس پہ گئے خون میں بھر آئے

ہر پنجہ بجلی تھا ستمگاروں کے حق میں
دونے ہوئے تھے دو مہ نوخوں کی شفق میں

اُٹھتی تھی نہ ڈر سے کسی خونخوار کی گردن
سر خود کا جھکا جاتا تھا تلوار کی گردن

دو چار کے مُنہ کٹ گئے دو چار کی گردن
اسوار کا سر اڑ گیا رہوار کی گردن

دو نیمچے بجلی سے گزرتے تھے کمر سے
آدھے ہوئے جاتے تھے لعیں جان کے ڈر سے

دو چھوٹی سی تیغوں سے قیامت نظر آئی
معصوموں کے ہاتھوں سے کرامت نظر آئی

سر کٹنے کی اعدا کے علامت نظر آئی
لوہے کی سپر بھی نہ سلامت نظر آئی

بیوجہ نہ پھرتے تھے منہ اہل جفا کے
دریا کے تھپیڑے تھے طمانچے تھے قضا کے

گردن سے بڑھے کاٹ کے پیکر نکل آئے
جوشن کو دکھاتے ہوئے جوہر نکل آئے

چار آئنہ میں تیر کے باہر نکل آئے
صابون سے دو تار برابر نکل آئے

محراب کے نیچے کسے جھکتے نہیں دیکھا
مچھلی کو بندھے پانی میں رکتے نہیں دیکھا

ہر غول میں غلطان و طپاں تھے سر و پیکر
دستانے کہیں تھے کہیں ڈھالیں کہیں مغفر

جب ہمچو ان دونوں کے اٹھتے تھے برابر
منہ خوف سے ڈھالوں میں چھپاتے تھے ستمگر

روکے انہیں طاقت یہ نہ تھی پیر و جواں کی
صورت نظر آنے لگی تیغ دو زباں کی

غارت تھی وہ صف جس سے وغا کر کے پھرے وہ
دو ہاتھ میں سو سو کو فنا کر کے پھرے وہ

سرداروں کے سر تن سے جدا کر کے پھرے وہ
ہر غول میں اک حشر بپا کر کے پھرے وہ

غل تھا کہ پرے ٹوٹے ہوئے جم نہیں سکتے
سر کٹنے کی دہشت سے قدم تھم نہیں سکتے

گھوڑے تھے چھلاوہ کبھی یاں تھے کبھی واں تھے
پتلی میں تو پھرتے تھے پر آنکھوں سے نہاں تھے

یاں تھے جو سمکر تو ادھر گرم عناں تھے
بجلی تھے کسی جا تو کہیں آب رواں تھے

ہو سکتی تھی بجلی سے یہ سرعت نہ ہرن سے
جھونکے تھے ہوا کے کہ نکل جاتے تھے سن سے

نے آب تھے نے دود سے یہ جاندار تھے گھوڑے
ہر مرتبہ اڑ جانے پہ طیار تھے گھوڑے

اس پار کبھی تھے کبھی اس پار تھے گھوڑے
نقطہ تھی وہ سب فوج کہ پرکار تھے گھوڑے

دس بیس جو مر جاتے تھے ٹاپوں سے کچل کے
بڑھ سکتا نہ تھا ایک احاطہ سے اجل کے

تانے ہوئے سینوں کو جھکائے تھے دونوں
تلواروں کی موجوں سے گزر جاتے تھے دونوں

ہر غول میں بیخوف و خطر جاتے تھے دونوں
سب ہوتے تھے پسپا تو ٹھہر جاتے تھے دونوں

اکٹی ہوئی صف دیکھ کے ہنس دیتا تھا بھائی
بھائی کی طرف دیکھ کے ہنس دیتا تھا بھائی

دم لیکے جو گھوڑوں کو اُڑاتے تھے وہ جرّار
اعدا کے رسالوں کو بھگاتے تھے وہ جرّار

شیروں کی طرح فوج پہ جاتے تھے وہ جرّار
دو کرتے تھے یکتا جسے پاتے تھے وہ جرّار

شیروں نے جو مارا بھی تو رو داروں کو مارا
جب آنکھ ملی جن کے نمودا روں کو مارا

جمعیت لشکر کو پریشاں کیا دم میں
جو فوج کی جاں تھے اُنھیں ہیجان کیا دم میں

تلواروں سے جنگل کو گلستاں کیا دم میں
سر کاٹ کے خونخواروں کو غلطاں کیا دم میں

بیدست تھے علموں کو جو نے دین لیے تھے
بچوں نے جوانوں سے نشان چھین لیے تھے

دو لاکھ کو دونوں نے کیا تھا تہ و بالا
تیغ ایک کی چلتی تھی تو اک بھائی کا بھالا

اِک بڑھ گیا گر ایک کے گھوڑے کو سنبھالا
دم اُس نے لیا اُس نے لڑائی کو سنبھالا

یک جا فرس تیز قدم ہو گئے دونوں
جب بھیڑ پڑی کچھ تو بہم ہو گئے دونوں

وہ چھیڑ کے تازی کو سواروں میں در آیا
دم بھر میں پیادوں کو یہ پامال کر آیا

جب شیر سا پہونچا وہ اُدھر یہ اِدھر آیا
جاں آگئی بھائی کو جو بھائی نظر آیا

بچ بچ کے نکلتے تھے جو نیزوں کے تلے سے
اک بھائی لپٹ جاتا تھا بھائی کے گلے سے

کچھ بھائی سے بڑھکر جو وغا کرتا تھا بھائی
بچ جانے کی بھائی کے دعا کرتا تھا بھائی

حق بھائی کی اُلفت کا ادا کرتا تھا بھائی
ہر زور پہ بھائی کی ثنا کرتا تھا بھائی

تم سا نہیں صفدر کوئی واللہ برادر
کیا خوب لڑے سلمک اللہ برادر

کہتا تھا بڑے بھائی سے چھوٹا بصد آداب
بھائی میں بھگا دوں ابھی اُن کو جو ملے آب

اب پیاس کی گرمی سے کلیجہ کو نہیں تاب
سینے میں مرا دل نہیں آتش پہ ہے سیماب

ہم لوگ محق کیا نہیں اس آب رواں کے
تا لب نہ خلش ہو گی ہے کانٹوں سے زباں کے

کہتا تھا بڑا بھائی میں صدقے ترے گلفام
ہم خشک زبانوں کو بھلا پانی سے کیا کام

اب جلد اجل آئے تو کوثر کا پئیں جام
غش ہم کو بھی آجائے گا پانی کا نہ لو نام

آنکھیں تو ستمگاروں کی تیغوں سے لڑی ہیں
چھلکے رہو اماں در خیمے پہ کھڑی ہیں

اِس نہر کا لینا تو کچھ ایسا نہیں مشکل
رکھیں ہمیں کیا تاب لعینوں کی ہے کیا دل

پُل باندھ لیں لاشوں کے ابھی ہم سرِ ساحل
بتلائیے پھر نہر کے لے لینے سے حاصل

دیکھو نہ اُدھر پیاس سے گو لاکھ تعب ہے
اماں ہمیں گر دودھ نہ بخشیں تو غضب ہے

اشک آنکھوں میں بھر کر کہا چھوٹے نے بہت خوب
ہر دم ہے رضامندیِ مادر ہمیں مطلوب

ایسے تو نہیں ہم کہ بزرگوں سے ہوں مجوب
منظور یہ تھا فخر کا نکلے کوئی اسلوب

دریا کو بھی دیکھیں گے نہ اب آنکھ اُٹھا کے
پیتے بھی تو پہلے شہِ والا کو پلا کے

جعفر کے جو پوتے ہیں تو حیدر کے نواسے
کچھ ہم علی اکبر سے زیادہ نہیں پیاسے

یہ کہتے ہی لڑنے لگے پھر اہلِ جفا سے
فریاد کہ بچوں پہ گری فوجِ قضا سے

خوں سر کا بہا منہ پہ تو گھبرا گئے دونوں
دو لاکھ کی تیغوں کے تلے آگئے دونوں

ڈوبے ہوئے تھے شام کے بادل میں وہ واہ
پردے سے کھڑی تکتی تھی زینب سوئے جگاہ

عباس سے کہتے تھے تڑپ کر شہِ ذیجاہ
اب مجھ سے جدا ہوتے ہیں دو شبیر مرے آہ

کیونکر متحمل ہو دلِ اِس رنج و محن کا
گھر لٹتا ہے بھائی مری نادار بہن کا

اس بی بی کے فاقوں کے ہیں پالے ہوئے یہ لال
دولت ہے یہی اور یہی حشمت و اقبال

سات آٹھ برس کے ہیں ابھی کیا ہے سن و سال
سب ہاتھ ملیں گے جو یہ گل ہو گئے پامال

تازہ ہیں و پھول ہیں جعفر کے چمن میں
مرجائے گا باپ اُن کی خبر سن کے وطن میں

رو کر دمِ رخصت وہ یہی کہتے تھے ہر بار
میں شاہ کا خادم ہوں یہ دونوں ہیں نمک خوار

آگاہ صعوباتِ سفر سے نہیں زنہار
اے دخترِ زہرا مرے بیٹوں سے خبردار

میں کہہ نہیں سکتا ہوں کہ ماں تم پہ فدا ہیں
اب تو یہی دونوں مرے پیری کے عصا ہیں

شوہر کا تڑپنا اُسے کچھ بھی نہ بھایا
ہے ہے مری اُلفت میں لٹی زینبِ ناشاد

یوں بھائی پہ صدقے کوئی کرتا نہیں اولاد
ہم دیکھتے ہیں اور بہن ہوتی ہے برباد

روئے گی وہ بیٹوں کو تو سمجھائے گی کیونکر
منہ زینبِ دلگیر کو دکھلائیں گے کیونکر

عباس نے کی عرض کلیجہ ہے دو پارا
ان کو تو کسی کی نہیں امداد گوارا

زخمی ہوئے نہ مجھ کو نہ اکبر کو پکارا
بھائی یہ غلام آپ جو فرمائیں اشارا

حضرت کی قسم دے کے میں سمجھاؤں گا اُن کو
مچلیں گے تو گودی میں اُٹھا لاؤں گا اُن کو

حضرت نے کہا صاحبِ غیرت ہیں وہ دونوں
لختِ جگرِ شاہِ ولایت ہیں وہ دونوں

خرغامِ نیستانِ شجاعت ہیں وہ دونوں
واللہ بڑے صاحبِ ہمت ہیں وہ دونوں

دو لاکھ تو کیا ہیں جو کروروں میں گھریں گے
لے جان دیئے وہ نہ پھریں ہیں نہ پھریں گے

بڑھنے لگے میداں کی طرف قاسمِ ذیجاہ
اکبر نے یہ کی عرض کہ میں جاتا ہوں لا شاہ

ہے دونوں کی فرقت کا مجھے صدمۂ جانکاہ
لاکھوں میں ہیں تنہا پھوپھی اماں کے پسر آہ

رہتی کہیں گر نہ پڑیں برچھیاں کھا کر
میں ساتھ اُنھیں لے آتا ہوں اصغر کو جگا کر

گھبرا کے دریچے سے زینب یہ پکاری
سر ننگے میں نکلوں گی جو تم جاؤ گے واری

اولاد مجھے تم سے زیادہ نہیں پیاری
بتلاؤ کہ ہیں اُن کی ہوں عاشق کہ تمھاری

میداں کی طرف قاسمِ نے پر بھی نجائیں
تلواروں میں عباسِ دلاور بھی نجائیں

زہرا کی قسم کچھ نہیں بیٹوں کا مجھے دھیان
بھائی یہ تصدق ہوں یہی تھا مجھے ارمان

وہ آئے تو دسواس سے دل ہوگا پریشان
صدقے کو نہیں پھیر کے لاتے ہیں میں قربان

خود روؤں گی پر شاہ کو غم کھانے نہ دوں گی
لاشے بھی اُٹھانے کے لیے جانے نہ دوں گی

میداں میں ہے کیا اور بجز نیزہ و شمشیر
مرجاؤں کی زخمی ہوئے گر قاسمِ دلگیر

دِل کس کا چھدے تم کو لگائے جو کوئی تیر
سمجھاؤں میں صدقے گئی کیوں روتے ہیں شبیر

باقی ہے اگر زیست تو پھر آئیں گے دونوں
غم کس لیے کیا ہوگا جو مرجائیں گے دونوں

شہزادوں کو کھوتے ہیں غلاموں کے لیے آہ
میں جوڑتی ہوں ہاتھ بس اب روئیں نہ للہ

ہے شرم کی کیا وجہ میں لونڈی وہ شہنشاہ
سو ایسے ہوں بیٹے تو نثارِ رشۂ ذیجاہ

ممتاز ہے فدیہ ہے جو زہرا کے پسر کا
شان اُس کی بڑھے فخر ہو جو جدِ پدر کا

باپ اُن کا اگر ہوتا تو وہ سر نہ کٹاتا
زہرا کے کلیجے کے عوض برچھیاں کھاتا

بیٹوں کو یوں ہی میری طرح نذر کو لاتا
اپنے کوئی محسن کو نہیں دل سے بھلاتا

جو پاس ہی جس کے وہ عطا شہِ دیں ہی
کہدے مرے مارا جائے کا حق کس پہ نہیں ہی

بیٹوں سے ہوئی گر تو ہوئی آج جدائی
سر پر مرے دُنیا میں سلامت رہیں بھائی

اِک ولتِ اولاد لٹائی تو لٹائی
کیا لُٹ گیا وہ کونسی ایسی تھی کمائی

کیوں رُوں میں دُنیا میں جو دلبند نہیں ہیں
کیا اکبر و اصغر مرے فرزند نہیں ہیں

یہ ذکر ابھی تھا کہ ستمگار پکارے
کُوشاہ کی ہمشیر کے بیٹے گئے مارے

ٹکڑے کیا معصوموں کو تلواروں کے مارے
وہ لوٹتے ہیں خاک پہ وہ عرش کے تارے

پامالی کو ان دونوں کی اسوار پر جینگے
بچوں کے سراب کٹ کے نشانوں پہ چڑھینگے

یہ سُنتے ہی تھرانے لگے حضرتِ عباس
گھبرا کے اُٹھے خاک سے شبیر بصد یاس

سر کھولے ہوئے بی بیاں ڈیوڑھی کے جو تھیں پاس
سب نے کہا لو شہ کی بہن ہوگئی بے آس

ٹوٹا ہی فلک بنتِ شہنشاہِ نجف پر
زینب کو چلو لیکے بس اب مائنی صف پر

ہی ہی کا جو اک شور ہوا رانڈوں میں برپا
زینب بھی ہٹی چھوڑ کے دروازے کا پردا

چلائی ارے چپکے رہو غل ہی یہ کیسا
بھائی ہیں سلامت مجھے کیوں دیتے ہو پُرسا

ہی ہی نہ کرو صاحبو گھبرائینگے شبیر
پھر کون ہی زینب کا جو مر جائینگے شبیر

تم روتے ہو کس واسطے میں تو نہیں روتی
دامانِ مژہ بھی نہیں اشکوں سے بھگوتی

دل ہوتا جو ایسا ہی تو کیوں بیٹوں کو کھوتی
دولت کوئی ماں جائے سے پیاری نہیں ہوتی

قایم رہے اقبال محمد کے خلف کا
بس نام بھرے گھر میں نہ لو مائنی صف کا

سر اپنے نہ کھولو کہ مجھے آتا ہی وسواس
اک شب کی دلھن گھر میں ہی اس کا بھی نہیں پاس

شبیر تو سر پر ہیں جو بیٹوں سے ہوئی یاس
اکبر مری اُمید ہی قاسم ہی مری آس

اب خلد میں دادی کے تڑپ جائینگے دونوں
کیا پیٹنے رونے سے چلے آئینگے دونوں

باتیں کہیں سب سے پہ سنبھالا نہ دلِ زار
تڑپا یہ کلیجہ کہ گری خاک پہ اکبار

واں لاشوں پہ روتے ہوئے پہونچے شہِ ابرار
یاں کوئی ساعت کے ملے وہ جگر افگار

کس عمر میں ہستی کا چمن چھوڑ رہے تھے
گودی کے پلے خاک پہ دم توڑ رہے تھے

رخ زرد تھے اور خاک میں آلودہ تھے گیسو
جھک آئے تھے کٹ کٹ کے مہِ نو سے وہ ابرو

تلواروں سے ٹکڑے تھے وہ بلور سے بازو
مہتاب سی وہ چھاتیاں اور تیر سے پہلو

پھٹتا تھا جگر آنکھ نہ کھل سکتی تھی غش سے
ہونٹوں پہ زبانیں نکل آئیں تھیں عطش سے

ٹکڑے ہوا سینے میں دلِ سبطِ پیمبر
ہے ہے کہا اور لاشوں سے پلٹے شہِ صفدر

چھوٹے سے بڑے نے یہ کہا ہوش میں آکر
بالیں پہ حضور آئے ہیں چونکو تو برادر

مشتاق تھے تم سید و بیکاہ کو دیکھو
مرتے ہوئے دیدارِ شہنشاہ کو دیکھو

سُن کے یہ صدا غش سے چونکا وہ دلاگا
دونوں نے رکھا سر قدمِ شاہ پہ اک بار

اکبر سے یہ کی عرض کہ اے شاہ کے دلدار
دشمن ہیں بہت قبلۂ عالم سے خبردار

ہم دونوں غلاموں کا غم کھائیو بھائی
سر پیٹیں جو اماں انھیں سمجھائیو بھائی

یہ کہہ کے لگے ہچکیاں لینے جو وہ پیارے
بس موت کے آثار نمایاں ہوئے سارے

سر پیٹ کے ہاتھوں سے شبیر پکارے
ماموں سے بچھڑتے ہو میں قربان تمھارے

پھر کی نہ کوئی بات سفر کر گئے دونوں
آنسو تھے رواں آنکھوں سے اور مر گئے دونوں

حضرت کے جو رونے کی صدا خیمے میں آئی
راٹھوں نے اُدھر ماتمی صف گھر میں بچھائی

زینب نے کہا ہائے غضب روتے ہیں بھائی
غصہ یہ پکاری کہ دوہائی ہے دوہائی!!

لو چاکِ گریبان کیے آتے ہیں شبیر
معصوموں کے لاشوں کو لیے آتے ہیں شبیر

بیٹھی صفِ ماتم پہ اُدھر شاہ کی خواہر
سیدانیوں نے اُٹھ کے اُدھر کھول دیئے سر

لاشوں کو لیے آئے جو گھر میں شہِ صفدر
زینب کے قریں بیٹھ گئے سر کو جھکا کر

فرمایا کہ لو بختِ جگر آئے تمھارے
لو دودھ انھیں بخشو پسر آئے تمھارے

شبیر نے جب دودھ کا زینب سے لیا نام
ہر چند کیا ضبط پہ تھرا گیا اندام

دل تھام کے کہنے لگی وہ بیکس و ناکام
آپ اُن سے رضامند ہیں یا شاہِ خوش انعام

فرمایا دل اُن دونوں سے واللہ خوشی ہے
میں اُن سے خوشی ہوں مرا اللہ خوشی ہے

عاشق تھے مرے اور مرے غمخوار تھے دونوں
بچے تھے مگر صادق الاقرار تھے دونوں

اُس وقت میں ماموں کے مددگار تھے دونوں
حیدر کی طرح صفدر و جرار تھے دونوں

موت آئے کہ داغوں سے دل اب بھر گیا زینب
دونوں یہ نہیں مر گئے میں مر گیا زینب

افسوس کہ ان دونوں کی دیکھی نہ جوانی
میں کیا کہوں کیا صاحبِ ہمت تھے یہ جانی

ہوتی ہے بہت زخمیوں کو تشنہ دہانی
پر ہم سے دمِ مرگ بھی مانگا نہیں پانی

سمجھے کہ گرفتارِ ستم آج ہے ماموں
وہ جانتے تھے پانی کو محتاج ہے ماموں

ہمشیر سے یہ کہہ کے جو روئے شہِ ابرار
بس آ گیا فرزندوں کی ہمت پہ اُسے پیار

تھرائی ہوئی خاک سے اُٹھی وہ دلِ افگار
پاس اُن کے لاشوں کی بلائیں لیں کئی بار

کانپے جو قدم گر کے سنبھلنے لگی زینب
مُنہ خون بھرے چہروں سے ملنے لگی زینب

دیکھا جو لہو بچوں کا چھاتی اُمنڈ آئی
نزدیک تھا مر جائے یداللہ کی جائی

پر فاطمہ کے صبر کی شان اُس نے دکھائی
سب سے یہ کہا نیک لگی میری کمائی

بچے مرے قرباں ہوئے احسان خدا کا
اے بیبیو صدقہ ہے یہ شاہِ شہدا کا

رو کر شہِ والا نے کہا صدقے میں تم پر
دم بھر انھیں لو لو کہ یہ مہمان ہیں خواہر

بانو نے اشارا کیا اے سبطِ پیمبر
قربان گئی آپ بس اب جائیے باہر

گر ضبط اسی طرح سے فرمائیں گی زینب
یہ ماتمِ اولاد ہے مر جائیں گی زینب

روتے ہوئے خیمے سے جو ڈیوڑھی پہ گئے شاہ
فرزندوں کو چلّانے لگی زینبِ دلخواہ

یہ نیند ہے کیسی کہ خبر تم کو نہیں آہ
صدقے گئی جاؤ شہِ کونین کے ہمراہ

زخمی ہوئے شبیر تو جاں اپنی میں دوں گی
اچھا میں تمھیں دونوں سے ماں جائے کو لوں گی

لو نیچے کاندھوں پہ دھر واہی مرے پیارو
تنتے ہوئے شبیر کے ہمراہ سدھارو

گو پیاسے ہو دو دن کے یہ ہمت کو نہ ہارو
یہ خون میں ڈوبے ہوئے کپڑے تو اتارو

اُٹھ بیٹھو میں صدقے گئی اتنا نہیں سوتے
اس طرح تو جاگے ہوئے دولھا نہیں سوتے

سوتا ہی لڑائی کے دن ایسا کوئی غافل
بچو تمھیں کیا سُن کے کہینگے شہِ عادل

دیکھو کہ تڑپتی ہی یہ ماں صورتِ بسمل
سُلجھاؤ یہ زلفیں کہ اُلجھتا ہی مرا دل

کیا غش میں ہو یہ سونے کا نقشا نہیں ہوتا
ایسا تو کوئی نیند کا ماتا نہیں ہوتا

پھر دونوں کے سر زانو پہ رکھ کر یہ پکاری
لو اب ہوا معلوم کہ تم مر گئے واری

نے ہوش میں کچھ مجھ کو خبر تھی نہ تمھاری
اب آنکھوں سے چھپ جائیگی یہ صورتیں ساری

دنیا کو نہ دیکھا کہ اجل آ گئی بچو
ہی ہی یہ تمھیں کس کی نظر کھا گئی بچو

بچو تمھیں قسمت نے نہ پروان چڑھایا
حسرت ہی ماں نے تمھیں دولہ نہ بنایا

پیدا ہوئے جس دن سے کبھی چین نہ پایا
دیکھی نہ جوانی کہ پیامِ اجل آیا

ہی ہی چمنِ دہر میں پھولے نہ پھلے تم
جب فصل بہاری کے دن آئے تو چلے تم

میں روتی تھی در پہ مجھے سمجھا نہ گئے تم
دروازے پہ دم بھر کے لیے آ نہ گئے تم

ہی ہی دولھنیں بھی مجھے دکھلا نہ گئے تم
پیاسے تھے مگر جانبِ دریا نہ گئے تم

جیتی ہی وہ ماں جس کے گزر جانے کے دن تھے
یہ بیاہ کی راتیں تھیں کہ مر جانے کے دن تھے

خاموش انیس اب کہ تڑپتا ہی دلِ زار
کافی ہی رُلانے کو تری درد کی گفتار

اس جنس کا گر آج نہیں کوئی خریدار
فیاض ہی لیکن شہِ مظلوم کی سرکار

افسردہ نہ ہو غنچۂ اُمید کھلے گا
کھُلجائیں گی آنکھیں وہ صلہ تجکو ملے گا

مرثیہ (۹)

جاتی ہے کس شکوہ سے رن میں خدا کی فوج
کمریں و خاپہ باندھے ہے مشکلکشا کی فوج

صف بستہ آگے پیچھے ہے سب پیشوا کی فوج
جنت کا رخ کیے ہے شہِ کربلا کی فوج

ڈیوڑھی پہ جن و انس و ملک کا ہجوم ہے
خیمے سے اب علم کے نکلنے کی دھوم ہے

حاضر ہیں صبح سے درِ دولت پہ جاں نثار
اکسٹھ ہیں رہے ہیں رفیقانِ ذی وقار

پیدل کھڑے ہیں سامنے باندھے ہوئے قطار
بیٹھے ہیں زین پوش بچھائے ہوئے سوار

شوقِ زیارتِ علمِ فوجِ شاہ ہے
ایک اک کی جانب درِ دولت نگاہ ہے

رُخ ہے کسی کا جوشِ شجاعت سے لالہ رنگ
کوئی سنوارتا ہے بدن پر سلاحِ جنگ

جھک جھک کے جست کرتا ہے کوئی فرس کا تنگ
چلّہ سے جوڑتا ہے کوئی فاقہ کشِ خدنگ

بھالا سنبھالتا ہے کوئی جھوم جھوم کے
تلتا ہے کوئی تیغ کے قبضے کو چوم کے

ملتا ہے ہنس کے ایک جواں ایک کے گلے
ساری خوشی یہ ہے کہ بس اب خلد میں چلے

چہرے وہ سُرخ سُرخ وہ جرأت کے ولولے
حق سے یہ التجا کہ نہ رن سے قدم ٹلے

مر کر بھی دل میں الفتِ حیدر کی بو رہے
پانی ہمیں ملے نہ ملے آبرو رہے

حاضر ہے ذوالجناح شہنشاہِ بحر و بر
کلغی ہے یا کہ خوشۂ پروین قریبِ سر

خادم چنور لیے ہیں مگس ساں اِدھر اُدھر
پیچھے ہیں بادپائے عزیزانِ نامور

گھوڑے سمند سرورِ ذی شاں کے ساتھ ہیں
پریوں کے غول تختِ سلیماں کے ساتھ ہیں

ڈیوڑھی پہ خادمانِ محل کی ہے پکار
آتے ہیں اب حضور خبردار ہو شیار!!

خلعت پہن رہے ہیں علمدارِ نامدار
نذریں خوشی کے دینے کو حاضر ہوں جاں نثار

بھائی بڑا ہے سر پہ تو سایہ ہے باپ کا
عہدہ جوان بیٹے نے پایا ہے باپ کا

یہ سُن کے شاد ہو گئی فوجِ حسین سب
آئے رفیق سب درِ دولت پہ باادب

بولے حبیب ابنِ مظاہر کہ شکرِ رب
ہاں سرفروشو جنگ و جدل کا مزا ہے اب

سرو ے کے لے بہشت کی جس کو تلاش ہو
دیکھیں علم کے سائے میں کس کس کی لاش ہو

کون اور کائنات میں ہے دوسرا جواں
قابل اسی کے دوشِ مبارک کے ہے نشاں

بازوئے شاہِ دیں حسدِ مرتضیٰ کے جاں
پیروں کا سرپرست جوانوں کا قدرداں

باتیں پیمبروں کی خدا کے ولی میں ہیں
سب اس میں جمع ہیں صفتیں جو علی میں ہیں

اُلفت وہی حیا وہی مہر و وفا وہی
طاعت وہی وقار وہی اتقا وہی

بخشش وہی کرم وہی جود و سخا وہی
جرات وہی جدال وہی دبدبا وہی

گیتی میں اور بھی کوئی ایسا دلیر ہے
خود تھا علی کا قول کہ عباس شیر ہے

بے مثل سب ہیں قبلۂ عالم کے تشنہ دار
لیکن خدا نے اس کو دیا ہے عجب وقار

جیسے نبی کی فوج میں ہے شیرِ کردگار
ویسا ہی ہے علی کا یہ تشنہ کام نثار

سب فوج سے بڑھا ہوا رتبہ اسی کا ہے
شیرِ خدا کے بعد یہ حصہ اسی کا ہے

باہر تو اشتیاقِ علم میں ہے سب سپاہ
خیمے میں باندھتے ہیں کمر شاہِ دیں پناہ

سب خویش و اقربا ہیں مسلح قریبِ شاہ
ہیں سامنے علم لیے عباسِ عرش جاہ

رُتبے کو اوج۔ نخلِ ترقی مراد پر
گویا علی کھڑے ہیں مہیّا جہاد پر

شیرِ خدا کا خودِ مبارک ہے زیبِ سر
کلغی ہمائے اوجِ سعادت کے جس میں پر

مہتاب ہے کہ ابر سے نکلا ہوا قمر
ابرو ہیں ذوالفقارِ یداللہِ نامور

ڈورے جو سُرخ سرخ ہیں چشمِ سیاہ میں
پھرتی ہیں خوں بھری سے تیغیں نگاہ میں

اس کی خوشی جو تھی کہ ملا رایتِ رسول
رُخسار تھے کھلے ہوئے دو ارغواں کے پھول

قدِ سرو باغِ حسن نہ پستی فروش طول
وہ لب کہ جس سے روح کو ہوتا زگی حصول

یہ شور تھا نمک کا جہاں کے رواق میں
حوریں بھی ہونٹ چاٹتی تھیں اشتیاق میں

دیتے تھے تہنیت جو غزالانِ پُر جگر
عباس مسکرا کے جھکاتے تھے اپنا سر

فرطِ طرب سے چاند سا چہرہ تھا جلوہ گر
رُخ کی ضیا اِدھر تھی عَلَم کی ضیا اُدھر

وہ آسماں حشم تو یہ کیواں جناب ہیں
غل تھا کہ ایک صبح میں دو آفتاب ہیں

زینب بلائیں لیکے یہ کہتی تھیں بار بار
منصب مبارک اے شہِ مرداں کے یادگار

کہتے تھے ہاتھ جوڑ کے عباسِ ذی وقار
مجکو سمجھیے عون و محمد کا جاں نثار

ان کی طرف سے مہتمِ بندوبست ہوں
مالک یہ شاہزادے ہیں میں پیشدست ہوں

فرماتی تھیں یہ دخترِ خاتونِ کائنات
تم دونو کے بزرگ ہو یہ کونسی ہے بات

اُس وقت ہے خوشی جو اس آفت سے ہو نجات
سمجھوں کہ بیکسوں کو دوبارہ ملی حیات

گھیرا ہے بیگناہ شہِ مشرقین کو
تم سب شریک ہو کے بچا لو حسین کو

سب خوش تھے خیمۂ شہِ ذیجاہ میں مگر
چیں بر جبین تھے زینبِ ناشاد کے پسر

نہ جانبِ عَلَم تھی نہ مانگی طرف نظر
آنکھوں میں ڈبڈبائے تھے آنسو جھکے تھے سر

اِس طرح تھا عرق رُخِ پرآب و تاب پر
جیسے پڑے ہوں قطرۂ شبنم گلاب پر

پھر کر اُدھر سے ماں نے جو بیٹوں کی لی نظر
سمجھیں عَلَم نہ ملنے سے بیدل ہیں یہ قمر

ہٹ کر کیا اشارا کہ آؤ ذرا اِدھر
آئے عقب سے شہ کے سعادت نشاں پسر

بولیں کہ اب نہ ہوش نہ مجھ میں حواس تھے
قربان جاؤں کیا ہی جو چہرے اوداس تھے

ہتھیار سج چکے ہیں شہنشاہِ حق شناس
تم نے نہ زیبِ جسم کیا فاخرہ لباس

مردوں کو جان دینے میں ہوتا نہیں ہراس
دولھا سے بن کے جاؤ امامِ اُمم کے پاس

کچھ ملگجے ہیں آؤ میں کپڑے اُتار دوں
سرمہ لگا دوں گیسوئے مشکیں سنوار دوں

شب سے تو صبح تک یہ دعا تھی ہر ایک پل
تیغوں میں پہلے ہم کو کرے سرخرو اجل

اب کیا ہوا یہ کونسا غصہ کا ہے محل
آنکھوں میں اشک رُخ پہ عرق ابرو پر بل

وہ خوش مزاجیاں نہ وہ باتوں کے طور ہیں
اِس وقت دیکھتی ہوں کہ تیور ہی اور ہیں

ماں پر یہ آفتیں ہیں یہ ماموں پہ ظلم و جور
پیارو ہمارے حال پہ لازم ہی تم کو غور

نازک مزاجیوں کے کسی دن تھے یہ طور
اب مشورے ہیں اور تصور ہیں اور اور

وہ دل نہیں وہ آنکھ نہیں وہ نظر نہیں
اوروں کا ذکر کیا تمھیں میری خبر نہیں

اس کا نہیں خیال کہ کیونکر جیے گی ماں
ہوتا ہی آفتوں میں محبت کا امتحاں

تم میری دس برس کی ریاضت ہو میری جاں
مجھ سے سوا ہی کون تمھارا مزاج داں

جس پر یہ برہمی ہی وہ سب جانتی ہوں میں
غصّہ کی آنکھ کا ہیکو پہچانتی ہوں میں

پردا ہی تو سناؤ الگ چل کے اک حال
دونوں نے عرض کی کہ نہیں کچھ نہیں ملال

ہاں ہم کو آج بھول گئے شاہ خوش خصال
اوروں کی پرورش ہی ہمارا نہیں خیال

کیا وارثہ دار جعفر طیار ہم نہ تھے
اس عہدۂ جلیل کے حقدار ہم نہ تھے

انگشت رکھ کے دانتوں میں ماں نے کہا کہ ہا
اب اُس کا ذکر کیا ہی جو ہونا تھا ہو چکا

دیکھو سُنیں نہ زوجۂ عباسِ باوفا
اچھا یہ ہی خوشی کی جگہ یا گلے کی جا

غبطہ نہ اُس میں چاہیئے جو امرِ خیر ہو
واری وہ کون غیر ہی تم کون غیر ہو

اِک دو پہر کے واسطے ناحق یہ قیل و قال
تم ہو گئے تا یہ عصر نہ عباس خوش خصال

اِس دن کی دے گئے ہیں خبر شیرِ ذوالجلال
مجکو نہیں یقیں کہ بچے فاطمہ کا لال

پیدا ہوئی ہوں اشک بہانے کے واسطے
رہ جاؤں گی میں قبر میں جانے کے واسطے

لو اپنے دودھ کی تمھیں دیتی ہوں میں قسم
اب کچھ کہو گے منہ سے تو ہو گا مجھے بھی غم

سنتے تھے تم جو کہتے تھے عباسِ ذی حشم
دو جا کے اُن کو تہنیت عہدۂ علم

صدقے گئی خلافِ ادب کچھ سخن نہ ہو
میری خوشی یہ ہی کہ جبیں پر شکن نہ ہو

کُنبے میں ایک نے بھی اگر سُن لیا یہ حال
کہتی ہوں صاف میں مجھے ہو گا بہت ملال

ننھے سے ہاتھ جوڑ کے بولے وہ نونہال
ہم باوفا غلام ہیں کیا تاب کیا مجال

دیجے ہمیں سزا جو ابرو پہ پھر پڑیں
کہیے تو چھوٹے ماموں کے قدموں گر پڑیں

زینب بلائیں لیکے یہ بولیں کہ میں نثار
دونو ہو تم سعید و رشید و وفا شعار

وے ایسے بیٹے سب کو زمانے میں کردگار
ذی قدر و ذی شعور و سخن فہم ذی وقار

لازم خوشی ہی جو جسے عہدہ سپرد ہو
چھوٹوں کے تم بزرگ گئے گود کے خورد ہو

پہنائے پیار سے انھیں پھر فاخرہ لباس
ہتھیار جب لگائے تو روئیں بدر دو یاس

جب اُن کو لیکے آئیں امامِ امم کے پاس
بولے گلے لگائے انھیں شاہ حق شناس

دو چاند ہیں یہ خانۂ شیر الٰہ میں
زینب انھیں بھی بھیجو گی کیا قتل گاہ میں

نکلے نہیں ہیں گھر سے ابھی تک گلبدن
تلوار اگر چلی تو پڑے گا غضب کا رن

فوجوں سے گونجتا ہی یہ سب بلا کا بن
طالب ہیں ایک جان کے دو لاکھ تیغ زن

لشکر سے تیر کیں مری جانب جو آئیں گے
میں کس طرح جیوں گا جو یہ زخم کھائیں گے

بنتِ علی نے عرض یہ کی ہاتھ جوڑ کر
رکھتی نہیں کچھ اور میں یا شاہِ بحر و بر

اک جان ہی بس اور یہ دو پارۂ جگر
مایہ مری یہی یہی دولت یہی ہی زر

پالا ہو جس نے اُس کا نہ کچھ حق ادا کروں
اِن کو بچاؤں گر تو کسے پھر فدا کروں

پھر عرض کی کہ ای خلف شاہ قلعہ گیر
اس کا نہ کیجیے دھیان کہ یہ سن میں ہیں صغیر

دونوں نے بنتِ شیرِ خدا کا پیا ہی شیر
سینہ سپر کریں گے جب دم چلیں گے تیر

تلواریں چمکیں خون کے دریا چڑھے رہیں
امید ہی کہ سب سے یہ آگے بڑھے رہیں

حضرت کے آگے بات کی اِن کو نہیں مجال
مخفی حضور پہ ہی ارادوں کا اِن کے حال

دادا کا رعب و دبدبہ و شوکت و جلال
تیغ و سپر میں ہی شہِ مرداں کی چال ڈھال

یہ کیجے نظر سنوں پہ تو بیشک صغیر ہیں
ہمت میں نوجوان ہیں متانت میں پیر ہیں

روتی تھی میں جو آج کی شب کو بدر دو یاں
دونوں دلاسا دینے کو آ بیٹھے میرے پاس

آ کر کہا کہ آپ کو اتنا ہی کیوں ہراس
آسان کچھ ہی قتل شہنشاہِ حق شناس

کل شیر سب ہیں اور یہ دشتِ مصاف ہی
سُن لیجیے گا آپ کہ میدان صاف ہی

حضرت کے ساتھ فضلِ خدا ہے وہ دلیر
تھرا کے بھاگ جاتا ہے نعروں سے جن کے شیر

تا کوفہ کیا عجب ہے جو ہوں زخمیوں کے ڈھیر
کر دیں گے رستموں کو زبردستیوں سے زیر

بچے ہیں شیر کے جنھیں بچہ سمجھتی ہیں
کیا آپ ماموں جان کو تنہا سمجھتی ہیں

بیکا ہو دشمنوں کا شہِ دیں کے بال اگر
پھر کاٹ ڈالیے گا تنوں سے ہمارے سر

حضرت تک آ سکے کوئی کیا جان کیا جگر
آنکھیں نکال لیں جو کرے غیظ سے نظر

پوتے شجاع کے ہیں نواسے دلیر کے
ساعد ہیں یہ علی کے یہ بازو ہیں شیر کے

لاکھوں میں دس جو ہم ہوں تو نہیں اس کی آن بان کے
حافظ ہیں سب یہ مصحفِ ناطق کے جان کے

حملے کریں گے رن میں جو سینوں کو تان کے
مل جائینگے زمین سے طبق آسمان کے

سو سو کی جان لے کے سراک جان کھوئے گا
ہم سب کے بعد ہو گا جو قسمت میں ہوئے گا

خالی نجائینگے یہ شجاعت کے ولولے
رکھدینگے دوڑ دوڑ کے تیغوں پہ خود گلے

ہم بھی ہیں بنتِ فاطمہ کے شیر کے پلے
مرتے ہیں شوق میں کہیں تلوار تو چلے

چمکا کے نیچوں کو جو کھیلینگے جان پر
لاشے زمین پہ ہوں گے لہو آسمان پر

دونوں نے اس طرح بفصاحت کیا بیاں
مجکو یقینِ فتح ہوا یا شہِ زماں

گویا دوبارہ آ گئی میرے بدن میں جاں
خوش ہو کے بولی میں کہ تصدق ہو تم پہ ماں

محسن ہو آج جو مرے بھائی کی بن پڑے
اس منہ کے میں نثار خدا اس کو سچ کرے

ہر بار دیکھتی ہوں میں ان کی طرف بغور
دو تین دن سے اور ہیں کچھ تیوروں کے طور

کہتے ہیں ناگوار ہیں اعدا کے ظلم و جور
جب چین ہو مٹے جو یزیدِ لعیں کا دور

سکہ پڑے حسینِ علیہ السلام کا
خطبہ ہو منبروں پہ شہیدوں کے نام کا

نو دس برس کے ہیں ابھی بچوں کے کیا ہیں سن
راتیں یہ غفلتوں کی ہیں اور کھیلنے کے دن

یہ تو وہ معرکہ ہے کہ ہیں مضطرب مسن
لیکن کنیز ان کی طرف سے ہے مطمئن

گھوڑے اڑا اڑا کے جو فوجوں پہ جائینگے
اتنا میں جانتی ہوں کہ جیتے نہ آئینگے

پہروں ہنسیں جو چھوٹے کی باتیں سنیں حضور
کہتا ہی نیمچے کو ہلا کر وہ ذی شعور

نامرد ہی جو آج کرے جنگ میں قصور
اس کو نہ قصرِ خلد ملے اور نہ حورِ عور

بس چند روز رہ چکے دنیائے زشت میں
کل پہلے داخلہ ہی ہمارا بہشت میں

ہر بار الٹ کے کرتے کی ننھی سی آستیں
کہتا ہی کیا لڑینگے دلیروں سے اہلِ کیں

ہیں مرتضیٰ علی کے پسر شیرِ خشمگیں
جانیں ہزار ہوں تو نثارِ امامِ دیں

کل نیمچے ہیں اور عدو کی سپاہ ہی
روتی ہیں والدہ ہمیں دنیا سیاہ ہی

ہنس ہنس کے مجھ سے کرتے تھے دو نو ابھی بیاں
ہم کو حضور نے نہ دیا فوج کا نشاں

میں نے کہا تو ہی ہوئے کچھ دستِ ناتواں
بولے کہ خیر آئے تو ہنگامِ امتحاں

ابتو غلام قبلۂ عالم کے ساتھ ہیں
کوفے کا در ہی اور یہ کمزور ہاتھ ہیں

فرمایا شہ نے ان کی شجاعت میں فرق کیا
ہیں ورثہ دار شیرِ الٰہی یہ با وفا

اچھا ہمارے ساتھ چلے ایک دل ربا
زینب تمہارے پاس ہے ایک مہ لقا

تم کس طرح جیوگی جو دونوں سے یاس ہو
گھر لٹتے وقت ایک تو فرزند پاس ہو

زینب نے عرض کی کہ مجھے ہی یہ آرزو
دونوں نثار آپ پہ ہوں میرے روبرو

بچ جاے جان آپ کی یا شاہِ نیکخو
میں طالبِ ثواب یہ خواہانِ آبرو

بہتر ہی دونوں بیٹوں کی گر سوگوار ہوں
میں بھی جنابِ فاطمہ کی ورثہ دار ہوں

طفلی سے آج تک نہ ہوے یہ کبھی جدا
کھیلے تو ایک گھر میں پلے ہیں تو ایک جا

چرچا ہی سارے کنبے میں دونو کے پیار کا
بیشک ہیں ایک جان دو قالب یہ مہ لقا

تڑپے ملاپ کو جو خفا ہو کے بھائی سے
وہ کس طرح جیے گا جدا ہو کے بھائی سے

دم بھر مفارقت ہو تو آنسو بہاتے ہیں
روتے ہیں اس طرح کہ مجھے بھی رلاتے ہیں

دونوں جب ایک جا ہوں تو کھانے کو کھاتے ہیں
مکتب میں ساتھ جاتے ہیں اور ساتھ آتے ہیں

بھائی جو زخمِ نیزہ و شمشیر کھائے گا
انصاف آپ کیجیے یہ مر نہ جائے گا

چھوٹا تنک مزاج ہی یا شاہِ بحر و بر
سُن لے تو جان دیدے گلا اپنا کاٹ کر

نو دس برس جہان میں ہوئے جس طرح بسر
باہم یوہیں جہان سے کریں آخری سفر

ہر جا بڑے کے ہاتھ میں چھوٹے کا ہاتھ ہو
میں چاہتی ہوں دونوں کا مرنا بھی ساتھ ہو

باپ ان کا آج ہوتا جو یا شاہِ نامدار
کرتا قدم پہ سر کو تصدق بہ افتخار

ایک اُن کے بدلے آپ کے قدموں پہ ہو نثار
میرے عوض فدا کرے ایک اپنی جانِ ار

اِن پر ہمارا حق ہی تو ہم پر حق آپ کا
یہ بھی تو کچھ ادا کریں حق اپنے باپ کا

کرتے تھے مجھ سے وقتِ سفر یہ بیاں
محروم اس شرف سے ہوں میں نر و ناتواں

بچوں کا ساتھ اور سفرِ خوف الاماں
مجبور دشمنوں میں چلے ہیں شہِ زماں

وقت آپڑے تو پاس ہمارا نہ کیجیو
بیٹوں کو تم حسین سے پیارا نہ کیجیو

گردن جھکا کے کہنے لگے شاہِ خاص و عام
تم کو جہان میں پسر نہ ملیں گے یہ تشنہ کام

مٹتی ہی نسلِ جعفرِ طیّار نیک نام
چھاتی سے سر لگا کے وہ بولی کہ یا امام

للہ ان کے باب میں اب کد نہ کیجیے
ہدیہ فقیر کا ہی اسے رد نہ کیجیے

چُپ ہو گئے سُن اس سے بہت خوب کہہ کے شاہ
قاسم نے کی یہ عرض کہ یا شاہِ دیں پناہ

بڑھ آئی ہی اُدھر سے بہت شام کی سپاہ
فرمایا آپ نے کہ نگہبان ہی اللہ

حملوں سے فوجِ شام کے جی چھوٹ جائینگے
جب ہم بڑھے تو موج سے سب ٹوٹ جائینگے

زینب کے نورِ عین بڑھے جب بصد حشم
کھولا سروں پہ حضرتِ عباس نے عَلَم

ماں کا اشارا تھا کہ رہے شفقت و کرم
ہاتوں کو جوڑ جلد جھکو چومنے قدم

کچھ حد ہی اس بزرگی و جاہ و جلال کی
دیکھیں نہ آنکھ شہِ مرواں کے لال کی

لیکر بلا میں بھائی کی بولی وہ سوگوار
اپنے غلام سمجھو انھیں تم پہ ہیں نثار

پہلے پہل نکلتے ہیں گھر سے یہ گلعذار
ان کی مدد ضرور ہی ہنگامِ کارزار

صدمے سے جان اب نہیں ہرا کی جائی میں
ڈھرکا یہ ہی کہ دیکھیے کیا ہو لڑائی میں

سیراب اُدھر ہیں سب انھیں سو لہر کی پیاس
کیا ہو جو نہر دیکھ کے ہو جائیں بے حواس

پشتی پہ جب ہو شیر تو بیجا ہی پھر ہراس
رہنا نہ دور ان سے اگر ہی بہن کا پاس

بچے کہاں یہ اور وہ دل فوج شام کا
بھیّا مجھے ہی دھیان بزرگوں کے نام کا

زندوں میں آؤں میں جو بہ مقتل سے مر کے آئیں
کنبے میں سُرخرو ہوں اگر خوں میں بھر کے آئیں

ایلیٹ بہادروں کی صفیں نام کر کے آئیں
خیمے میں آئیں اب تو جہاں سے گزر کے آئیں

بھیّا مجھے قسم ہی جناب امیر کی
پانی پیا تو بوند نہ بخشوں گی شیر کی

عبّاس نے کہا یہ نہ فرمائیے حضور
ایسے یہ شیر ہیں کہ کریں جنگ میں قصور

بچے کسی نے دیکھے ہیں اس طرح کے غیور
کونے کو شام پر جو اُلٹ دیں تو کیا ہی دُور

بچپن میں کافروں سے خدا کے ولی لڑے
یہ یوں لڑینگے جیسے احد میں علی لڑے

ہی سب عرب میں لیت سے غالب انھیں کا جد
مثل علی و غا میں کرینگے یہ جدّ و کد

جس دم رجز پڑھینگے یہ صفدر بشدّ و مد
غل ہو گا گو نجتے ہیں ترائی میں دو اسد

یہ پارہ جگر ہیں علی سے دلیر کے
سب خصلتیں ہیں شیر کی بچے ہیں شیر کے

کچھ فکر کی جگہ نہ تردد کا ہی مقام
سُن لیجیے گا آج یہ جیسے کرینگے کام

اِن سے کبھی جدا نہیں رہنے کا یہ غلام
میں عبدِ سرفروش ہوں اے خواہر امام

بندے کا حفظ خالقِ عالم کے ہاتھ ہی
روتی ہیں آپ کیوں مری جان ان کے ساتھ ہی

یہ سُن کے مضطرب جو پھری وہ جگر فگار
دیکھا بڑھے ہیں جانب در شاہِ نامدار

پھیلا کے ہاتھ کہنے لگے شاہِ ذی وقار
زینب گلے سے بھائی کے لپٹو پھر ایک بار

جو حالِ دل ہی کہہ نہیں سکتا زباں سے میں
چھٹتی نہیں تم آج بچھڑتا ہوں ماں سے میں

بھائی بہن کے درد کی باتیں لکھوں اگر
بہہ جائے آب ہو کے جو پتھر کا ہو جگر

چھاتی سے سر لگائے ہوئے تھی وہ نوحہ گر
رکھے ہوئے تھے دوش پہ سر شاہِ بحر و بر

غم سے جگر لہو تھا شہِ مشرقین کا
سیدانیوں میں شور تھا ہی ہی حسین کا

بنت علی کے پیچھے تھی سیدانیوں کی صف
غُل تھا مدد کو آیئے اب یا شہِ نجف

لڑیاں تھیں چار ایک سی اشکوں کی وظف
شہ کہتے تھے بہن نہ کرو جان کو تلف

غربت میں اور کوئی نہ یاور نہ عون ہے
تم مر گئیں تو پھر مرے بچوں کا کون ہے

فرما کے یہ بڑھا پسرِ ختمِ مرسلیں
ماتم کی صف پہ بیبیاں زینب کو لے گئیں

مشکل تھا ضبط غش ہوئی وہ بیکس و حزیں
خیمے سے نکلے روتے ہوئے بادشاہِ دیں

وا من سلم کا کھول کے عباس رک گئے
صف باندھ کر سلام کو مجرائی جھک گئے

دیکھا جو نورِ چہرۂ سردارِ خاص و عام
پڑھنے لگے درود جوانانِ تشنہ کام

سر کو جھکا جھکا کے جھکے جب پئے سلام
جو سر تھا سر جھکانے میں وہ پا گئے امام

یعنی غلام منکسر و خاکسار ہیں
اس پائے عرش قدر پہ یہ سر نثار ہیں

سب فوج کو سلام کا جب دے چکے جواب
بس جانبِ فرس متوجہ ہوئے جناب

روح الامیں نے دی یہ صدا تھام کر رکاب
بسم اللہ اے خدیوِ زماں مالکِ قاب

نورِ محمدی رخِ انور کی ضو میں ہے
شوکت تری رکاب میں نصرت جلو میں ہے

اس شان سے فرس پہ شہِ انس و جن چڑھے
جس طرح نکلے ابر سے خورشید و ن چڑھے

بہرِ جہاد راہِ خدا مطمئن چڑھے
گھوڑوں پہ نوجوانوں سے پہلے مسن چڑھے

سب جاں فشاں سوار تھے راہِ ثواب میں
پیدل مگر تھے ابنِ مظاہر رکاب میں

بڑھتا تھا خون جوشِ شجاعت سے دم بدم
گردن میں وہ کجی تھی نہ مطلق کمر میں خم

ہر نوجوان سے تھا یہ اشارا بصد حشم
یعنی جہاں سے جائنگے سیدھے جناں میں ہم

برمیں زرہ کمانِ کیانی تھی دوش پر
قبضے پہ ایک ہاتھ تھا اک زین پوش پر

ابرو جھکے جو پڑتے تھے پلکوں پہ بار بار
رومال پھاڑ کر انھیں باندھا تھا استوار

آنکھوں سے شیرِ نر کے جلالت تھی آشکار
گویا کہ تھی غلاف میں حیدر کی ذوالفقار

جلدی چلے جو چند قدم جھوم جھوم کے
رعشہ وداع ہو گیا ہاتوں کو چوم کے

اِک شور تھا کہ عود کیا پھر شباب نے
یا کی دُعا حبیب کے حق میں جناب نے

ریشِ سفید رُخ پہ سیہ کی خضاب نے
پائی یہ آب و تاب کہاں آفتاب نے

بر زیرِ نور سینہ کو آئینہ ہو گیا
یوں جُھرّیاں مٹیں کہ تن آئینہ ہو گیا

کہتے تھے باگ روکے ہوئے شاہِ نامدار
یہ کس لیے پیادہ روی اے نحیف و زار

میں بھی اُتر پڑوں گا نہ ہوگے اگر سوار
کرتے تھے عرض یہ کہ توانا ہی جاں نثار

ہر چند پیرِ خستہ دل و ناتواں شدم
ہر گہ نظر بروے تو کردم جواں شدم

فرمایا تم کو دیتا ہوں اُس سر کی میں قسم
جو بعدِ عصر تیغ سے ہو جائے گا قلم

میں بھی نکالتا ہوں کابوس سے اب قدم
اچھا تمھارے ساتھ پیادہ چلیں گے ہم

پونہچو جناں میں بحرِ مصیبت کو جھیل کے
ہم تم تو ایک گھر میں پلے ساتھ کھیل کے

وہ لوٹنا بھی خاک کا اب تک ہی یادگار
تم پر بھی گرد تھی مری لغوں پہ بھی غبار

اُس وزم تم پہ مجھ سے سوا تھا نبی کا پیار
فرماتے تھے یہ ہی مرے پیارے کا دوست دار

شبیر کے حبیب کو پہچانتا ہوں میں
لوٹے گا یہ لہو میں یوہیں جانتا ہوں میں

رو کر کہا حبیب نے آخر ہوا وہ دور
اب اُن کا دور ہی کہ جو ہیں حاکمانِ جبر

یہ وقت اور کچھ ہی وہ ہنگام تھا کچھ اور
مولا کبھی رہا نہیں دُنیا کا ایک طور

گردش نے فلک کی نئے انقلاب میں
کوثر ہی جن کا آج وہ محتاج آب ہیں

یہ عرض کر کے روئے حبیبِ وفا شعار
جھک کر کہا یہ پیرِ غلام آپ پر نثار

جب تک سمند پر وہ دلاور ہوا سوار
روکے رہے لگامِ فرس شاہِ نامدار

ہر دوست پر پدر سے زیادہ شفیق تھے
کیا قدر داں وہ شاہ تھا اور کیا رفیق تھے

بس جھپٹ کر فرس کو امامِ زماں بڑھے
آگے جو تھے رُکے ہوئے وہ سب جواں بڑھے

کاندھوں پہ رکھ کے نیزوں کو شیر اں بڑھے
مشتاقِ تیغ و خنجر و تیر و سناں بڑھے

یوں طے کیا دلیروں نے اُس راہِ خیر کو
جاتا ہی جس طرح کوئی گلشن میں سیر کو

بشاش قتل گاہ میں پہنچے جو وہ دلیر
نیزوں کو گاڑ گاڑ کے گونجے مثالِ شیر

دعویٰ یہ تھا کہ کیجیو ان سرکشوں کو زیر
عرصہ نہ جنگ میں ہو فتح و ظفر میں دیر

تیغوں سے روم و شام کی بستی اُجاڑ دیں
کوفے کے در پہ جا کے نشانوں کو گاڑ دیں

حد سے سوا تھی کثرتِ فوجِ ستم شعار
لکھی ہی راویوں نے چھ لاکھ اور دس ہزار

پیدل تھے بے حساب تو تھے لاتعد سوار
فوجوں کا دستِ چپ کے بھی کن نہیں شمار

پیکِ خیال جا کے پھر آتا تھا راہ سے
پنہاں تھی کربلا کی زمیں سب نگاہ سے

اکناف بحر و بر میں جو لشکر کا تھا مقام
شہر و جبل بھرے ہوئے تھے فوج سے تمام

ناکوں پہ چوکیاں تھیں جزیروں میں اہتمام
مسدود ہو گئی تھی سبیلِ خط و پیام

آیا کبوتر اُڑ کے جدھر صید ہو گیا
قاصد جہاں ملا وہ وہیں قید ہو گیا

ظاہر ہوئی سیاہیِ لشکر سے دن کو رات
وہ کشمکش کہ موت کے طالب تھے ذی حیات

دُنیا پرست دشمنِ ساداتِ نیک ذات
مقتل سے کوفے تک ہی فتونِ یوں صفات

دریا کے صرف آب سے لب خشک ہو گئے
جتنے کنوئیں تھے راہ میں سب خشک ہو گئے

دُنیا میں نیک کم ہیں بہت اور بد ہزار
لکھا ہی فوجِ شہ کا کتابوں میں یہ شمار

چالیس کل پیادے تھے تیس سب سوار
طفل اُن میں تھے کئی سمن اندام و گلعذار

بوٹے سے تو تھے ایک بھی اُن میں جواں نہ تھا
سبزہ بھی جن کے گورے رُخوں پر عیاں نہ تھا

بچوں میں سبزہ رنگ کوئی تھا کوئی صبیح
شیریں سخن لبوں میں نمک رنگتیں ملیح

چاہیں لبوں کو اُن کے جو باتیں سنیں فصیح
مردوں کو دم میں زندہ کریں صورتِ مسیح

جدّ و پدر کی طرح جری تھے دلیر تھے
بچے تھے یوں پہ غیض جو آئے تو شیر تھے

وہ نیچے ہلال کے دمِ خم پہ جن کو فوق
جرات کا جوش تیغ زنی کا دلوں میں شوق

ہنس ہنس کے زخم کھائیں زبانوں کو اُن کا ذوق
گیسو خوں پکانوں میں بندے گلوں میں طوق

آنکھیں جو نرگسی ہیں تو رُخ بھولے بھالے ہیں
نذروں کے منتوں کے مرادوں کے پالے ہیں

یہ تصویر ۱۲۷۵ھ کے ایک قلمی نسخہ سے لی گئی ہے

ایک ایک خوش بیاں تو ہزار نکتہ سنج ہے
کچھ پیاس کا نہ غم ہے نہ فاقوں کا رنج ہے

لشکر وہ ہے کہ حسن کے دریا کا گنج ہے
چہرہ ہزار کا ماہ چہار و دو پنج ہے

انگڑائیاں جو لیتے ہیں سینوں کو تان کے
کہتا ہے حسن خود کہ نثاران کی شان کے

کم گو کوئی حسیں کوئی شیریں سخن کوئی
بچپن میں سرو قد کوئی رشکِ چمن کوئی

نازک مزاج کوئی تو گل پیرہن کوئی
تصویرِ جد کوئی تو شبیہِ حسن کوئی

دولت یہی حسین کے حصہ میں آئی تھی
مایہ تھا فاطمہ کا علی کی کمائی تھی

شیرانِ دشت کو جگر ایسے نہیں ملے
غواص کو کبھی گہر ایسے نہیں ملے

حمزہ کو جنگ کے ہنر ایسے نہیں ملے
جعفر نے پائے بال پر ایسے نہیں ملے

جو تھا نبی کے بعد خدا کے ولی کا تھا
حضرت کو وہ ملا کہ جو حصہ علی کا تھا

پہلے پہل جو نکلے تھے گھر سے وہ گلعذار
تیغیں چمکتی دیکھ کے بڑھتے تھے بار بار

فرماتے تھے یہ روک کے عباسِ نامدار
شبیر وا بھی نہیں ہے تمہیں حکمِ کارزار

حجت تمام کی نہیں شاہِ غیور نے
سبقت نہ کرنا منع کیا ہے حضور نے

عجلت کو جانتے ہیں سبک جو ہیں بردبار
مے وقت دوڑتے نہیں فی قدر دی وقار

دیکھو تماشہ فوج کی کثرت ہے بے شمار
باجے بجا کے کھولینگے رایت ستم شعار

جلدی نہ کیجو گو کہ لڑائی میں دیر ہو
تم تو خدا کے شیر کے شیروں کے شیر ہو

دستِ ادب کو جوڑ کے بولے وہ تشنہ کام
کر دیجے ہمیں علی اکبر کے پانیام

بیٹے سے مسکرا کے یہ کہنے لگے امام
عاشق تمہارے نام کے ہیں یہ فلک مقام

بیٹا یہ سن میں چھوٹے ہیں سب میں بڑے ہو تم
اچھا صف ان کے باندھ کے آگے کھڑے ہو تم

پھرے ہوئے ہیں شیر خبردار ہو شیار
کوئی بڑھانے پائے نہ اس صف سے راہوار

عجلت ہر ایک امر میں بچوں کا ہے شعار
بہلا کے روکے رہنا انہیں تم پہ ہے نثار

جان اپنی سب دیے ہیں نبی رگوں کے نام پر
گھوڑے اڑا کے جانہ پڑیں فوجِ شام پر

تسلیم کرکے شہ کو مرتب جو کی وہ صف
سب جس پرے میں تھے گہر قلزم شرف

فرقت میں جن کی چاک رہا سینۂ صدف
زہرا کے رشتہ دار یدا اللہ کے خلف

اُن سے کسے جہان میں عشقِ ولی نہیں
اب تک وہ آبرو تو کسی کو ملی نہیں

شرمندہ جس سے چاند ہو چہرے وہ تابناک
دل بلبلوں کے خون تو گریباں گلوں کے چاک

خود وادیٔ السلام جو چھانے نجف کی خاک
ایسے کبھی ملیں گہر ہائے صاف و پاک

تسبیح ہاتھ آئے یہ کس نیک نام کو
دُرِ نجف تھے وہ جو ملے تھے امام کو

شیرِ خدا کے سات جگر بند نامدار
دونوں نواسے حضرتِ زہرا کے یادگار

پوتے چھوؤں وحیدِ زماں فخرِ روزگار
یکتائے دہر پانچ بھتیجے فلک وقار

خود جس کی فرع واصلِ علی و بتول تھے
یہ سب اُسی درخت کی شاخوں کے پھول تھے

یوسف تھے ایک مصر میں اور مشتری ہزار
کیف و کم ثمن ہی کتابوں سے آشکار

یوسف سے کربلا میں تھے اٹھارہ گلعذار
عالم کی جان فخرِ حسینانِ روزگار

یاں منزلت تھی قدر تھی قیمت تھی قوت تھی
زہرا کے یوسفوں کی خریدار موت تھی

تیغ و تبر اگر ہوں ہلال اور آفتاب
سر کاٹے چہرۂ علی اکبر سے پھر نقاب

گر دیکھ لیں وہ حسنِ ملیح اور وہ شباب
حوریں گلوں کو کاٹ کے تڑپیں ہے نہ تاب

پریاں تو اُن کے سایہ کا پیچھا نہ چھوڑتیں
دامن کبھی جنابِ زلیخا نہ چھوڑتیں

لاریب فیہ حُسن میں یوسف تھے بے مثال
گستاخیاں معاف ادب کا بھی ہے خیال

مثلِ نبی ملیح تھے یہ سب نکو خصال
وہ خامشی سخن کی وہ شیرینیٔ مقال

شہرہ آج تک ہے خوبیٔ یوسف میں شک نہیں
پھیکا ہے پرتو حسن کہ جس میں نمک نہیں

ناگہ نشان بڑھا اُدھر کی سپاہ نے
کھولا اِدھر علم کو علمدار شاہ نے

چوما نشاں کو بڑھ کے ہر اک خیر خواہ نے
طوبا لکم کہا شہِ عالم پناہ نے

رفعت بڑھی زمینِ سعادت سرشت کی
ٹھنڈی ہوا پھریرے سے آئی بہشت کی

رایت وہ سبز لشکرِ سادات کا نشاں
وا بانِ پاک کشتیٔ اُمت کا بادباں

پنجہ مثالِ پنجۂ خورشیدِ زر فشاں
پرچم تھا بال کھولے تھی یا حورِ جناں

مشکِ عبیر و عود کا بازار سرد تھا
مٹی کا عطر خاک کی خوشبو سے گرد تھا

نقارۂ وغا پہ لگی چوب ناگہاں
گردوں پہ مثلِ رعد سے پار ہوئی طبل کی فغاں

شہپور کے غریو سے ہلتا تھا آسماں
قرنا کی وہ مہیب صدا تھی کہ الاماں

نیزوں کو ہر سوار اُدھر تولنے لگا
گونجے اِدھر بھی شیر کہ رن بولنے لگا

شہنا کا شور سُن کے لرزتا تھا بند بند
برچھی ہلی رسالوں میں نیزے ہوئے بلند

صحرائے ہولناک کی وحشت ہوئی دوچند
ڈر کر کنوتیوں کو پلٹنے لگے سمند

سن کر دہل کا شور کلیجے دہل گئے
صحرا سے دب کے شیرِ نیستاں نکل گئے

پیاسوں پہ جب اُدھر سے چلے تیر بے شمار
مولا نے غازیوں کو دیا حکمِ کارزار

نکلے وغا کو قبلۂ عالم کے جاں نثار
جن کی شجاعتیں ہیں زمانے میں یادگار

ہونگی نہ ہیں نہ ایسے کبھی باوفا ہوئے
سب جاں نثار حق نمک سے ادا ہوئے

حر و بریر و وہب و عمیر فلک مقام
وہ مسلم ابن عوسجہ عرش احتشام

سعد و زہیر قین و حبیب نجستہ کام
وہ شیر جس کا بوعمر نہشلی تھا نام

جس غول پر جھپٹ کے یہ آئے وہ ہٹ گیا
ایک ایک مرتے مرتے پروں کو اُلٹ گیا

نکلے وغا کو ایلچیِ شاہ کے پسر
ماتم میں تھے کہ تھا ابھی تازہ غمِ پدر

فوجوں پہ حملہ ور ہوئے جس دم وہ شیر نر
دم میں تنوں سے کٹ کے گرے کوفیوں کے سر

رن پر چڑھے جو سوگ کے کپڑے اُتار کے
مارے گئے وہ شیر ہزاروں کو مار کے

لاشوں کو قتل گاہ سے لے آئے جب حسینؑ
نکلے پرے سے حضرتِ زینبؑ کے نورعین

کی عرض یا امامِ زماں شاہِ مشرقین
راتوں میں ہے یتیموں کے ماتم کا شور و شین

پھر وقت کو نسا ہے جواب ہم فدا نہ ہوں
دل تھرتھرا رہے ہیں کہ اماں خفا نہ ہوں

فرمایا کیا نجاؤ گے رخصت کو ماں کے پاس
دونوں نے ہاتھ جوڑ کے تب کی یہ التماس

اکبر سے آپ پوچھ لیں یا شاہِ حق شناس
فرما رہی ہیں والدۂ آسماں اساس

اب گھر میں آئیو تو وغا کر کے آئیو
سر لیکے ابنِ سعد کا یا مر کے آئیو

فرمایا خیر فوج سے جنگ و جدل کرو
جو ماں نے کہدیا ہے اسی پر عمل کرو

ہاں خواہشِ وصالِ عروسِ اجل کرو
بچپن میں اس بقا کو فنا سے بدل کرو

راحت نے اس طرف نہ کیا رخ نہ چین نے
دیکھے نہ ماں نے بیاہ نہ سہرے حسین نے

تسلیم کر کے گھوڑوں پہ وہ نازنیں چڑھے
غل پڑ گیا جہاد کو دو مہ جبیں چڑھے

یوں اشہبوں پہ دلبرِ ضرغامِ دیں چڑھے
نظروں سے سب اُتر گئے گھوڑے زمیں چڑھے

پریاں نکل کے قاف کی اہوں سے چھپ گئیں
دو بجلیاں چمک کے نگاہوں سے چھپ گئیں

پہونچے جو زین ہیں برجِ شرف کے وہ آفتاب
نیزے زمین پہ گاڑ دیئے مثلِ بوتراب

نعرہ کیا کہ اُو پسرِ سعد نے حجاب
ہمراہ لے کے شمر کو آ سامنے شتاب

گو سیکڑوں سوار ہزاروں پیادے ہیں
تلوار پہلے تجھ سے چلے یہ ارادے ہیں

ہم نے سُنا ہے یہ کہ قریشی نسب ہے تو
نیکوں میں ہے ہوئے ہیں بدوں میں خجستہ خو

ہم ٹوکتے ہیں اوسگِ ناپاک و کینہ جو
شیروں سے آ وغا کو جو ہے پاسِ آبرو

فاقوں میں نبرد دیکھ جدال و قتال دیکھ
دعویٰ ہے کچھ تو ہاشمیوں کا جلال دیکھ

ماں بنتِ فاطمہ ہیں بنی فاطمہ ہیں ہم
دادا ہیں ابنِ عم رسولِ فلک حشم

ہیں اس طرح حسب میں نبی و علی بہم
دو نام کو ہیں ایک ہیں پر کعبہ و حرم

بھائی جُدا ہے خویش جُدا ہے وصی جُدا
اُن سے علی جُدا نہ خدا سے نبی جُدا

نے فصل ہے وصی نبی مالک الرقاب
ضرغامِ دین مدینۂ علم نبی کا باب

دریائے فیضِ رحمتِ معبود کا سحاب
نورِ خدا سپہرِ جلالت کا آفتاب

جو اُن سے منحرف ہوا وہ دوزخی ہوا
ایسا کوئی شجاع نہ ایسا سخی ہوا

کہف الورے سراج ہدے حجتِ خدا
جس سے فزوں کسی نے نہ کی طاعتِ خدا

ہر ضرب جس کے ہاتھ کی تھی ضربتِ خدا
خاکی بنا وہ آئینہ قدرتِ خدا

حق ساتھ ہی حسین کے ہم اُن کے ساتھ ہیں
پہنچا علی کا زور جنھیں یہ وہ ہاتھ ہیں

چھوٹے نے کی یہ عرض کہ بڑھیے بس اب حضور
مخفی ہوا ہی خیمے میں ڈر کر وہ بے شعور

ہوتا ہی اور دھوپ سے اب پیاس کا وفور
مرتا ہی ہر طرح یہ تامل ہی کیا ضرور

دو ہاتھ میں بھگا کے سواروں کو گھاٹ کے
خیمہ گرا دو اس پہ طنابوں کو کاٹ کے

کھینچے یہ کہہ کے نیمچے دونوں نے یک بیک
پہونچی زمیں سے آئینۂ مہر تک چمک

گاؤ زمیں ادھر تھی ہراساں اُدھر سمک
ڈر کر پروں پہ نادِ علی پڑھتے تھے ملک

غل تھا چمک دمک ہی سب آبدار ہی
اِک جا ہیں دو یہ نیمچے یا ذوالفقار ہی

دو بجلیاں سپاہ میں کوندیں فرس بڑھے
جس طرح قافلے سے صدائے جرس بڑھے

اب کون روکے شیر بڑھے جب تو بس بڑھے
مقتل میں بیس ہو گئے جو کہ دس بڑھے

بچوں نے زورِ حق کے ولی کا دکھا دیا
سب نے گٹ مٹ ضربِ علی کا دکھا دیا

وہ دو نواشہیوں کی رو اِدھر اُدھر
کاووں میں بس کے مر گئے سو سو اِدھر اُدھر

تابندہ تھے جو آٹھ مہِ نو اِدھر اُدھر
پھیلی ہوئی زمین پہ تھی ضو اِدھر اُدھر

کیلوں سے آشکار تھے جلوے نجوم کے
پریاں تھیں دو کہ پھر رہی تھیں جھوم جھوم کے

آئے جدھر خدا کا غضب آگیا اُدھر
پلٹے جدھر یہ رعبِ علی چھا گیا اُدھر

چھپٹے جدھر شکستِ عدو کھا گیا اودھر
ٹھہرے جہاں کسی سے نہ بچھا گیا اودھر

انسان تو کیا کہ شیروں کے زہرے بھی آب تھے
آنکھیں ملائے کون کہ دو آفتاب تھے

کیا دونوں تازیوں کی سبک تازیاں لکھوں
کیوں کر رواروی میں خوش اندازیاں لکھوں

کس طرح نیچوں کی سرافرازیاں لکھوں
کیا دونو شاہزادوں کی جانبازیاں لکھوں

پوتے ہیں کس جری کے خلف کس ولی کے ہیں
اعلیٰ یہ مدح ہی کہ نواسے علی کے ہیں

جو شیرِ حق ہیں تھے وہ شجاعت انھیں میں ہے
جعفر کی شان و شوکت و صولت انھیں میں ہے

شبیر سے کریم کی ہمت انھیں میں ہے
کونین بخش دیں یہ سخاوت انھیں میں ہے

گو ان کے مدح خوانوں کے لب پے سوال ہیں
مُنہ بھر دیں موتیوں سے کہ زینب کے لال ہیں

وہ چھوٹے چھوٹے خود وہ پیشانیوں کی شان
وہ دبدبہ وہ رعب وہ عمرانیوں کی شان

دینداریوں کا نور خداوانیوں کی شان
وہ دونوں نیچوں کی سرافشانیوں کی شان

باہم چلے نہ زور گیا کچھ نہ کس گیا
جب چمکے مینہ سروں کا سراسر برس گیا

جس صف پہ دور سے وہ جلالت قریں بڑھے
غل پڑ گیا کہ دلبر ضرغام دیں بڑھے

وہ کیا بڑھے کہ دو اسدِ خشمگیں بڑھے
شیروں کا وہ شکار ہوئے جو لعیں بڑھے

زندہ بھی کشتۂ خطر و بیم ہو گئے
دو حصے ہو کے موت کے تقسیم ہو گئے

چلّہ سے جس کا تیر ملائک پہ سر نہ تھا
جز گوشۂ فرار کسی جا مفر نہ تھا

زندہ جو بھاگے چین ادھر تھا ادھر نہ تھا
کشتوں کے پشتے تھے کہ نظر کا گزر نہ تھا

دریا تھا یا سیاہ صفیں تھیں کہ موج تھی
دو بجلیوں کے بیچ میں اک فوج تھی

تیروں میں جس طرف وہ گئے بے دھڑک گئے
شیروں کی بو جو آگئی گھوڑے بھڑک گئے

زندوں کے خوفِ جاں سے کلیجے دھڑک گئے
زخموں سے کیا مزا تھا کہ بسمل پھڑک گئے

یکسر قدم سپاہ سے دریا کے اٹھ گئے
ہونٹوں کو چاٹتے ہوئے دنیا سے اٹھ گئے

وہ گورے گورے ہاتھ وہ نازک کلائیاں
وہ بازوؤں کا زور وہ تیغ آزمائیاں

وہ نیچوں میں تیغِ علی کی صفائیاں
وہ ولولے وہ پہلے پہل کی لڑائیاں

جس غول پر وہ صاحبِ شمشیر آپڑے
ثابت ہوا کہ فوج پہ دو شیر آپڑے

جس پہلوان پہ عون کی تلوار پڑ گئی
چہرہ تو کیا ہے زیست کی صورت بگڑ گئی

چھوٹے کی آنکھ جس سے لڑائی میں لڑ گئی
سر تیز اک سناں تھی کہ پتلی میں گڑ گئی

آنکھوں کو رو کے صف سے وہ مردک نکل گیا
گویا قضا کو توڑ کے ناوک نکل گیا

اِک شور تھا کہ چشم نمائی غضب کی ہے
آفت کا معرکہ ہے لڑائی غضب کی ہے

یہ گھاٹ قہر کا یہ ترائی غضب کی ہے
چھوٹے سے نیچوں کی صفائی غضب کی ہے

بڑھتا تھا آپ سے نہ کوئی جنگ کے لیئے
لاتی تھی موت گھر کے چورنگ کے لیئے

جس پر اُڑا کے رخش وہ جانبار جا پڑا
ثابت ہوا کہ صید پہ شہباز جا پڑا

دو ہو کے تیغ پر وہ فسوں ساز جا پڑا
خود منہ کے بھل سمند سبکتاز جا پڑا

دونوں ہیں نورِ عین علی سے غیور کے
آنکھیں نکال لیں کوئی دیکھے جو گھور کے

اللہ کا غضب اُدھر آیا جدھر بڑھے
پہونچا سروں پہ تیغ کا سایہ جدھر بڑھے

جلوہ عروسِ فتح نے پایا جدھر بڑھے
گھونگٹ سپاہِ شام نے کھایا جدھر بڑھے

گرتی تھی برق لشکرِ ابنِ زیاد پر
گویا چڑھے تھے دو نئے دولھا جہاد پر

ماتھے وہ اور وہ پیچ عمامہ کے لٹ پٹے
گیسو جو بنتِ فاطمہ نے ہاتھ سے بٹے

وہ ابروؤں کے بل کہ ہلال فلک کٹے
آنکھیں وہ نرگسی تھیں کہ جس سے نظر ہٹے

چہرے کسی نے دیکھے ہیں ایسے بتاب کے
رخسار چار پھول کھلے ہیں گلاب کے

وہ برگِ گل سے لب وہ دہن اُن کے تنگ تنگ
وہ بھینی بھینی بو کسی غنچہ میں وہ نہ رنگ

لعل و گہر ہیں ان دو رداں کے آگے دنگ
اِک منجمد وہ قطرۂ نیساں ہے اور یہ سنگ

تشبیہہ بھی جو ان سے ندی نا امید ہیں
اس غم سے موتیوں کے کلیجوں میں چھید ہیں

گورے گلے کہ جن سے نمایاں ہے نورِ حق
سُرخی نہیں یہ مہرِ منوّر پہ ہے شفق

وہ نیچے وہ ہاتھ دل کفر جس سے شق
سینے میں ایک مصحفِ ناطق کے دو ورق

خالی ہیں گو شکم پہ یہ جرّار سیر میں
فاقہ تو ارث ہے کہ یہ شیروں کے شیر ہیں

اُن دو نو شہسواروں کی وہ چہل پہل وہ ٹنگ جائے
جو اُن کی چال دیکھنے آئے وہ دنگ جائے

صورت کا نہ پتا و نہ سرعت کا ڈھنگ جائے
اُڑتے تھے یوں کہ جیسے ہوا پر خدنگ جائے

پریاں تھیں دو وہ اسپِ سعادت اثر نہ تھے
سب تھی ہوا کی تیز پری اور پر نہ تھے

اسوار آفتاب تھے گھوڑے تھے ماہرو
سرعت یہ تھی کہ دوڑتا تھا جسم میں لہو

جاندار و خوش رکاب و سعید و خجستہ خو
صاف آتی تھی پسینے سے جن کے فاکی بو

ڈھالا تھا جوڑ بند کو سانچے میں نور کے
نازک کلائیاں تھیں کہ پونچے بلور کے

دو نوکنو تیاں کہ دو پیکانِ تیر ہیں
چاروں سُم اُن کے غیرتِ ماہِ منیر ہیں

آنکھوں پہ کیجیے جو نظر نے نظیر ہیں
یال ایسی جس کے بیچ میں پریاں اسیر ہیں

سرعت میں اُن سے طیر کو نسبت نہ تیر کو
نرمی یہ جلد میں کہ خجالت حریر کو

آئے اُدھر سے گر تو اِدھر سے نکل گئے
پہونچے کنارِ بحر تو بر سے نکل گئے

مانندِ برق لشکرِ شر سے نکل گئے
دو تیر آگے تیز نظر سے نکل گئے

یوں پھر رہے تھے بیچ میں فوجِ غنیم کے
جیسے سحر کو چلتے ہیں جھونکے نسیم کے

غنچے تھے دو ملے ہوئے اک جا کہ اُن کے گوش
برگستواں میں جسم کہ رستم تھا در عہ پوش

سرعت کو دیکھ لیں تو اڑیں طائروں کے ہوش
گرتا تھا منہ سے کف تو شجاعت کا تھا یہ جوش

پریاں اُڑا سکیں نہ روش اُن کی چال کی
بالکل مزاج شیر کا آنکھیں غزال کی

وہ سم وہ نعل اور وہ سینے وہ ترک و تاز
بدر و ہلال و آئینہ و کبک و شاہباز

زیور تھا ایک شب کی دلھن کا کہ اُن کے ساز
وہ کلغیاں کہ طرۂ لیلیٰ سے سرفراز

بن کر گہر پسینے کے قطرے ٹپکتے ہیں
ہیکل کی تختیاں کہ ستارے چمکتے ہیں

گو چھوٹے چھوٹے پاؤں نہ جاتے تھے تارکاب
پراڑیاں جمی ہوئی تھیں مثلِ بوتراب

یوں مرکبوں کی باندھے تھی سر وہ فلک جناب
بیجا قدم رکھیں جو سمندوں کو تھی نہ تاب

غل تھا ہٹے رہو کہ مزاج ان کا آگ ہے
حیدر سے شہسوار کی یہ ران و باگ ہے

گھوڑوں کے کس پرے میں قیامت بپا نہ کی
فاقہ تھا پر کمی تگ و رَو میں ذرا نہ کی

وہ کونسی گرہ تھی کہ تیغوں نے وا نہ کی
کن سرکشوں کے جسم سے گردن جدا نہ کی

نیزوں کے بند قطع کمانوں کے ساتھ تھے
حلالِ مشکلات کے بچوں کے ہاتھ تھے

بچوں کے نیچے بھی غضب آبدار تھے
سیلِ فنا تھے صاعقہ شعلہ بار تھے

دو نو ہم جو ہو کے اُٹھے ذوالفقار تھے
سائے کو بھی شریک جو کیجیے تو چار تھے

دو کرتے تھے یہ راکب و مرکب کو زین کو
دو ہاتھ کاٹ دیتا تھا سایہ زمین کو

قبضے وہ تکیہ گاہ ظفر جن کا نام ہے
پھل وہ کہ جس کو کھاتے ہی قصہ تمام ہے

پانی وہ جس کو کہیے کہ زہر الیتام ہے
کاٹ ایسا سنگِ سخت جہاں موم خام ہے

جوہر وہ دم نکلتے ہیں جس کی مثال پر
افشاں چینی ہوئی ہے جبینِ ہلال پر

فولاد پوش پھینک کے ہتھیار چھپ گئے
گوشوں میں سر جھکا کے کماندار چھپ گئے

چار آٹھ میں جو قتل ہوئے چار چھپ گئے
زخموں کے گل بہت جو کھلے خار چھپ گئے

مشکل وہاں تمیز و بد و نیک ہو گئی
غل تھا کہ لو بہار و خزاں ایک ہو گئی

جن کے جمے تھے رنگ وہ بے رنگ ہو گئے
لڑنے کا حوصلہ نہ رہا تنگ ہو گئے

چار آئینہ جو پہنے تھے چورنگ ہو گئے
بچوں نے وہ کیا کہ جواں دنگ ہو گئے

دھومیں وغا کی قاف سے تا قاف ہو گئیں
اللہ رے مصاف صفیں صاف ہو گئیں

کوفی بچے نہ رومی و رازی جدھر پھرے
جھک جھک گئیں صفیں وہ نمازی جدھر پھرے

غازہ لگایا فتح نے غازی جدھر پھرے
پسپا تھے یکہ تازہ تازی جدھر پھرے

مہلت نہ سر اٹھانے کی تھی فوجِ شام کو
دونا بلند کر گئے جعفر کے نام کو

جا پہونچے تھے مقام بن سعد کے قریں
بھاگا عقب سے چیر کے خیمے کو وہ لعیں

کتنی طنابیں کاٹ چکے تھے یہ بے یقیں
ہاں ہاں کا شور کر کے بڑھے سب عدو دیں

بھاگا اُدھر تو جوش میں وہ اضطراب کے
یہ دونو بھائی رہ گئے ہونٹوں کو چاب کے

چھوٹے نے عرض کی یہ سراپا ہیں مکر و کید
دیکھا حضور چھٹ گیا پنجے میں آ کے صید

چھٹنے کی شرم ہے نہ انھیں بھاگنے کی قید
فرمایا عون نے یہ ہے استاد زرق و شید

بھاگا طنابیں کٹتے ہی کیا حیلہ ساز ہے
سچ ہے حرام زادے کی رسی دراز ہے

بڑھکر پکارے حضرت عباس عرش جاہ
کس سمت ابن سعد ہے اور شمر روسیاہ

ذلت اُٹھا کے بھاگ گیا افسر سپاہ
روکے گئے نہ ایک سے دو طفل واہ واہ

سرسبز ہوتے ہیں ہمیں جب کثرت پڑتے ہیں
یوں لشکروں سے شیر کے فرزند لڑتے ہیں

ہاں مرد اگر ہے سامنے بچوں کے آ تو جائے
بھاگے گا پھر تو خیر کوئی زخم کھا تو جائے

مخفی کدھر ہے شیروں کو صورت دکھا تو جائے
بگڑی ہوئی لڑائی کو ظالم بنا تو جائے

بپھرے ہیں شیر ہاتھ میں تیغ و سپر تولے
گرتا ہے وہ جھکا ہوا خیمہ خبر تو لے

بھاگا رئیس خود یہ خبر چار سو گئی
عزت سبھوں کی آج گئی آبرو گئی

آخر شغال تھا نہ دبکنے کی خو گئی
خلعت پہن کے بھی خِ رزالت کی بو گئی

جب کچھ کڑی پڑی تو جفا جو نکل گیا
ضیغم جلال میں ہیں کہ آہو نکل گیا

مرتا ہے نے حیا زر و جاگیر و مال پر
اک نیمچے کا وار بھی روکا نہ ڈھال پر

آنکھیں چرائیں شیر جب آئے جلال پر
سر وار ہو کے چھپ گیا لُٹ اس جدال پر

پائے نہ گر شکار تو جانباز کیا کرے
گنجشک جب نہاں ہو تو شہباز کیا کرے

باتوں میں اتنا تھم جو گئے وہ فلک پناہ
خیمے کو لے کے پشت پہ سب جم گئی سپاہ

دریا کی فوج اُدھر سے ہوئی بڑھکے سد راہ
چاروں طرف سے گھر گئے زینب کے رشکِ ماہ

پتھر بھی تیر ظلم بھی نیزے بھی چل گئے
سینوں کو توڑ توڑ کے ناوک نکل گئے

یوں تیر کھا کے فوج پہ جاتے تھے وہ دلیر
غصے میں جس طرح کہ جھپٹتا ہے زخمی شیر

لشکر کو کر دیا تھا زبردستیوں سے زیر
انبار اِدھر سروں کی اُدھر زخمیوں کی ڈھیر

دیکھا غضب سے جس کی طرف زرد ہو گیا
تلوار جس پہ سن سے چلی سرد ہو گیا

تیغیں قریب سے جو لگاتے تھے اہل شر
اک بھائی بڑھ کے ہوتا تھا اک بھائی کی سپر

عباس بڑھ کے دیتے تھے حضرت کو یہ خبر
کیا کیا لڑے ہیں آپ کی ہمشیر کے پسر

نامی جوان بھاگ گئے شام و روم کے
خیمے پہ جا پڑے پسر سعد شوم کے

پر اب خدا بچائے کہ فوجیں کثیر ہیں
تیغیں ہیں برچھیاں ہیں سناں ہیں تیر ہیں

رو کر امامِ دیں نے کہا اب اخیر ہیں
کب تک لڑیں کہ تشنہ دہن ہیں صغیر ہیں

نو دس برس میں ماں سے بچھڑنے کے دن تھے
یہ کھیلنے کی فصل تھی لڑنے کے دن تھے

زینب کھڑی ہی تھی پردے کے پیچھے جونہی قرار
فضہ خبر یہ دیتی تھی جا جا کے بار بار

کیا کیا لڑے ہیں حیدر و جعفر کے یادگار
حضرت سے مدح کرتے ہیں عباسِ نامدار

جس وقت ذکرِ معرکہ آرائی ہوتے ہیں
رومال کھ کے آنکھوں پہ حضرت بھی روتے ہیں

رو کر کہا کہ روتے ہیں کس واسطے امام
میں اُن کی اک کنیز یہ دونوں پسرِ غلام

مجکو دکھا تو دے کہ کدھر ہیں وہ لالہ فام
اُس نے کہا کہ چھائی ہے جنگل میں فوجِ شام

لاکھوں سے معرکہ ہے مگر باوجود ہیں
بی بی وہ ابنِ سعد کے خیمہ کے پاس ہیں

تلوار چل رہی ہے کہ اللہ کی پناہ
ڈھالوں کی بدلیوں میں چھپے ہیں وہ رشکِ ماہ

کثرت ہے اس قدر کہ پہونچتی نہیں نگاہ
وہ بھاگتی ہیں اور پلٹتی ہے سب سپاہ

آوازِ دار و گیر تو گردوں پہ جاتی ہے
دونوں کے نیمچوں کی چمک تا تک آتی ہے

طبلِ ظفر پہ چوب لگی یک بیک ادھر
ڈیوڑھی سے آئیں خیمہ میں زینب جھکائے سر

عباس نے کہا شہِ والا سے دوڑ کر
چلیے حضور لٹ گیا بنتِ علی کا گھر

گھبرا کے کشمکس میں دمِ اُن کے نکل نہ جائیں
لاکھوں سوار ہیں کہیں بچے کچل نہ جائیں

تلوار لے کے قاسمِ شیریں سخن بڑھے
عباس کیا بڑھے شہِ خیبر شکن بڑھے

مانندِ شیرِ اکبرِ گل پیرہن بڑھے
فرزند سے یہ کہہ کے امامِ زمن بڑھے

پردے میں اہلِ بیتِ نبی کے خلل نہ آئے
ڈیوڑھی پہ تم رہو کہیں زینب نکل نہ آئے

پہونچے یہ تین شیر جو مقتل میں ایک بار
کیا پیدلوں کا ذکر فراری ہوئے سوار

ریتی پہ شہ کو یوں نظر آئے وہ گلعذار
بند آنکھیں منہ کھلے ہے ہونٹوں پہ جانِ زار

دنیا سے وقتِ کوچ بھی دونوں کا ساتھ ہے
گردن میں ایک بھائی کے بھائی کا ہاتھ ہے

بچوں کو جاں کنی میں جو پایا حسین نے
بوسے لیے گلے سے لگایا حسین نے

آنکھوں سے خوں جگر کا بہایا حسین نے
ہاتھوں سے نیچوں کو چھوڑایا حسین نے

آغوش میں بڑے کو شہنشاہ لے چلے
چھوٹے کی لاش قاسمِ نوشاہ لے چلے

پہونچے قریب خیمہ جو شاہِ فلک سریر
تھا غیر حال مر گئے رستے میں وہ صغیر

پردہ الٹ کے خیمہ کا با حالتِ تغیر
فضّہ پکاری ای حرم شاہِ قلعہ گیر

دوڑ و حسین خیمہ میں لاشوں کو لاتے ہیں
دولھا بنے ہوئے مرے شہزادے آتے ہیں

دوڑے اُدھر سے چھاتیوں کو پیٹتے حرم
ڈیوڑھی سے پہلے آیا پچکتا ہوا عَلَم

رایت کے نیچے بچوں کے تھیں تیتیں بہم
آپہونچے لڑکھڑاتے ہوئے سرورِ امم

لاشوں کے آگے اکبرِ یوسف جمال تھے
کپڑے ہر اک کے خون سے بچوں کے لال تھے

ماتم کی صف سے اُٹھ گئیں زینب یہ کہہ کے بات
لوگو بتاؤ کونسے دولھا کی ہے برات

لاشوں کو رکھ کے غش ہوئے سلطانِ کائنات
دوڑیں لٹا کے بچے کو بانوئے خوش صفات

لڑکے بھی چھاتیوں کو بہم پیٹنے لگے
لاشوں کے گرد آ کے حرم پیٹنے لگے

بیٹھی تھیں ایک گوشہ میں زینب جو ننگے سر
واں جا کے بولیں بانوئے ناشاد و نوحہ گر

پرسے کو لوگ جمع ہیں چلیے ذرا اودھر
فرمایا میں نجاؤں گی بچوں کی لاش پر

آنچ آتمہ کی دل کو جلائے تو کیا کروں
گر فرق میرے صبر میں آئے تو کیا کروں

بس سُن چکی کہ نام کیا خوب لڑ چکے
لاشوں پہ لاشیں لوٹ چکیں کھیت پڑ چکے

کنبہ تمام ہو چکا دو گھر اوجڑ چکے
گودی میں جو پلے تھے وہ بچے بچھڑ چکے

اب اُن کا غم نہ فکر مرے گھر کی چاہیے
بی بی سلامتی علی اکبر کی چاہیے

بھائی کے آگے لاشوں پہ جا کر کروں بین
نے صبر ہے یہ دل میں کہیں گے مجھے حسین

گر مر گئے تو مر گئے وہ دونو نورِ عین
کیوں کر چلوں کھڑے ہیں شہنشاہِ مشرقین

روؤں گی میں تو پھر علی اکبر بھی روئیں گے
صدمہ مجھے یہ ہے کہ برادر بھی دیکھیں گے

بھائی کا حق ادا ہوا احسان کر دگار
رونا ہی وا ں بھی ہیں رہیں رو ں گی زار زار

لاشوں کو دیکھ کر مرا دل ہو گا بے قرار
کی عرض آپ صاحبِ با تم ہیں میں نثار

چلیے نہ ضبط کیجیے فریاد و آہ کو
لاشوں پہ بھانجوں کی غش آیا ہی شاہ کو

لاشوں پہ لائیں بی بیاں زینب کو تھام کر
ماتم کی صف پہ گر پڑی وہ سوختہ جگر

بولیں بڑھا کے دستِ مبارک ادھر ادھر
نیچے کدھر ہیں کچھ مجھے آتا نہیں نظر

کیسی پڑا دھڑی ہی یہ کیوں بین ہوتے ہیں
لو گو نہ غل مچاؤ مرے لال سوتے ہیں

ماں صدقے جائے لو مرے زانو پہ سر رکھو
اِس بیکسی میں ماں کی بھی جانب نظر کرو

لازم نہیں کہ ہاتھ سے تیغ و سپر رکھو
آفت میں ماموں جان کی اپنے خبر رکھو

دیکھو نہ آنچ آئے شہِ خوش خصال پر
فوجوں کی پھر چڑھائی ہی زہرا کے لال پر

کیسی یہ نیند آج ہی پیارو اُٹھو اُٹھو
ماموں کے ساتھ رن میں سلحدارو اُٹھو اُٹھو

کپڑے لہو بھرے یہ اُتارو اُٹھو اُٹھو
الجھے ہیں گیسوؤں کو سنوارو اُٹھو اُٹھو

اِن پیاری پیاری آنکھوں پہ اماں نثار ہو
انگڑائیاں تو لو کہ جگر کو قرار ہو

سینوں سے توز میں پہ رکھو ہاتھ اُتار کے
باندھو کھلے ہوئے یہ عمامے سنوار کے

اماں نثار گیسوؤں کے تار تار کے
چونکو اُٹھو کلام کرو ماں سے پیار کے

نخلِ مراد میں نہ ثمر ہی نہ برگ ہی
اب سمجھی میں یہ نیند نہیں خوابِ مرگ ہی

لاکھوں سے معرکہ میں وغا کر کے آئے ہو
بچپن کی غفلتیں یہ نہیں مر کے آئے ہو

دولھا بنے ہو خون میں سب بھر کے آئے ہو
صدقے گئی رولانے کو ماں در کے آئے ہو

مجھ سے بچھڑ کے تم اسی منزل میں رہ گئے
ارمان شادیوں کے مرے دل میں رہ گئے

کیونکر ملے گا ماں کو تمھارا سراغ ہائے
لوٹا اجل نے حیدر و جعفر کا باغ ہائے

یوں بجھ گئے ہماری لحد کے چراغ ہائے
میرا بڑھاپا اور یہ بچوں کے داغ ہائے

ہی ہی یہ گھر بھرا ہوا ویران کر گئے
اماں کی قبر بنتے نہ پائی کہ مر گئے

کس طرح دیکھوں خاک میں میرے اٹے ہوئے
اُلجھے ہیں میرے ہاتھ کے گیسو بٹے ہوئے

سینے فگار چاند سے بازو کٹے ہوئے
ہے ہے کفن بنے یہی کپڑے پھٹے ہوئے

نہ کچھ ترک نہ تخت شہیدوں کو چاہیئے
مرنا یہیں جہان میں سعیدوں کو چاہیئے

تابوت اٹھانی دھوم سے مرتے وطن میں گر
ہوتا پدر بھی ساتھ جنازے کے نوحہ گر

قبر بنانی ماں کی لحد کے ادھر ادھر
کیا حشر ہوگا پہونچے گی یثرب میں جب خبر

ام البنین پیٹتی روضے پہ جائیں گی
صغرا کے پاس بی بیاں پرسے کو آئیں گی

بچو تمھیں بتاؤں میں غربت میں کیا کروں
گھر ہے نہ یہ وطن ہے مصیبت میں کیا کروں

بھائی گھرا ہوا ہے اس آفت میں کیا کروں
فاقوں میں تشنگی میں صعوبت میں کیا کروں

راحت نہ روح کو نہ کسی دل کو صبر ہے
پانی نہ غسل کو نہ کفن ہے نہ قبر ہے

مجبور تم بھی ماں بھی ہے ناچار میں نثار
تنہائی میں خدا ہے مددگار میں نثار

رستا بُرا ہے باندھ لو ہتھیار میں نثار
چھوٹے مرے پسر سے خبردار میں نثار

اللہ اس سفر کی بلاؤں کو رد کرے
کھٹکا جہان ہو بھائی کی بھائی مدد کرے

سُنتی ہوں اس سفر میں خطر لے شمار ہیں
جانیں وہی اسی جو میان مزار ہیں

پرسش ہے روک ٹوک ہے جنگل ہے خار ہیں
وہ بھی ڈرے ہوئے ہیں جو طاعت گزار ہیں

منزل کا شب کی ماں کو پتہ دے کے جایئو
قربان جاؤں ساتھ مجھے لے کے جایئو

دن ڈھل گیا قریب ہے شام اے مسافرو
کس بن میں شب کو ہوگا مقام اے مسافرو

کچھ تو کرو زبان سے کلام اے مسافرو
بھیجو گے کب پیام و سلام اے مسافرو

پیٹوں گی جنگلوں میں جو تم کو نہ پاؤں گی
میں شب کو ڈھونڈتی ہوئی مقتل میں آؤنگی

کہتا تھا باپ شب کو نہ بچے نکلنے پائیں
بھولے ہیں راستہ نہ کہیں گھر کا بھول جائیں

دربار میں بھی ہوں تو سویرے سے گھر آئیں
ہے ہے یہ دشت ظلم جو کرتا ہے سائیں سائیں

پہنچوں گی کس طرح میں جو ڈر ڈر کے رو گے
واری اندھیری رات میں کس طرح سو گے

شب کو یہ خوش آمدیں مری کرتے تھے بار بار
تا دودھ ہم کو بخش دے مادر جگر فگار

ان بھولی بھولی باتوں کی ماں ہو گئی نثار
باتیں وہ رات کی مجھے بھولیں گی نہ وہ پیار

اب واری سر خرو ہوئے تم رب کے سامنے
لو دودھ میں نے بخشدیا سب کے سامنے

یہ بین کر کے لاشوں سے لپٹی وہ نوحہ گر
غش آیا۔ سانس اُلٹ گئی ٹکڑے ہوا جگر

اک حشر تھا کسی کو کسی کی نہ تھی خبر
بانو پکاری سوئے علمدار دیکھ کر

بچوں کے ساتھ ماں بھی جہاں سے گزر نہ جائے
لاشے اُٹھاؤ شاہ کی ہمشیر مر نہ جائے

بس اب انیس طول سے بہتر ہے اختصار
ہاں ختم کر کے مرثیہ شاہ نامدار

خالق سے ہاتھ اُٹھا کے دُعا کر بانکسار
قایم رہے جہاں میں یہ شاہِ فلک وقار

ہر دم زیادہ حشمت و اقبال و جاہ ہو
حامی جنابِ فاطمہ زہرا کا ماہ ہو

رباعی

خوں بھائی کا شہ کے روبرو بہتا تھا
پیاسے کا لہو کنارِ جو بہتا تھا

تھا بیچ میں سقائے حرم کا لاشہ
دریا تو اُدھر اِدھر لہو بہتا تھا

مرثیہ (۱۰)

جاتا ہی شیرِ بیشۂ حیدر فرات پر
طاری ہی خوفِ مرگ ہر اک ذی حیات پر

صدمہ عجب ہی بادشہِ کائنات پر
آنکھوں سے اشک بہے ہیں بات بات پر

بجھتا ہی وہ جو قبرِ علی کا چراغ ہی
جو حال ہو بجا ہی کہ بھائی کا داغ ہی

صابر کا ہی یہ حال کہ مشکل ہی ضبطِ آہ
فرماتے ہیں کہ تھام لے بندے کو یا الٰہ

کیا مرحلہ ہی سخت یہ کیونکر کٹے گی راہ
بھائی مرا یہی یہی لشکر یہی سپاہ

آخر بشر ہوں میں جو نہ روؤں تو کیا کروں
تیغِ علی کو ہاتھ سے کھوؤں تو کیا کروں

دوری کا غم ہی کیوں نہ ہیں اشک متصل
پالا ہی بر میں آہ تھمے کس طرح سے دل

اعضا کو توڑے دیتا ہی یہ دردِ جاں گسل
ای موت آ کہ روحِ علی سے نہ ہوں خجل

رخصت کا حرف لب پہ بھی لایا نہ جائے گا
مجھ سے تو یہ پہاڑ اٹھایا نہ جائے گا

یہ نوجواں بضاعتِ حیدر ہی یا کریم
حمزہ یہی مرا ہی جعفر ہی یا کریم

پیارا پسر سے بھی یہ برادر ہی یا کریم
یوں سب ہیں پر اسی سے مرا گھر ہی یا کریم

بازو یہی ہی ہاتھ مرے اس کے ہاتھ ہیں
میں جانتا ہوں شیرِ خدا میرے ساتھ ہیں

زینب کے لال مر گئے لشکر بچھڑ گیا
سہراب کھا کے قاسم نے پر بچھڑ گیا

وہ کیا شہید ہو گئے سب گھر بچھڑ گیا
پھر میں نہیں اگر یہ برادر بچھڑ گیا

اس مرکے میں ذبح ہوں پہلے تو عید ہو
سبطِ نبی کے بعد یہ بھائی شہید ہو

حضرت اُدھر تڑپتے ہیں تھامے ہوئے کمر
عباس بی بیوں سے ہیں رخصت طلب ادھر

لائی ہی سوکھی مشک سکینہ بچشمِ تر
فرماتے ہیں بھتیجی کا منہ چوم چوم کر

پہلے تھا ذکرِ آب تسلی کے واسطے
اب جا کے پانی لاتے ہیں بی بی کے واسطے

کہتی ہے خشک ہونٹ دکھا کر وہ لالہ فام
اصغر کو لے کے ہاتھوں پہ بانو نیک نام
دکھلاؤں اس کا حال شہِ نامدار کو
کرتے ہیں عرض حضرتِ عباسِ نامدار
پر کیا کروں رضا جو نہ دیں شاہِ ذی وقار
رخصت ہیں سعی کیجے کہ ہو نام آپ کا
کچھ سوچ کر یہ کہنے لگی وہ شکستہ حال
جیتا ہے تم کو دیکھ کے خیر النسا کا لال
بانو نے مرتضیٰ کی کمائی کو کھو دیا
زینب یہ بولیں آپ کا وسواس ہے بجا
پانی بھی مل ہی جائے گا صغیروں کا ہے خدا
موقع نہ سعی کا ہے نہ مشکل کشائی کا
کہنے لگی یہ زوجۂ عباسِ خوش صفات
مشکیزہ لے کے گریہ نجائیں سوئے فرات
ہر وقت کبریا سے طلبگارِ خیر ہوں
جس جا حسین بیٹھے تھے عریاں سر کیے
کی عرض تا کجا کوئی خونِ جگر پیئے
ہچکی لگی ہے اصغرِ ناشاد کام کو
فرمایا بیری مرگ گوارا کرو تو جاؤ
اچھا سکینہ جس میں خوشی تم ہمیں لاؤ
ثابت ہوا کہ ہاتھ سے عمو کو کھوؤ گی

اب موجان مجھ میں نہیں طاقتِ کلام
فرماتی ہیں کہ مرتا ہی ہے تشنہ کام
ہچکی لگی ہوئی ہے مرے شیر خوار کو
بچوں پہ جان دینے کو حاضر ہے جاں نثار
چلیئے پسر کو لے کے وہاں بہرِ کردگار
وہ کام ہے غلام کا یہ کام آپ کا
کیا کہتے ہو نہ بھائی یہ میری نہیں مجال
نیکی بدی ہو کچھ تو کہیں شاہِ خوش خصال
بچوں کے واسطے مرے بھائی کو کھو دیا
کیونکر دلاؤں بھائی سے ان کو کوئی رضا
تنہا نہ ہوں جہان میں شہِ ہنشاہِ کربلا
یہ چل بسے تو کون ہے پھر میرے بھائی کا
بی بی بھلا یہ کون سے وسواس کی ہے بات
پھر ننھے ننھے بچوں کی کس طرح ہو حیات
آگے جو کچھ بھوں کی رضا میں تو غیر ہوں
واں خود گئے بھتیجی کو آغوش میں لیے
پانی کہیں سے آئے تو یہ جاں بلب جیئے
مولا بس اب نہ روکیئے اپنے غلام کو
مشکیزہ بھر کے چاند سی چھاتی پہ زخم کھاؤ
یہ کیا سکھا کے لائی ہو بی بی ادھر تو آؤ
پانی کو اب تو روتی ہو پھر ان کو روؤ گی

انجام کی خبر نہیں کچھ تم کو ہائے ہائے
یہ اودے اودے ہونٹ انھیں تم نے کیوں دکھائے

خیراب دعا کرو کہ یہ اعدا پہ فتح پائے
دولت دلی حرم کی مرے ہاتھ سے نہ جائے

جب مشک بھر کے دوش پہ یہ نیک خو رکھے
دریا کا معرکہ ہی خدا آبرو رکھے

گردن جھکا کے شرم سے بولی وہ مہ جبیں
پوچھیں حضور میں نے کچھ ان سے کہا نہیں

اصغر کو لائیں گود میں جب بانوئے حزیں
ہاں مشک ہی تھی صورت یہ ہی یا امام دیں

مجرم جو لب پہ حرفِ شکایت بھی لائے ہوں
لیجے قسم زباں کے جو کانٹے دکھائے ہوں

یسٰن کے گود میں لیا اُس تشنہ کام کو
عباس خم ہوئے شہِ دیں کے سلام کو

باقی رہی نہ ضبط کی طاقت امام کو
پلٹا لیا برادرِ عالی مقام کو

حالت جو غیر ہو گئی زہرا کے جائے کی
قبر علی سے آئی صدا ہائے ہائے کی

بوسہ قدم پہ دے کے وہ شیر ژیاں چلا
غل پڑ گیا کہ یاور شاہِ زماں چلا

چلائے اہل بیت کہ راحت رساں چلا
لو فاطمہ کے گھر سے علی کا نشاں چلا

سادات کس بلا میں گرفتار ہو گئے
ہی ہی حسین بیکس و بے یار ہو گئے

اللہ رے رعب آمدِ عباسِ عرش مدر
سینوں میں دل چھپے ہوئے تھے جو شوں میں صید

غل ہی قریب تر ہی سپہر وغا کا بدر
رہبر ہے آب گھاٹ سے بھاگے ہیں اہل غدر

آتا ہی ابنِ ضیغمِ یزداں لڑائی کو
شیروں نے ڈر کے چھوڑ دیا ہی ترائی کو

لشکر میں ایک ایک کو ہی زندگی سے یاس
ڈر سے کسی کے ہوش ٹھکانے نہیں حواس

وہ دور دور سب ہیں صفیں تھیں جو پاس پاس
آمد میں شیر کی بھی یہ ہوتا نہیں ہراس

غل چار سو یہ ہی کہ قدم سر کے جاتے ہیں
گھوڑے بھگا و حضرتِ عباس آتے ہیں

وہ عازم وغا ہی جو شیروں کا شیر ہی
روتا ہی دل کے بھائی سے بھائی یہ دیر ہی

زور آوری سے اُس کی تہکن بھی زیر ہی
جرار ہی شجاعِ جہاں ہی دلیر ہی

لرزہ ہی اُن کے تن میں جو مرد و نبرد ہیں
شیروں کے ہاتھ پاؤں ترائی میں سرد ہیں

رن سے قدم اُٹھائے ہوئے ہیں سران فوج
مانندِ پیر کانپ رہے ہیں جوانِ فوج

دہشت سے منہ چھپائے ہیں تیغیں میانِ فوج
دامن لپیٹتے ہیں کمر سے نشانِ فوج

رایت تمام خوف سے تھرّائے جاتے ہیں
لشکر کے بھاگنے کے نشاں پائے جاتے ہیں

نکلا حرم سرا سے جو وہ آسماں حشم
نصرت نے گرد پھر کے لیے بوسۂ قدم

شوکت وہ اُس جناب کی وہ رفعتِ علم
پنجے کی ضو سے برق چمکتی تھی دم بدم

ذرّوں سے ترگیں تھے گہر لعل سنگ سے
صحرا زمردی تھا پھریرے کے رنگ سے

وہ ضو علم کی وہ رُخِ عباسِ نامور
رکھے تھا ہاتھ چہرے پہ خورشید خیرہ سر

پنجہ اُدھر علم کا رُخِ پُر ضیا اِدھر
وہ نورِ سرمدی تہ و بالا تھے جلوہ گر

یکتا وہ زرق برق میں یہ آب و تاب میں
تھا فرق ایک نیزے کا دو آفتاب میں

پنجے سے نورِ پنجتنی آشکار ہے
پرچم پہ طرّہ سرِ حیدر نثار ہے

دامن بھی ابرِ رحمتِ پروردگار ہے
پہونچا جو اُس کے سایہ میں وہ رستگار ہے

کشتی کا بادبان ہو تو کوثر پہ جا لگے
طوبیٰ نہال ہو اگر اُس کی ہوا لگے

ناگاہ مل ہوا فرسِ تیز گام لاؤ
آیا علی کا سرورِ رواں خوش خرام لاؤ

ہاں رخشِ تیز رَو کو بصد اہتمام لاؤ
اسپِ گراں رکاب و مرصع لجام لاؤ

ہے انتظار ابرشِ آہو شکار کا
بیٹا سوار ہوئے گا دلدل سوار کا

آیا فرس سجا ہوا کس ترک و تاز سے
سرعت کا قافلہ نکل آیا حجاز سے

رکھتا تھا پاؤں خاک پہ اس امتیاز سے
جیسے پری چمن میں خراماں ہو ناز سے

فوق اُس کو تھا ہمائے سعادت نشان پر
سم تھے زمین پر تو دماغ آسمان پر

وہ تھوتنی کہ غنچۂ سوسن سے تنگ تر
وہ انکھڑیاں غزل ہوں ہرن جن کو دیکھ کر

کیلیں نجوم نعل ہلال اور سم قمر
بار یک جلد سینہ کشادہ بلند سر

کھاتی تھی ہر پری بھی قسم اُس کی جان کی
غصہ یہ تھا کہ تنگ ہو وسعت جہان کی

لہ ورا مفرد ہو اور اس کی جمع ہو ۱۲ سلہ ابرش اس گھوڑے کو کہتے ہیں جس کی جلد پر رنگ کے چھینٹے گل رنگ مخلف ہوں ۱۲

دلدل نژاد برق تجلی براق سیر
دریا میں موج دشت میں آہو ہوا میں طیر

اسوار دم دلاسے سے گر پھیر لے تو خیر
گر سانس لی تو دم بھی نہ لے پھر فلک بغیر

سرعت غضب ہی گو کہ وہ نے آب دانہ ہی
اُس کو تو نبض کی حرکت تازیانہ ہی

سایہ کا اُس کے دھوپ میں سرعت سے تھا یہ حال
وحشت میں جس طرح سے بھرے چوکڑی غزال

گہ برمیں گاہ بحر میں گاہے سوے جبال
گم کردہ آشیاں تھا عقاب کشادہ بال

سایہ نہ تھا ہمائے سعادت پناہ تھا
گویا ہوا کے زور میں شاہین تباہ تھا

وہ شوخیاں فرس کی وہ سرعت وہ آوجاد
تنو حسن تھا فقط جسے ہیکل کا اک بناؤ

جب چاہو سیر عالم امکاں کی دیکھ آؤ
تازی ہو روح پاؤ قدم میں وہ لطف پاؤ

رفعت میں پست حوصلہ کبک دری کا تھا
چھل بل ہرن کی تھی تو جھکڑ پری کا تھا

لو اب سوار ہوتے ہیں عباس نامور
لو دامن قبا نے لیا بوسہ کمر

لو ہٹ کے ہاتھ آپ نے رکھا ایال پر
لو آفتاب خانۂ زیں پر ہی جلوہ گر

برچھا لیا سمند کو زانو میں داب کے
لو دو ہلال بن گئے حلقے رکاب کے

بڑھنے میں صرف ہاں جو دہن سے نکل گیا
وحشی غزال دشت ختن سے نکل گیا

لشکر گلوں کی بو کا چمن سے نکل گیا
جھونکا نسیم کا تھا کہ سن سے نکل گیا

طاؤس کیا کہ برق بھی شرما کے رہ گئی
پچھلے سموں کی گرد نظر آکے رہ گئی

گھوڑا اُڑا کہ ہو گئی سرعت ہوا کی گرد
بوے چمن تھی یا قدم باد پا کی گرد

جا پہونچی تا بہ فرق ثریا ترے کی گرد
اُڑ کر سر فلک پہ گئی کربلا کی گرد

خورشید کی ضیا تھی سموں کے نشان پر
نخوت سے تھا زمین کا دماغ آسمان پر

شوکت وہ اُس فرس کی وہ عباس کی نمود
پڑھتا تھا کوئی شخص تبارک کوئی درود

غل تھا کہ ہر ثنا ہی پہ واجب الوجود
کیا ان کے سامنے کسی انسان کی ہست و بود

سب کے گلوں میں ان کی غلامی کا طوق ہی
یہ وہ بشر ہیں جن کو ملایک پہ فوق ہی

۱۲ قولہ جو دن ہوتا ہی تو ہوا میں اور رات ہوتی ہی تو دریا میں

پیدا مثالِ حیدرِ کرّار رعبِ حق
چمکا جو نورِ عرش بنا خاک کا طبق

رخسار تھے کہ سورۂ والشمس کے ورق
ابرو تھا خط کو آیۂ واللّیل کا سبق

موتی کی آگے دانتوں کے کچھ آبرو نہ تھی
سوسن تھا نور کا وہ بیاضِ گلو نہ تھی

وہ ہاتھ کارِ خیر رہا جن سے روز و شب
ساعد تھے صاف ساعدِ پر نورِ شیرِ رب

بازو وہ جن میں قوتِ دستِ خدا تھی سب
شانے وہ جن میں شانِ نشانِ شہِ عرب

پہلو میں قلب وہ جو ہمیشہ کھڑا رہا
سینہ وہ صدر تھا جو وفا سے بھرا رہا

شان و شکوہ و صولت و عدل و نہیب و داد
اسلام و دین و ملّت و ایمان و اعتقاد

اشفاق و رحم و دوستی و خُلّت و وداد
خوف و رجا و آرزو و مطلب و مراد

اندوہ و درد و رنج مطیعانِ نو میں تھے
سب غاشیہ بدوشِ فرس کی جلو میں تھے

شوکت کا قول تھا کہ مطیعِ جناب ہوں
کہتی تھی فتح خاکِ درِ بوتراب ہوں

نصرت کا ادّعا تھا کہ میں کامیاب ہوں
دعویٰ تھا فخر کو کہ علی کا عتاب ہوں

فاقے سے تھے پہ صبر بھی منہ موڑتا نہ تھا
ہر گام پر ثباتِ قدم چھوڑتا نہ تھا

تلوار وہ ہلال کٹے جس کو دیکھ کر
تھی کہکشاں کمندِ عدو بندِ شیرِ نر

مہتابِ آسمانِ ظفر آہنی سپر
خود آفتاب تھا تو جبینِ مبیں قمر

رُخ کے عرق سے نور کے قطرے ٹپکتے تھے
حلقے نہ تھے زرہ میں ستارے چمکتے تھے

نیزے کی نوک سے جگرِ آفتاب خوں
سینہ ہے آسمان کا اُسی دن سے نیلگوں

ابرو کے حوریِ فتح و ظفر تھا کمان کا نوں
تھا ماہِ نو بھی جس کے خم و خم سے سرنگوں

دہشت سے گوشہ گیر ریسانِ شام تھے
ترکش کے سارے تیر اجل کے پیام تھے

نیزہ زمیں میں گاڑ کے گونجا جو شیرِ نر
چہروں سے رنگ اُڑ گئے تھرّا گئے جگر

نکلے جز میں خشک زباں سے وہ شعرِ تر
جس کے جواب میں فصحا نے جھکائے سر

غل تھا زبانِ ناطقہ الکن ہے لال ہے
لاریب فیہ مُصحفِ ناطق کا لال ہے

نعرہ یہ تھا کہ گوہرِ برجِ شرف ہوں میں
فرزندِ صاحبِ شرف و مَن عرف ہوں میں

فخرِ سلف جو شاہ ہو اُس کا خلف ہوں میں
اللہ و پنجتن ہیں جدھر اس طرف ہوں میں

رایت سے پیش رَو ہوں خدا کی سپاہ کا
پیرو ہوں بادشاہِ ہدایت پناہ کا

حیدر کی ذوالفقار سے لاکھوں کے سر کٹے
جوشن ہیں سینے سینوں کے اندر جگر کٹے

خیبر میں جبرئیل کے بھی تین پر کٹے
پر یوں کٹے کہ تیغ سے جیسے سپر کٹے

ضربت کا حال عمرو دلاور سے پوچھیے
حیدر کا زور مرحب و عنتر سے پوچھیے

بچوں کا ایلچی بھی ہوں اور تشنہ کام ہوں
سقائے اہلِ بیتِ رسولِ انام ہوں

شبیر کی سپر ہوں علی کی حسام ہوں
شاہوں کا شاہ ہوں شہِ دیں کا غلام ہوں

سینے پہ تیر کھاؤں گا تلواریں کھاؤں گا
یہ مشک آب نہر سے میں لے کے جاؤں گا

یوں تو ہیں تین روز سے بے آب و دانہ سب
لیکن قریبِ مرگ ہیں وہ طفلِ تشنہ لب

کیوں آل کو ستاتے ہو بے جرم و بے سبب
کچھ مصطفےٰ کا پاس نہیں تم کو ہے غضب

دو دن تو بیکسوں پہ عطش میں گزر گئے
کس پر یہ خون ہو گا جو معصوم مر گئے

ہم اپنا سر کٹانے کو حاضر ہیں ظالمو
تیغوں میں بھوک پیاس میں صابر ہیں ظالمو

بچے بھی میہماں کے مسافر ہیں ظالمو
آثارِ مرگ چہروں پہ ظاہر ہیں ظالمو

گر ہم تمھارے زعم میں تقصیر وار ہیں
پر اُن کا کیا قصور ہے جو شیر خوار ہیں

یہ دھوم یہ خیام کا تپنا یہ گرم بن
مرجھا گیا ہے احمدِ مختار کا چمن

مانندِ غنچہ پیاس سے کھولے ہیں سب دہن
پانی بغیر اب نہ جئیں گے وہ گلبدن

گرمی سے ہاتھ پاؤں غریبوں کے سرد ہیں
نیلے ہیں ہونٹ پھول سے رخسار زرد ہیں

چلایا شمر تب کہ عبث ہے سوالِ آب
دیں گے زبان تیغ سے ہم آپ کو جواب

بچوں کی پیاس سے ہے جو حضرت کو اضطراب
پھر کس لیے ہے بیعتِ حاکم سے اجتناب

خیمے سے گھٹنیوں اگر اصغر بھی آئے گا
جز آب تیر پانی کا قطرہ نہ پائے گا

ایسا سخن کبھی سُنا تھا نہ کان سے
بر چھی لگی مگر نہ کہا کچھ زبان سے

جھومے فرس پہ جب شہِ مرداں کی شان سے
بس خود بخود اُگلنے لگی تیغ میان سے

نعرہ کیا کہ اوسگِ ناپاک دور ہو
یہ کیا سخن ہی منہ میں ترے خاک دور ہو

حجت تمام کرنے کی خاطر تھے یہ کلام
ظالم شراب خوار کی بیعت کرے امام

سوکھی ہوئی زباں جو ہلا دے وہ تشنہ کام
حاضر ابھی ہوں چشمۂ کوثر کے لاکھ جام

قدرت ہی سب طرح کی امامِ جلیل کو
چاہیں تو پھیر دیں سلسبیل کو

کیا جانے مرتبہ پسرِ فاطمہ کا تو
عترتِ بہشت کی ہیں تو کوثر کی آبرو

سردار بُردبار نکوکار نیک خو
اُن کا عدو خدا و پیمبر کا ہی عدو

جاری ہی فیضِ فاطمہ کے نورِ عین کا
غاصب ہی تو یہ نہر بھی ہی حق حسینؑ کا

یہ کہہ کے لی نیام سے تیغِ شرر فشاں
آواز دی زمیں نے کہ یا حافظِ زماں

شعلے نے الحذر کہا بجلی نے الاماں
دہشت سے تھرتھرا گیا مریخِ آسماں

ثابت ہوا کہ چہرۂ خورشید کٹ گیا
غل تھا کہ فوجِ شام کا دفتر الٹ گیا

بجلی چمک کے ہوتی تھی جب آسماں کے پار
پڑھتا تھا عرش آیۂ کرسی کو بار بار

زیرِ زمیں تو گاؤ زمیں کو نہ تھا قرار
تھرا رہا تھا نورِ فلک وقت گیر و دار

غل تھا علی کی تیغ کا سب رنگ ڈھنگ ہی
جبریل کانپتے تھے کہ خیبر کی جنگ ہی

اقبال و تندرستی و آسایش و قرار
امن و امان و صبر و توانائی و وقار

علم و سکون و راحت و آرام و اختیار
رعب و ثبات و سرکشی و قدر و اقتدار

آثارِ قہرِ حق اُنھیں معلوم ہو گئے
سب تیغ کے چمکتے ہی معدوم ہو گئے

غل تھا چمکتی آتی ہی تیغِ اجل چلو
ڈر کر کہا اماں نے کہ قبل از جدل چلو

دب کر صدا غرور نے دی سر کے بل چلو
بولی سلامتی کہ سلامت نکل چلو

دریا بہے گا خوں کا کنارے فرات کے
دم بھر میں بند ہوئیں گے کوچے نجات کے

ڈھالوں سے شامیوں کے اُدھر چھا گئی گھٹا
دریا پہ جھوم جھوم کے سب آ گئی گھٹا

ایسا بڑھا یا ابر کہ شرما گئی گھٹا
باران تیر دشت میں برسا گئی گھٹا

کشتوں کو اپنے فوج عدو روندنے لگی
جنگل میں برق قہر خدا کوندنے لگی

چمکی جو تیغ آمد قہر خدا ہوئی
سر پر جو آ گئی تو قیامت بپا ہوئی

سینے سے روح جسم سے گردن جدا ہوئی
خوں میں ڈبو چکی تو نہ پھر آشنا ہوئی

باڑھ اس غضب کی تھی وہ اس زور و شور کا
دشمن کو اُس کا گھاٹ کنارا تھا گور کا

ہر دم تھی معرکہ میں اجل اُس کے دم کے ساتھ
گرتا تھا خود کٹک کے برابر جھلم کے ساتھ

رہتی تھی اس طرح ظفر و فتح خم کے ساتھ
جیسے ہمیشہ رہتا ہے سکہ درم کے ساتھ

ہر دل پہ اُس کی شان و جلالت کا نقش تھا
تمغہ نہ کہیئے آیۂ نصرت کا نقش تھا

بسم اللہ صحیفۂ نصرت تھی اُس کی تاب
مانند ذوالفقار گراں قدر و انتخاب

جوہر میں آب و صلابت میں لاجواب
وہ قد وہ خم وہ منہ کی صفائی وہ آب و تاب

اُترے جگر سے جس کے اُسی کو خبر نہ ہو
کاٹے گلے ہزار کے اور خوں میں تر نہ ہو

پایا تھا باغیوں نے ثمر یہ دم جدل
ڈھالوں سے پھول اُڑ گئے تھے بچھیوں سے پھل

شاخیں کماں کی توڑتا تھا پنجۂ اجل
گرتے تھے سہم کر قدر انداز منہ کے بھل

گوشوں کو ڈھونڈھتے تھے کماں کش ہٹے ہوئے
ریتی پہ نخل تیر پڑے تھے کٹے ہوئے

گوپال و تیغ و خنجر و زوبین و تیر
دو دو تھے پیش آئینۂ تیغ بے نظیر

دم میں یہ صف تمام اُدھر کا پرا خیر
آفت کا معرکہ تھا قیامت کی دار و گیر

اُڑ کر بھی مرغ روح کا بچنا محال تھا
جوہر حسام میں تھے کہ لوہے کا جال تھا

یوں مورچوں کو چاٹ گئی تیغ شعلہ رنگ
لوہے کو خاک شور میں کھا جائے جیسے زنگ

کمروں سے کھنچ نہ سکتے تھے خنجر میان جنگ
جوشن جو کٹ گئے تھے تو چار آئینے تھے دنگ

تلواریں منہ چھپاتی تھیں ضرب دشت سے
ڈھالیں لپٹ گئی تھیں سواروں کی پشت سے

گرتی تھی کوندکر جو وہ تیغ شرارہ ریز
دوزخ کھلا تھا بند تھے سب کو چہ گریز

چلنے میں تیغ تیز فرس تیز ہاتھ تیز
رہ رہ کے گرم ہوتا تھا ہنگامہ ستیز

کشتہ تھے ایک ضرب میں دو ہوں کہ چار ہوں
شش در تھے سب کہ موت سے کیونکر دوچار ہوں

کاٹی سپر تو کاسۂ سر تک پہونچ گئی
سر پر پڑی تو پیر کے برتک پہونچ گئی

برسے مثال برق جگر تک پہونچ گئی
پی کر لہو جگر کا کمر تک پہونچ گئی

بڑھ کر کمر سے زین پر آئی سرنگ کے
ٹکڑے گرے نہ تھے کہ یہ نیچے تھی تنگ کے

اُن کے قدم بھی اُٹھ گئے جو سرگزار تھے
مکمن نہ تھا فرار کہ دل بے قرار تھے

بھڑکی تھی آگ نعل رہ تاش سوار تھے
ٹاپیں فرس کی تھیں کہ سروں کے وار تھے

جاتا تھا یوں غضب میں صف اہل کید پر
شیر ژیاں جھپٹتا ہو جس طرح صید پر

تیغ دو دم سروں سے گذرتی تھی دم بدم
دوزخ میں فوج شام کی بھرتی تھی دم بدم

بڑھتی تھی دم بدم تو ٹھہرتی تھی دم بدم
ندی لہو کی چڑھ کے اترتی تھی دم بدم

ڈر سے جگر بھی آب تھے زہرے بھی آب تھے
موجیں تھیں دست و پا کی سروں کے حباب تھے

نکلا اُدھر سے جو وہ اجل کا شکار تھا
پیدل ہو یا سوار وہ دو تھا یہ چار تھا

کوسوں لہو سے دشت ستم لالہ زار تھا
بجلی چمک رہی تھی فرس نے قرار تھا

کیا ہو زرہ سے ضرب جب ایسی کڑی لگے
سر یوں برس رہے تھے کہ جیسے جھڑی لگے

رہوار نے وغا میں کہاں رستمی نہ کی
شمشیر جانستاں نے کہاں برہمی نہ کی

مالک سے بیکسی میں کہاں ہمدمی نہ کی
سو مرتبے چلی پہ برش نے کمی نہ کی

دم سے تھا بحر خوں کا کنارا لگا ہوا
جانوں کا گھاٹ پر تھا اُتارا لگا ہوا

جس سمت کر کے تیغ کا سایہ گزر گیا
پہونچوں سے دونوں ہاتھ اُڑے تن سے سر گیا

خالی ہوئی یہ صف وہ پر اخون میں بھر گیا
گھوڑے سمیت کر کے یہ تڑپا وہ مر گیا

گرتا تھا خود جری پہ جری ماجرا یہ تھا
بسمل بھی لوٹتے تھے برابر مزا یہ تھا

فتح و ظفر تھی غاشیہ گیر و رکاب دار
دکھلا رہی تھی راہِ عدم تیغ تابدار

جوہر تھے یا کہ سلسلۂ زلفِ تابدار
تلوار بھی ملی تو بہشتی کو آبدار

اِک شور تھا کہ زیست کا عرصہ قلیل ہے
پیاسو پیو کہ تیغ کا پانی سبیل ہے

دشمن جو گھاٹ پر تھے وہ دھوئے تھے جاں سے ہاتھ
سر اُڑ گئے تنوں سے جدا تھے عناں سے ہاتھ

توڑا کبھی جگر کبھی چھیدا سناں سے ہاتھ
جب کٹ کے گر پڑے تو پھر آئیں کہاں سے ہاتھ

اب ہاتھ دستیاب نہیں منہ چھپانے کو
ہاں پاؤں رہ گئے ہیں فقط بھاگ جانے کو

سر بر قدم پہ تھے تنِ کفار سے جدا
قبضہ کمان کا دستِ کماندار سے جدا

چلے تھے سر بسر لبِ سوفار سے جدا
ڈر سے جدا ہلاک تھے تلوار سے جدا

زہگیر کیا کرے جو نہ ترکش میں تیر ہو
چلاتے تھے کہ چل کے کہیں گوشہ گیر ہو

یوں تھرتھرا رہے تھے ہر اک پہلوان کے پاؤں
چلنے میں جیسے کانپتے ہیں ناتوان کے پاؤں

اُٹھا اُٹھا گئے سپاہِ ضلالت نشان کے پاؤں
رن میں جمے رہے تو اسی نوجوان کے پاؤں

ہٹتا بھی ہے جہاد میں حق کا ولی کہیں
عباس بھی ہٹیں جو ہٹے ہوں علی کہیں

جب شیر سے ترائی کی جانب جھپٹ گئے
صف آئی صف پہ گھوڑے پہ گھوڑے الٹ گئے

اب کیا بڑھیں کہ ڈر سے لہو تن کے گھٹ گئے
جن کے قدم جمے رہے سر ان کے کٹ گئے

حملوں کے بعد تنتے تھے یوں نعرے مار کے
انگڑائی شیر لیتا ہے جیسے ڈکار کے

ہر شے تھی خوفِ ضربتِ شمشیر سے جدا
ناوک کمان سے دور کماں تیر سے جدا

پیرِ حزیں جوان سے جواں پیر سے جدا
چلّے سمٹ کے ہوتے تھے زہگیر سے جدا

سارے عقاب تیرِ غم نے پری میں تھے
پیکاں میں نہ سری تھی نہ پیکاں سری میں تھے

نیزے کو تولتا ہوا گر کوئی یل بڑھا
دریائے قہر حق طرفِ پر دغل بڑھا

کچھ ہاتھ کچھ حسامِ دو دستی کا پھل بڑھا
تلوار سر پہ آئی کہ دستِ اجل بڑھا

دو ٹکڑے طول میں جو دمِ امتحاں ہوئے
غل تھا کہ معنیِ یدِ طولیٰ عیاں ہوئے

رُکتی تھی خود پہ نہ جھلم پہ نہ ڈھال پر
حیرت تھی فوجِ شام کو اس چال ڈھال پر

بالا تھا راستی میں قدس کا ہلال پر
جوہر فروتنی کے بھی تھے اس کمال پر

چشمک یہ دم بدم تھی کہ سرکش ذلیل ہیں
چلتے ہیں جھک کے وہ جو نجیب و اصیل ہیں

گھوڑوں کے دوڑنے سے اُڑی دشت میں جو گرد
مقتل بھی زرد تھا فلکِ نیلگوں بھی زرد

جتنے جواں تھے دفترِ مردانگی میں فرد
چہرے کٹے ہوئے تھے انھیں کے دمِ نبرد

تصحیح کیسا ہوش میں اک خود غلط نہ تھا
زخمی تھے منہ کہیں اثرِ خال و خط نہ تھا

ہر سمت تھا مقدمہ جانوں کا رد و بکار
آتی تھی موت جائزہ لینے کو بار بار

اسوار بر طرف تو ندار و رسالہ دار
طبلق لیے تھے منشیِ فوجِ ستم شعار

کیا ابتری سپاہِ ضلالت اثر میں ہے
غل تھا چلو کہ فوج کی بھرتی سفر میں ہے

تسلیم کو جھکے ہوئے تھے با ادب نشان
لشکر میں برہمی تھی سلامی تھے سب نشان

اُٹھتا تھا شور ہاتھ سے گرتے تھے جب نشان
نوبت یہ ہے کہ فوج کا مٹتا ہے اب نشان

آفت بپا ہے پاؤں تھمے کیا سپاہ کا
سکّہ پڑا ہے ضربِ علمدارِ شاہ کا

جب اُٹھ کے تیغ صفدرِ قدسی شرف گری
گویا کہ برقِ سطوتِ شاہِ نجف گری

آیا اُدھر خدا کا غضب جس طرف گری
کٹ کر گرا پرے پہ پرا صف پہ صف گری

سیفی چلی کہ سیفِ صفِ کارزار پر
گھوڑے گرے پیادہ پہ پیدل سوار پر

آئے جو سوئے نہر صفیں موڑ موڑ کے
بھاگے کماں میں تیر عدو چوڑ چوڑ کے

تلواریں ٹپکیں خاک پہ دم توڑ توڑ کے
بھاگے وغا میں گھاٹ کو سب چھوڑ چھوڑ کے

دو برچھیاں نہ پھر نہ وہ شورِ مصاف تھا
جس مورچے پہ تیغ اُٹھائی وہ صاف تھا

وہ رہ گئے کہ زخموں سے جو چور چور تھے
جو تھے قریبِ نہر وہ سب دور دور تھے

غازی تھے صف شکن تھے جری تھے غیور تھے
دریا پہ اور کوئی نہ تھا بس حضور تھے

غل تھا کہ اب بچیں گے نہ ہم اس لڑائی میں
بھاگو کہ شیر گونج رہا ہے ترائی میں

لہ یہ مکالمہ نوفل و ضلالت کا ہے

لڑتا کنارِ نہر جو پہونچا وہ شہسوار
خون پوچھکر رکھی تہ ران تیغ آبدار

آئی صدائے حضرتِ الیاسِ باوقار
ای نورِ عینِ ساقیِ کوثر ترے نثار

سر بہو کون تیغ پکڑ کر جو تو بڑھے
دھو ہاتھ منہ کہ نہر کی بھی آبرو بڑھے

سقائے اہلِ بیت پکارا بچشمِ تر
میں ہاتھ دھو کے جان سے آیا ہوں نہر پر

پیاسا ہے تین روز کا مختارِ خشک و تر
بچے تڑپ رہے ہیں لہو ہے مرا جگر

طوفان کا دھیان صاحبِ کشتی کو چاہیئے
بچوں کی پہلے فکر بہشتی کو چاہیئے

ڈالا میانِ نہر جو اسپِ صبا شتاب
آنکھیں قدم سے ملنے لگے دوڑ کر حباب

موجیں بڑھیں برائے قدم بوسیِ جناب
اچھلیں علم کے چومنے کو ماہیانِ آب

لہروں کی بجلیاں جو برابر چمکتی تھیں
کھلتی تھیں اور حبابوں کی کلیاں چھٹکتی تھیں

پانی سے منہ اٹھائے جو تھا اسپ سربلند
ڈھیلا کیا دلیر نے خود جھک کے زیر بند

بولا ہلا کے سر کو سمند وفا پسند
پیاسا ہے ذوالجناح شہنشاہِ ارجمند

جیواں تو ہوں حضور پہ خوش اعتقاد ہوں
میں بھی تو ابنِ فاطمہ کا خانہ زاد ہوں

فرمایا آپ نے مرے غمخوار مرحبا
ڈگتا نہیں کبھی قدم صاحبِ وفا

تو اپنی خانہ زادی کا حق کر چکا ادا
پیشِ خدا بزرگ ہے صابر کا مرتبا

پانی سے ای فرس تجھے جب اجتناب ہو
سیراب کس طرح پسرِ بوتراب ہو

دریا سے مشک بھر کے جو نکلا وہ تشنہ کام
پھر گھاٹ پر گھٹا کی طرح آئی فوجِ شام

تنہا پہ نے وطن پہ ہوا پھر ہجومِ عام
پھر ہر طرف سے چلنے لگے نیزہ و حسام

اک شور تھا کہ بڑھنے نہ دو اس دلیر کو
کشتہ کرو ترائی میں حیدر کے شیر کو

گھوڑا کہیں گھرا کہیں اڑ کر نکل گیا
جوڑ کے گر پڑا وہ سموں سے کچل گیا

نعروں سے مر گیا کوئی کوئی دہل گیا
صف بچھ گئی ادھر کی جدھر وہ اچھل گیا

مسکینہ لے کے لاکھوں سے کب تک فگار یں
کیوں ای بہادرو کہو عباس کیا کریں

برسے جو دس ہزار کمانوں سے تیر کیں
غربال ہو گیا تنِ عباسِ مہ جبیں

وار اپنا کر گیا جو برا برسے اک لعین
بالائے خاک کٹ کے گرا بازوئے یمیں

مڑ کر نگاہ کی کہ الٰہی یہ کیا ہوا
اک ہاتھ رہ گیا تھا سو وہ بھی جدا ہوا

ٹھنڈا ہو گیا علمِ شاہِ دیں پناہ
عباس نامور نے بھری دل سے ایک آہ

دانتوں سے پکڑی مشک کہ محنت نو تباہ
مشکیزے پر بھی تیر لگا وا مصیبتا

گھوڑے سے ڈگمگا کے بصد یاس گر پڑے
پانی کے ساتھ حضرتِ عباس گر پڑے

اٹھ بیٹھے گر کے حضرتِ عباسِ ذی حشم
گھٹنے کے نیچے مشک تھی زانو پہ تھا علم

جھک کر زمین پہ غش میں جو سنبھلا وہ اکرم
گرزِ گراں عقب سے پڑا سر پہ ہی ستم

ٹکڑے ہوا جگر اسد ذو الجلال کا
سر پاش پاش ہو گیا حیدر کے لال کا

مڑ کر جو فرطِ غیظ سے قاتل پہ کی نظر
مارا کسی نے تیر ولا ور کی چشم پر

جھپکی نہ آنکھ واہ رے دل واہ رے جگر
تیور جو آئے جھوم کے سنبھلا وہ شیر نر

جوشِ غضب میں خاک پہ بیٹھے تھے شیر سے
گویا لہو ٹپکتا تھا چشم و لیر سے

شانوں سے سارے جسم کا جب بہ گیا لہو
ریتی پہ تھرتھرا کے جھکے آپ قبلہ رو

آواز دی کہ آیئے یا شاہِ نیک خو
سر تن سے کاٹ لینے کے در پے ہیں کینہ جو

خوں میں تڑپ تڑپ کے یہ غمخوار رہ نہ جائے
صدمہ یہ ہے کہ حسرتِ دیدار رہ نہ جائے

نکلا حرم سرا سے علمدار کا پسر
گورے گلے میں ہنسلیاں تھیں کان میں گہر

چہرے کا رنگ اڑا ہوا گرد آلود تا عرق میں تر
کی عرض شہ سے ننھے سے ہاتھوں کو جوڑ کر

شاید خبر نہیں ہے امامِ غیور کو
آقا پدر پکار رہے ہیں حضور کو

ڈیوڑھی سے بلبلا کے سکینہ نے یہ کہا
ہاں ہاں سنی تھی میں نے بھی عباس کی صدا

جلدی کسی کو بھیجیے یا شاہِ کربلا
اب گھر سے میں نکلتی ہوں ہے ہے مرے چچا

مر جاؤں گی اگر انھیں جیتا نہ پاؤں گی
کیونکر چچی کو ہائے یہ صورت دکھاؤں گی

حضرت نے آہ کی کہ لرزنے لگی زمین
ناگاہ واں سے بڑھ کے پکارے کئی لعیں

اب جلد سر کٹانے کو آئین امام دیں
کہدے کوئی کہ مر گئے عباس مہ جبیں

بڑھنے دیا نہ گھاٹ سے آگے دلیر کو
کیا گھیر کر کچھار میں مارا ہی شیر کو

تیروں سے جسم چھن گیا بازو ہوئے قلم
افتادہ ہی وہ خاک پہ ٹوٹا ہوا علم

آئے ہیں یاں پھر ہے کے پرزے اڑا کے ہم
پانی نہ مشک میں ہی نہ عباس میں ہی دم

دنیا سے آج اٹھ گیا حامل نشان کا
کٹتا ہی سر ترائی میں کڑیل جوان کا

سنتے ہی اس صدا کے شکستہ ہوئی کمر
تڑپے اٹھے گرے نہ سنبھالا گیا جگر

کانپے جو پاؤں تھام لیا بازوئے پسر
چلاتے تھے کہو علی اکبر چلیں کدھر

خورشید کیوں چھپا ہی یہ کیا واردات ہی
کچھ سوجھتا نہیں ہمیں دن ہی کہ رات ہی

عباس کے پسر سے تو کہدو کہ گھر میں جائے
دیکھو حرم سرا سے سکینہ نکل نہ آئے

فضہ ابھی خبر نہ کسی رانڈ کو سنائے
اکبر اجڑ گیا مرا گھر ہائے ہائے ہائے

پرسا تو دوں بخت کی طرف مجکو موڑ دو
سر پیٹتا چلوں گا مرے ہاتھ چھوڑ دو

یہ روز قتل حمزہ و جعفر ہی ای پسر
یوم وفات حضرت شبر ہی ای پسر

یہ ماتم شہادت حیدر ہی ای پسر
صبر اب کہاں یہ داغ برادر ہی ای پسر

میر الم بتول کی جائی سے پوچھیے
صدمہ جوان بھائی کا بھائی سے پوچھیے

غربت میں لٹ گیا مرا گھر ہائے ہائے
سیدھی نہ ہوگی اب یہ کمر ہائے ہائے

تازہ ہی آج داغ پدر ہائے ہائے
کاٹا گیا چھری سے جگر ہائے ہائے

عباس کیا جہاں سے گئے ہم گزر گئے
محسن ہوا شہید حسنؑ آج مر گئے

کرتا تھا عرض باپ کو تھامے ہوئے پسر
دل کو ذرا سنبھالیے یا شاہ بحر و بر

زندہ ابھی ہیں حضرت عباس نامور
گھبرائیے نہ اب ہی ترائی قریب تر

خادم اٹھائے گا جسد پاش پاش کو
چلیے حرم میں لے کے بہشتی کی لاش کو

جس دم قریبِ لاش کے لائے حسین کو
عباس جاں بلب نظر آئے حسین کو

تڑپا وہ شیر سن کے صدائے حسین کو
اکبر نے ہاتھ اُٹھا کے دکھائے حسین کو

دو کوہ غم کے دل پہ جو اک بار گر پڑے
پہلو میں لاش کے شہِ ابرار گر پڑے

بھائی کی لاش بھائی نے دیکھی جو خوں میں تر
اُمڈا یہ دل کہ منہ کے قریب آگیا جگر

بولے یہ آنکھیں کھول کے عباسِ نامور
اکبر سنبھالو قبلۂ عالم کو بیٹھ کر

صدقے ہزار جان امامِ غیور کے
مجھکو اُٹھا کے گرد پھراؤ حضور کے

منہ مل کے منہ پہ کہنے لگے شاہِ خوش خصال
عباس تم کو نزع میں بھی ہے مرا خیال

اے میرے بھائی جان کہو اپنے دل کا حال
صفدر نے مسکرا کے کہا شکرِ ذوالجلال

آرام آگیا تپشِ روح و دل گئی
آپ آئے کیا کہ دولتِ کونین مل گئی

مولا نزولِ رحمتِ پروردگار ہے
اب آمدِ آمدِ شہِ دُلدل سوار ہے

شبر کھڑے ہیں راہ میں چشمِ اشکبار ہے
شاید جنابِ فاطمہؑ کا انتظار ہے

قدسی قطار باندھے ہیں ناقوں پہ نور کے
آتے ہیں باغِ خلد سے نانا حضور کے

کیا بندہ پروری ہے یہ عزّ و افتخار
لاکھوں برس کی زیست ہے اس موت کے نثار

تھم تھم کے جسم سے جو نکلتی ہے جانِ زار
دُشوار ہے مفارقتِ شاہِ نامدار

کیونکر نہ ایسی مرگ پہ نازاں غلام ہو
ہنگامِ نزع جس کے سرہانے امام ہو

رونے لگے یہ کہہ کے جو عباسِ ذی وقار
فرمایا شہ نے روتے ہو کیوں تم پہ میں نثار

کی عرض اب بدن سے نکلتی ہے جانِ زار
غم ہے کہ آپ اکیلے ہیں یا شاہِ نامدار

تلواریں کھینچ کھینچ کے لشکر جو آئے گا
اب کون ہے جو قبلۂ دیں کو بچائے گا

کہنے لگے بسی ہے موت سے اے قبلۂ امام
باتیں تو تھیں بہت پہ نہیں طاقتِ کلام

بگڑا ہے دم کی آمد و شد کا بھی انتظام
کچھ ایسی آ بنی ہے کہ مجبور ہے غلام

پاؤں گا اب کہاں میں امامِ غیور کو
جی چاہتا ہے یہ کہ نچھوڑوں حضور کو

گھبرا کے نزع میں علی اکبر سے یہ کہا
ای شاہزادۂ دو جہاں میں ترے فدا

میرا تو کوچ ہی طرفِ گلشنِ بقا
فرزندِ فاطمہ سے خبردار اک ذرا

گر منع بھی کریں تو اکیلا نہ چھوڑیو
عمو نثار باپ کو تنہا نہ چھوڑیو

یہ کہہ کے پائے شاہ کی جانب بڑھایا سر
کانپے لہو بھری ہوئی آنکھوں کو کھول کر

ٹپکے مژہ سے خون کے قطرے اِدھر اُدھر
کس یاس سے حسین پہ کی آخری نظر

من کا جری کا ڈھل گیا بھائی کی گود میں
بھائی کا دم نکل گیا بھائی کی گود میں

چلائے سر کو پیٹ کے سلطانِ بحر و بر
فریاد ہی کہ مر گئے عباسِ نامور

بیکس ہوا حسین لٹی دولتِ پدر
آئی صدا علی کی کہ شبیر صبر کر

فرزند تھا مرا یہ تمھارا غلام تھا
جو حال ہو بجا ہی کہ پیارا غلام تھا

یہ سب شرف ہی تیری غلامی کا اے پسر
زہرا سرہانے لاش کے روتی ہیں ننگے سر

جعفر بھی ہیں عقیل و حسن بھی ہیں نوحہ گر
نانا تمھارے روتے ہیں تھامے ہوئے جگر

پُرسا تمھیں شہید کا دینے کو آئے ہیں
یہ سب تمھارے بھائی کے لینے کو آئے ہیں

اٹھکر پکارے حضرتِ شبیر نامدار
میں لُٹ گیا دوہائی ہی یا شبیر کردگار

ہی ہی مرا شفیق مرا یار و غمگسار
خدمت گزارِ عاشقِ صادق وفا شعار

بھائی کا کیا سفر ہوا میں آپ مر گیا
بچے مرے یتیم ہوئے باپ مر گیا

بازو شکستہ ہو گیا ٹوٹی کمر مری
آنکھیں اُدھر تھیں اس کی جدھر تھی نظر مری

اب نے خبر ہیں کون رکھے گا خبر مری
واحسرتا زرہ مری ہی ہی سپر مری

کیوں مجھ سے منہ پھرا لیا تقصیر کیا ہوئی
سب جس سے کانپتے تھے وہ شمشیر کیا ہوئی

یہ کہہ کے گر پڑے شہِ والا بروئے خاک
تر ہو گئی شہید کے خوں سے قبائے پاک

بیٹا تڑپ گیا کہ پدر ہو گئے ہلاک
کر ڈالا دستِ غم سے گریبان چاک چاک

تیور جو آئے گر کے شہِ مشرقین کو
چلائی فاطمہ کہ سنبھالو حسین کو

جلدی عبا اُڑھا کے دلاور کی لاش پر
اکبر نے عرض شاہ سے کی ہاتھ جوڑ کر

خیمے سے نکلی آتی ہیں رانڈیں برہنہ سر
تنہا کھڑا ہی راہ میں عباس کا پسر

آیا وہ گر تو ساتھ سکینہ بھی آئے گی
دیکھی چچا کی لاش تو جیتی نہ جائے گی

فرمایا شہ نے آپ کا مطلب ہی اس سے کیا
روئے نہ پیارے بھائی کو مظلوم کربلا

مجھ سے ابھی تو بچھڑے ہیں عباس باوفا
راحت ہو شمر آ کے جو کاٹے مرا گلا

ہی ہی ابھی سے رشتۂ الفت کو توڑ دوں
کس پر میں ان کی لاش کو جنگل میں چھوڑ دوں

آواز پھر علی کی یہ آئی کہ اے پسر
تو جا کہ میں تو ہوں ترے بھائی کی لاش پر

ڈیوڑھی پہ غش ہی زوجۂ عباس نامور
دونوں غلام زادے تمہارے ہیں نوحہ گر

صدمے جہان میں ہے پدری کے عظیم ہیں
اک سوگوار رانڈ ہی اور دو یتیم ہیں

ناچار لاش چھوڑ کے اُٹھے امام دیں
مشک و علم کو لے کے چلے اکبر حزیں

کوتل تھا ساتھ اسپ علمدار مہ جبیں
باگیں کٹی تھیں تیغوں سے ڈھلکا ہوا تھا زیں

لٹکی ہوئی تھی تیغ و سپر بھی دلیر کی
پرخوں زرہ سند پہ رکھی تھی شیر کی

ماتھا لہو سے ڈوبا ہوا تھوتھنی و گار
سینہ بھی سب چھنا ہوا گردن بھی خمدار

گردن پھرا کے تکتا تھا دریا کو بار بار
یعنی پڑا ہی دشت میں تنہا مرا سوار

خادم برہنہ سر لیے آتا ہی اس طرح
دلدل کو لوگ لاتے ہیں مجلس میں جس طرح

صدمے سے تھی علم کی بھی ٹوٹی ہوئی کمر
چھینٹیں تھیں خوں کی سبز پھریرے پہ سر بسر

پرچم پہ یوں جھکا ہوا پنجہ تھا خوں میں تر
جس طرح پیٹتا ہی کوئی سوگوار سر

پیدا تھی ہر قدم پہ علامت نشان سے
پیٹو کہ اُٹھ گیا مرا حامل جہان سے

پہونچے حسین خیمۂ اقدس کے جب قریں
آگے بڑھے جھکا کے علم اکبر حزیں

دوڑا تڑپ کے دلبر عباس مہ جبیں
چلایا کیا غضب یہ ہوا یا امام دیں

کوتل ہی کیوں نہ مرے بابا کدھر گئے
سر پیٹ کر حسین پکارے کہ مر گئے

یہ سُن کے ننگے پاؤں پھرا وہ جگر فگار
آیا حرم میں مضطر و نالاں و بے قرار

مادر پکاری خیر تو ہے تم پہ میں نثار
چلایا چاک کر کے گریبان وہ سوگوار

پانی کو جو سدھارے تھے وہ خوں میں تر ہوئے
اماں اُڑاؤ خاک کہ ہم بے پدر ہوئے

پردا اُلٹ کے خیمے کا فضہ نے دی صدا
اے پردے والو ڈیوڑھی سے ہٹ جاؤ اک ذرا

لاتے ہیں گھر میں مشک و عَلَم شاہِ کربلا
مارے گئے جہاد میں عباسِ باوفا

موت آئی اُن کو پیاسوں کی تقدیر سو گئی
ہے ہے علی کی چھوٹی بہو رانڈ ہو گئی

خیمے میں حشر ہو گیا سُنتے ہی یہ خبر
رانڈوں کے دل اُلٹ گئے تھرّا گئے جگر

ماتم کی صف پہ بیٹھ گئی کوئی نوحہ گر
غش کھا کے گر پڑی کوئی کھولا کسی نے سر

ہے ہے کا غل ہوا کہ سکینہ اُچھل پڑی
جلے سے بال کھولے دُلھن بھی نکل پڑی

اکبر نے آ کے گاڑ دیا صحن میں عَلَم
کھولے سروں کو زیرِ عَلَم آئے سب حرم

حضرت پکارے پیٹ کے زانو پہ رو و غم
لو زینب اپنے بھائی کو روتے ہیں رن میں ہم

جیتے رہے تھے اس الم و یاس کے لیے
رنڈسالہ لاؤ زوجۂ عباس کے لیے

برپا ہوا یہ حشر کہ ہے ہے علی کے لال
بکھرائے حسین کی بہنوں نے سر کے بال

پیٹی پچھاڑیں کھا کے جو بانوئے خوش خصال
مٹی پہ لوٹنے لگے اطفالِ خرد سال

فق ہو گیا سکینہ کا مُنہ سانس اُلٹ گئی
پھیلا کے ننھے ہاتھ عَلَم سے لپٹ گئی

مُنہ دامنِ عَلَم سے چھپائے بصد بکا
چلاتی تھی کدھر گئے ہے ہے مرے چچا

اس خوں بھرے علم کے میں قربان میں فدا
مشکیزہ کیوں دیا تھا یہ سب ہے مری خطا

بابا اکیلے ہو گئے آفت گزر گئی
ہے ہے یہ پانی مانگنے والی نہ مر گئی

اللہ رے دل خراشیِ علی کی بہو کے بین
مسکانِ آسمان و زمیں کو بھی تھا نہ چین

چادر پڑی تھی مُنہ پہ کہ تھے سامنے حسین
تھامے تھی ہاتھ خواہرِ سلطانِ مشرقین

ٹکڑے تھے تیغِ غم سے دلِ سوگوار کے
حکمِ حیا یہ تھا کہ نہ رونا پکار کے

کچھ سوچکر جو ہٹ گئے واں سے امامِ دیں
اُس وقت ہاتھ اُٹھا کے عَلَم کی بلائیں لیں

منہ کر کے سوئے نہر پکاری وہ دُل حزیں
صاحب حسین روتے ہیں تم کو خبر نہیں

جنگل بسا دیا شہِ والا کو چھوڑ کے
صاحب کدھر چلے گئے آقا کو چھوڑ کے

صاحب سکینہ جان بلکتی ہیں آیئے
کانٹے زباں کے دیکھ کے آنسو بہایئے

صدقے گئی بھتیجی کو پانی پلایئے
قربان جاؤں مشک بھری ہو تو لایئے

الفت کے دلدہی کے منافی نہ چاہیے
صادق ہیں آپ وعدہ خلافی نہ چاہیے

کل تھی سہاگن آج تو میں سوگوار ہوں
بیوہ ہوں جاں بلب ہوں غریب الدیار ہوں

جانِ علی ہیں آپ تو میں جاں نثار ہوں
ہاں ناز ہی تو یہ ہے کہ خدمت گزار ہوں

جنگل میں چھوڑیے نہ مجھے ہاتھ تھام کے
بیٹے ہیں آپ امام کے بھائی امام کے

والی کہاں یہ راٹھ یتیموں کو لیکے جائے
اِس کربلا نے لوٹ لیا مجھکو ہائے ہائے

اب گھر سے کام کیا جو رضا سوگوار پائے
سر پیٹتی ہوئی لبِ دریا کنیز آئے

کیا اُس کی زندگی جسے وارث سے یاس ہو
میری بھی قبر آپ کی تربت کے پاس ہو

ہی ہی عَلَم کے ملنے کی شادی کہوں میں کیا
خضر ان کو مل گئے عَلَمِ سبز کیا ملا

باہر سے پہلے آکے مرے پاس یہ کہا
تھی جس کی آرزو ہمیں عہدہ وہی ملا

صدقے سے شہ کے جعفرِ طیار ہم ہوئے
صاحب تمھیں خبر ہی علمدار ہم ہوئے

میں نے بلائیں لیکے پس از تہنیت کہا
آقا کو اور تم کو سلامت رکھے خدا

سردارِ فیض بخش علمدارِ باوفا
بولے یہ سب حسین کی ہی شفقت و عطا

کیا کیا نوازشیں ہیں امامِ غیور کی
لے آؤ تم بھی جا کے بلائیں حضور کی

کہتے تھے شب کو بھر کے دم سرد دم بدم
تم ہم کو چاہتی ہو تمھیں چاہتے ہیں ہم

سو سر خدا جو دے تو نثارِ شہِ امم
گر ہی تو بس تمھاری جدائی کا ہی الم

کل ہم ہیں اور خنجر و شمشیر و تیر ہیں
اس کا بھی غم بڑا ہی کہ بچے صغیر ہیں

کیسی یہ غفلت آج ہی ای شیر حق کے لال
بچوں کی اب نہ فکر نہ لونڈی کا ہی خیال

بھائی تھی جس کے بالوں کی بلائیں کمال
اُس نے تمھارے سوگ میں کھولے ہیں سر کے بال

اب وصل کے نہ دن نہ شبِ اشتیاق کی
کیونکر کٹیں گی وحشت میں راتیں فراق کی

صاحب تمھیں تو سونے کو ہاتھ آئی خوب جا
دریا کا قرب سرد ترائی خنک ہوا

میں اور آپ آج کی شب تک نہ تھے جدا
بستر کو خالی دیکھ کے گزرے گی مجھ پہ کیا

تڑپوں نہ کس طرح کہ نئی واردات ہی
صدقے گئی فراق کی یہ پہلی رات ہی

ہی ہی مرے نصیب کہ تم سے بچھڑ گئی
غم ہی کہ کیوں نہ میں دمِ رخصت بگڑ گئی

کن احتیاط میں تھی کہ مصیبت یہ پڑ گئی
والی مجھے بلاؤ کہ دنیا اجڑ گئی

کیا راہ و رسم ہی یہی دنیائے زشت میں
لونڈی تو قید خانہ میں صاحب بہشت میں

کیونکر کہوں کہ آپ میں مہر و وفا نہ تھی
میری ہی خاک قابلِ خاکِ شفا نہ تھی

اتنا گلہ ہی بس کہ یہ غفلت روا نہ تھی
کیا پائینتی بھی اک مری تربت کی جا نہ تھی

نے وجہ خیر خواہ سے منہ موڑتے نہیں
ساتھی برا بھی ہو تو اُسے چھوڑتے نہیں

یوں منہ کو موڑنا تو طریقِ وفا نہیں
صدقہ گئی مرا تو کوئی آسرا نہیں

کیونکر تھمے جہاز موافق ہوا نہیں
منجدھار میں تو ناؤ ہی اور ناخدا نہیں

دیتی ہوں واسطہ میں شہِ مشرقین کا
والی مجھے نباہیے صدقہ حسین کا

صاحب تمھیں سکینۂ ناشاد کی قسم
صاحب تمھیں مصیبتِ سجاد کی قسم

تم کو حسینِ کشتۂ بیداد کی قسم
تم کو ہمارے نالہ و فریاد کی قسم

جب تم نہ ہو تو خاک ہی دنیائے زشت میں
مجکو بھی اپنے پاس بُلا لو بہشت میں

یہ کہہ کے پیٹنے جو لگی سر وہ سوگوار
ڈیوڑھی پہ آئے روتے ہوئے شاہ نامدار

بھاوج کے ہاتھ تھام کے بولے بحال زار
بس بس خدا کو یاد کر اب اے جگر فگار

انجام کار سب کے لیے مرگ و گور ہی
بی بی خدا سے کیا کسی بندے کا زور ہی

بس اے انیس طول کی آگے نہیں ہے تاب
طاری ہے ضعف دیتی ہے طاقت بھی اب جواب

بلواؤ خاکسار کو یا ابنِ بو تراب
ڈر ہے کہ ہند میں مری مٹی نہ ہو خراب

جلوہ رہے مزار پہ مولا کے نور کا
خاکِ شفا میں قبر ہو صدقہ حضور کا

رباعی

نافہم سے کب داد سخن لیتا ہوں
دشمن ہو کہ دوست سب کی سن لیتا ہوں

چھپتی نہیں بوے دوستانِ یکرنگ
کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لیتا ہوں

رباعی

چل جلد اگر قصدِ سفر رکھتا ہے
تو کچھ بھی مآل کی خبر رکھتا ہے

راحت دنیا میں کس نے پائی ہے
جو سر رکھتا ہے درد سر رکھتا ہے

مرثیہ (۱۱)

جس دم حسین دلبرِ شبّر کو رو چکے
غربت میں یادگارِ برادر کو رو چکے

پالا تھا جس کو اُس مہِ انور کو رو چکے
صفدر کو تشنہ لب کو دلاور کو رو چکے

دل پر ہجومِ حسرت و اندوہ و یاس تھا
ایک بھائی اور ایک پسر شہ کے پاس تھا

رعشہ تنِ ضعیف میں لب خشک رنگ زرد
سینے میں گاہ ہوک اُٹھی گاہ دل میں درد

چھنٹیں قبا پہ خون کی تھیں گیسوؤں پہ گرد
خالی پروں کو دیکھ کے بھرتے تھے آہِ سرد

غم تھا کہ ابنِ فاطمہ آفت میں کیا کرے
اب ہم سے دیکھیے کہ قسمت جدا کرے

بھرتے تھے آہِ سرد کبھی تھام کر جگر
روتے تھے گاہ زانوئے اقدس پہ رکھ کے سر

تکتے تھی مسکرا کے کبھی جانبِ پسر
کرتے تھے یاس سے کبھی عباس پر نظر

وہ نونہال اور یہ پھولے پھلے ہوئے
حضرت کی ایک گود کے دونوں پلے ہوئے

ماتم اِدھر تھا فوج کے باجوں کی دھوم اُدھر
یاں بیکسی تھی فوجِ عدو کا ہجوم اُدھر

باہم تھے سرکشانِ رے و شام و روم اُدھر
زر بانٹتا تھا خود پسرِ سعدِ شوم اُدھر

ہر شخص نعمتوں سے اُدھر کامیاب تھا
گرمی میں تین روز سے یاں قحطِ آب تھا

عباس چاہتے تھے کہ پہلے ہوں میں نثار
اکبر کا عزم تھا کہ بس اب سر ہی تن پہ بار

بھائی کے غم میں رو کے یہ آقائے نامدار
عموں سے پہلے جائیں ہمیں بہرِ کارزار

جاتا ہی وقت ہاتھ سے گر اب فدا نہ ہوں
حضرت یہ چاہتے ہیں کہ دونوں جدا نہ ہوں

اُٹھا ہی اہلِ بیت سے جب شورِ العطش
شہ کہتے ہیں قریبِ ہلاکت ہیں فاقہ کش

کرتے ہیں عرض رو کے علمدارِ ماہوش
شاید سکینہ جان کو پھر آگیا ہی غش

کس سے کہیں جو قلب پہ صدمے گزرتے ہیں
افسوس ہم تو جیتے ہیں معصوم مرتے ہیں

دیکھا ہی جب سے لاشۂ قاسم کو پائمال
چھریاں جگر پہ چلتی ہیں یا شاہِ خوش خصال

گر قبلۂ اُمم سے ملی رخصتِ جدال
دشتِ نبرد کو ابھی کر دیں لہو سے لال

رو کے غلام کو یہ کسی کا جگر نہیں
دریا نہ چھین لیں تو علی کے پسر نہیں

چاہیں جدھر لہو کی اُدھر ندیاں بہائیں
ظالم کسی پرے میں سلامت نظر نہ آئیں

کاسے سروں کی ٹھوکریں اک اک قدم پہ کھائیں
مشکیزہ بھر نہ لیں تو نہ منہ آپ کو دکھائیں

چھوٹے نہ تیغ ہاتھ سے جب تک کہ دم رہے
چھاتی پہ مرتے وقت بھی مشک و علم رہے

شہ نے کہا کہ اس میں کسی کو ہی کیا کلام
تم غیظ میں جو آؤ تو ہل جائے روم و شام

بھائی مگر یہ غیظ و غضب کا نہیں مقام
میری تو یہ دُعا ہی کہ ہو صابروں میں نام

پہلے مروں میں تم نہ اگر سدِ راہ ہو
مجکو نہیں قبول کہ امت تباہ ہو

بولے بہا کے اشک علمدارِ نامدار
ہل مِن مُبارِز کی ہی اُس فوج میں پکار

یاں ایک شاہزادہ ہی اور ایک جاں نثار
آخر حضور دیں گے کسے اذنِ کارزار

دیکھیں تو آپ اُن کے نشانوں کے اوج کو
اتنا تو ہو کوئی کہ نہ بڑھنے دے فوج کو

شہ نے کہا انھیں بھی تو ہی شوقِ جنگ کا
غازی نے کی یہ عرض کہ یا شاہِ کربلا

اچھا جہاد کی علی اکبر کو دی رضا
انصاف کیجیے مجھے خلقت کہے گی کیا

کس منہ سے پاس جاؤنگا خیر الانام کے
جب شاہزادہ قتل ہو آگے غلام کے

بانو کی روح جسمِ شہِ نے وطن کی جان
دنیا کی زیب آلِ رسولِ زمن کی جان

چھوٹے پڑوں کی آنکھوں کا تارا بہن کی جان
پامال ہو وہ گل جو ہی ساری چمن کی جان

اُس زندگی پہ خاک اگر ایک دم جیئیں
ہم شکلِ مصطفےٰ تو نہ ہوا اور ہم جیئیں

شہ نے کہا کہ پھر مجھے کھانے دو تیغ و تیر
تم سا جوان قتل ہو جیتا رہے یہ پیر

تم یادگارِ شیرِ خدا شاہِ قلعہ گیر
ہم صورتِ رسولِ خدا یہ مہِ منیر

سمجھے ہو سہل تم مجھے مشکل ہی کیا کروں
دو داغ اور ایک میرا دل ہی کیا کروں

تم ہو گے تو تباہ نہ ہو گا ہمارا گھر
عابد کو بیڑیاں نہ پنھائیں گے اہلِ شر

عریاں نہ ہوں گے بلوے میں سیدانیوں کے سر
زینب کو شام میں نہ پھرائیں گے دربدر

بچ جائیں گے سنبھوں کے گلے پر سماں سے
بندے نہ پھر چھنیں گے سکینہ کے کان سے

کہنے لگے یہ رو کے علمدارِ ذی حشم
میرا ہی افتخار نگہبانیِ حرم

کرتے ہیں گر سپرد یہ عہدہ شہِ اُمم
بہتر ہی پھر کسی کو عنایت ہو یہ عَلَم

نام و نشاں سے کام نہ دنیا سے کام ہی
مجکو رضائے سیدِ والا سے کام ہی

سُمعًا و طاعتہً ہمیں کیا آبرو سے کام
کچھ عرض کی مجال نہ تکرار کا مقام

بہتر ہی بیڑیاں بھی پہن لے گا یہ غلام
کھولوں سلاحِ جنگ اجازت جو دیں امام

آقا کریں عتاب نہ گر جاں نثار پر
جا بیٹھوں منہ چھپا کے علی کے مزار پر

رونے لگے یہ سُن کے شہنشاہِ بحر و بر
عباس آئے خیمہ کے اندر جھکائے سر

سیدانیاں یہ کہنے لگیں تھام کر جگر
کیا ہی جو روتے آئے ہیں عباسِ نامور

اکبر کی خیر ہوشہ والا کی خیر ہو
یارب وطن میں فاطمہ صغرا کے خیر ہو

سب بی بیاں تھیں گردِ علمدارِ نامدار
جو پوچھتا تھا اور یہ روتے تھے زار زار

کہتی تھی رو کے زوجۂ عباسِ فی وقار
صاحب کہو تو کچھ کہ میرا دل ہی نے قرار

آنکھوں سے اشک بہتے ہیں چہرہ بھی لال ہی
مقتل میں کیا ہوا جو تمھارا یہ حال ہی

لیکر بلائیں کہتی تھی بانوئے شاہِ دیں
بھیا بتاؤ خیر سے ہیں اکبرِ حزیں

کہتے تھے ہاتھ جوڑ کے عباسِ مہ جبین
ہی خیریت حضور نہ گھبرائیں کچھ نہیں

کرتا نہیں مدد کوئی لاکھ التجا کریں
جو بد نصیب ہوں وہ نہ روئیں تو کیا کریں

بنتِ علی کے پاس جو پہونچا وہ سیم بر
ماتم کی صف پہ رکھ دئے ہتھیار کھول کر

گھبرا کے بولی زینبِ ناشاد و نوحہ گر
عباس کیا ہی کھولتے ہو کس لیے کمر

اب تو کوئی لڑے گا نہ بیکس امام سے
کیوں بھائی صلح ہو گئی کیا فوجِ شام سے

رونے کی وجہ کیا ہی اُبھتا ہی میرا دم
قاسم کے غم میں کیا ہوا کچھ اور تازہ غم

بہتے ہیں اشک نرگسی آنکھوں سے دم بدم
بولو تو کچھ حسین کے سر کی تمھیں قسم

آخر کھلے گا سب پہ کوئی واردات ہو
مجھ سے الگ کہو جو چھپانے کی بات ہو

کہنے لگی یہ زوجۂ عباس خوش خصال
وہ کونسی ہی بات کہ جس کا ہی یہ ملال

قسمیں جناب دیتی ہیں تم کو نہیں خیال
صاحب بڑی بہن سے کہو اپنے دل کا حال

صدقہ انھیں کا سب ہی کہ پھولے پھلے ہو تم
بیٹوں کی طرح گود میں ان کی پلے ہو تم

قدموں پہ سر جھکا کے یہ عباس نے کہا
کیونکر نہ روؤں قتل ہوئے خویش و اقربا

میرا کفیل کوئی نہیں آپ کے سوا
مجھکو حسین مرنے کی دیتے نہیں رضا

میرا نہیں خیال شہِ خاص و عام کو
دیجے نجف میں جانے کی رخصت غلام کو

فرماتے ہیں کہ اکبر مہرو وغا کو جائیں
بچے ہوں کامیاب شہادت ہمیں سنائیں

دیکھیں انھیں شہید یہ دل ہم کہاں سے لائیں
پردہ اسی میں اب ہی کہ عالم سے منہ چھپائیں

کب اُٹھ گئے جہاں سے کسی کو خبر نہ ہو
اس بن میں جا رہیں کہ بشر کا گزر نہ ہو

زینب نے تب کہا کہ یہ آزردگی ہی لو
معلوم اب ہوا مجھے مطلب ہی ان کا جو

کیونکر کہوں کہ بھائی کو مرنے کا دو اذن
اچھا بُلا کے کہتی ہوں آگے جو ہو سو ہو

رونا اِدھر اُدھر کو غریبی و یاس ہی
ان کا بھی درد ہی مجھے اُن کا بھی پاس ہی

مشکل مجھے ہی کس سے کہوں اپنا حالِ زار
وہ ماں کی جان و روح یہ بابا کی یادگار

بیکس بہن سے پوچھے کوئی بھائیوں کا پیار
کیونکر جییں گے ہائے شہنشاہِ نامدار

کہتے ہیں موت خلق میں سب اس جدائی کو
یارب مفارقت نہ ہو بھائی سے بھائی کو

زاری اِدھر تھی اور پریشاں تھا سب کا حال
آیا اُدھر حسین کو عباس کا خیال

ہمشکل مصطفےٰ سے یہ بولا علی کا لال
آزردہ ہو گئے ہیں علمدارِ خوش خصال

بیتاب دل ہی چھاتی سے لپٹائیں بھائی کو
آؤ حرم میں چل کے منا لائیں بھائی کو

اکبر کا ہاتھ تھام کے گھر میں حسین آئے
دیکھا کھڑے ہیں حضرتِ عباس سر جھکائے

پھیلا کے ہاتھ لب پہ شہِ دیں سخن یہ لائے
آؤ گلے لگو کہ دلِ زار چین پائے

تم تو عزیز ہو مجھے اس نورِ عین سے
کس بات پر خفا ہوئے بیکس حسین سے

عباس ہاتھ جوڑ کے بولے کہ کیا مجال
ہیں شیرِ کبریا کی جگہ شاہِ خوش خصال

کیا ذکر ہے ملال کا اے فاطمہ کے لال
عاجز ہوں شکر میں جو زباں سب ہو تن کے بال

حضرت غلام کہہ کے پکاریں تو شاد ہوں
مادر مری کنیز ہے میں خانہ زاد ہوں

حضرت کے منہ کو دیکھ کے زینب نے یہ کہا
آپ ان پہ شیفتہ ہیں یہ ہیں آپ پر فدا

صدقے بہن ہو بھائی انھیں دیجیے رضا
دنیا میں اور بھی ہے کوئی ایسا با وفا

مثلِ علی جہاں کے شجاعوں کے تاج ہیں
ظاہر ہے آپ پر کہ یہ نازک مزاج ہیں

وہاں ہے وہ غاطلب سیہ خانماں خراب
ان کو کسی کی بات کے سننے کی کب ہے تاب

حضرت کے ڈر سے دے نہیں سکتے ہیں کچھ جواب
غصہ یہی ہے اور یہی ان کو پیچ و تاب

بگڑیں تو پھر بپا ہو قیامت جہان میں
رونا یہ ہے کہ آتا ہے فرق آن بان میں

اکبر کو آپ بھیجیے گر سوئے فوجِ شام
ہو جائیں دشمن ان کے تڑپ کر ابھی تمام

مطلب یہ ہے کہ فوج پہ چمکے مری حسام
دنیا میں مجھ سے بڑھ کے نہ ہوئے کسی کا کام

پہلے ہمیں حسین پہ سر کو فدا کریں
پالا ہے دکھ سے اب انھیں کیونکر جدا کریں

نیت سفر پہ باندھی ہے تھیار کھول کر
بہنوں کی بیکسی پہ بھی اب تو نہیں نظر

کیا آپ نے کہا تھا کہ اکبر کٹائے سر
مجکو کبھی یقیں نہیں یا شاہِ بحر و بر

میرے حواس ان کے تڑپنے سے چھوٹے ہیں
روئی ہوں میں بھی ساتھ یہ اس طرح روئے ہیں

کیونکر زباں سے اپنی کہوں میں جگر فگار
ضد ہے یہی کہ جلد ملے اذن کارزار

حضرت پہ ان کے دل کا تو مطلب ہے آشکار
خیر اب خوشی انھیں کی کریں شاہ نامدار

صفدر ہیں جان دینے کو کچھ جانتے نہیں
غصے میں یہ تو بات کوئی مانتے نہیں

شہ نے کہا کہ بس ہی اسی بات کا ملال
لیں اذنِ جنگ خیر سدھاریں پئے جدال

قسمت میں ہی کہ یہ بھی نہ ہو وقتِ انتقال
تنہا مسافرت میں مرے فاطمہ کا لال

قاتل ہو زخمی چھاتی پہ خنجر ہو پیاس ہو
کٹنے لگے جو حلق تو کوئی نہ پاس ہو

ہم چاہتے ہیں ساتھ جئیں ساتھ ہی مریں
مرنے لگیں جو ہم تو یہ زانو پہ سر دھریں

تلواریں کھا کے ایک جگہ خون میں بھریں
خیران کی جو خوشی یہی پہلے سفر کریں

مشتاق ہیں بہشت کے حوروں کے قصر کے
یہ قبل ظہر ہو پہنچیں گے ہم بعد عصر کے

سب اہلِ بیت رونے لگے سُن کے یہ کلام
قدموں پہ شہ کے جھک کے یہ بولا وہ نیک نام

تقصیر بخشیئے مری اے شاہِ تشنہ کام
چھاتی سے سر لگا کے یہ کہنے لگے امام

بھائی سے دِل بُرا کہیں ہوتا ہی بھائی کا
یہ روٹھنا فقط تھا بہانہ جدائی کا

لائیں سلاح سامنے زینب بچشمِ تر
پٹکا اُٹھا کے شہ نے کہا باندھیے کمر

تسلیم کی ادب سے جری نے جھکا کے سر
ہتھیار سج کے خیمہ سے نکلا وہ نامور

غم چھا گیا امید چلی یاس رہ گئی
بس سر جھکا کے زوجۂ عباس رہ گئی

لیکر علَم اُدھر سے بڑھا وہ فلک جناب
خادم اُدھر سے لائے فرس کو بصد شتاب

گھوڑے پہ جلوہ گر جو ہوئے مثلِ آفتاب
نورِ قدم سے چاند بنے حلقۂ رکاب

اسوار نے نظیر فرس نے مثال تھا
جو نعل کا نشاں تھا زمیں پر ہلال تھا

آمد علی کے شیر کی ہی رزم گاہ میں
دہشت سے تہلکہ ہی عدو کی سپاہ میں

ہر چند ابھی سواریِ صفدر ہی راہ میں
بجلی چمک رہی ہی عدو کی نگاہ میں

غل ہی وہ شیر قصد کیے ہی ترائی کا
پھر معرکہ ہی آج علی کی لڑائی کا

یوں چھیڑتے فرس کو اُس آفت کے میں آئے
جیسے نسیمِ فصلِ بہاری چمن میں آئے

اس دبدبے سے لشکرِ یماں شکن میں آئے
اک شور پڑ گیا اسد اللہ رن میں آئے

جنگل کے شیر صورتِ آہو دبک گئے
جتنے بڑے ہوئے تھے پرے سب سرک گئے

اللہ رے رعب حضرت عباس عرش جاہ
صف پر گریں صفیں تہ و بالا ہوئی سپاہ

دیکھا جدھر شکار یہ کی شیر نے نگاہ
ہٹ ہٹ گئے جو نہر کو روکے تھے رو سیاہ

کھایا نگہ کا تیر اگر آنکھ چار کی
دکھلا دی ابروؤں نے پرش ذوالفقار کی

کاندھے پہ ساتھ مشک و علم پشت پر سپر
وہ تیغ تیز دم میں جو کر دے ہم کو سر

وہ تیر الحفیظ کماں وہ کہ الحذر
وہ ضرب گرز توڑ دے جو کوہ کی کمر

وہ ڈھال روک لے جو تہمتن کے وار کو
نیزہ وہ جو فرس سے اٹھا لے سوار کو

سر پر وہ خود گرد پھرے جس کے آفتاب
نور جبیں سے بدر فلک قدر کو حجاب

بیتاب ابروؤں کی حسن کے دیواں میں لاجواب
جو خال مشکبیز کا نقطہ وہ انتخاب

مر جائے شیر پر جو پڑے اس ولی کی آنکھ
آنکھوں کو دیکھئے تو بعینہٖ علیؑ کی آنکھ

قرآن و رحل روے مبین و خط سیاہ
ظلمت میں آفتاب ہے یا حرف شب میں ماہ

سوکھے لبوں پہ برگ گل تر کا اشتباہ
مدح دہن میں اب نہیں ملتی سخن کو راہ

ایسا دقیق اور معما کہیں نہیں
موجود اسم ہے پہ مسما کہیں نہیں

کیونکر کہیں کہ غنچۂ تصویر ورد ہے
یاں یاسمن بھی فرط خجالت سے زرد ہے

کس طرح منقسم ہو وہ جوہر جو فرد ہے
حیراں خیال فلسفی ہرزہ گرد ہے

میزان عقل میں حکما کے تلا نہیں
یہ وہ طلسم ہے جو کسی سے کھلا نہیں

دانتوں میں وہ چمک کہ نظر کو نہیں ہے تاب
خود جس کی برق و شرق سے آگے کا اس کو حجاب

کیا ان کے سامنے گہر بے بہا کی آب
دعوے ہو کچھ تو دول ابھی مدال شکن جواب

گر منہ سے دُر کہوں تو فصاحت سے دور ہے
دانا کو آبرو کی حفاظت ضرور ہے

شانوں کو آفتاب اگر کیجیے رقم
ذرے سے آفتاب جہاں تاب یاں ہے کم

لو کاٹتا ہے غیظ سے اپنی زباں قلم
یہ وہ ہے جس پہ فوج خدا کا رہا علم

کون ایسا نوجواں تھا خدا کے ولی کے بعد
بیشک علم انہیں کے لیے تھا علی کے بعد

شانے وہ گول گول وہ بازو بھرے بھرے
فرقت میں جن کی حور نہ نکیہ پہ سر دھرے

پہنچوں کے زور سے تہ و بالا ہوئے پرے
پنجہ وہ جس کو دیکھ کے شیر ژیاں ڈرے

ضو اُن ہتھیلیوں کی کہاں آفتاب میں
وہ انگلیاں درائیں جو خیبر کے باب میں

سینہ وہ آئنہ ہے کہ صدق و صفا کا گھر
مسکن ادب کا علم کا ماخذ حیا کا گھر

سینے میں اس طرح ہے دل باوفا کا گھر
جس طرح سب گھروں میں مقدس خدا کا گھر

کعبہ ہے گو زمیں پہ مگر عرش قدر ہے
دل صدر میں ہے صدر جہاں ہے وہ صدر ہے

قربان ہیں ثباتِ قدم پر ہزار سر
رکھتا ہے فخر جس پہ بصد افتخار سر

اعدا جو لاکھ ہوں تو کریں ایک بار سر
سر کیں نہ اور کٹ کے گریں بے شمار سر

نقش اس قدم کا خاک پہ رہتا ہے اس طرح
مٹتا نہیں کبھی خطِ تقدیر جس طرح

ناگہ صدا بلند ہوئی طبلِ جنگ کی
جو تھے بہادر اُن کے دلوں میں اُمنگ کی

نکلے نقیب اور یہ صدا بے درنگ کی
باگیں اُٹھاؤ اسپ کمیت و سرنگ کی

نامی جواں وہ ہے جو لڑے اس دلیر سے
اب سامنا ہے شیرِ الٰہی کے شیر سے

جب یوں بڑھائے دل تو سواروں کے دل بڑھے
گرزانے تول تول کے لشکر کے بل بڑھے

ہر صف سے یوں اڑے ہوئے تیغوں کے پھل بڑھے
جس طرح قبضِ روح کو دستِ اجل بڑھے

تنہا تھا وہ صفیں تھیں بہم جس کے واسطے
یہ معرکہ تھا اک متنفس کے واسطے

اُلٹی علی کے شیر نے بھی آستیں اِدھر
قبضے پہ ہاتھ اُدھر گیا کانپی زمیں اِدھر

ظاہر ہوا جلالِ جہاں آفریں اِدھر
آیا جلال میں اسدِ خشمگیں اِدھر

صف پر جو صف گری تو پیادے سوار پر
گویا علی نے ہاتھ رکھا ذوالفقار پر

یوں تیغِ شعلہ زا نکل آئی نیام سے
نکلی بیاضِ صبح شبِ تیرہ فام سے

جس طرح برقِ ابر سے معنی کلام سے
چہرہ دکھایا حور نے دارالسلام سے

آئینہ ظفر تھا کہ نکلا غلاف سے
کھینچا پری کو فخرِ سلیماں نے قاف سے

چمکی جو تیغ برق جہندہ بنا سمند
آہو جو خاک پر تو ہوا کی طرف پرند

خود آگ تھا وہ رخش تو سیماب جوڑ بند
اسوار کو چھپالے وغا میں وہ سربلند

ہر نعل و سم کو فوق تھا بدر و ہلال پر
طاؤس و کبک و جدیں تھے اُس کی چال پر

گھوڑا کہیں پرند کسی جا پری کہیں
آہو کہیں ہما کہیں کبک دری کہیں

تیروں نے اُس سے رَو میں نہ کی ہمسری کہیں
نرمی کہیں شتاب کہیں صعفری کہیں

رکھتا تھا معرکہ میں قدم اس وقار سے
جیسے چمن میں پھول گرے شاخسار سے

کلک اُس کے ہاتھ پاؤں کو لکھے تو کیا لکھے
مردم ہوا پرست کہیں گر ہوا لکھے

خود نے سعادتی ہی جو بالِ ہما لکھے
مشہور نارسا ہو جو ذہن رسا لکھے

ناقص کہیں جو طالبِ تشبیہ تام ہیں
یہ سب اُسی کے حاشیہ دار و کے نام ہیں

پریاں نثار ہوتی ہیں چال اُس کی دیکھیے
حوروں کے بال دیکھ کے یال اُس کے دیکھیے

سرعت دمِ جدال و قتال اُس کی دیکھیے
کیا حسن ہی رکاب و دوال اس کے دیکھیے

روشن ہیں پتلیاں کہ قدم اُس جری کے ہیں
آنکھیں یہ حور کی ہیں وہ گیسو پری کے ہیں

آغازِ جنگ میں وہ تک و دو وہ آؤ جاؤ
گھونگھٹ نیا تھا چال نئی تھی نیا بناؤ

جاتا تھا یوں اُتار ہو رستے میں یا چڑھاؤ
جیسے ہوا میں جاتی ہی آبِ رواں پہ ناؤ

تھا صاحبِ عَلَم بھی جدل پر تُلا ہوا
کشتی کا بادباں تھا پھریرا کھُلا ہوا

ڈھالوں کو روکتے تھے جوانانِ پُر جگر
بجلی گری پڑے گی تو پھر کیا کرے سپر

وہ اُڑ گئیں کلائیاں دھڑ سے گرا وہ سر
بازو ہوا وہ قطع وہ وہ ہو گئی کمر

وہ آتش فساد و غضب خاک ہو گئی
سینہ وہ کٹ گیا وہ زرہ چاک ہو گئی

جب سن سے وہ چلی تو گرے سر زمین پر
سر تھے کسی جگہ کہیں پیکر زمین پر

وہ تیغ دم نہ لے کہیں دم بھر زمین پر
جبریل بھی بچھائیں اگر پر زمین پر

فتح و ظفر حسامِ دو دستی کے ساتھ ہی
دستِ خدا کے جوشنِ بازو کا ہاتھ ہی

وہ برق جب اِدھر سے اُدھر جا کے پھر گئی
خوں پی کے سرگرا کے صفیں کھا کے پھر گئی

مے جان سے کیا اُسے تڑپا کے پھر گئی
تھی اک چھری کہ حلق پہ اعدا کے پھر گئی

چڑھتے ہی رن پہ نشۂ جرات اُتر گئے
دیکھا نہ صاف منہ اسی حسرت میں مر گئے

یوں تھیں صفیں کہ موج کے پیچھے ہو جیسے موج
تھا دم بدم شناور دریائے خوں کو اوج

چکر میں تھی بصورت گرداب ساری فوج
تلوار فرد فرد کو کرتی تھی زوج زوج

بیدم ہیں وہ جو تیغ و دوم سے دوچار ہیں
گر چار ہیں تو آٹھ جو دو ہیں تو چار ہیں

غصہ ستم تھا قہر غضب تھا جفا نئی
اُڑتے تھے سر تنوں سے چلی تھی ہوا نئی

مضمون نئے ہیں بندشِ مہر و وفا نئی
تیزی نئی ہے چال نئی ہے ادا نئی

جیسے ورق ہوا سے پرے یوں اُلٹتے ہیں
سو سو گلے اشارۂ ابرو میں کٹتے ہیں

فوجوں میں ابتری تھی علی کے طفیل سے
سیفی سے صاف تیز دعائے بکیل سے

جوہر کہیں فزوں تھے ضیا میں سہیل سے
ہاتوں بڑھے ہوئے تھے روانی میں سیل سے

نازل تھا قہر منزلِ ہستی خراب تھی
گھر گر رہے تھے کفر کے بستی خراب تھی

اعدا کے حق میں ہو گیا تعاب حسام سم
کرتے تھے آہوؤں کی طرح خوش خرام رم

نیزے تھے خوف سے صفتِ چوب خام خم
ایسا لڑا جہاں میں کوئی تشنہ کام کم

دشمن بھی معترف تھے وہ پیکار کر گئے
مقتل سے اُڑ کے تا سرِ کہسار سر گئے

اک آگ تھے کہ خاک میں سب کو ملا گئے
سم ہو گیا اُسے جسے پانی پلا گئے

آئے جدھر زمین کے طبقے ہلا گئے
زخموں کے پھول نخلِ بدن کے کھلا گئے

تیروں کو بلبلوں کا نشیمن بنا دیا
رن کی زمین شور کو گلشن بنا دیا

رہوار بھر رہا تھا طرارے اِدھر اُدھر
سب بھاگتے تھے خوف کے مارے اِدھر اُدھر

اُڑتے تھے اُس کے دم سے شرارے اِدھر اُدھر
دنبالہ دار گرتے تھے تارے اِدھر اُدھر

دریا پہ ہاتھ دھوئے تھے سب اپنی جان سے
تلوار کیا برستی تھی آگ آسمان سے

شمشیر زن کے ہاتھ میں دستِ خدا کا زور
پہونچا تھا ہاتھوں ہاتھ جسے مرتضےٰ کا زور

کس بل غضب کا قہر کی ضربت بلا کا زور
نعرہ یہ تھا کہ مجھ میں ہی مشکلکشا کا زور

مرحب سا اتنی فوج میں اک نامور نہیں
کیونکر کھلے یہ زور کہ خیبر کا در نہیں

حسرت رہی وفا کی دلِ حق پسند کو
کھولا نہ ایک نے مرے نیزہ کے بند کو

پستی میں لاؤں اوج سے کس سربلند کو
خندق میں عمر ہو تو اڑاؤں سمند کو

دو ٹکڑے کر دوں رستم و سیاب گیو کے
پٹکے سے باندھوں مثلِ علی ہاتھ دیو کے

جم کر لڑو صفوں کی صفائی تو دیکھ لو
گردن کی اور سروں کی جدائی تو دیکھ لو

ابن علی کی قلعہ کشائی تو دیکھ لو
پیاسے مسافروں کی لڑائی تو دیکھ لو

سرسبز ہوں میں تیغِ دودم سرخرو رہے
تم کو ہوس رہے نہ مجھے آرزو رہے

ہر بار رن پہ رن پڑے ایسی نبرد ہو
ہنگامہ گرم ہو کے نہ بازار سرد ہو

تھرّائے آسماں رخِ خورشید زرد ہو
بڑھنے نہ دو مجھے تو یہ جانوں کہ مرد ہو

بالائے دوش مشک ہے تلوار ہاتھ میں
دریا کا گھاٹ لیتا ہوں دو چار ہاتھ میں

یہ سُن کے واں کی فوج سے اک پہلوان بڑھا
گویا کہ جھومتا ہوا پیلِ دماں بڑھا

نیزہ بڑھا اُدھر سے اِدھر سے نشان بڑھا
پنجہ اُٹھا کے صید پہ شیرِ ژیاں بڑھا

دیکھا جو نعرہ مار کے اُس بدخصال کو
سمجھے یہ سب اسد نے دبوچا غزال کو

نیزہ اِدھر اُدھر سے بصد کروفر تلا
باندھا اُدھر جو بندِ شقی نے اِدھر کھلا

ہوتا ہے کیا ہزار کرے فوج غلغلہ
یہ موجِ بحر قہر وہ پانی کا بلبلہ

تھی چوٹ پر جو چوٹ تکاں پر تکان تھی
نیزہ میں نوک تھی نہ کلائی میں جان تھی

جوڑا بچا کے سر کو ستمگر نے رہ سے تیر
تھرا رہا تھا شورِ بگیر و بدہ سے تیر

زخمی ہوا نہ صدر نہ گذرا زرہ سے تیر
گوشے کماں کے کٹ گئے ٹوٹا گرہ سے تیر

سرزد خطا یہ کیا ہوئی شش در پہ تھا
اوچھے سے وار میں نہ کماں تھی نہ تیر تھا

ظالم پکارا تول کے پھر گرز گاؤ سر
اس کی ہو لگے تو سلامت نہا و سر

ممکن نہیں کہ خاک پر گر کر اٹھاؤ سر
ہاں نورِ چشمِ حیدرِ صفدر بچاؤ سر

رستم سا پہلوان ہو تو جی اس کا چھوٹ جائے
ایک اس کی ضرب میں کمرِ کوہ ٹوٹ جائے

عباس نے کہا کہ خموش اور زباں دراز
گو میں ضعیف ہوں پہ توانا ہی کارساز

اللہ خاکسار کو کرتا ہی سرفراز
کیا گرز گاؤ سر کی حقیقت ہی اور گراز

برہم اگر ہوں لال شہِ قلعہ گیر کے
پھیکیں زمیں پہ کلہ اژدر کو چیر کے

نے شرم راست بازوں سے یہ کج ادائیاں
کیا تجھ سے گاؤ زور سے زور آزمائیاں

نیکوں سے یہ بدی یہ بھلوں سے برائیاں
ہم توڑ ڈالتے ہیں اسد کی کلائیاں

ضیغم دبک کے بیشۂ حیدر میں آتے ہیں
یاں کے غزال شیر کو آنکھیں دکھاتے ہیں

مارا جھپٹ کے گرزِ گراں روسیاہ نے
روکا سپر پہ ضرب کو اس دیں پناہ نے

پکڑی کلائی ہاتھ سے بازوے شاہ نے
چھوٹی نہ لاکھ زور کیا روسیاہ نے

نقصانِ جاں بھی دست درازی کے ساتھ ہو
چھوڑے نہ گرز کو تو نہ بازو نہ ہاتھ ہو

جب پھٹ کے انگلیوں سے ٹپکنے لگا لہو
پہنچا سزا کو میں یہ پکارا وہ کینہ جو

بولے یہ ہاتھ جوڑ کے عباسِ نیک خو
پھر کیجیو نہ لاف زنی میرے روبرو

تو ہاتھ جوڑتا ہی تو منہ موڑتا ہوں میں
صیدِ زبوں سمجھ کے تجھے چھوڑتا ہوں میں

یہ گھاٹ چھین کر ہمیں بھرنی ہی مشک کب
تڑپا رہا ہی قلب کو بچوں کا اضطراب

تلوار جلد کھینچ لے او خانماں خراب
رکتا ہی کیوں لڑائی کا ہو فیصلہ شتاب

مشکل کشا کی تیغ کا یہ فیضِ عام ہی
جب چار ہاتھ چل گئی قصہ تمام ہی

جب اس طرح سے چل گئے تیغ و زبان کے وار
تیغ دو دم کو تول کے آیا وہ نابکار

رو کر کے چند وار صدا دی کہ ہوشیار
شمشیر سر پہ آئی کہ مرحب پہ ذوالفقار

سب غول چار آئنہ والوں کا دنگ تھا
سر تھا نہ صدر تھا نہ کمر تھی نہ تنگ تھا

دوہو کے منہ کے بھل جو گرا وہ ستم شعار
عباس سوے نہر بڑھے بہر کارزار

بس سرنگوں گیا سوے دوزخ وہ نابکار
نیزے اُٹھا اٹھا کے یہ کہنے لگے سوار

گو آپ کی ہی تیغ میں آفت کا کاٹ ہی
بڑھیے ذرا سنبھل کے یہ تیغوں کا گھاٹ ہی

غازی پکار ابڑھ کے ہمارے قدم ہٹیں
تیغیں ہٹیں نشان ہوں سلامی علم ہٹیں

ممکن نہیں کہ صاحب سیف و قلم ہٹیں
دریا سے تم ہٹو یہ نہ ہوگا کہ ہم ہٹیں

سر کے نہیں قدم کبھی آگے بڑھے ہوے
اُترے ہیں شیر پیر کے دریا چڑھے ہوے

دریا یہ کیا ہی اور تمھاری بساط کیا
ثابت قدم کو تیغوں کا ڈر کیا صراط کیا

یہ گھاٹ کیا ہی قہر ہو تو کیا رباط کیا
جب جان دی تو جسم کی پھر احتیاط کیا

اُڑنے کو پر ملیں گے اگر تیر کھائیں گے
کوثر پہ اب تو ہم اسی دریا سے جائیں گے

رکھیں گے تیغ تیز کے قبضے پہ ہاتھ جب
کھُل جاے گا اشارے میں بند و بست سب

دریا ہی جن کے جد کا وہ بچے ہیں تشنہ لب
سر لوٹتے پھریں گے جو لوٹا کسی نے اب

ہتھیار کیا ہیں فوج کے جی چھوٹ جائیں گے
یہ مورچے بندھے ہوئے سب ٹوٹ جائیں گے

اعدا جمے سنبھال کے ہتھیار گھاٹ پر
ڈھالیں نہ تھیں گھٹا تھی دھواں دھار گھاٹ پر

آئی چمک کے برق شرربار گھاٹ پر
چلنے لگی دلیر سے تلوار گھاٹ پر

اعدا ہزار ڈھالوں میں منہ کو چھپاتے تھے
کیا وار تھا کہ نار میں سر اُڑ کے جاتے تھے

چھٹے مثال شیر جدھر صف الٹ گئی
یہ ہاتھ تن سے اڑ گیا وہ ڈھال کٹ گئی

جو فوج مثل موج بڑھی تھی وہ ہٹ گئی
دیکھا جو گھاٹ تیغ کا جرات بھی گھٹ گئی

اللہ کا غضب تھا کہ تلوار ہاتھ میں
دریا کا گھاٹ لے لیا دو چار ہاتھ میں

بجلی تھی یا کہ تیغ کا پرتو اِدھر اُدھر
مر کر سوار گرتے تھے سو سو اِدھر اُدھر

چلتے تھے تھم کے وقت تگ و دو اِدھر اُدھر
ہل چل تھی بیچ میں تو روا رو اِدھر اُدھر

عنصر بھی تھے شریک دم تیغ لاگ میں
پھینکا ہوا نے خاک میں پانی نے آگ میں

ہر بار اڑ کے جاتا تھا چاروں طرف سمند
تلوار نے گریز کے کوچے کیے تھے بند

گھوڑوں سے گر کے پست ہوئے کتنے سربلند
دریا میں گر کے مر گئے کتنے جفا پسند

صف پر گری تھی صف تو پرے بھی پروں پہ تھے
دو پاؤں تھے زمین پہ اور دو سروں پہ تھے

اللہ ری سمند کی چھل بل لڑائی میں
تلوار چل رہی تھی مسلسل لڑائی میں

بجلی تھی یا چمکتی تھی ہیکل لڑائی میں
پھٹ پھٹ گئے تھے ڈھالوں کے بادل لڑائی میں

بھاگڑ میں شہسواروں کی ہوا رچھٹ گئے
جی چھوٹے گھاٹ چھٹ گیا ہتھیار چھٹ گئے

جب سن سے تیغ تیز چلی سر پہ سر گرا
خون ناریوں کا اڑ کے مثالِ شرر گرا

بھائی پہ بھائی باپ پہ مر کر پسر گرا
چمکی جو دو طرف یہ ادھر وہ ادھر گرا

کشتوں کے پشتے ہو گئے ضربِ لیر سے
عرصہ فرس پہ تنگ تھا لاشوں کے ڈھیر سے

بجلی تھی سر پہ یا چمک اس شعلہ ریز کی
یارا نہ جنگ کا تھا نہ طاقت گریز کی

زہرے تھے آب تاب کے تھی تیز تیز کی
گھاٹ اس طرف تھا باڑھ ادھر تیغ تیز کی

ہٹ کر مقابل امن نہ بڑھ کر نجات تھی
آگے لہو کی نہر تھی پیچھے فرات تھی

ساحل پہ تیغ تول کے گو نجا وہ شیر نر
جو ہم کو روکتی تھیں وہ فوجیں گئیں کدھر

توڑا ہے ایک ہاتھ سے خیبر کا ہم نے در
کرتے ہیں مرتضیٰ کے پسر یوں ہم کو سر

ہم سے مقابلہ تھا اسی کائنات پر
یہ مورچے تھے چیونٹیاں تھیں یا فرات پر

جن کو نہ دو دو دن ہو بہم قوتِ لایموت
اُن کے جواب میں یہ تحیر ہی بے سکوت

زرہیں تھیں یا کہ موم کچھ اب تک نہیں ثبوت
حلقے یہ تھے کمند کے یا تارِ عنکبوت

ثابت نہیں خیار تھے بید یا عمود تھے
پانی پہ حباب تھے یا سر پہ خود تھے

تینوں نے کچھ نہ کاٹ دکھایا یہ کس نے بل
نیزے وہ کیا ہوئے جو تلے تھے دمِ جدل

پرزے کہاں ہیں اُن کے جو ڈھالیں تھیں بے بدل
کیا برچھیوں نے غیر مذلت دکھائے پھل

سر اُن کے کس طرف کو سنانیں کدھر گئیں
وہ تیر کیا ہوئے وہ کمانیں کدھر گئیں

تر تھے عرق میں ہاتھ میں تھی تیغِ خوں چکاں
ٹھنڈی ہوا کچھار سے آئی جو ناگہاں

بولے یہ کانپ کانپ کے عباسِ نوجواں
واحسرتا کہ دھوپ میں ہیں شاہ انس و جاں

بس اے صبا جہاں کی فضا ہے قفس ہمیں
پانی کی آرزو نہ ہوا کی ہوس ہمیں

ساحل سے نہر میں جو گیا وہ فلک حشم
دوڑے حبابِ بحر کہ آنکھوں پہ یہ قدم

پانی میں جلوہ گر تھا جو عکسِ رخِ علَم
تھے مہر و ماہ آئنۂ آب میں بہم

آئی صدا درود کی ہر نخل و سنگ سے
دریا زبرجدی تھا پھریرے کے رنگ سے

عباسِ نامور جو کیے تھے لبوں کو بند
پانی پہ ڈالتا تھا نہ منہ اسپِ سربلند

گردن پہ ہاتھ پھیر کے بولا وہ ارجمند
احسنت اے سمندِ رضا جو وفا پسند

با آبرو مزا ہے سوئے خلد جانے میں
تیری وفا کا شور رہے گا زمانے میں

چھینٹیں جو منہ پہ دینے لگا وہ فلک وقار
گردن ہلائی اُس نے کہ یہ بھی ہے ناگوار

پانی گیا جو منہ میں تو میں ہو گا شرمسار
پیاسا ہے ابن فاطمہ کا طفلِ شیر خوار

آقا لہو جگر ہے سکینہ کے حال پر
فاقہ یہ شبیر ہے محمد کی آل پر

مشکیزہ بھر کے خشک کو آواز دی کہ چل
یاں منتظر تھی راہ کو روکے ہوئے اجل

آئے تھے گھاٹ تک بڑھے برچھیوں کے پھل
تینوں پہ تینیں فوج پہ تھی فوج دل پہ دل

گھیرے تھے لوگ ان کی راہیں بھی بند تھیں
نیزے تُلے ہوئے تھے کمانیں بلند تھیں

اک شور تھا کہ شیر دلاور نہ جانے پائے
سقائے اہلِ بیتِ پیمبر نہ جانے پائے

فرزند فاطمہ کا برادر نہ جانے پائے
ہاں نورِ عین ساقیِ کوثر نہ جانے پائے

پھرتی ہے ظفر یزید کی گرد شہید ہو
عباس کے گلے کو جو کاٹیں تو عید ہو

نعرہ کیا جری نے کہ ہم رُکنے والے ہیں؟
یہ دیکھے بھالے سب میں جو بھالے سنبھالے ہیں

ابتر کیا تھا جن کو وہی یہ رسالے ہیں
ثابت ہوا کہ دن ابھی ڈھالوں پہ کالے ہیں

پستی کو ڈھونڈھتی ہے بلندی نشانوں کی
خنجر ابھی کبھی پہ ہے قسمت کمانوں کی

اس وقت سب جہاں مجھے مل کر تو روک لے
فوجیں تو آئیں سامنے لشکر تو روک لے

دیوارِ تیغ و نیزہ و خنجر تو روک لے
تم کیا ہو مجھکو سدِ سکندر تو روک لے

آیا ہوں جاں بلب کئی بچوں کو چھوڑ کر
حائل پہاڑ ہو تو نکل جاؤں توڑ کر

فرما کے یہ فرس کو بڑھایا دلیر نے
دریا لہو کا دم میں بہایا دلیر نے

شیرِ خدا کا زور دکھایا دلیر نے
پٹکا زمین پر جسے پایا دلیر نے

یوں توڑ ڈالیں نیزوں کی ڈنڈیں مروڑ کے
جس طرح پھینکدے کوئی تنکے کو توڑ کے

ہتھیار پھینک پھینک کے بھاگے شریر سب
چوٹیں پڑیں کہ بھول گئے دار و گیر سب

کٹ کٹ گئے ملے ہوئے چلدوں سے تیر سب
چھپتے تھے سہم سہم کے برنا و پیر سب

ڈھالوں میں منہ چھپاتی تھیں تیغیں پڑی ہوئی
سینہ سپر تھی کوندتی تھی تیغ برق دم

جس دوش پر تھی مشک اسی ہاتھ میں علم
رکتے نہ تھے مگر کہیں عباس ذی حشم

برسا رہے تھے تیروں کا مینہ بانیِ ستم
جب باگ اٹھائی فوج کی حلقوں کے پار تھا

کیا شیر دل سوار تھا کیا راہوار تھا
پیدل جو گر پڑے تو بڑھے جنگ کو سوار

لشکر یزید کا تھا کہ دریائے بے کنار
نیزے قلم کیے تو چلے برچھیوں کے وار

بھاگے جو وہ تو آئے کنارے پہ نیزہ دار
پلے سے تیر چلتے تھے نیزے قریب سے

کیونکر مہم یہ سر ہو اک آفت نصیب سے
مجبور ہے بشر جو نہ مہلت اجل سے پائے

فوجوں سے اس ترائی میں لڑتے ہوئے جو آئے
غازی کے ہاتھ کٹ گئے شانوں سے ہائے ہائے

تلواریں سر پہ لگ گئیں پہلو پہ تیر کھائے
دانتوں سے مشک چھوٹ گئی دم الٹ گیا

پانی بہا تو جان چلی زور گھٹ گیا
مارا کسی نے دیدۂ حق بیں پہ تیر آہ

غش سے فرس پہ جھک کے جو سنبھلا وہ دیں پناہ
رہوار سے گرا پسرِ ضیغمِ الٰہ

سر پر لگا جو گرز تو حالت ہوئی تباہ
جس طرح زخمی شیر تڑپتا ہے خاک پر

اٹھ بیٹھتے ہیں لوٹ کے یوں ارضِ پاک پر

اِک شور تہنیت کا ہوا فوج میں اُدھر
یاں بارِ غم سے ٹوٹ گئی شاہ کی کمر

تلوار ٹیکتے ہوئے دوڑے جو تنگ سر
تھا ماپسر نے بازوئے شبیرِ نوحہ گر

نے ہاتھ تھامے پاؤں بڑھانا محال تھا
جس طرح نے قرار ہو بسمل یہ حال تھا

بھائی کا داغ درد جگر تین دن کی پیاس
ضعفِ بصر شکستہ کمر منتشر حواس

فرماتے تھے پسر سے ٹھہر کر بدردو یاس
اکبر کدھر ہے لا شۂ عباسِ حق شناس

بتلاؤ اب کہ حال ہمارا تباہ ہے
رستہ پہاڑ ہو گیا کیا سخت راہ ہے

دم چڑھ گیا ہے سانس اکھڑتی ہے دم بدم
صدمے سے بیٹھا جاتا ہے دل کیا اُٹھیں قدم

دُنیا سے کھو گئے ہیں عباس ذی حشم
سیدھا ہوں کس طرح یہ برابر کا ہے الم

سب گھٹ گیا ہے خوں جو میرا رنگ زرد ہے
دل میں کمر میں سینے میں پہلو میں درد ہے

دم توڑتا ہے نہر پہ شاید وہ مہ لقا
یہ تھی کراہنے کی اُسی شیر کی صدا

کس وقت میں بچھڑ گیا ہم سے وہ باوفا
دو بھائیوں کو موت بھی آئی نہ ایک جا

ڈھونڈے گی اُن کو روح اگر میں بھی جاؤں گا
پیدا نہ باپ ہو گا نہ بھائی کو پاؤں گا

پہونچے ترائی میں جو شہِ دیں بصد تعب
سقائے اہلِ بیت نظر آئے جاں بلب

بازو کٹے تھے خون میں ڈوبا تھا جسم سب
دم توڑتے تھے ہچکیاں لے لیکے ہے غضب

آنکھوں سے نزع میں بھی رواں عوے اشک تھی
پر خوں علم پہ ہاتھ تھا چھاتی پہ مشک تھی

سینے پہ مُنہ کو رکھ کے پکارے شہِ زمن
حاضر ہوا برادرِ مظلوم و نے وطن

اے مرے شیر آمرے جرار و صف شکن
آزردہ ہو کے دیر میں پہنچا یہ خستہ تن

مرتے ہیں ہم جلاد و ہیں منہ سے بول کے
دیکھو تو حال بھائی کا آنکھیں کھول کے

غازی نے آنکھیں کھول کے دیکھا رخِ امام
اینٹھی تھی یہ زباں کہ نہ کچھ ہو سکے کلام

کروٹ جو لی کراہ کے کانپا بدن تمام
آتا تھا ہچکیوں کا کہ تھا موت کا پیام

مانند بوئے گل دمِ آخر گزر گیا
منزل پہ بوجھ رکھ کے مسافر گزر گیا

بھائی جواں جو مر گیا بھائی کے سامنے
پٹکا زمیں پہ سر سے عمامہ امام نے

حضرت سے عرض کی پسرِ تشنہ کام نے
چلیے اب اہلِ بیتِ محمد کو تھامنے

ماتم بپا نہ ہو جسد پاش پاش پر
نکلی سکینہ گر تو سب آئیں گی لاش پر

فرمایا شاہ نے کہ برادر کو رو تو لوں
مظلوم کو شہید کو صفدر کو رو تو لوں

سقائے اہلِ بیتِ پیمبر کو رو تو لوں
عاشق کو نے وطن کو دلاور کو رو تو لوں

صبر آئے کس طرح ابھی تازہ جدائی ہے
اولاد باپ کی ہے برابر کا بھائی ہے

مر جائے بھائی اور نہ بھائی بکا کرے
غربت میں ہو یہ جس پہ مصیبت وہ کیا کرے

چھاتی پھٹے اگر نہ گریباں قبا کرے
میری بھی موت اب کہیں جلدی خدا کرے

مرتے ہی اس کے رشتۂ الفت کو توڑ دوں
گودی میں جو پلے اُسے جنگل میں چھوڑ دوں

ناگاہ در سے خیمے کے فضہ نے دی صدا
دریا سے کس طرف گئے عباسِ باوفا

کیسا یہ غل ہے نہر پہ اے شاہِ کربلا
گھر سے نکل پڑی ہے سکینہ برہنہ پا

تن کانپتا ہے ضعف سے ہاتھوں میں ہاتھ ہے
عباس کا پسر بھی سکینہ کے ساتھ ہے

یہ شور سُن کے لاش سے اُٹھے امامِ دیں
مشکِ علم کو لیکے چلے اکبرِ حزیں

چلائی رو کے عاشقِ عباس مہ جبیں
ہے ہے علم تو آتا ہے میرے چچا نہیں

چھائی ہوئی ہے کیسی اُداسی نشان پر
کیا بن گئی ارے مرے عمو کی جان پر

لائے علم جو خیمے میں سلطانِ بحر و بر
رایت کے ساتھ ساتھ تھے بچے برہنہ سر

دیکھا جو اس علم کا پھریرا لہو میں تر
سید انیاں زمیں پہ گریں تھام کر جگر

سر پیٹتی تھی کوئی کوئی خاک اُڑاتی تھی
ہے ہے کا شور تھا کہ زمیں تھرتھراتی تھی

چلاتے تھے حسین کہ غم خوار مر گیا
زینب ہمارا یارِ وفادار مر گیا

قوت تھی جس سے ہائے وہ جرار مر گیا
سقائے آلِ احمدِ مختار مر گیا

اب کون آفتوں میں رکھے گا خبر مری
سیدھی نہ ہو گی قبر میں بھی اب کمر مری

غش جس جگہ تھی زوجۂ عباسِ نوجواں
سب مل کے اُس کو زیرِ علم لائیں بی بیاں

بکھرا کے سر کے بال پکاری وہ خستہ جاں
لوگو بتاؤ لاش علمدار ہے کہاں

پوچھو بلائیں لیکے شہِ تشنہ کام کی
کیا وجہ ہے کہ لاش نہ لائے غلام کی

بولی یہ رو کے بانوئے بیکس بدرد و غم
وہ کر گئے تھے آپ وصیت یہ مرتے دم

چلائی سر کو پیٹ کے وہ کشتۂ اَلَم
صاحب ترستے رہ گئے دیدار کو بھی ہم

مرتے ہوئے نہ چاند سی صورت دکھا گئے
کس بات پر کنیز سے صاحب خفا گئے

خاموش اب انیس کہ اک حشر ہے بپا
مجلس میں چار سمت ہے اک شورِ مرحبا

کر حق سے ہاتھ اُٹھا کے بصد عجز یہ دُعا
یارب دکھاوے روضۂ سلطانِ کربلا

اچھی نہیں مریض کو دوری مسیح سے
حسرت یہ ہے کہ روؤں لپٹ کر ضریح سے

رباعی

رعبِ شہِ ذی جاہ سے تھرّاتے ہیں
سب طرزِ غلامانہ بجا لاتے ہیں

آداب یہ ہے کہ تعزیہ خانے میں
آتے ہیں تو جھک جھک کے علم آتے ہیں

رباعی

شاہانِ جہاں سب ہیں گدائے حیدر
ہے ابرِ کرم دستِ سخائے حیدر

یعقوب و خلیل و یوسف و آدم و نوح
سب کی مشکل میں کام آئے حیدر

مرثیہ ۱۲

جب لشکرِ خدا کا عَلَم سرنگوں ہوا
سقائے اہلِ بیتِ نبی غرقِ خوں ہوا
ڈوبا لہو میں چاند شہِ مشرقین کا
یارب کوئی جہان میں اسیرِ محن نہ ہو
ماں باپ سے جدا کوئی گل پیرہن نہ ہو
بھائی بچھڑ چکا ہے شہِ مشرقین سے
طاقت تھی جس سے شہ کو سنبھالے وہ شیر
پیاسا جہان سے لبِ کوثر گیا وہ شیر
غم آگیا کمر میں شہِ خوش خصال کی
لشکر میں شادیاں تھیں اُدھر غم تھا اس طرف
امید اُدھر تھی یاس کا عالم تھا اِس طرف
کمریں کسے ہوئے تھا زمانہ جدال پر
مرنا جوان بھائی کا اور اس پہ یہ ستم
اعدا صفیں جمائے ہوئے جنگ پر بہم
نرغے میں اُن کے سبطِ رسالت پناہ تھا
نہ پاس انھیں نبی کا نہ مطلق خدا کا ڈر
باتوں میں زور دل میں بدی طینتوں میں شر
پیدا تھا کفر شرم و حیا ناپدید تھی

اِک شور تھا کہ خانۂ دیں نے ستون ہوا
سیدانیوں میں اور تلاطم فزوں ہوا
خالی کیا اجل نے بھرا گھر حسین کا
جنگل میں گھر لٹا کے کوئی بے وطن نہ ہو
پھولا پھلا اُجاڑ کسی کا چمن نہ ہو
اب نوجواں پسر کی ہے رخصت حسین سے
جس سے مزاحیات کا تھا مر گیا وہ شیر
سقائی کر کے خون میں خود بھر گیا وہ شیر
تصویر مٹ گئی اسدِ ذوالجلال کی
ساماں وہاں تھا جشن کا ماتم تھا اس طرف
اعدا میں عید تھی تو محرم تھا اِس طرف
کیا وقت پڑ گیا تھا محمد کے لال پر
پرسانہ ولد ہی نہ تشفی نہ درد و غم
ہنستے تھے سوگواروں کے رونے پہ دم بدم
مشرب میں جن کے پانی کا دینا گناہ تھا
قرآں سے نے وقوف حدیثوں سے بے خبر
بدکار و بدخصال و بداعمال و بدگہر
سادات ذبح ہوتے تھے اور ان کو عید تھی

کیسے وہ کلمہ گو تھے تعجب کا ہے مقام
اسلام اگر یہی ہے تو اسلام کو سلام

کس جا چھپینگے روزِ عدالت ضرور ہے
یا منتقم ظہورِ امامِ زماں دکھا

آنکھیں ہیں منتظر رخِ آرامِ جاں دکھا
دشمن رہے نہ ایک شہِ بشر قرین کا

اولاد والے دل میں ذرا اک خیال کر
بیٹا وہ نوجوان جسے اٹھارھواں ہے سال

ماں باپ کے لیے تو اجل کا پیام ہے
بھائی وہ مر چکا ہے کہ تھا جس کے دم سے گھر

اطفالِ بے رضائے وغا ہے جواں پسر
پیری میں اس جوان کو بھی کھوئیں تو کیا کریں

قابو ہے اب جگر پہ نہ ہے دل پہ اختیار
ماں باپ سے پسر کو چھوڑے نہ کردگار

راحت ہے گر گلوئے پدر پر چھری چلے
بڑھتا ہے ہاتھ جوڑ کے جب شہ کا نورِ عین

فرماتے ہیں کہ سنتے ہو سید نبی کے بین
بھائی جہان سے جانبِ خلدِ بریں گئے

بیکس پھوپھی کو گھر میں تمہارا ہے انتظار
چھوٹی بہن پکارتی ہے تم کو بار بار

ہم کوئی دم میں آبِ دمِ تیغ پیتے ہیں

کافر بھی لیتے ہیں تو کراہت سے اُن کا نام
کھل جائے گا کھنچے گی جو کل تیغِ انتقام

ہم دور ہیں نہ وہ نہ قیامت ہی دور ہے
اب دم لبوں پہ ہے درِ امن و اماں دکھا

پھر برقِ ذوالفقار کو آتش فشاں دکھا
اُس دن غلام سوگ تمہارے حسین کا

ہوتی ہے کیسی الفتِ فرزندِ خوش خصال
کیا ہوگا نورِ چشمِ رسولِ خدا کا حال

دشمن بھی رونے لگتے ہیں یہ وہ مقام ہے
سیدھی ابھی ہوئی نہیں ٹوٹی ہوئی کمر

تو کوں میں برچھیوں کی ہے شبیر کا جگر
کیوں منصفو کہو جو نہ روئیں تو کیا کریں

یہ مرحلہ وہ ہے کہ ہیں صابر بھی بے قرار
زخمِ سنان و تیغ گوارا یہ ناگوار

جو ہو سو ہو مگر نہ جگر پر چھری چلے
خیمے کو تکنے لگتے ہیں منہ پھیر کر حسین

عباس کے الم میں یہ برپا ہے شور و شین
پُرسے کو بھی چچی کے تم اب تک نہیں گئے

دھڑکے سے ماں کے دل کو نہیں ایک دم قرار
دیکھ آؤ اپنے چاہنے والوں کو میں نثار

یہ چند دم تمہارے بھروسے پہ جیتے ہیں

اصغر کو دیکھو عابد مضطر کی لو خبر
سمجھاؤ بی بیوں کو کہ بیٹیں نہ اپنا سر

رانڈوں کے تم پسر ہو یتیموں کے تم پدر
گھر تھامتے ہیں باپ کا ذی مرتبہ پسر

کس کو یہ داغ پیرِ فلک نے دیا نہیں
سر پر کسی کے باپ ہمیشہ جیا نہیں

تم سے بھی کم تھے عمر میں جب ہم ہوے یتیم
ماں بھی نہ تھی یہ اور تھی اک آفتِ عظیم

ہم دونوں بھائیوں کے جگر غم سے تھے دونیم
ہر ہر بلا میں حافظ و حامی رہا کریم

رانڈوں کو یہ الم ہی کہ منہ موڑے جاتے ہیں
ہم تو جہاں ہیں تم سا پسر چھوڑے جاتے ہیں

کینے کی جان باپ کا اقبال گھر کا نور
یوسف جمال صاحبِ توقیر ذی شعور

جرار و بردبار و دلاور سخی غیور
آنکھوں کی روشنی جگر و قلب کا سرور

خرد و کلاں کو اجرِ زیارت حصول ہیں
تم ہو تو اہلِ بیت میں گویا رسول ہیں

نعمت ہی زیست خلق میں ایسے سعید کی
پیدا ہی نورِ رخ سے ضیا صبح عید کی

تھی سب کو آرزو رخِ روشن کے دید کی
تصویر ہو رسولِ خدائے مجید کی

کیونکر جدا نگاہ سے بیٹا کریں تمھیں
آنکھیں یہ چاہتی ہیں کہ دیکھا کریں تمھیں

رات کے دن ہیں آمدِ فصلِ شباب ہی
پہلا ابھی کتابِ جوانی کا باب ہی

اٹھارھویں برس کا بھلا کیا حساب ہی
نے حاشیہ ابھی ورقِ آفتاب ہی

نقطے ہیں خال کے خطِ عنبر فشاں نہیں
بابا نثار ہوا بھی پورے جواں نہیں

اکبر تمھاری قدر نہیں ہی کسی کو آہ
اس حسن کا بشر نہیں کوئی خدا گواہ

ہوتے جو لوگ احمدِ مرسل کے خیر خواہ
تم کو سمجھتے ثانیِ پیغمبرِ الٰہ

آنکھوں پہ رکھتے فخر سے نعلینِ پاک کو
اکسیر جانتے انھیں قدموں کی خاک کو

جینے کی اب خوشی ہی نہ دنیا کی ہی ہوس
ہی دل کو شوقِ آبِ دمِ تیغ ہر نفس

بچھڑینگے تم سے گر ہی تو صدمہ یہی ہی بس
جیتے تو کرتے بیاہ تمھارا اسی برس

دولھا بنا کے شانِ جہانی بھی دیکھتے
طفلی تو دیکھی حسنِ جوانی بھی دیکھتے

پھولو پھلو کہ زینبِ باغِ جہاں ہو تم
آخر ہی عمر پیر ہیں ہم نوجواں ہو تم

شاداں رہے گی روح کہ راحت رساں ہو تم
مرنے کے بعد باپ کا نام و نشاں ہو تم

گر ہم نہیں تو خانۂ زہرا میں تم رہو
اب زندگی یہی ہی کہ دنیا میں تم رہو

اکبر کا رنگ اڑ گیا سنتے ہی یہ کلام
کی عرض ہاتھ جوڑ کے شہ سے کہ یا امام

فرزندِ ارجمند ہیں سجاد نیک نام
اکبر تو ہی حضور کا ادنیٰ سا اک غلام

اس امر سے فزوں کوئی شرمندگی نہیں
آقا کے بعد موت ہی یہ زندگی نہیں

بندے ہزار ہم سے نثارِ سرِ حضور
دُنیا ہو اور آپ ہوں اے اکبر آپ کے نور

روشن جو ہی جہان اسی دم کا ہی ظہور
ذرہ ہر اک ہی نورِ قدم سے چراغِ طور

ظلمت زدائے خلق شہِ دیں کی ذات ہی
دنیا میں آفتاب نہ ہو جب تو رات ہی

رونق زمیں کی ہی کہ امام زماں ہیں آپ
سایہ ہی جس کا عرش پہ وہ آسماں ہیں آپ

بہرِ جہاں ہیں باعثِ امن و اماں ہیں آپ
شیرازۂ صحیفۂ کون و مکاں ہیں آپ

فردوں کی ابتری ہی جو دفتر کشانہ ہو
کیونکر تھمے جہاز اگر ناخدا نہ ہو

افضل ہی کون سبطِ رسالت مآب سے
دُنیا میں ہی تو یہ برکت ہی حباب سے

سرسبز ہی زراعتِ عالم سحاب سے
ذرّوں کی زندگی ہی فقط آفتاب سے

چھٹکارہ رہے باپ کے پیارے کہاں رہیں
جب آسماں نہ ہو تو ستارے کہاں رہیں

دم سے حضور کے ہی غلاموں کی ہست و بود
مولا ہیں اس جہاں میں درِ رحمت و جود

اے چشمۂ عطا و کرم بحرِ فیضِ وجود
دریا اگر نہ ہو تو حبابوں کی کیا نمود

سب خلق شاہِ دیں سے طلبگارِ عون ہی
جب نوح غرقِ خوں ہو تو کشتی کا کون ہی

پھر زیست کیا کرے وہ جو بعد آپ کے جیے
کھائے غم اور خونِ جگر عمر بھر پیے

غیروں نے آج پائے مبارک پہ سر دیئے
بچپن سے ہم نے باندھی ہی تلوار کس لیے

اب پنجتن کا خاتمہ ہی کوئی آن میں
پھر بھی یہ معرکہ کبھی ہوگا جہان میں

سب بھائی بند قتل ہوئے رن میں تشنہ لب
حضرتؑ مجھے بچاتے ہیں کیوں اس کا کیا سبب

خادم کو بھی سعادتِ عقبیٰ کی ہے طلب
دیجے رضا جہاد کی بہرِ رسولؐ رب

کہیے نہ یہ کہ ساتھ نہ دو تشنہ کام کا
منہ سے نکل پڑے گا کلیجہ غلام کا

سینے میں دل لرزتا ہے جینے کے نام سے
زندہ وہی ہے پہلے مرے جو امام سے

سیراب ہو نہ دیجے شہادت کے جام سے
آقا یہ بوجھ اٹھ نہ سکے گا غلام سے

دیکھے گا کون لوٹنے فوجیں جو آئیں گی
خادم سے بیڑیاں کبھی پہنی نہ جائیں گی

عابد خدا کے فضل سے ہیں صابروں میں فرد
مظلوم پر دبا غمِ انگیز اہلِ درد

سہ لینگے وہ یتیمی و غربت میں گرم و سرد
ہم اور کام کے نہیں لائق بجز نبرد

وہ آلِ مصطفےٰؐ کا مدار المہام ہو
جو ہو پسر امام کا خود بھی امام ہو

خوں میں نہا کے گر نہ ہوا آج سُرخرو
پھر کس کو منہ دکھاؤنگا یا شاہِ نیک خو

چمکا رہے ہیں برچھیاں میداں میں جنگجو
غصّے سے جوش کھاتا ہے اب جسم کا لہو

کس سے کہوں اگر نہ کروں عرض آپ سے
بیٹے کی آبرو متعلق ہے باپ سے

ملی ہو یہ مرحلہ جو کریں پرورش حضور
خلدِ بریں بعید نہ باغِ ارم ہے دور

کوشش میں اس طرف سے تو مطلق نہیں قصور
ای آفتاب ذرہ نوازی ہے اب ضرور

نہ زندگی نہ جاہ و حشم چاہتا ہوں میں
آقا کی اک نگاہِ کرم چاہتا ہوں میں

ماں کا بھی کیا پیار ہے اب حق میں میرے زہر
امداد کا مقام ہے اب یا امامِ دہر

آبِ فرات کی نہیں اب تشنگی میں لہر
جنت میں شہد و شیر کی خالق دکھائے نہر

مٹی ملے تو سبطِ پیمبرؐ کے ہاتھ سے
پانی پیوں تو ساقیِ کوثرؐ کے ہاتھ سے

دیجے رضائے حرب کہ مرتا ہے اب غلام
خیمے میں چلیے لیکے مجھے یا شہِ انام

چپ ہو رہینگی سُن کے پھوپھی آپ کے کلام
بن جائے گا زباں کے ہلانے میں میرا کام

مانے گا وہ ادب سے جو صابر ہے اہل ہے
مشکل کشا کے لال کو ہر امر سہل ہے

بولے بہا کے اشک شہنشاہِ نامور
مرنے کی تم کو ماں سے دلائے رضا پدر

سچ ہے بھلا تمھیں مرے دل کی ہے کیا خبر
پوچھو یہ اس سے جس کا جوان ہے کوئی پسر

اس معرکے سے جو نہیں واقف وہ آپ ہیں
بیٹا ہمارے حق بطرف ہے کہ باپ ہیں

کھوتا ہے اس کو کوئی بڑھاپے کی ہو جو آس
ہم میں تو بات کرنے کے مطلق نہیں حواس

صابر وہ ہر بلا میں ہیں جو ہیں خدا شناس
اچھا یہی خوشی ہے تو جاؤ پھوپھی کے پاس

مشہورِ خلق بیٹے کا اور ماں کا پیار ہے
ملحوظ یہ مرحلہ بھی تو پھر اختیار ہے

بولا یہ ہاتھ جوڑ کے فرزندِ نیک نام
خیمے میں چلیے ساتھ مرے یاشہِ انام

تنہا یہاں نہ چھوڑے گا حضرت کو یہ غلام
آنسو بہا کے کہنے لگے شاہِ تشنہ کام

کرتے ہو رحم حال پہ مظلوم باپ کے
پھر کون ساتھ دے گا مرا بعد آپ کے

فرما کے یہ چلے طرفِ خیمہ شاہِ دیں
گردن جھکائے ساتھ تھا فرزندِ مہ جبیں

پہونچا قریب در جو محمدؐ کا نازنیں
تھم کر سنا تو کہتی ہیں یہ زینبِ حزیں

لو گو بلاؤ اکبرِ یوسف جمال کو
کیوں رن میں اتنی دیر لگی میرے لال کو

بنتِ علی کے پاس ہے بانو بھی بے حواس
بیٹے میں جان پیاس سے لب خشک جی اداس

زینب سے عرض کرتی ہے رو رو کے وہ حق شناس
کڑھیے نہ ہونگے اکبرِ مہرو پدر کے پاس

کہتی ہیں چین اب مجھے دم بھر نہ آئے گا
نکلوں گی خود اگر علی اکبر نہ آئے گا

فضہ نکل کے خیمے سے باہر خبر تو لا
آنے میں دیر کیوں ہوئی یہ ماجرا ہے کیا

سنتی ہوں میں کہ شاہ سے ہیں طالبِ رضا
پوچھیں تو کہیو نزع میں ہے بنتِ مرتضا

جب دم نکل چکے تو چلے جائیے گا آپ
چلیے نہیں پھوپھی کو نہ پھر پائیے گا آپ

کیوں گفتگو پھوپھی کی سنی تم نے اے پسر
بیٹے سے مڑ کے کہنے لگے شاہِ بحر و بر

ماں کی ابھی رضا نہیں اور پیچھے ہیں سر
نازک ہے عورتوں کا دل اے غیرتِ قمر

رخصت وہ دینگی مرنے کی جن کا یہ حال ہے
ان کو ہے اور فکر تمھیں کچھ خیال ہے

آساں اسے سمجھتے ہو تم اے پدر کی جاں
اظہار ماں سے مرنے کی رخصت کا الاماں

تبلایئے گرے گا جو یہ غم کا آسماں
کیونکر جیے گی زینبِ ناشاد و ناتواں

تم زندگی ہو دخترِ شیرِ الٰہ کی
کیسی رضا ہاں تو دعائیں ہیں بیاہ کی

ہم کو نہ ساتھ لیکے چلو بہرِ کردگار
اچھا ہمیں نظر نہیں آتا مآل کار

پر وہ اُٹھا کے شہ سے یہ بولا وہ ذی وقار
چلیے تو آپ خیمے میں یا شاہِ نامدار

دامانِ ابن فاطمہ پر ہاتھ چاہیے
مشکل ہو جب تو عقدہ کشا ساتھ چاہیے

زینب جو یہ سنی اس کھڑی تھی قریب در
اکبر کا روئے پاک اُنھیں آ گیا نظر

جلدی بلائیں لیکے پکاری وہ نوحہ گر
صدقے پھوپھی اس آنے کے اے غیرتِ قمر

خوشبو مہک رہی ہے رسالت مآب کی
ڈیوڑھی میں روشنی ہے مرے آفتاب کی

اکبر نے کی یہ عرض کہ حاضر ہو اغلام
حضرت کو لیکے آیا ہوں اے آسماں مقام

مژدہ سنا جو یہ تو پکاری وہ تشنہ کام
آنکھوں پہ فرق پر قدمِ قبلۂ انام

رونا مرا سنا تھا تو گھبرا کے آئے ہو
صدقے تو ہوں کہ تم مرے بھائی کو لائے ہو

ڈیوڑھی میں آئے روتے ہوئے بادشاہ دیں
تھامے تھا ہاتھ باپ کا فرزندِ مہ جبیں

شوقِ لقائے شہ میں بڑھی زینبِ حزیں
بھائی کے گرد پھر کے پسر کی بلائیں لیں

سوزش نہ وہ رہی جگر و دل کے داغ میں
گویا بہار آ گئی پژمردہ باغ میں

بیت الشرف میں آئے جو شبیرِ خوش خصال
رانڈوں کو روتے دیکھ کے صدمہ ہوا کمال

بڑھکر پھوپھی سے بولے یہ اکبر بصد ملال
چلیے ذرا الگ تو کہوں کچھ پدر کا حال

سب گھر نثار حضرتِ شبیر کیجیے
لٹنے کا طور ہے کوئی تدبیر کیجیے

بڑھکر کہا پھوپھی نے کہو جلد میری جاں
گھبرا کے دیکھنے لگی بیٹے کے منہ کو ماں

آہستہ اُن سے روکے یہ بولا وہ نوجواں
رن میں چلے تھے مرنے کو شاہِ زماں

میں پاؤں پر گرا ہوں جو تشریف لائے ہیں
گھر میں حسینؑ آخری رخصت کو آئے ہیں

غربت میں جو مریں گے شہنشاہِ بحر و بر
پھر کون سرپرست ہے کس سے تھمے گا گھر

اس وقت کس سے میں کہوں دردِ دل و جگر
مانگو دعا کہ باپ سے پہلے مرے پسر

اُٹھ جاؤں میں جہان سے بابا کے سامنے
میرا گلا کٹے شہ والا کے سامنے

آساں قیامت آتی ہے جاتی ہے آ بر و
اِک جان بابا جان کی اور سیکڑوں عدو

ہل من مبارز کا اُدھر غل ہے چار سو
دیکھو نہ اب رکینگے شہنشاہِ نیک خو

کفار لوٹ لینگے محمدؐ کی آل کو
رد کو خدا کے واسطے زہرا کے لال کو

دیتے نہیں رضا جو مجھے شاہِ حق شناس
کہتا ہوں صاف میں فقط آپ کا ہے پاس

کہیے امید کس سے رکھیں اور کس سے آس
ہم کو ثواب حصولِ سعادت سے بھی ہے یاس

حق بھی ادا ہو نہ شہِ خوش خصال کے
خوب آبرو حضور رہے دی ہم کو پال کے

حضرت کے پیار کی ہے بدولت یہ رنج و غم
گھر بھی چھٹا پدر بھی کہیں کے رہے نہ ہم

ہے اب نفس کی آمد و شد خنجر دو دم
مر جاؤنگا ابھی قدمِ پاک کی قسم

کیا لطف زیست وقت جو رخصت کا مل گیا
بابا اُدھر گئے کہ اِدھر دم نکل گیا

مرتے جو سر کٹا کے تو ہوتا ہمارا نام
خیر اب تڑپ کے خاک پہ ہو جائینگے تمام

جو دونوں صاحبوں کی رضا کیجے غلام
لیکن جگہ ہے صبر کی ہمت کا ہے مقام

آساں ہے جبر دل پہ اگر اختیار ہو
وہ کیجیے کہ فاطمہ سے آنکھ چار ہو

مہماں ہیں کوئی دم کے شہنشاہِ بحر و بر
رخصت کو گھر میں آئے ہیں بانہ دھے ہوئے کمر

صدقے کیے پھوپھی نے تو حضرت پہ دل نثار
اماں جگہ حجاب کی ہے سوچیے اگر

بیٹوں میں کس کو سبطِ نبی پر فدا کیا
بتلائیے کہ آپنے زہرا سے کیا کیا

ہوتا ہے معرکے میں محبت کا امتحاں
اب گھر میں کس کے پاس ہے فرزندِ نوجواں

لے جاں ہو جو دشمنِ سردارِ انس و جاں
چرچا یہی کریں گی وفادار بی بیاں

گھر اپنا فاطمہ کی بہو نے ڈبو دیا
فرزند کو بچا لیا وارث کو کھو دیا

چھاتی پہ رکھیے صبر کی سل بہرِ کردگار
لے چلیے مجھکو پیشِ شہنشاہِ نامدار

کہیئے کہ آپ کرتے ہیں کیوں عزمِ کارزار
حاضر ہی صدقے ہونے کو آقا یہ جاں نثار

کام اس سے کیا زباں کو جو باتیں رکیک ہوں
لیکن یہ شرط ہی کہ پھوپھی بھی شریک ہوں

زہرا کے بعد قافلہ سالار ہیں یہی
ہاں رتبہ دان سیدِ ابرار ہیں یہی

کہنے کو سب ہیں پر مری مختار ہیں یہی
ماں ہیں یہی پھوپھی یہی غمخوار ہیں یہی

ارشاد یہ کریں تو نثارِ امام ہوں
بیٹا ہوں آپ کا مگر ان کا غلام ہوں

کانپا یہ سن کے بانوئے ناشاد کا جگر
کی بنتِ فاطمہ کی طرف یاس سے نظر

ٹپکا کے اشک آنکھوں سے بولی وہ نوحہ گر
ہی ہی یہ کیا کریں کہ مصیبت میں ہی پدر

بیجا ہلاک کوئی بھی کرتا ہی آپ کو
کس طرح چھوڑے نرغۂ اعدا میں باپ کو

یہ ذکر تھا اِدھر کہ پکارے امامِ دیں
لو الوداع اے حرمِ ختمِ مرسلیں

آ پہونچے متصل درِ خیمہ کے اہلِ کیں
لے آؤ جامہ کہں اے زینبِ حزیں

رخصت کو آئیں جو مرے نازوں کے پالے ہیں
اکبر کو روکیو یہ تمہارے حوالے ہیں

اکبر پھوپھی کو دیکھ کے بولے کہ ہی غضب
لو آفت آئی گھر پہ چلے شاہِ تشنہ لب

دوڑے سروں کو کھولے ہوئے اہلِ بیت سب
بانو گری تڑپ کے قدم پر بصد تعب

بیٹے نے تھامے ہاتھ شہِ کربلا کے
زینب نے سر جھکا دیا سینہ پہ بھائی کے

شانے پہ منہ کو رکھ کے پکارے شہِ زمن
اماں کی تم سے بو مجھے آتی ہی اے بہن

بولی یہ ہاتھ جوڑ کے بانوئے خستہ تن
آقا ابھی تو زندہ ہی اکبر سا صف شکن

دکھ درد میں پدر کے پسر کام آتے ہیں
آپ ان کے ہوتے کس لیے میدان میں جاتے ہیں

شہ نے کہا بہن مجھے اس کا نہیں خیال
ہی تم کو صابروں کی طرح صبر میں کمال

اپنے جنوں کو دیکھ کے ہوتے ہیں سب نہال
خود چاہتا ہوں میں کہ یہ گل ہو نہ پائمال

شادی کے دن ہیں اس غریب الوطن کی ہی
صدمہ مجھے یہ ہی کہ ریاضت بہن کی ہی

بولی وہ عندلیب چمن پرورِ بتول
طرہ وہی ہی سب پہ میسر چڑھے جو پھول

اے نخلِ باغِ فیض و گلِ گلشنِ رسول
داغِ گلِ ریاضِ تمنا بدل قبول

شادی سدا نہیں چمنِ روزگار میں
روئے خزاں میں وہ جو ہنسا ہو بہار میں

کیجے کنیز کی نہ ریاضت کا کچھ خیال
صدقے گلِ ریاضِ نبی پر ہزار لال

بھائی پہ آبنی تو بھتیجے کا کیا ملال
اُن کو بھی صدقہ ہونے کی ہی آرزو کمال

ہاں دل تو چاہتا ہی کہ دم بھر جدا نہ ہوں
کام آئیں غیر جب تو یہ کیونکر فدا نہ ہوں

گر کر قدم پہ شہ کے یہ بولا وہ نوجواں
بس اب رضا جہاد کی دیں قبلۂ زماں

صدمہ ہوا پھوپھی کے جگر پر کہ الاماں
کانپے جو پاؤں گرنے لگی تھرتھرا کے ماں

خوں گھٹ گیا امامِ زماں زرد ہو گئے
اچھا کہا مگر ہمہ تن درد ہو گئے

اکبر پھرے جو گردِ قدم سے اُٹھا کے سر
بولے گلے لگا کے شہنشاہِ بحر و بر

اے نورِ عین اے سببِ قوتِ جگر
کیا اپنا زورِ خیر جہاں سے کرو سفر

بس قطع ہو گئی جو توقع تھی آپ سے
اٹھارھویں برس میں بچھڑتے ہو باپ سے

نقصان کو نسا ہی جو مرتے پدر کے ساتھ
ہوتا سناں پہ چاند سا سر میرے سر کے ساتھ

افسوس زخمی ہو گیا دل بھی جگر کے ساتھ
زینب ہماری جان چلی اس پسر کے ساتھ

کنبے کی جان آنکھوں کا تارا یہی تو تھا
بابا کی زندگی کا سہارا یہی تو تھا

تم سے بھی کب سکا نہ یہ دلبر ہزار حیف
کچھ کر سکی نہ بانوے نے پر ہزار حیف

خالی ہوا بس آج بھرا گھر ہزار حیف
لو صاحبو چلے علی اکبر ہزار حیف

یہ آفتاب اب کوئی دم میں غروب ہی
دولھا بنا کے مرنے کو بھیجو تو خوب ہی

خلعت پنھایا ماں نے وہ کپڑے اُتار کے
رکھا عمامہ فرق پہ زلفیں سنوار کے

زینب پکاریں ہاتھوں کو چھاتی پہ مار کے
سہرا بھی باندھو سر پہ مرے گلعذار کے

بولا پسر کہ عزم ہی اب رزم گاہ کا
اماں کفن پنھاؤ یہ خلعت ہی بیاہ کا

سجنے لگا یہ کہہ کے وہ صفدر سلاح جنگ
رکھا جو خود سُرخ ہوا اور رُخ کا رنگ

پہنی زرہ تو دل کو دغا کی ہوئی اُمنگ
تن کر چلے لپٹ گئی برسے قبائے تنگ

بڑھ کر چلے جو قبلۂ دیں کے سلام کو
تڑپا دل اِس طرح کہ غش آیا امام کو

غل پڑ گیا کہ خلق سے اکبر کا کوچ ہے
لو روشنی چلی مہِ انور کا کوچ ہے

لٹتا ہے گھر شبیہِ پیمبر کا کوچ ہے
گلنارِ مرتضےٰ کے گلِ تر کا کوچ ہے

اِس کربلا میں کونسی کرب و بلا نہیں
کٹتا ہے وہ نہال جو پھولا پھلا نہیں

حلقے سے بی بیوں کے جو نکلا وہ آفتاب
ہمراہ تھے پسر کے امامِ فلک جناب

چڑھنے لگا فرس پہ تو دل کو رہی تاب
گھبرا کے شہ نے ہاتھ بڑھایا سوئے رکاب

تڑپا جو دل تو ہاتھوں کو حضرت کے تھام کے
سر رکھ دیا پسر نے قدم پر امام کے

تھرا کے عرض کی خلفِ مرتضےٰ ہیں آپ
کعبہ ہیں آپ یا شہِ دیں رہنما ہیں آپ

شہ نے کہا مسافرِ ملکِ بقا ہیں آپ
ہم صورتِ جنابِ رسولِ خدا ہیں آپ

الفت نہیں یہ پاسِ رسالت مآب ہے
ایسے سعید لال کی خدمت ثواب ہے

صدقہ میں اس لحاظ کے اے تشنہ لب مرے
عاشق مرے شفیق مرے مہرباں مرے

مہرو مرے حسین مرے شیرِ زیاں مرے
پیری میں باپ کیا کرے اے نوجواں مرے

طاقت تھی جس سے دل کو وہ دولت بچھڑ گئی
میں تو یہ جانتا ہوں کہ دُنیا اُجڑ گئی

آتے ہیں ہم بھی خیر سدھارو سفر کرو
اچھا بسا و دشت کو ویران گھر کرو

تیغوں میں آفتاب سا سینہ سپر کرو
پھر دیکھ لے یہ باپ ذرا اُدھر کرو

اِک جا رہے پہ غنچۂ خاطر کھلے نہیں
مدت گزر گئی کہ گلے سے ملے نہیں

کیونکر دھواں اُٹھے نہ جگر سے ہزار حیف
خدمت بھی کچھ ہوئی نہ پدر سے ہزار حیف

پانی نہ اس شباب میں ترسے ہزار حیف
پیاسے چلے حسین کے گھر سے ہزار حیف

گو نہر تھی قریب مگر دست رس نہ تھا
تم خوب جانتے ہو کہ بابا کا بس نہ تھا

کوثر پہ جا کے کہیو علی سے ہمارا حال
لال آپ کا بلا میں ہی یا شیرِ ذوالجلال

کٹ جائے میرا حلق کہ لاشا ہو پائمال
حضرت کو اپنی بیٹیوں کا چاہیے خیال

ان کے قدم تھیں جو کوئی دستگیر ہو
ایسا نہ ہو کہ دخترِ زہرا اسیر ہو

یہ کہہ کے خود سوار کیا نورِ عین کو
کس صبر سے ادا کیا خالق کے دین کو

روتا اُس آفتاب نے چھوڑا حسین کو
روشن ضیائے رخ نے کیا مشرقین کو

قدسی درود پڑھتے تھے چہرے کے نور پر
گھوڑے پہ آپ تھے کہ تجلی تھی طور پر

وہ شوخیاں سمندِ فلک سیر کی وہ چال
پیلِ دماں کہیں کہیں ضیغم کہیں غزال

مرکب جو نے عدیل تو راکب بھی بے مثال
رعب و مہیب و دبدبہ و سطوت و جلال

بجلی کی زرق برق تھی ساز و یراق پر
غل تھا چڑھے ہیں احمدِ مرسل براق پر

پھیلی ہوئی تھی دشت میں زلفِ سکی کی بو
کچھ بو تھی گیسوؤں کی تو کچھ کربلا کی بو

غل تھا یہ بو ہی سلسلۂ مصطفےٰ کی بو
مٹی ہی اس کے سامنے مشکِ خطا کی بو

حلقے نہیں یہ گیسوے عنبر سرشت کے
دیکھو کھلے ہوئے ہیں دریچے بہشت کے

صدقے ہی عود عنبر سارا نثار ہی
جنگل ہی مشک بیز ہوا مشک بار ہی

حلقہ ہی جو وہ نافۂ مشکِ تتار ہی
سنبل کا اس کے سامنے کیا اقتدار ہی

ہمسر نہیں جو گیسوؤں کے پیچ و تاب سے
مخفی ہی آج تک شبِ قدر اس حجاب سے

پیدا ہی زلف و رو سے منوّر سے شانِ رب
نکلا ہی آفتاب میانِ سوادِ شب

لطف روزِ عید و شبِ قدر میں ہی کب
ہی دو طرف تو چین و خطا بیچ میں طلب

رستہ نہ بھول جائے مسافر ہجوم میں
اک شب کا فاصلہ ہی فقط شام و روم میں

معراجِ مصطفےٰ کی یہ شب ہی تو وہ سحر
زیبا ہی اس کو کہیے اندھیرے کا چاند گر

ہی زلف و رُخ مُفسّر و لیل و القمر
اے خضر ہاں ظفر کا وسیلہ ہی یہ سفر

دن جس کا ہی سعید مبارک وہ رات ہی
ظلمت کو طے کیا تو پھر آبِ حیات ہی

پہلو میں دن کے رات زہے شانِ کارساز
یوسف جو دیکھ لے تو جھکائے سرِ نیاز

افزوں ہی سب سے رونقِ دینِ شہِ حجاز
زیبا ہی گورے رخ پہ غضب گیسوے دراز

اب تو نظر پہ شبِ معراج چڑھ گئی
حیرت ہی دن تو کم نہ ہوا رات بڑھ گئی

کیوں زلف کی ثنا میں الجھتے ہیں مشرکاں
سلجھا ہوا بیاں ہو تو مضموں ہو صاف صاف

تعقید سر بسر ہی فصاحت کے برخلاف
باریک اس دقت کی ہیں ہاں خطا معاف

فکریں رسا ہیں جن کی یہاں وہ بھی ہیچ ہیں
رستہ تو مال بھرکا ہی اور لاکھ بیچ ہیں

وہ خود فروغِ پاک پہ وہ چاندسی جبیں
پرتو سے جس کے غیرتِ مہتاب سب نہیں

قرآں کی لوحِ مطلعِ نو آفتابِ دیں
آئینۂ حلب یدِ بیضا مہِ مبیں

اس کو جو اس جبیں کے برابر نہ دیکھتا
پھر اپنے آئینہ کو سکندر نہ دیکھتا

ابرو ہی یا کھنچی ہوئی شمشیرِ تیز دم
صانع نے ایک لوح پہ رکھے ہیں دو قلم

پایا بھلا کمانِ کیانی نے کب یہ خم
کیا متصل ہی گوشہ سے گوشہ زہے حشم

مدت کھنچے تو پھر کشش ان کی یہاں نہ ہو
قرباں ہو لاکھ بار تو خاطر نشاں نہ ہو

خمدار وہ بھویں وہ جبینِ قمر مثال
تابندہ ایک چاند کے پیچھے ہیں دو ہلال

مطلع ہی صاف غور سے بینا کریں خیال
نقطہ ہی نورِ حسن کا ابرو پہ ہی جو خال

خوبی میں وہ تو یہ ہمہ تن لاجواب ہی
دیوانِ حسن میں یہی بیت انتخاب ہی

ہی آسمانِ حسن و شرف یہ فلک جناب
ابرو ہیں دو ہلال تو پیشانی آفتاب

منظورِ شمسی و قمری کا ہو گر حساب
ہاں دیکھ لیں رخِ خلفِ ابنِ بوتراب

باریک ہیں سمجھ گئے مطلب انیس کا
اُنتیس کا وہ چاند ہی یہ چاند تیس کا

مانندِ شانہ گر ہمہ تن ہو کوئی زباں
تو بھی مژہ کا وصف سراسر نہ ہو بیاں

قربانِ حسنِ صنعتِ خلاقِ انس و جاں
پردا ہی بہرِ چشم کبھی گاہ سائباں

موئے نگینِ دُرِّ ثمینِ نجف یہ ہی
آنکھوں پہ جس کو رکھتے ہیں مردم شریف ہی

اِس چشم کو وہی کہے نرگس جو ہو بصیر
پیشِ نظر یہ دیدۂ حق بیں ہیں بے نظیر

کیوں ہرزہ گرد ہو کے گناہوں میں ہوں حقیر
یہ عین مردمی ہے کہ مردم ہیں گوشہ گیر

اس نور کے مکاں سے نکلنا فضول ہے
گھر بیٹھے ان کو سیرِ دو عالم حصول ہے

دکھلاتی ہے بیاض و سواد ان کی شانِ رب
دن کے قریب صبح سحر کے قریب شب

پائی کسی ہرن نے یہ چشمِ سیاہ کب
پیدا ہے ان سے عینِ علی کا جلال سب

دیکھیں جو رعب تیرِ نیستاں غزال ہوں
دُنیا ہو غرقِ خوں جو یہ غصّہ سے لال ہوں

بیمار کہتے ہیں شعرا چشم کو جو سب
صحت میں اس کی شک ہے غلط ہو تو کیا عجب

دارالشفا یہ خود ہیں پئے بندگانِ رب
دیدان کی ہر مریض کی صحت کا ہے سبب

چشمک ہے ان کو عیسیِ گردوں پناہ سے
مردے جلا دیئے ہیں کرم کی نگاہ سے

آنکھیں وہ نرگسی جنھیں دیکھے سے ہو سرور
روشن میانِ کعبہ ہیں یا دو چراغِ طور

یا صاف دو ستاروں کا ہے ایک جا ظہور
کوثر سے یا بھرے ہوئے ہیں ساغرِ بلور

حق بیں ہیں حق شناس ہیں یزداں پرست ہیں
ہشیار کیوں نہ ہوں مے عرفاں سے مست ہیں

غیغم نظر ہیں صاحبِ رعب و جلال ہیں
ہاں شیر ان کے غیظ کے آگے غزال ہیں

یہ نشۂ رحیمِ روانی سے لال ہیں
ساحر بھی ہیں تو ساحرِ سحرِ حلال ہیں

پتلی نہیں یہ چشمِ سیہ کے حجاب میں
پنہاں ہے روئے حضرتِ یوسف نقاب میں

جاگے ہیں رات کے تو نقاہت ہے آشکار
ڈورے جو سُرخ ہیں تو یہ ہے نیند کا خمار

مستانہ ہے یہ طور کہ جھکتے ہیں بار بار
آنسو ہیں یہ صدف میں ہیں یا دُرِّ شاہوار

روئے ہیں فرقتِ شہِ عالی جناب میں
نرگس کے پھول تیر رہے ہیں گلاب میں

رخسار کو قمر جو کہوں اس میں داغ ہے
خورشید ہے تو کیا ہے وہ دن کا چراغ ہے

دُرّوں کو سر چڑھائے یہ کس کو داغ ہے
وہ گل ہیں جن کے ذکر سے دل باغ باغ ہے

دنیا میں کوئی شے نہیں اس آب و تاب کی
رنگت ہے بیوتی کی تو خوشبو گلاب کی

گل سُرخ رو ہوا نہ کبھو اُن کے سامنے
مخفی چمن کا روئے نکو اُن کے سامنے

نے رنگ ہی گلاب کی بو اُن کے سامنے
باغِ بہشت ساختہ رو اُن کے سامنے

خوشبو سے عطر بیز ہیں پردے دماغ کے
تازہ یہ دونوں پھول ہیں نہر کے باغ کے

آیا لبوں کا ذکر بس اب ناطقہ ہی بند
ہی نے نمک یہ بات کہوں گر نبات و قند

کیا لطف گر مزہ نہ اُٹھائیں سخن پسند
خود ہر سخن سے ان کی فصاحت ہی بہرہ مند

اعجاز ہی زبانِ بلاغت نظام میں
قرآں کی ساری شکل ہی ان کے کلام میں

مشکل ہی وصفِ گوہرِ دندان نے مثال
غوّاصِ بحرِ حسن دکھا اپنا کچھ کمال

اِس مدح میں صلہ کے جو ملنے کا ہی خیال
بھر دیگا موتیوں سے دہن فاطمہ کا لال

قبضے میں آسماں کے خزانے زمیں کے گنج
ہنس ہنس کے یہ لٹاتے ہیں دُرثمیں کے گنج

اعجاز دونوں ہاتھوں میں مشکل کشا کا ہی
زوران کلائیوں میں شہِ لافتا کا ہی

گھر بازوؤں میں قوّتِ خیبر الورے کا ہی
سینہ نہ جانیو یہ خزانہ خدا کا ہی

کیوں شور ہو نہ ان کے قدم کے ثبات کا
جس سے تھما ہوا ہی سفینہ نجات کا

پڑتا ہی ماہ رُخ کا جو پرتو اِدھر اُدھر
پھرتی ہی چاندنی کی طرح ضَو اِدھر اُدھر

گرتے ہیں کانپ کانپ کے سو سو اِدھر اُدھر
لشکر میں نے دغا ہی روا رو اِدھر اُدھر

غل تھا عمر کا سر ابھی لائیں جو زور ہو
اس کو نگاہِ بد سے جو دیکھیں تو کور ہو

دیکھو تو منصفو یہ ملک ہی بشر نہیں
چہرے پہ ضَو یہ ہی کہ مجالِ نظر نہیں

سب محو ہیں کسی کو کسی کی خبر نہیں
پھر کون ہی پیمبرِ برحق اگر نہیں

وقتِ ادب ہی ہاتھ سے تیغ و تبر رکھو
آئے رسول دوڑ کے قدموں پہ سر رکھو

نکلا لگائے چترِ زری ابنِ سعدِ شوم
بولا یہ کیا ہراس ہی شبیر و یہ کیا ہی دھوم

تنہا وہ اک جواں یہ اُدھر فوج کا ہجوم
کھوتے ہو آبروئے رئیسانِ شام و روم

پیارا یہی پسر ہی شہِ مشرقین کا
خوش ہو کہ خاتمہ ہوا فوجِ حسین کا

تلواریں لو نیاموں سے جلدی پرے جماؤ
نیزے ہلا ہلا کے سوار و ادھر کو آؤ

ہاں اے کماں کشو قدر اندازیاں دکھاؤ
فرزندِ فاطمہ کے پسر کا لہو بہاؤ

گر نورِ احمدی کی جہاں میں ضیا نہ ہو
انعام پھر وہ دوں جو کسی نے دیا نہ ہو

لالچ میں آئے سُن کے یہ باتیں وہ زیردست
سمجھے کہ اس طرف ہی ظفر اس طرف شکست

دریا پہ کچھ سوا ہوا پہلے سے بندوبست
جھومے یلانِ فوجِ ستم مثلِ پیلِ مست

جنگل تھا سب سیاہ ہجومِ سپاہ سے
کوسوں تھی پھیلی ہوئی تمی ترائی نگاہ سے

اس طرح بڑھ کے ہٹتے تھے وہ بانیِ حسد
اُٹھتا ہی جس طرح کہ سمندر سے جزر و مد

پیاسے پہ آئے تیر اُدھر سے جو لاتعد
قبضہ پہ ہاتھ رکھ کے کہا یا علی مدد

دیکھا نگاہِ قہر سے ہر نابکار کو
گویا خدا کا شیر بڑھا کارزار کو

اللہ رے نہیبِ رجز خوانیِ ہر بر
جھنجلا کے گونجتا ہو نیستاں میں جیسے ببر

چھائی ہوئی تھی فوجِ ضلالت مثالِ ابر
جو منچلے تھے فوج میں بڑھتا تھا اُن پہ شیر

غل تھا کہ سب علی کا جلال آشکار ہی
فقرہ ہر اک رجز کا نہیں ذوالفقار ہی

نعرہ کیا جو مثلِ علی آسماں ہلے
تھرائی یہ زمین کہ کڑک کر مکاں ہلے

سینوں میں دل ہلے تو صفوں میں نشاں ہلے
کیا منہ کسی کا تھا کہ دہن میں زباں ہلے

گردن نہ اُن کی اُٹھتی تھی جو سر بلند تھے
اللہ رے رعب نطق فصیحوں کے بند تھے

بعدِ ستائشِ اب و جدِ شیر زبڑھا
ہٹتی ہوئی گھٹا کی طرف جوں قمر بڑھا

لاکھوں تھے پر نہ ایک اُدھر سے اِدھر بڑھا
جرار تیغ تولے ہوئے بے سپر بڑھا

یوں خندہ رو گیا وہ جری رزمگاہ میں
جاتا ہی جس طرح کوئی اپنی سپاہ میں

نیزوں سے روکنے لگے ڈر ڈر کے سب سوار
صفدر نے بڑھ کے میان سے لی تیغ آبدار

سب کی نظر میں کوند گئی برقِ ذوالفقار
ٹوٹے عَلَم گرے جو الف ہو کے راہوار

غل تھا کہ سر بلند ہی جو وہ بھی پست ہی
اکبر نے دی صدا یہ نشانِ شکست ہی

فرما کے یہ کمر میں رکھی اسپ کی لجام
پھرنے لگا نظر کے اشارے میں خوش خرام

سُرعت وہ رخش کی وہ روانی حسام کی
اِک برق کوندتی تھی میانِ سیاہِ شام

دُلدل کی چال جو وہ چلن باد پا کا تھا
بجلی کی تھی جو تیغ تو گھوڑا ہوا کا تھا

کُہنی تک آپنے جو اُلٹ لی تھی آستیں
اِک زلزلہ تھا کانپتی تھی دشت کی زمیں

روکے تھے منہ پہ خوف سے ڈھالوں کے اہلِ کیں
ہنس ہنس کے دیکھتے تھے علی اکبرِ حسیں

افزوں تھی اُنگلیوں کی ضیا تیغ طور سے
جنگل میں روشنی تھی کلائی کے نور سے

ناگہ چلی میان سے وصفِ تیغ شعلہ ریز
دم بھر میں گرم ہو گیا ہنگامہ ستیز

آئی چمک چمک کے سروں پر جو تیغِ تیز
ان میں سے ایک کو نہ ملی مہلتِ گریز

سالم تھے نخلِ قد پہ نشانِ ثمر نہ تھا
دونوں صفوں میں ایک کی گردن پہ سر نہ تھا

بڑھتے تھے یوں کہ شیر جھپٹتا ہے جس طرح
ہٹتے تھے دل کہ ابر سمٹتا ہے جس طرح

ہاتھ اُڑتے تھے شجر کوئی چھٹتا ہے جس طرح
یا زخمِ خامہ تیغ سے کٹتا ہے جس طرح

جو اونچی دو چار ہوا صاف چار تھا
فولاد موم خام سکیلہ خیار تھا

تھی استخوان شانہ سپر اُس کے سامنے
دامِ زرہ تھا سنبلِ تر اُس کے سامنے

موداِ رسب تھے کاسۂ سر اُس کے سامنے
ڈھیلی گرہ تھا بندِ کمر اُس کے سامنے

آفت کا کاٹ قہر کا خم منہ بلا کا تھا
سب نگ ڈنگ ضربتِ مشکل کشا کا تھا

آئی جو سن سے سینہ کی جانب اُلا کے سر
ڈھڑ سے گرا سمند کی ٹاپوں پہ آ کے سر

مرکب نے کی نظر سوے راکب بلا کے سر
نکلی وہ تیغ تیر بغل سے جھکا کے سر

ظالم نئی طرح سوے دوزخ روانہ تھا
سر تھا نہ صدر تھا نہ کمر تھی نہ شانہ تھا

برسا رہی تھی دشت میں وہ شعلہ رو لہو
حیدر کا لال بیچ میں تھا چار سو لہو

تا سینہ اس طرف تو اِدھر تا گلو لہو
کوسوں تھا سرزمینِ عرب میں لہو لہو

بہتا تھا خون زمین پہ جو اہلِ خلاف کا
فرطِ خوشی سے سُرخ تھا چہرہ مضاف کا

لہ یہ شعر کسی اور جگہ کے اضافہ ہے ۱۲

جب آئی سن سے کاٹ کے جوشن نکل گئی
اُڑ کر صفوں کے بیچ سے ناگن نکل گئی

یوں چاک کر کے سینۂ دشمن نکل گئی
شہ رگ سے جان صد سے گردن نکل گئی

سالم رگیں نہ جسم کی نہ استخواں رہے
ٹوٹے قفس میں طائرِ وحشی کہاں رہے

اللہ ری تیزیِ دمِ شمشیرِ سرشگاف
قبضہ میں جس کے حکم قضا تھا بسان قاف

دریائے خوں میں پیر کے نکلی دم مصاف
پھر منہ لہو پیے پہ جو دیکھا تو پاک صاف

نسبت تھی ذوالفقار سے اس نے عدیل کو
دھبا کہیں لگا ہی نجیب و اصیل کو

تھا نہرِ علقمہ کے قریں بحرِ خوں کا اوج
تھے آگے پیچھے دست بریدہ بسانِ موج

سر صورتِ حباب نمایاں تھے فرد و زوج
طوفانِ آبِ تیغ میں ڈوبی ہوئی تھی فوج

بھاگیں تو گھاٹ تیغ کا مابین راہ تھا
خشکی میں فوجِ شام کا بیڑا تباہ تھا

پھول اُڑ گئے پھل اس کا جو چمکا سپر کے پاس
نکلی اُدھر سپر سے کہ آپہونچی سر کے پاس

سر سے اُتر گئی دلِ بیدادگر کے پاس
دل سے جگر کے پاس جگر سے کمر کے پاس

کھولا کمر کا بند تو در آئی زین میں
زین سے گئی فرس میں فرس سے زمین میں

اب دم نہ کیجو بڑھ کے قضا اس سے کہہ گئی
ندی لہو کی مشت پر افگت میں بہ گئی

کاٹی زرہ کڑی بھی پڑی جو وہ سہ گئی
بھاگا کوئی شقی تو لہو پی کے رہ گئی

غصہ میں مثلِ برق قرار اُس نے کم لیا
لاکھوں میں ڈھونڈھ کر اُسے مارا تو دم لیا

پھل اس کا ناسپر پہ ناجوشن پہ رہ گیا
جس پر پڑی تڑپ کے وہ تو سن پہ رہ گیا

دو ٹکڑے ہو کے سر نہ فقط تن پہ رہ گیا
خوں بھی اجل گرفتہ کی گردن پہ رہ گیا

دم میں نہ وہ غرور نہ وہ خودسری رہی
مجرم وہی رہا یہ خطا سے بری رہی

جنگل میں چار سمت لہو کے چمن بنے
جو خیرہ سر تھے نقشِ فنا اُن کے تن بنے

مُردے شکست پا کے وہ پیماں شکن بنے
چار آئینے جو قبر تو جوشن کفن بنے

کشتوں پہ پشتے لاشوں پہ لاشوں کا بار تھا
عصیاں کا اُس پہ بوجھ غضب کا فشار تھا

بل کھا کے اس طرف سے کوئی یل بڑھا اگر
پہونچا سمند اڑا کے برابر وہ شیر نر

چمکی جو تیغ برق سی کوندی ادھر ادھر
آئی لہو میں پیر کے وہ ماہی ظفر

چھوڑ اسوار کو نہ فرس کو نہ تنگ کو
اک شور تھا کہ کھا گئی مچھلی نہنگ کو

قبضوں میں تیغیں چھپتی تھیں دہشت تھی اس قدر
گرد اپنے آپ کرتی تھی گرداوری سپر

یہ خوف تھا کہ زیں سے نکلتے نہ تھے تبر
سہمے تھے تیر یوں کہ اٹھا سکتے تھے نہ سر

ہر اک کمند دامِ بلا میں اسیر تھی
واں خود اماں کی طرح کماں گوشہ گیر تھی

نصرت جلو میں گھوڑے کے پھرتی تھی مثلِ باد
کہتی تھی فتح آج بر آئی مری مراد

تھی یہ ظفر کی عرض کہ یا خالق عباد
جلدی شکست پائیں یہ سب بانیِ فساد

پامال کر کے یوں انھیں یہ مہ لقا پھرے
جس طرح جنگ بدر سے شیر خدا پھرے

چم خم وہ تیغ کا وہ لگاوٹ وہ آب و تاب
آتش کسی جگہ کہیں بجلی کہیں سحاب

سیلی تھی اک پری کی شکم پر کہ اس کی تاب
تیزی زباں میں وہ کہ فرشتوں کو دے جواب

جوہر سے اس کا جسم جواہر نگار تھا
گویا گلے میں حور کے ہیرے کا ہار تھا

پیاسی بھی خون فوج کی اور آبدار بھی
غل تھا کہ ایک گھاٹ میں پانی بھی نار بھی

بجلی بھی ابر تر بھی خزاں بھی بہار بھی
تلوار بھی چھری بھی سپر بھی کٹار بھی

پانی نے اس کے آگ لگا دی مآنیں میں
اک آفتِ جہاں تھی لگانے بجھانے میں

کرتی تھی پائمال صفوں کو وہ برق سیر
دہشت سے تھا سپاہ شقاوت کا حال غیر

نہ خود کو پناہ نہ اس سے سپر کی خیر
چار آئنہ سے لاگ تھی اس کو سپر سے بیر

سکتے پڑے تھے اکبر غازی کی حرب کے
لوہا بھی دب گیا تھا یہ معنی ہیں ضرب کے

تیر افگنان کوفہ و شام و عراق و ری
چلاتے تھے رہے گی کشاکش یہ تا بکے

قادر ہے مثل حکم قضا خجستہ پے
سر کاٹے اس نے تیر چلے اس طرف سے جب

پہنچائے علم تیر ہیں برسوں گزار کے
بس پھینکدو چڑھے ہوئے چلے اتار کے

نیزوں کے بند بند قلم برچھیاں دو نیم
مثلِ قلم زبانِ درازِ سناں دو نیم

چار آئنہ کٹے ہوئے گز گز گراں دو نیم
مغفر سے تا کمر جسدِ پہلواں دو نیم

سالم تھا پیش آئنۂ تیغ جو نہ تھا
لشکر میں کونسا تھا وہ بکتر جو دو نہ تھا

وہ تیغ جب بڑھی صفِ کفار ہٹ گئی
چمکی جو برق ڈھالوں کی بدلی سمٹ گئی

دم بھر میں یوں صفوں کو اُلٹ کر لپٹ گئی
دن کی نئی میں لہو کے ڈریڑوں سے کٹ گئی

دریا بھی آبِ تیغ سے نلے آبرو ہوا
غل تھا کہ لو فرات کا پانی لہو ہوا

گیتی ہلا دی نعرۂ ضرغامِ دہر نے
گھیرا ہر اک کو حضرت باری کے قہر نے

مانگی پناہ چھوڑ کے ساحل کو بحر نے
گرداب کو سپر کیا سینے پہ نہر نے

گھر امن کا جو بحر میں نایاب ہو گیا
کانپیں یہ مچھلیاں کہ جگر آب ہو گیا

بولے نہنگ خوب نہیں یہ اگر مگر
اب تم نکل کے بحر سے بر میں بناؤ گھر

برپا ہے شامیوں کے ستم سے یہ شور و شر
لڑتے ہیں اپنے حق پہ ید اللہ کے پسر

چشمہ ہے یا محیط ہے شط ہے کہ نہر ہے
اس کے گواہ ہم ہیں کہ زہرا کا مہر ہے

ہل چل ہوئی غضب کی صفِ کارزار میں
دبکے نکل کے شیرِ نیستاں کچھار میں

پوشیدہ مارے خوف کے اژدر تھے غار میں
جنگل سمک کے چھپنے لگا کوہسار میں

اک شور تھا کہ آگ لگی کائنات میں
ریتی پہ مچھلیاں تھیں سمندِ فرات میں

جب کوند کر سمند یہاں سے وہاں گیا
ثابت نہ کچھ ہوا کدھر آیا کہاں گیا

جھاڑیں جو پتلیاں تو نظر سے نہاں گیا
گھوڑا براق بن کے سوئے آسماں گیا

غل تھا وہ آ کے دیکھ لے اس بادپا کے پاؤں
دیکھے نہ ہوں زمانہ میں جن نے ہوا کے پاؤں

سرعت سے شرمسار نسیمِ سحر ہوئی
آنکھوں میں پھر گیا نہ ثمرہ کو خبر ہوئی

تن سے عرق کی بوند جو ٹپکی گہر ہوئی
جب خاک اُڑی ادھر تو دمِ اُس کی خور ہوئی

گھوڑا نہ کہیے تختِ سلیماں روا نہ تھا
اُس کے لیے تو جنبشِ رگ تازیانہ تھا

۱۲ ۱۲ ۱۲

باریک جلد وہ کہ غجل قاقم و حریر
مشکیں پرند آہوئے رم خوردہ شیر گیر

حلقے سے یوں نکل گیا جیسے کماں سے تیر
آتش مزاج باد یہ پیما فلک مسیر

یوں فتح ساتھ ساتھ تھی اُس اہوار کے
جیسے پیادہ چلتا ہی آگے سوار کے

تلوار تھی جو ابر تو گھوڑا بھی برق تھا
مثلِ عروسِ نو رخوبی میں غرق تھا

کچھ اس میں اور ابر میں مطلق نہ فرق تھا
دو گام اس کو فاصلۂ غرب و شرق تھا

پاکھر تھی موتیوں کی عرق جسم پاک پر
آئی تھی باد تند فرس بن کے خاک پر

تھا اس گروہ میں یہ تلاطم یہ انتشار
ناگہ اُٹھا جو شام کی جانب سے اک غبار

بولا یہ فوج سے عمرِ سعد نابکار
بھیجی کمک یزید نے لو شکر کردگار

یہ اکبر جری کی اجل کا بہانہ ہی
آیا وہ پہلواں جو وحید زمانہ ہی

یہ سُن کے فوج سب متوجہ ہوئی اُدھر
دیکھا کہ اک جواں ہی فرس پہ کروفر

نیزے پہ آگے آگے تو ہیں سر نوں کے سر
پیچھے ہیں دو ہزار جوانانِ پُر جگر

قامت سے شان عمرِ شقی آشکار ہی
سمجھے یہ سب کہ خش پہ رستم سوار ہی

وہ خود جس کو دیکھ کے مرحب ہو سرنگوں
کیف شراب غیظ سے آنکھیں ہو جام خوں

قتال بدمزاج مہیب و سیہ دروں
یکتاش و خیلتاش سے بھی توش میں فزوں

تیغ و سناں میں رشک زیاں و گیو تھا
کہنے کو آدمی پہ حقیقت میں دیو تھا

بعد از سلام بڑھ کے عمر نے کیا بیاں
آپ آئے کیا کہ آگئی مرتے ہوؤں میں جاں

نیزہ زمیں پہ گاڑ کے بولا وہ پہلواں
سرگرم کارزار ہی یہ کونسا جواں

عباس ہی کہ فاطمہ کا نورِ عین ہی
کی عرض اُس شقی نے کہ ابن الحسین ہی

کاٹے ہیں جب سے دست علمدار نامور
سرگرم کارزار ہی یہ شاہ کا پسر

پوچھا شقی نے ہوئے گا سن اس کا کس قدر
اُس نے کہا جوان نہیں پورا یہ پُر جگر

اٹھارھواں یہ سال ہی سن کے حساب میں
سبزہ ابھی نمود ہی باغِ شباب میں

بولا شقی کہ فوج کا لڑکے سے ہی یہ حال
ٹوٹے ہیں مورچے صف لشکر ہی پائمال

تب شمر نے کہا کہ یہ ہیں شیر حق کے لال
طفل و جوان و پیر ہیں اس گھر کے بیمثال

سر بر ہو کون قہر خدا ہی وغا نہیں
اس پر کہ تین روز سے پانی ملا نہیں

ناری کے آگ لگ گئی سن کر علی کا نام
بولا بگڑ کے وہ کہ مرے منہ پہ یہ کلام

پھر کیا اگر علی کا خلف ہی یہ تشنہ کام
کرتی ہی شق پہاڑ کا سینہ مری حسام

پیدا کیا ہی نام ہزاروں کو مار کے
اتروں گا اب فرس سے سر اس کا اتار کے

یہ کہہ کے پھر کیا کمر آہنی کو چست
آلات حرب تن پہ کیے سر بسر درست

سارے قوی قوی تھے مگر عقل سخت سست
سر میں وہی غرور وہی غرہ نخست

کوڑا کیا فرس کی جو باگ اس نے پھیر کے
ہر صف میں غل ہوا کہ چلا منہ میں شیر کے

آیا اڑا کے خرش وہ جس دم قریب زد
ہمشکل مصطفےٰ نے کہا یا علی مدد

پشتی پہ ہوے شیر الٰہی سا جس کا جد
ہوتا ہی کیا حریف کرے لاکھ جدو کد

دریاے موج خیز پہ تھے وہ حباب تھا
زہرہ شقی کا آنکھ ملاتے ہی آب تھا

بڑھکر ہٹا لرز کے جو سنبھلا وہ پر غرور
بولے یہ مسکرا کے علی اکبر غیور

آمد میں وہ شکوہ و تعلی وہ مکر و زور
گر جا تھا اس قدر تو برسنا بھی تھا ضرور

سرکش زمیں پہ گر کے سنبھلتا نہیں کبھی
نخل غرور پھولتا پھلتا نہیں کبھی

مقدور پر بھی کرتے ہیں عاقل فرو تنی
عاجز ہیں سب خدا کی مگر ذات ہی غنی

ہم سے زیادہ کون ہی تلوار کا دھنی
چلتے ہیں جھک کے صورت شمشیر آہنی

دیکھا نہ راستی کا مزہ کج ادائی میں
سبقت کسی پہ ہم نہیں کرتے لڑائی میں

سب جانتے ہیں دست علی کی صفائیاں
سر کیں نبی کے سامنے کیا کیا لڑائیاں

عالم کے سرکشوں نے شکستیں اٹھائیاں
بدر و احد میں خون کی نہریں بہائیاں

مدح علی رسول خدا کی زباں پہ ہی
لاسیف ولافتی کی صدا آسماں پہ ہی

غرہ ہمیں نہیں تجھے دعوے ہی گر تو آ
تیری طرف یزید ہماری طرف خدا

آمد تو دیکھی جنگ کا بھی کچھ ہنر دکھا
مالک تجھے سقر میں بلاتا ہی جلد جا

ساتوں جہنم آتشِ فرقت میں جلتے ہیں
شعلے تری تلاش میں باہر نکلتے ہیں

تو لاشقی نے سُنتے ہی یہ گرز گاؤ سر
اکبر نے دوشِ پاک سے لی ہاتھ میں سپر

آیا ادھر سے گرز ادھر سے چلا تبر
دو ہو گیا عمود مثالِ خیارِ تر

گرز اس طرح نکل گیا پنجے سے چھوٹ کے
سمجھے سیب زمین پہ گرا ہاتھ ٹوٹ کے

بھالا سنبھالا دشمنِ ایماں نے مل کے ہاتھ
نیزے کے چار پانچ نکالے سنبھل کے ہاتھ

پہلے ہی بک چکا تھا ستمگر اجل کے ہاتھ
بڑھتا نہ تھا جو پاؤں تو رکتا تھا چل کے ہاتھ

کم تھے نہ یہ بھی زور میں گو وہ زیاد تھا
نیزے کے بند بند کا توڑان کو یاد تھا

رکھ کر تبر نیام سے لی تیغِ شعلہ ور
تھرا کے خود اماں نے صدا دی کہ الحذر

بھالے کے ہاتھ بھول گیا سب وہ خیرہ سر
یہ بھی اُدھر تھے پھرتا تھا نیزہ جدھر جدھر

جاتا کدھر یہ تیغ سے جائے اماں نہ تھی
دیکھا جو غور سے تو سناں کی زباں نہ تھی

بالائے سر جو ڈانڈ کو لایا وہ خود پسند
کھولے تمام نیزہ بسیار دگر کے بند

پھینکی شقی نے فرق پہ جھنجلا کے پھر کمند
سر کو بچا کے شیر نے تلوار کی بلند

گردش تھی ہاتھ کی نہ بڑھے کچھ نہ گھٹ گئے
حلقے کھلے تھے جو وہ اشارے میں کٹ گئے

ہٹ کر خطا شعار نے جوڑا کماں میں تیر
تیر افگنی میں شہرۂ آفاق تھا شریر

سرکش خدنگ مرگ سے کیونکر ہو گوشہ گیر
چلہ کٹا کمان کا زہے تیغ نے نظیر

قربان زور و ضربت نصرت نشان کے
کھل کر قفا سے بند ھ گئے بازو کمان کے

خادم نے تیر جوڑ کے دی دوسری کمان
نیزہ اُٹھا کے شہر نے آواز دی کہ ہاں

سیسر اُدھر اُٹھی تھی کہ چمکی ادھر سناں
بھالے کی نوک جھونک نئی تھی نئی تکاں

ہمایہ دل کہ بن گئی موذی کی جان پر
ناوک زمیں پہ تھا تو کماں آسمان پر

ہاں ای محیط طبع روانی دکھا مجھے
پیری میں زور شورِ جوانی دکھا مجھے

ہاں ای زبان سیف زبانی دکھا مجھے
ای نطق آج سحر بیانی دکھا مجھے

تلواریں کھنچ گئیں دم تیغ آزمائی ہے
آفت کا معرکہ ہے غضب کی لڑائی ہے

ای تیغ بادشاہِ نجف شعلہ بار ہو
ای شہسوار مستعدِ کارزار ہو

ای برق طیع کوند کے گردوں کے پار ہو
ای سیف خامۂ دوزباں شعلہ بار ہو

ہاں معرکہ ہے بن کے لڑائی بگڑ نہ جائے
چوٹیں نئی ہوں سب کوئی مضمون کٹ نہ جائے

ہاں غازیو دکھاتا ہوں تصویرِ حرب گاہ
غل ہو درود کا عوضِ شورِ واہ واہ

تولے ہے تیغ اِدھر پسرِ شاہِ دیں پناہ
آمادۂ نبرد اُدھر ہے وہ روسیاہ

دونوں کو معرکہ میں تمنّا ہے جنگ کی
باگیں اُٹھی ہوئی ہیں کمیت و نرنگ کی

دوزخ اُدھر ہے خلد بریں کا چمن اِدھر
کانٹے اُدھر ہیں لالہ رُخ و گلبدن اِدھر

کافر اُدھر شبیہ رسول زمن اِدھر
مرحب ہے اُس طرف شہِ خیبر شکن اِدھر

باطل چلا جہاں سے کہ حق کا ظہور ہے
جو نار ہے وہ نار ہے پھر نور نور ہے

عاری ہیں تیغ زن شہِ مرداں کے سامنے
گل ہیں چراغ مہر درخشاں کے سامنے

کیا سحر سامری بنِ عمران کے سامنے
کیا مُور کی بساط سلیماں کے سامنے

آہو کا اور شیر کا انداز اور ہے
حقا کہ سحر اور ہے اعجاز اور ہے

دو بجلیاں سی کوند کے گرتی ہیں بار بار
ڈھالوں کے پُرزے اڑتے ہیں ہوتے ہیں پارہ پارہ

طاؤس ہیں ہرن ہیں چھلاوہ ہیں اہوار
لشکر ہے اک زباں کہ یہ جرات ہے یادگار

غالب یہی ہیں گو وہ قوی تر ہے گیو سے
غل ہے کہ لڑ رہے ہیں یداللہ دیو سے

بڑھتا ہے مثل تیغ ادھر سے وہ نامور
دب دب کے پیچھے ہٹتا ہے وہ صورتِ سپر

یوں نعرہ زن ہے غیظ میں شبیر کا پسر
یہ اضطراب جنگ میں ظالم ٹھہر ٹھہر

حملے تو دیکھ رُخ سے جھلم کو اتار کر
او روسیاہ آنکھ تو شیروں سے چار کر

کٹ کٹ کے وار کرتا ہی پیہم وہ روسیاہ
پر ان کی تیغ سے کہیں ملتی نہیں پناہ

روباہ وہ پہ لخت دل ضیغم الٰہ
جن کے غلام ملک شجاعت کے بادشاہ

زیبا ہی برق شعلہ فشاں میغ کے لیے
تیغ ان کے واسطے ہی یہ ہیں تیغ کے لیے

اس دوپہر کی دھوپ میں تیغوں کی وہ چمک
دو بجلیاں ہی کوند رہی تھیں تہ فلک

حیرت میں تھے زمیں پہ پسر چرخ پر ملک
مثل علی جھپکتی نہ تھی شیر کی پلک

رُخ پر ہراس کچھ دم جنگ جدل نہ تھا
تلوار چل رہی تھی پہ ابرو پہ بل نہ تھا

گھاتیں ہزار کرتا تھا وہ لاکھ مکر و زور
لیکن کہاں چراغ کہاں مہر دیں کا نور

اوجھڑ سپر کی ہی جو اٹھائے سر غرور
بولے تو موت کا بھی طمانچہ نہیں ہی دور

سچ کہتے ہیں ہراس میں کیا زور چل سکے
پنجہ میں شیر کے ہو تو کیونکر نکل سکے

شانہ کٹا سپر سے بچایا جو اُس نے سر
ٹکڑے اُڑے جھلم کے ہٹی منہ سے جب سپر

چار آیئنہ میں جسم تو محفوظ تھا مگر
سارا چھنا ہوا تھا زرہ کی طرح جگر

تاب و تواں کو حرب میں ہارا ہوا تھا وہ
تیغ زباں کے زخم کا مارا ہوا تھا وہ

خالی گئیں منجی ہوئی چوٹیں جو اُس کی سب
مُنہ کو پھرا پھرا کے شفق کاٹتا تھا لب

تلوار کو اُٹھا کے پکارا وہ شیر تب
ہشیار او لعین اجل آتی ہی سر پہ اب

مہلت ابھی ہی تیغ و سپر کو سنبھال لے
باقی ہو کچھ ہوس تو اُسے بھی نکال لے

بولا سپر کو فرق پہ رکھ کر وہ پُر غرور
پھنکتا ہی تن پہ دھوپ سے ہی پیاس کا وفور

میداں کرہ ہی نار کا اے کبریا کے نور
بھڑکی ہی آگ سینے میں اک صورت تنور

ہر چند ہاتھ دھوے ہوں اپنی حیات سے
مہلت ملے تو پی لوں میں پانی فرات سے

تلوار روک کر یہ پکارا وہ لا لہ فام
تو نے سُنا تو ہوگا کہ ہم بھی ہیں تشنہ کام

تلوار روکنے کا نہیں گرچہ یہ مقام
پر خیر پی لے نہر سے پانی کا بھر کے جام

فیاض ہیں کریم ہیں ابن کریم ہیں
دشمن پہ رحم کرتے ہیں ہم وہ رحیم ہیں

خنداں ہوئے شقی پہ لبِ تیغِ جاں گداز
بڑھکر زبانِ طعن سناں نے بھی کی دراز

آواز دی کماں نے زہے شانِ نے نیاز
سوفار نے صدا دی کہ سرکش ہی حیلہ ساز

ہی خوف ضربِ تیغ سے طالب پناہ کا
بولی سپر کہ پھر گیا رُخ روسیاہ کا

لے آیا آب سامنے خادم بصد شتاب
پانی پہ گر پڑا وہ کہ تھی ضبط کی نہ تاب

ظالم نے سامنے جو پیا ڈگڈگا کے آب
پیاسے تھے تین دن کے ہوا دل کو اضطراب

تڑپا جو قلبِ چشم کے ساغر چھلک پڑے
اُٹھا دھواں جگر سے کہ آنسو ٹپک پڑے

سیراب ہو چکا جو وہ سفاک و بدگہر
کی عرض کیجے آپ بھی پانی سے حلق تر

فرمایا تشنہ لب ہی شہنشاہِ بحر و بر
آبِ حیات ہو تو پییں ہم نہ نے پدر

ڈونے ہوئے ہیں چشمۂ کوثر کی چاہ میں
یہ آب نہر خاک ہی اپنی نگاہ میں

شبیر نے جو دور سے دیکھا یہ ماجرا
دو چار گام بڑھ کے یہ بیٹے کو دی صدا

ای مرحبا رسول کے ہم شکل مرحبا
سیراب سلسبیل سے تم کو کرے خدا

کیونکر نہ صبر و شکر میں ایسا کمال ہو
کیونکر نہ ہو کہ ساقیِ کوثر کے لال ہو

تسلیم کر کے شہ کو بصد عجز و انکسار
مثلِ اسد شکار پہ آیا وہ شہسوار

نعرہ کیا کہ او سگِ بزدل ستم شعار
ہاں اب تو تازہ دم ہی اُٹھا تیغ آبدار

ہنستا ہی کیوں عرب کی حمیت کو تو نہ کھو
پانی تو پی چکا ہی بس اب آبرو نہ کھو

سُن کر برس پڑا وہ جفاکار و بدگہر
رَد کر کے سارے وار بڑھا شاہ کا پسر

لہرا رہی تھی فرق پہ وہ ماہی ظفر
مارا جو ہاتھ برق سی کوندی قریبِ سر

چھوڑا سوار کو نہ فرس کو نہ تنگ کو
اک شور تھا کہ کھا گئی مچھلی نہنگ کو

دو ہو کے گر پڑا جو برابر وہ پہلوان
جبریل پر اُٹھا کے پکارے کہ الاماں

نکلی زمیں میں ڈوب کے شمشیرِ خوں چکاں
تکبیر کہہ کے جوش میں جھوما وہ نوجواں

افلاک سے گزر گئی سادات کی صدا
آئی خدا کے عرش سے اُمت کی صدا

منہ پھیر کر حسین کی جانب جو کی نظر
دیکھا زمیں پہ سجدے میں ہیں شاہ بحر و بر

فریاد کی کہ ای خلفِ سید البشر
نزدیک ہے کہ پاس سے شق ہو دل و جگر

موت آئے اب تو روح کو راحت نصیب ہو
کیجے دعا کہ جلد شہادت نصیب ہو

فرمایا شہ نے ای علی اکبر ترے نثار
میں کیا کروں نہیں مرا پانی پہ اختیار

کوثر پہ شیر حق کو تمہارا ہے انتظار
مظلوم باپ تم سے نہایت ہے شرمسار

لائے کہاں سے دل کہ یہ صدمہ اٹھا سکے
تم مانگو اور حسینؑ نہ پانی پلا سکے

ڈیوڑھی پہ روئی بنتِ علی سُن کے یہ کلام
روتی ہوئی نکل پڑیں سیدانیاں تمام

رانڈوں کے روکنے کو بڑھے اس طرف امام
گھوڑا اڑا کے فوج میں ڈوبا وہ تشنہ کام

سب طور تھا و خاے جنابِ امیر کا
حملے نہ تھے غضب تھا خدائے قدیر کا

قلب و جناح کے جو دلاور ہوئے تلف
گھبرا کے میمنہ پہ گری میسرہ کی صف

یہ غول اُس طرف تو وہ مجمع تھا اس طرف
گویا کہ لڑ رہے تھے غضب میں شہِ نجف

یوں حملہ ور تھے تیغ زنوں کی قطار پر
جاتا ہے شیر جیسے غنیموں کی ڈار پر

آئے گئے جو بیچ سے لشکر کے بار بار
مابین راہ تیغوں سے تن ہو گیا فگار

اب اُس طرف ہیں آپ صفِ فوجِ نابکار
غل ہے ادھر اب آنے نہ پائے یہ نامدار

نیزے ملا دو سینوں سے گھوڑوں کو پھیر کے
کشتہ کر دو ہیں علی اکبر کو گھیر کے

روکی تمام فوج نے اک تشنہ لب کی راہ
گھوڑا اڑا کے بیچ میں آیا وہ رشکِ ماہ

ڈھالوں سے دشت کیں تھا کہ گوتک سیاہ
تلوار چل رہی تھی کہ اللہ کی پناہ

لاکھوں سے معرکہ میں کوئی یوں لڑا نہیں
غل تھا عرب میں ان کبھی ایسا پڑا نہیں

گردوں پہ تھی صدا چکا چاک تیغ و تیر
ڈوبا تھا خوں میں سب شہ و بیں کا منہ منیر

فرماتے تھے جو رکتا تھا اسپ فلک سیر
اب ہم بھی ہیں تمام لڑائی بھی ہے اخیر

زخموں سے تو بھی چور ہے اور ہم بھی چور ہیں
افسوس بس یہی ہے کہ بابا سے دور ہیں

سلام اور نوحہ کی تکرار رہتی ہے ۱۲

نکلا پرے سے شیث رہیی جفا شعار
ہمراہ تھے شقی کے کماں دار دس ہزار

تیروں کا مینہ برس گیا پیاسے پہ ایک بار
راکب کا جسم گھوڑے کے پہلو ہوئے فگار

اُڑ اُڑ کے طے جو کرتا تھا راہِ ثواب کو
غل تھا کہ پر خدا نے دیئے ہیں عقاب کو

نکلے کماں کشوں کے جو حلقے سے وہ جناب
تھی پھر تو برچھیوں کی کرن گرد آفتاب

ڈوبے لہو میں لٹنے لگا گلشنِ شباب
روتے تھے خوں کے آنسوؤں سے دیدۂ کرب

مجروح شیر بیچ میں تھا اس ہجوم کے
نیزے پہ نیزے کھا رہے تھے جھوم جھوم کے

ملکر کے معرکہ یہ پھرے تھے کہ ناگہاں
چھاتی پہ سامنے سے لگی ظلم کی سناں

دِل توڑ کر انی جو ہوئی پشت سے عیاں
نیزہ جگر سے کھینچ کے تڑپا وہ نوجواں

ٹکڑے کبد کے خوں کے ڈریڑوں میں بہہ گئے
گھوڑے پہ یا علی ولی کہہ کے رہ گئے

سینہ دھرے تھے زیں پہ ایالِ فرس پہ سر
چھوٹی تھی لٹکے ہاتھوں سے تیغ نہ سپر

اٹکا ہوا تھا پسلیوں کے بیچ میں جگر
لختے جمے ہوئے تھے لہو کے اِدھر اُدھر

تڑپا تھا جو گھوڑے پہ صدمہ تکان کا
غل تھا کہ دم نکلتا ہی کڑیل جوان کا

چلّا رہا تھا یوں پسرِ سعد روسیاہ
ابنِ نمیر کیا تیرا نیزہ چلا ہی واہ

ہم میں کسی سے قتل نہ ہوتا یہ رشکِ ماہ
بیکس حسینؑ ہو گئے دنیا ہوئی تباہ

کر دے خبر کوئی علی اکبر گزر گئے
دیکھو تڑپ رہے ہیں کہ شبیر مر گئے

بڑھ کر پکارا شمر ستمگار و بد خصال
اے ابنِ فاطمہ خلف شیر ذوالجلال

جلد آ کے دیکھیے پسرِ نوجواں کا حال
لاشہ سموں سے گھوڑوں کے ہوئے گا پائمال

جو حملہ ور تھا تیغ دو دم تول تول کے
دم توڑتا ہی اب وہی منہ کھول کھول کے

پہونچی یہ جاں گزا جو صدا گوشِ شاہ میں
دُنیا سیاہ ہو گئی شہ کی نگاہ میں

دوڑے گرے اُٹھے کئی جا اتنی راہ میں
آئے جگر کو تھامے ہوئے قتل گاہ میں

چاروں طرف جلال میں جاتے تھے اس طرح
بچے کو کھو کے شیر تڑپتا ہی جس طرح

دوڑے گئے اِدھر کبھی جھپٹے اِدھر کبھی
بن میں کبھی تھے رن میں کبھی نہر پر کبھی

تھامی کمر کبھی تو سنبھالا جگر کبھی
کی مُڑ کے خیمہ گاہ کی جانب نظر کبھی

تشویش تھی کہ مادرِ اکبر نکل نہ آئے
خیمہ سے بنتِ فاطمہ باہر نکل نہ آئے

چلاتے تھے کہ ای علی اکبر کدھر ہے تو
مرتا ہے باپ ای مرے دلبر کدھر ہے تو

کچھ سوجھتا نہیں مرے یاور کدھر ہے تو
دن ہے کہ رات ای مہِ انور کدھر ہے تو

آباد گھر حسین کا تاراج ہو گیا
خورشید دوپہر سے غروب آج ہو گیا

بیٹا ضعیف باپ کدھر ڈھونڈھنے کو جائے
بچھڑے پدر سے عین جوانی میں ہائے ہائے

دشمن کو بھی خدا نہ فراقِ پسر دکھائے
پھر بابا جان کہہ کے پکارو تو چین آئے

مرنے کی جس کی فصل تھی اُس نے قضا نہ کی
واحسرتا کہ عمر نے تم سے وفا نہ کی

ناگہ صدا یہ آئی کہ بابا اِدھر ہوں میں
ای نخلِ باغِ فاطمہ زیرِ شجر ہوں میں

خالق سے لو لگی ہے چراغِ سحر ہوں میں
جلد آیئے کہ آپ کا پیارا پسر ہوں میں

دردِ جگر کہیں نہ اجل کا بہانہ ہو
دیدار دیکھ لے تو مسافر روانہ ہو

دوڑے حسین سُن کے یہ آوازِ دردناک
دامن تھا سب قمیصِ تنِ یوسفی کا چاک

فرزند لوٹتا نظر آیا بروئے خاک
بس گر پڑے پسر کی برابر امامِ پاک

تڑپا جو دل تو لختِ جگر سے لپٹ گئے
روحی فداک کہہ کے پسر سے لپٹ گئے

دیکھا کہ جسم سرد ہے بیحس ہیں دست و پا
دم ہے مگر حباب میں ہو جس طرح ہوا

منہ رکھ کے منہ پہ کہنے لگے شاہِ کربلا
کیوں بابا جان کہہ دو گزرتی ہے دل پہ کیا

بولو تو منہ سے کچھ کہ میں بیکس امام ہوں
سوکھی زباں دکھا کے کہا تشنہ کام ہوں

سر پیٹ کر امام پکارے کہ ہائے ہائے
بیٹا حسین ڈھونڈھ کے پانی کہاں سے لائے

جاں اپنی دے کے لوں اگر اک جام ہاتھ آئے
ای نورِ عین پیاس تمہاری خدا بجھائے

سید ہے بغض ہے سپہ بدصفات کو
گھیرے ہوئے ہیں خون کے پیاسے فرات کو

آنسو بہے یہ سنتے ہی اُس شکِ ماہ کے
چاہا کہ مل لے آنکھوں کو قدموں پہ شاہ کے

کروٹ امامِ دیں کی طرف لی کراہ کے
کھولا جو مُنہ نکل گیا دم ساتھ آہ کے

اینٹھی زبان تو ہونٹھ بھی تھرّا کے رہ گئے
گیسو زمین گرم پہ بل کھا کے رہ گئے

جُھک کر پکارے شاہ کہ بیٹا کدھر گئے
غش آگیا ہی درد سے جگر سے کہ مر گئے

باتیں بھی کچھ نہ کیں کہ جہاں سے گزر گئے
چلتے تھے ہم بھی اور نہ دم بھر ٹھہر گئے

یوں قافلے سے چھوٹ کے شبیر رہ گیا
سب نوجوان چلے گئے یہ پیر رہ گیا

سمجھے تھے ہم نبھے گا نہ پیر و جواں کا ساتھ
پیر و جواں کا ساتھ ہی تیر و کماں کا ساتھ

غربت میں کون دے پدرِ ناتواں کا ساتھ
واحسرتا کہ چھوٹ گیا کارواں کا ساتھ

خیر آگے آگے جاتے ہو تم آسرا تو ہی
گو ہم شکستہ پا ہیں پہ سر پر خدا تو ہی

آگے تمھارے مر نہ گئے ہم ہزار حیف
نکلا نہ اب بھی تن سے مرا دم ہزار حیف

تم نے کیا نہ باپ کا ماتم ہزار حیف
یہ عمر اور یہ الم و غم ہزار حیف

گھر جس کے دم سے ہو وہ سعادت نشاں مرے
قدرت خدا کی پیر جیے نوجواں مرے

تڑپے یہ کہہ کے شاہ جو بیٹے کی لاش پر
اِس سانحہ کی ہو گئی راندوں کو بھی خبر

اِک غُل اُٹھا حرم سے کہ ہی ہی مرے پسر
بچوں کو لے کے بی بیاں دوڑیں ہنہ سر

آفت میں ایک کو خبرِ دست و پا نہ تھی
سر پر کسی کے تھی تو کسی کے ردا نہ تھی

سب بی بیوں میں ایک ضعیفہ کا تھا یہ حال
خم تھا کمر میں دوش پہ بکھرے ہوئے تھے بال

پیدا تھی زخمیوں کی تڑپ بسملوں کی چال
چلاتی تھی کدھر ہی ارے میرے نونہال

دیتی ہوں واسطہ میں رسالت پناہ کا
رستہ مجھے بتاوے کوئی قتل گاہ کا

کچھ سوجھتا نہیں مجھے مقتل ہی کس طرف
زخمی ہی جس میں شیر وہ جنگل ہی کس طرف

جس میں چھپا ہی چاند وہ بادل ہی کس طرف
لوگو شبیرِ احمدِ مرسل ہی کس طرف

ماں کا پیام کچھ اُسے دینے کو آئی ہوں
اپنے مرادوں والے کے لینے کو آئی ہوں

ہی ہی کدھر ہی گیسوؤں والا پسر مرا
جنگل میں نے چراغ کیا کس نے گھر مرا

کس خاک پہ تڑپتا ہی لختِ جگر مرا
کس نخل کے تلے ہی وہ نورس ثمر مرا

پیٹوں گی بین کر کے تنِ پاش پاش پر
بٹھلا دو ہاتھ تھام کے اکبر کی لاش پر

لوٹا اجل نے میرے بھرے گھر کو ہی غضب
خوں میں ڈبو دیا مہ انور کو ہی غضب

پُرزے کیا شبیہ پیمبر کو ہی غضب
برچھی لگی مرے علی اکبر کو ہی غضب

اِس عمر میں یہ نخلِ جوانی کا پھل ملا
بستی مری لٹی تجھے کیا ای اجل ملا

ای میرے خوش بیاں مجھے اپنی صدا سُنا
ای میرے نوجواں مجھے اپنی صدا سُنا

ای میرے تن کی جاں مجھے اپنی صدا سُنا
ای میرے قدر داں مجھے اپنی صدا سُنا

عاشق کے دل کو صبر کہاں ہی فراق میں
گھر سے نکل پڑی ہوں ترے اشتیاق میں

ای پیچدار گیسوؤں والے ترے نثار
ای یادگارِ گیسوؤں والے ترے نثار

ای مشکبار گیسوؤں والے ترے نثار
ای میرے چار گیسوؤں والے ترے نثار

دنیا سیاہ ہو گئی رستہ پہاڑ ہی
جنگل بسا ہوا ہی مرا گھر اُجاڑ ہی

ای میرے گلبدن مرے ابرو کماں جواں
ای میرے کم سخن مرے شیریں بیاں جواں

ای میرے صف شکن مرے حیدر نشاں جواں
ای میرے تیغ زن مرے شیر ژیاں جواں

لاکھوں سے معرکہ طپش آفتاب میں
دو دن کی پیاس نے تجھے مارا شباب میں

وہ بھینی بھینی تن کی مجھے بو سنگھاؤ پھر
ماں صدقے جائے تنتے ہوئے گھر میں آؤ پھر

کھل جائے ماں کا غنچۂ دل مسکراؤ پھر
جی بھر کے میں گلے سے لگا لوں تو جاؤ پھر

غربت میں شوق سے شہِ والا کا ساتھ دو
مجکو بٹھا کے پردے میں بابا کا ساتھ دو

گھبرا کے ایک شخص نے رادی سے یوں کہا
بی بی یہ کونسی ہی جو نکلی ہی بے ردا

مریم ہی یا خدیجہ ہی یا بنتِ مصطفےٰ
بولا وہ کانپ کر کہ قیامت ہوئی بپا

خواہر حسین کی ہی نواسی نبی کی ہی
منہ پھیر لے ارے یہی بیٹی علیؑ کی ہی

لکھتا ہی ایک راوی غمگین و دل کباب
تھی دشتِ بے نوا میں وہ بی بی جو نے نقاب

چہرے پہ آفتاب کے تھا دامنِ سحاب
گیتی کو زلزلہ تھا زمانہ کو اضطراب

گر گر کے آشیانوں سے طائر پھڑکتے تھے
چنگھاڑتے تھے شیر ہرن سر پٹکتے تھے

اس حشر میں جو شہ نے بہن کی سنی صدا
جلدی اُٹھا کے لاش چلے شاہِ کربلا

دیکھا کہ دوڑی آتی ہی زینب برہنہ پا
رو کر پکارے وا عجبا وا مصیبتا

سر ڈھانپ لو رداسے قیامت بپا نہ ہو
گھر میں چلو بہن علی اکبر خفا نہ ہو

اب وک لے کیمتِ قلم کی عنانِ انیس
بزمِ عزا میں سب ہیں ترے قدر داں انیس

پیری ہی یہ سفر کا رہے دھیان ہاں انیس
کیا جانیے روانہ ہو کب کارواں انیس

خیمے مسافرانِ عدم نے نکالے ہیں
جس قافلہ میں تم ہو وہ سب چلنے والے ہیں

رُباعی

دم الفتِ حیدر کا جو بھرتا ہوں میں
حال آتا ہی دل کو وجد کرتا ہوں میں

ممکن ہی کہاں صفاتِ ہمنامِ خدا
کیا آگے کہوں خدا سے ڈرتا ہوں میں

رُباعی

سینے میں یہ دم مثلِ سحر گاہی ہی
جو ہی اس کارواں میں وہ راہی ہی

پیچھے کبھی قافلہ سے رہتا نہ انیس
ای عمرِ دراز تیری کوتاہی ہی

مرثیہ (۱۳)

جب غازیان فوجِ خدا نام کر گئے
لاکھوں سے تشنہ کام لڑے کام کر گئے

اُمت کی مغفرت کا سر انجام کر گئے
فیض اپنا مثلِ ابرِ کرم عام کر گئے

پڑھتے ہیں سب درود جو ذکر ان کے ہوتے ہیں
ایسے بشر وہ تھے کہ ملک جن کو روتے ہیں

دیندار و سرفروش و شجاع و خوش اعتقاد
ہاتھوں میں تیغیں اور دلوں میں خدا کی یاد

زخموں کو نخلِ قد پہ وہ سمجھے گلِ مراد
مردانگی یہ پیاس میں فاقوں میں یہ جہاد

تیغوں سے بند کونسا اُن کا کٹا نہ تھا
پر معرکے سے پاؤں کسی کا ہٹا نہ تھا

برسوں رہے گا چرخ میں گر آسمان پیر
لیکن نظر نہ آئے گا اُن کا کہیں نظیر

گورے نہ اُن کے پائوں کو روئے مہِ منیر
خورشید جن کے سامنے اِک ذرۂ حقیر

پُرخوں قبائیں جسم میں سینے تنے ہوئے
پہونچے ریاضِ خلد میں دولہ بنے ہوئے

رستم اُٹھا نہ سکتا تھا سر اُن کے سامنے
شیروں کے کانپتے تھے جگر اُن کے سامنے

پھیکی تھی روشنی قمر اُن کے سامنے
اُڑتا تھا رنگ روئے سحر اُن کے سامنے

بخشا تھا نورِ حق نے ہر اک خوش صفات کو
ہوتا تھا دن جو گھر سے نکلتے تھے رات کو

پیشانیوں پہ جلوہ نما اخترِ سجود
دیکھیں جو اُن کا نور تو قدسی پڑھیں درود

رُخ سے عیاں جلال و جوانمردی و نمود
شہدائے اہلِ شیفتہ واجب الوجود

جینے کی شاہِ دیں کو دعا دے کے مر گئے
ایمان کے آئینہ کو جِلا دے کے مر گئے

تاثیر کر گئی تھی اُنھیں صحبتِ امام
تھا نزع میں بھی خشک لبوں پُر خدا کا نام

لبریز تھے محبتِ حیدر سے دل کے جام
ذی قدر ذی شعور و لآور خجستہ کام

لشکر جو اُن پہ ٹوٹ پڑے شام و روم کے
تلواریں کھائیں سینوں پہ کیا جھوم جھوم کے

لاکھوں میں انتخاب ہزاروں میں لاجواب
تھا خشک و تر پہ جن کا کرم صورتِ سحاب

وہ نور وہ جلال وہ رونق وہ آب و تاب
زہرا کے گھر کے چاند زمانے کے آفتاب

بس یک بیک جہاں میں اندھیرا سا چھا گیا
دن بھی ڈھلا نہ تھا کہ زوال اُن پہ آ گیا

گل ہو گئے عقیل کی تربت کے جب چراغ
جعفر کے لاڈلوں نے دیئے شہ کے اک دماغ

ماتم سے بھانجوں کے ہوا تھا نہ انفراغ
پامال ہو گیا حسن مجتبےٰ کا باغ

لاشے اُٹھائے جنگ کرے یا بکا کرے
جس پر گرے یہ کوہِ مصیبت وہ کیا کرے

صدمہ یہ تھا کہ لٹنے لگی دولتِ پدر
نکلے نہ بر کو اسد اللہ کے پسر

مارے گئے جہاد میں جن دم وہ شیر نر
رخصت ہوئے حسین سے عباس نامور

دریا بہے لہو کے بڑا کشت و خوں ہوا
ڈھلتے تھے دوپہر کہ علم سرنگوں ہوا

پیری میں قہر ہے خبرِ مرگِ نوجواں
ریتی پہ تھرتھرا کے گرے شاہِ انس و جاں

نکلیں سروں کو پیٹتی خیمے سے بی بیاں
تھا خانۂ علی میں تلاطم کہ الاماں

یوں گھر الٹ پلٹ تھا امامِ حجاز کا
جس طرح ٹوٹ جاتا ہے لنگر جہاز کا

غل تھا کہ خوں میں بھر گیا سقائے اہلِ بیت
دنیا سے کوچ کر گیا سقائے اہلِ بیت

ہم لُٹ گئے گزر گیا سقائے اہلِ بیت
فریاد ہے کہ مر گیا سقائے اہلِ بیت

ہے ہے کہاں سے لے کے مشکی کو لائیں گے
سوکھی زبان اب کسے بچے دکھائیں گے

ہلتا تھا خیمہ روتے تھے یوں اہلِ بیتِ شاہ
صدمے سے حال زوجۂ عباس تھا تباہ

چلاتی تھی کہ نہر کی مجکو بتاؤ راہ
ہے ہے میں لٹ گئی مرے بچے ہوئے تباہ

خم تھے گرا تھا کوہِ مصیبت حسین پر
ماتم تھا بی بیوں میں سکینہ کے بین پر

ماتم اِدھر تھا جشن میں تھے اہلِ شر اُدھر
بجتے تھے شادیانہ فتح و ظفر اُدھر

انعام بانٹتا تھا ہر اک کو عمر اُدھر
روتے تھے دیکھ دیکھ کے حضرت اُدھر اُدھر

غل تھا کہ بس حسین بہت روئے بھائی کو
کوئی جواں ہو اور تو بھیجو لڑائی کو

باقی نہیں کوئی تو غا کو خود آیئے
حیدر کی ذوالفقار کے جوہر دکھایئے

زخم سناں و خنجر و شمشیر کھایئے
گرمی بڑی ہی آج لہو میں نہایئے

آمادہ ہم تو دیر سے بہرِ ستیز ہیں
تیغیں بھی ہیں اُپی ہوئی خنجر بھی تیز ہیں

کاٹے ہیں جس نے بازوئے لختِ دلِ امیر
ہی خوب آبدار وہ شمشیر بے نظیر

چھیدا ہی جس سے مشک کو موجود ہی وہ تیر
یہ گرز وہ ہی ضرب سے جس کی ہوے اخیر

تڑپے تھے جس سے مشک کے انتوں سے چھوڑ کر
بچھی وہ ہی جو نکلی تھی پہلو کو توڑ کر

صابر بڑے ہیں آپ یا شاہِ انس و جاں
اِک بھائی کے فراق میں یہ نالہ و فغاں

رونے سے جی اُٹھیں گے نہ عباسِ نوجواں
حضرت پکارتے ہیں کسے بھائی کہاں

ملتا ہی کب جہاں میں بھلا جو گزر گیا
اب فکر اپنی کیجیے وہ شیر مر گیا

اکبر نے کی غضب کی نظر سوے فوجِ شام
کانپے یہ غیظ سے کہ اُگلنے لگی حسام

کی عرض ہاتھ جوڑ کے اے قبلۂ انام
سُنتے ہیں آپ لشکرِ اعدا کے یہ کلام

خوں تن میں جوش کھاتا ہی ہنگامِ جنگ ہی
مولا بس اب تو حوصلۂ صبر تنگ ہی

اُن کے کلام سُننے کی کس کے جگر میں تاب
خادم زبانِ تیغ سے دے گا انھیں جواب

کیا اپنے دل میں سمجھے ہیں یہ خانماں خراب
نعرہ کروں تو شیر کا زہرہ ہو آب آب

آدابِ شاہ سے نہیں ہم بول سکتے ہیں
زخم جگر پہ ابتو نمک یہ چھڑکتے ہیں

عمو کو قتل کر کے بہت ہو گئے ہیں شیر
اِن ظالموں کے زعم میں اب ہم نہیں دلیر

معلوم ہو گا لاشوں کے جب ان میں ہوں گے ڈھیر
دیکھیں تو کون اب ہی زبردست کون زیر

مجمع جو ہی اُدھر ہمیں تنہا سمجھتے ہیں
اچھا یوہیں سہی ہم اُنھیں کیا سمجھتے ہیں

جوہر دکھائیں ہم کو بہادر جو ہیں بڑے
تب جانیں ایک ایک نکل کر اگر لڑے

کیا لطف ہی جو ایک پہ سو مل کے پڑے
چاہیں جو ہم تو نہر کو لے لیں کھڑے کھڑے

دبتے ہیں سرکشوں سے کوئی جو دلیر ہیں
فاقہ ہو یا کہ پیاس ہو پھر شیر شیر ہیں

ہم کو یہ طعن و طنز کی باتیں نہیں پسند
کوفے میں لینگے دم جو اُٹھائینگے پھر سمند

ہونٹوں پہ غم سے اب ہی یہاں جان ہے بند
کاٹیں تبر سے تیغ سے خنجر سے بند بند

ہنس ہنس کے جسم پر تبر و تیر کھائیں گے
تیغ زباں کے زخم اُٹھائے نہ جائینگے

گھبرا کے دیکھنے لگے بیٹے کے مُنہ کو شاہ
فرمایا خیر کہہ لیں جو کہتے ہیں رو سیاہ

کیوں کانپتے ہو غیظ سے اے میرے شاہ
لازم ہی صبر و شکر کہ راضی ہے اللہ

غصہ اسی طرح اگر آئے گا آپ کو
خنجر کے نیچے دیکھوگے کس طرح باپ کو

برہم نہ ہوتمھیں سرِ شبیر کی قسم
لو گھر میں جاؤ خیر سمجھ لیں گے ان سے ہم

دیکھو ہمیں کہ بھائی کے بازو ہوئے قلم
تلوار دل پہ چل گئی مارا نہ ہم نے دم

سب جل کے خاک ہوں عدو جو بد دعا کروں
پر اُمتِ نبی ہی بجز صبر کیا کروں

یہ سُن کے زرد ہو گئے ہم شکلِ مصطفا
رو کر کہا یہ کرتے ہیں ارشاد آپ کیا

وہ وقت وہ گھڑی نہ دکھائے ہمیں خدا
بابا نہ ہو تو بیٹے کے جینے کا کیا مزا

آمادۂ فنا ہیں خوشی دل سے فوت ہو
پھر خضر کی حیات ملی گر تو موت ہو

کیا پہلے سر کٹائیے گا یا شہِ زماں
کس اشتیاق سے شہِ دیں نے کہا کہاں

آگے جو کچھ رضائے خدا اے پدر کی جاں
جیتے ہیں پیر سامنے مرتے ہیں نوجواں

دیکھو کہ چھوٹے بھائی کے ماتم میں روتے ہیں
پالا تھا جن کو ہم نے وہ دریا پہ سوتے ہیں

یہ کہہ کے اُٹھ کھڑے ہوئے سلطانِ بحر و بر
پٹکے سے باندھنے لگے ٹوٹی ہوئی کمر

قدموں پہ گر پڑے علی اکبر بچشمِ تر
کی عرض رحم کیجئے مر جائے گا پسر

آگے مرے جو ہوگی شہادت امام کی
دُنیا میں آبرو نہ رہے گی غلام کی

چھوٹے تھے جو کہ سن میں بڑے کر گئے وہ کام
یا شاہ کہلا لڑائی کے قابل نہیں غلام

عمو کے خوں کا لینگے لعینوں سے انتقام
ہم نے بھی تیغ باندھی ہی بچپن سے یا امام

عزت ملی ہی خلق میں صدقے سے آپ کے
بیٹا وہی جو رنج میں کام آئے باپ کے

انصاف آپ کیجیے یا سرورِ عرب
بیٹا تو گھر میں بیٹھے لڑے باپ تشنہ لب

مارا گیا نہ آج تو کل یہ کہیں گے سب
کیسا لہو سفید ہی دنیا کا ہی غضب

سر کو کٹا کے باپ جہاں سے گزر گیا
بیٹا جوان باپ کے آگے نہ مر گیا

بہرِ رسول رن کی رضا دیجیے مجھے
صدقہ علی کا اذن و غا دیجیے مجھے

مرتا ہوں یا امام جِلا دیجیے مجھے
یادِ خدا میں دل سے بھلا دیجیے مجھے

کھولیں کمر حضور تو دل کو قرار ہو
کہہ دیجیے کہ جا علی اکبر نثار ہو

شہ نے کہا تمھیں مرے دل کی نہیں خبر
پیارے کہاں سے لاؤں میں اس طرح کا جگر

ہے باپ کا عصائے ضعیفی جواں پسر
جب تم نہ ہو گے پاس تو مر جائے گا پدر

ایسے ہنسے نہ تھے کہ ہمیں تم رُلاتے ہو
شادی کے دن جو آئے تو مر ہی کو جاتے ہو

راتیں یہ عیش کی ہیں مرادوں کے ہیں یہ دن
پورے جواں نہیں ابھی کیا ہی تمھارا سن

اکبر تری جوانی پہ روئیں گے انس و جن
کیونکر قرار آئے گا ماں کو تمھارے بن

کیسی ہوا چلی چمنِ روزگار میں
سید کا باغ لٹتا ہی فصلِ بہار میں

دیتا اگر تمھیں کوئی فرزند ذوالجلال
ہوتی پدر کی قدر سمجھتے ہمارا حال

رخصت کا آپ سے یوہیں کر تا وہ جب سوال
تب جانتے کہ دیتے اُسے رخصتِ جدال

کیا جانے وہ مزہ جسے اِس کا ملا نہیں
اچھا سدھارو تم سے ہمیں کچھ گلا نہیں

تسلیم کر کے بولے علی اکبرِ غیور
لاکھوں برس جہاں میں سلامت ہیں حضور

فرمایا شہ نے خیر اجل بھی نہیں ہی دور
برچھی لگا کے دل پہ خوش آمدید کیا ضرور

تقریر میں پدر کو نہ اب بند کیجیے
خیمے میں جا کے ماں کو رضامند کیجیے

ہیں مبتلائے رنج بھلا کیا ہمارا پیار
تم سے جو سو پسر ہوں تو اس راہ میں نثار

ہر دم خدا سے خیر کا ہوں میں امیدوار
ہاں جان جانے دے تو مرا کیا ہی اختیار

سینے میں دل ہلے گا بدن تھرتھرائے گا
رخصت کا نام سنتے ہی غش اُس کو آئے گا

سب جانتے ہیں جو ہے پھوپھی کو تمھاری چاہ
معلوم ہوگا جاؤ گے جب سوئے خیمہ گاہ

باہیں گلے میں ڈالے گی زینب باشک آہ
قدموں پہ گر کے آپ کے ماں ہوگی سد راہ

یہ مرحلہ بھی کم نہیں زنجیر و طوق سے
دونوں رضا جو دیں تو چلے جاؤ شوق سے

حسرت یہ ایک کو ہے کہ دولھا بنے پسر
آئے دلھن جو چاند سی آباد ہو یہ گھر

پوتے کی آرزو میں ہے اک سوختہ جگر
نخل مراد کا یہی دنیا میں ہے ثمر

ہر دم یہی ہے ذکر جو فضل الٰہ ہو
اُنیسویں برس علی اکبر کا بیاہ ہو

ماں کہتی تھی بناؤں گی دولہا اسی برس
مرنے کی تم کو عین جوانی میں ہے ہوس

کچھ اس میں زور ہے نہ ہمارا نہ اُن کا بس
ہم بھی مریں گے خیر نہیں اتنا پیش و پس

شکوہ نہ چرخ کا نہ شکایت ہے آپ کی
پیری میں یہ بھی رنج تھا قسمت میں باپ کی

روتے ہوئے چلے علی اکبر سوئے خیام
کانپا یہ دل کہ بیٹھ گئے خاک پر امام

روتا ہوا جو ڈیوڑھی سے آیا وہ نیک نام
ڈوڑھی پہ کو دیکھ کے بانوئے تشنہ کام

دامن سے آ کے بالی سکینہ چمٹ گئی
زینب بلائیں لیکے گلے سے لپٹ گئی

ماں گرد پھر کے بولی کہ اے میرے گلعذار
تم صبح سے گئے تھے اب آئے یہ ماں نثار

در پر تڑپ تڑپ کے میں جاتی تھی بار بار
کھولو بس اب کمر کہ مرا دل ہے بے قرار

گرمی یہ اور قحط کئی دن سے آب کا
رخ تمتما گیا ہے مرے آفتاب کا

تر ہے قبا پسینے میں پنکھا کوئی ہلاؤ
سونا لگے ہو دھوپ میں واری ہوا میں آؤ

جھاڑوں دامن سے گرد میں زلفوں کی بیٹھ جاؤ
گھٹ جائے گا لہو مرا آنسو نہ تم بہاؤ

صدمہ جو دل پہ ہو اسے کچھ منہ سے کہتے ہیں
کیا ہے جو اشک نرگسی آنکھوں سے بہتے ہیں

صغرا کی تو وطن سے کچھ آئی نہیں خبر
جلدی کہو کہ منہ سے نکلتا ہے اب جگر

اکبر نے عرض کی کہ ہیں سب خیر سے مگر
لٹتا ہے کوئی آن میں خیر النسا کا گھر

ملتی نہیں رضا ہمیں آنسو بہاتے ہیں
بابا گلا کٹانے کو میداں میں جاتے ہیں

اس وقت کس سے دردِ دل اپنا کہوں میں آہ
تم بھی ہو سدِ راہ پھوپھی بھی ہیں سدِ راہ

چھائی ہے واں گھٹا کی طرح شام کی سپاہ
اماں مدد کرو کہ کمر باندھتے ہیں شاہ

اب زندگی ہے تلخ بہت دق ہیں جان سے
الفت نے آپ کی ہمیں کھویا جہان سے

دیتے نہیں رضا جو امامِ فلک اساس
خاطر فقط یہ آپ کی ہے اور پھوپھی کا پاس

اب غیر پاس کوئی نہیں اُن کے آس پاس
ناطاقتی ہے ضعف ہے فاقہ ہے اور پیاس

کیونکر لڑینگے وہ کہ سراپا ضعیف ہیں
پیری میں دل ضعیف ہے اعضا ضعیف ہیں

عباس جب سے مر گئے روتے ہیں دم بدم
رُخ زرد ہے کمان کی طرح ہو گئے ہیں خم

چلّوں میں تیر چوڑے ہیں واں بانیِ ستم
قرباں ہوں کس طرح پسرِ فاطمہ پہ ہم

سب رو رہے ہیں ان کی طرف جائیں کس طرح
ماں کو پھوپھی کو بہنوں کو سمجھائیں کس طرح

بابا کا حکم ہے کہ رضا جا کے ماں سے لاؤ
رضی پھوپھی ہوں جب تو لڑو اور زخم کھاؤ

مرضی ہے آپ کی کہ مرے پاس سے نجاؤ
یا فاطمہ تمہیں علی اکبر کے کام آؤ

چلنے گئیں نہ تیرِ ستمگر قتیں پر
نرغہ ہے ظالموں کا تمہارے حسین پر

دیکھی گئی نہ ماں سے یہ بیتابیِ پسر
وارث کی نے کسی پہ لگا کانپنے جگر

ہاتھوں سے دل کو تھام کے بولی وہ نوحہ گر
دولت پہ فاطمہ کے تصدق تمام گھر

پہلے نہ کچھ کہا تھا نہ اب روکتی ہوں میں
روتے ہو کس لیے تمہیں کب روکتی ہوں میں

زہرا کے لال پر مرے مادر پدر نثار
عابد نثار اصغرِ تشنہ جگر نثار

جانیں ہزار ہوں تو فدا لاکھ سر نثار
قربان گھر کنیز تصدق پسر نثار

گھبرائی گو کہ ہوں پہ بہو میں علی کی ہوں
مانگو گے جو وہ دونگی کہ لونڈی سخی کی ہوں

مجھ پر حوالہ کرتے ہیں گر شاہِ خوش خصال
رخصت نہ تم کو دوں یہ بھلا ہے مری مجال

صدقہ انھیں کا ہے کہ ملا تم سا نونہال
رخصت کا صدقے جاؤں پھوپھی سے کرو سوال

ہم سب کنیزیں بنتِ امیرِ عرب کی ہیں
اصغر ہو یا کہ تم وہی مختار سب کی ہیں

کہنے کو یوں ہیں چاہنے والے تمامے سب
لیکن ہے اُن کے عشق سے نسبت کسی کو کب

دن کو اُنھوں نے دن کبھی جانا نہ شب کو شب
لیجیے انھیں سے آپ کو جس شے کی ہے طلب

مجھ سے نہ کچھ نہ سیدِ عالی سے پوچھیے
گر پوچھیے تو پالنے والی سے پوچھیے

روتے ہوئے گئے علی اکبر پھوپھی کے پاس
دیکھا کہ غش پڑی ہے زمیں پر وہ حق شناس

زانو پہ سر لیے ہوئے کبرا ہے بے حواس
اِس حال میں بھی لب پہ یہی ہیں کلام یاس

اب تاب و طاقت جسد و روح و دل گئی
کیوں صاحبِ رضا علی اکبر کو مل گئی

اکبر سے مجھکو یہ نہ توقع تھی ہے غضب
اتنا نہیں خیال کہ ہے کون جاں بلب

اس گل نے ہائے میری ریاضت بھلا دی سب
نامِ خدا جواں ہوئے کیا ہم سے کام اب

ہیں محو رن کے شوق میں رخصت کے دھیان میں
سچ ہے کسی کا کون ہوا ہے جہان میں

یا نے ہمارے چین نہ آتا تھا کوئی دم
مالک اب اور ہو گئے کوئی ہوئے نہ ہم

کیا دخل تھا جو ڈیوڑھی سے باہر کھیں قدم
ہی ہے وہ میرا درد مصیبت وہ رنج و غم

جاگی ہوں میں جو چونک کے راتوں کو روئے ہیں
پوچھو تو کس کی چھاتی پہ بچپن میں سوئے ہیں

گنگھی کسی کے ہاتھ کی بھاتی نہ تھی کبھی
نے میرے لیٹے نیند نہیں آتی تھی کبھی

نے اُن کے ماں کی قبر پہ جاتی نہ تھی کبھی
روئیں پسر پہ اُن کو رُلاتی نہ تھی کبھی

میرے سوا کسی کو کبھی جانتے نہ تھے
جو تھی سو میں تھی ماں کو تو پہچانتے نہ تھے

ہر چند دونوں تھے مرے فرزند خرد سال
پر ان کے آگے اُن کا مجھے کچھ نہ تھا خیال

راتوں کو جب لپٹتے تھے مجھ سے وہ نونہال
میں کہتی تھی ہٹو علی اکبر ہے میرا لال

وہ دونوں مرنے والے تو پہلو میں ہوتے تھے
پھیلا کے پانوں یہ مری چھاتی پہ سوتے تھے

چھوٹا تو ضد بھی کرتا تھا راتوں کو بارہا
پر زعم کیا عقیل تھا بخشے اُسے خدا

دن رات تھی خوشا مدِ ہم شکلِ مصطفا
سینے پہ جب سوئے تو اُس نے یہی کہا

آقا کے نورِ عین ہیں عالی مقام ہیں
اماں یہ شاہزادے ہیں اور ہم غلام ہیں

رہتے تھے پاس باپکے وہ غیرتِ قمر
اُلفت میں ان کی مجکو کچھ اُن کی نہ تھی خبر

قرآن پڑھنے بیٹھتی تھی جب دمِ سحر
صورت پہ تھی اُنھیں کی تلاوت میں بھی نظر

غافل نہ ان کے پیار سے میں ایک آن تھی
قرآں تو رحل پر تھا ولے میں جان تھی

میں نے انھیں پہ صدقے کیے اپنے دونوں لال
تسکین تھی کہ باقی ہی اکبر سا نونہال

مانگے تو آکے مجھ سے بھلا رخصتِ جہاد
نکلوں گی ساتھ خیمے سے بکھرائے سر کے بال

کیا خوب جیتے جی مرے جائینگے مرنے کو
تلوار باندھ لی ہی ہمیں ذبح کرنے کو

بچپن میں تھا نہ ہم سے زیادہ کسی کا پیار
اب کیا غرض گزر گئی وہ فصل وہ بہار

پھیلیں مسیں نمود ہو اسبزۂ عذار
مالک ہیں خود بھلا مرا اب کیا ہی اختیار

ثابت ہوا ادھر ہی اُدھر مرنے جائینگے
میں مرچکی جاؤنگی تو وہ یاں تک آئینگے

باہر سدھارے یا ابھی ہیں ماں سے کچھ کلام
بھابھی نے کیوں لیا تھا ابھی وہ کے میرا نام

سینے پہ مُنہ کو رکھ کے یہ بولا وہ لالہ فام
آنکھیں تو آپ کھولیے حاضر ہی یہ غلام

خادم جدا نہ تھا شہِ گردوں سریر سے
کس جرم پر حضور خفا ہیں حقیر سے

کیا ہی قصور جس پہ یہ غصّہ ہی یہ عتاب
کرتا ہوں بات میں کوئی بے مرضیِ جناب

روتا ہوں اب صبر کی مجکو نہیں ہی تاب
شکوہ یہ خاکسار کا اے بنتِ بوتراب

ہر دُکھ میں ہر بلا میں مددگار آپ ہیں
پالا ہی مجکو مالک و مختار آپ ہیں

پیدا ہوا تو آپ کی صحبت مجھے ملی
کرتی ہی روح شکر وہ راحت مجھے ملی

یوسف کو کب ملی تھی جو دولت مجھے ملی
رکھا عزیز آپ نے عزت مجھے ملی

صدقہ ہی اس قدم کا جو سر تا فلک گیا
کی مہر آفتاب نے ذرہ چمک گیا

مرضی نہ ہو تو رن کو بھی جائے نہ یہ غلام
بندے ہیں ہم اطاعتِ مالک ہی ہم کو کام

تکرار کی مجال نہ اصرار کا مقام
مرتے اگر تو اس میں بھی تھا آپ ہی کا نام

روتی ہیں آپ کس لیے اچھا نہ جائینگے
پر یاد رکھیے مُنہ نہ کسی کو دکھائیں گے

یہ کہہ کے جھک گیا جو قدم پر وہ ذی وقار
بس ہو گئیں محبتِ قلبی سے بے قرار

پھیلا کے دونوں ہاتھوں کو اٹھیں بحالِ زار
شکوے کے بدلے منہ سے یہ نکلا کہ میں نثار

اُمڈا یہ دل کہ چشم کے ساغر چھلک پڑے
دیکھا جو آفتاب کو آنسو ٹپک پڑے

لیکر بلائیں بولیں کہ واری خفا نہ ہو
صدقے ہو تم پہ جان ہماری خفا نہ ہو

باتیں تھیں یہ تو پیار کی ساری خفا نہ ہو
روتے ہو کیوں منگا دو سواری خفا نہ ہو

آئے بلا حسین پہ جو اُس کو رد کرو
اچھا سدھارو دُکھ میں پدر کی مدد کرو

اُلفت کے جوش میں تو یہ منہ سے کہا مگر
اُٹھا یہ دل میں درد کہ تھرّا گیا جگر

کُبرے کو روتے دیکھ کے بولی وہ نوحہ گر
کیا ماجرا ہوا مجھے مطلق نہیں خبر

میں روکنے نہ پائی کہ وار اُن کا چل گیا
کیا میں نے کہہ دیا کہ کلیجہ نکل گیا

کیا جا کے اب نہ آئے گا گھر میں نونہال
ہے ہے مری کمائی پہ آجائے گا زوال

جس وقت سے شہید ہوئے رن میں نونہال
نے ہوش میں حواس میں ہے میرے اختلال

ایسا ہے اضطراب کہ کچھ جس کی حد نہیں
جو آپ میں نہ ہو سخن اس کا سند نہیں

میں ہوش میں نہ تھی یہ قدم پر گرے تھے جب
میں بھی کہوں یہ بانو پہ گرنے کا کیا سبب

لو مجھ پہ اب کھُلا کہ یہ رخصت کی تھی طلب
اکبر کو میں نے ہاتھ سے کھویا تھا ہے غضب

اصلا خبر نہیں مرے دلبر نے کیا کہا
میں نے جواب کیا دیا اکبر نے کیا کہا

کیا کہہ دیا تھا مرنے کو جائے یہ گلبدن
راضی ہوئی تھی میں کہ خزاں ہو مرا چمن

بیخود ہوں جب سے رن میں سدھارے شہِ زمن
کہتی ہوں کچھ زبان سے نکلتا ہے کچھ سخن

اتنی خبر نہیں علی اکبر کے پیار میں
قابو میں ہے نہ دل نہ زباں اختیار میں

زندوں میں ہوتی گر تو یہ کہتی کہ مرنے جائیں
اِس پیاس میں شہید ہوں فاقوں میں دم کھائیں

اٹھارھواں برس ہے دُلہن تو مجھے دکھائیں
پالا ہے منتوں سے مُرادیں مری بر آئیں

مرتی ہوں اشتیاق میں سہرا تو دیکھ لوں
سہرے کے نیچے چاند سا چہرہ تو دیکھ لوں

رخصت کے نام سے مرا پھٹتا ہے اب جگر
ایسا نہ ہو کہ بانو سے بیکس کو ہو خبر

گر سُن لیا تو دل میں کہینگی وہ نوحہ گر
پیارا ہوا نہ بنتِ علی کو مرا پسر

سمجھی تھیں کیا جو دی اُسے رخصت جلال کی
زینب نے ہائے قدر نہ کی میرے لال کی

سچ ہے کہ اُس کی چاہ سے نسبت مجھے کہاں
ہوں لاکھ اُن کی چاہنے والی وہ پھر جواں

آنکھوں کا نور قلب کی طاقت بدن کی جاں
آخر تو آتما کی ہے وہ قیامت کہ الاماں

کیا سوچتے ہو صاحبو کچھ تم کو خیر ہے
ماں ہے تو ماں ہے خلق میں پھر غیر غیر ہے

ماں کی نہ کم تو بہن اور نہ کسی کا پیار
غصہ ہو یا کہ سخت کہے دل میں ہے نثار

بلبل فدا ہے گل پہ شکایت کرے ہزار
دنیا میں عاشقوں کے دلوں کو کہاں قرار

دیں ماں کا ساتھ نام خدا اب جوان ہیں
میرا ہے جب یہ حال پھر اُس کی تو جان ہیں

جس دم سُنے یہ دور سے بانو نے سب کلام
آئی قریبِ حضرتِ زینب وہ نیک نام

کی عرض ہاتھ جوڑ کے اے خواہرِ امام
میں ہوں کنیز آپ کی لو یہ پسر غلام

کس کی مجال ہے جو کہے گا یہ کیا کیا
بی بی نے دی غلام کو رخصت بجا کیا

لونڈی ہے فاطمہ کی کنیزوں میں باوفا
ہو قطع وہ زباں جو کرے آپ کا گلا

حضرت کو ان کے سر پہ سلامت رکھے خدا
مالک ہیں آپ اس میں کسی کو ہے دخل کیا

کچھ جائے گفتگو ہے نہ ماں کو نہ باپ کو
ہے دخل اذن دینے نہ دینے کا آپ کو

غم کھائیے نہ خونِ جگر آپ پیجیے
عابد کو بھیجیے کہ اصغر کو بھیجیے

ہے اختیار دیجیے رخصت نہ دیجیے
قربان جاؤں جو ہو مناسب وہ کیجیے

شادی ہو یا کہ غم ہو شریکِ ثواب ہوں
ہر طرح سے میں تابعِ حکمِ جناب ہوں

گھر میرا جب سے لٹ گیا اس گھر میں آئی ہوں
شکوے کا کوئی حرف کبھی لب پہ لائی ہوں

کسری کی گو کہ پوتی ہوں سلطاں کی جائی ہوں
لونڈی ہوں آپ کی علی اکبر کی دائی ہوں

صدقہ یہ آپ کا ہے جو شہ کو عزیز ہوں
بھاوج نہ جانیے مجھے ادنیٰ کنیز ہوں

آپ اس کی ماں ہیں آپ کا فرزند ہے یہ لال
دخل اس معاملہ میں کوئی دے یہ کیا مجال

یہ عازم جدال ہے اور آپ کا یہ حال
قدموں کو چھوڑتا نہ کبھی نیکو خصال

آپ اس کو چاہتی ہیں یہ صدقے ہے آپ پر
پر کیا کرے کہ آج مصیبت ہے باپ پر

قسمت بُری ہے اس میں کسی کا قصور کیا
اچھا رہیں کہ جائیں ہمارا بھی ہے خدا

پروا ہماری ہے نہ خیال ان کو آپ کا
تابع ہم آپ کے بھی ہیں ان پر بھی ہیں فدا

عابد ہوں یا کہ یہ سبھی آنکھوں کے تارے ہیں
پر اب تو یہ نہ آپ کے ہیں نہ ہمارے ہیں

یہ سُن کے کانپنے لگی زینب جگر فگار
آئی صدائے فاطمہ بیٹی پہ ماں نثار

اللہ یہ محبتِ فرزند اور یہ پیار
تنہا ستم کی فوج میں ہے میرا گلعذار

رخصت نہ دے گی تو اگر اس نورِ عین کو
کون اب بچائے گا مرے بیکس حسین کو

آواز سُن کے کانپ گئی بنت مرتضا
بانو کے منہ کو دیکھ کے اکبر سے یہ کہا

واری سدھارو خیر جو کچھ مرضیِ خدا
ترکِ ادب ہے تم کو اگر اب نہ دوں رضا

یاں والدہ بہشت سے تشریف لائی ہیں
بنتِ نبی تمہاری سفارش کو آئی ہیں

تسلیم کر کے خیمے سے وہ سیمبر چلا
پیچھے حرم کا قافلہ سب ننگے سر چلا

بانو پکارتی تھی کہ پیارا پسر چلا
چلاتی تھی پھوپھی مرا لختِ جگر چلا

لٹتے ہیں اہلِ بیت دوہائی امام کی
تصویر گھر سے جاتی ہے خیر الانام کی

بھائی کے غم سے عابدِ بیکس تھے بے قرار
اُٹھتے تھے اور زمین پہ گرتے تھے بار بار

بہنیں پکارتی تھیں کہ بھیا ترے نثار
سینوں کو پیٹتی تھیں خواصیں بحالِ زار

اِک حشر تھا جدا علی اکبر جو ہوتے تھے
جھولے میں پھوٹ پھوٹ کے اصغر بھی روتے تھے

ہلتا تھا خیمہ رانڈوں میں تھی یہ وہ اُڑ دھڑی
آہوں کی بجلیاں تھیں تو اشکوں کی تھی جھڑی

کوئی اُدھر کو غش تھی کوئی تھی اُدھر پڑی
آفت کا وقت تھا تو قیامت کی تھی گھڑی

ماتم تھا یہ حسین کے تازہ جوان کا
جاتا ہے گھر سے جیسے جنازہ جوان کا

یہ رخصت ہونا اکبر کا بابا سے

نکلا حرم سرا سے جو وہ نورِ حق کا نور
خادم نے دی صدا کہ برآمد ہوئے حضور

حضرت کھڑے تھے خیمہ کی ڈیوڑھی کے پاس جا
دستِ ادب کو جوڑ کے بولا وہ ذی شعور

رخصت ہوں اب جو حکم شہ نامدار ہو
رو کر کہا حسین نے اچھا سوار ہو

گھوڑے پہ شاہزادۂ عالم ہوا سوار
گویا چلے جہاد کو محبوبِ کردگار

تھا ثانیِ براقِ فلک سیر راہوار
صرصر سے تند و تیز تو بجلی سے نے قرار

یوں سامنے سے وہ دمِ جواں نکل گیا
گویا ہوا پہ تختِ سلیماں نکل گیا

حضرت تو یاں زمیں پہ گرے تھام کر جگر
جاسوس نے یہ لشکرِ اعدا کو دی خبر

آتا ہے اک جوان حسیں غیرتِ قمر
چہرے پہ جس کے نورِ محمد ہے جلوہ گر

شان و شکوہ سب اسدِ کبریا کی ہے
کہتے ہیں سب بشر نہیں قدرت خدا کی ہے

ہے دھوم ذرہ ذرہ میں اس آفتاب کی
خوشبو ہے زلف و جسم میں مشک و گلاب کی

سر تا قدم ہے شانِ رسالت مآب کی
تصویر ہے رسولِ خدا کے شباب کی

گھوڑے کے گرد جن و ملک کا ہجوم ہے
صلوا علی النبی کی بیاباں میں دھوم ہے

روشن کیا ہے روئے منوّر نے راہ کو
رخ پر نہیں ٹھہرنے کا یارا نگاہ کو

حیراں ہے عقل دیکھ کے زلفِ سیاہ کو
آغوش میں لیے ہے شبِ قدر ماہ کو

چہرے کے نور سے شبِ مہتاب ماند ہے
خالق گواہ ہے کہ اندھیرے کا چاند ہے

یہ ذکر تھا کہ نورِ خدا جلوہ گر ہوا
گویا رسولِ پاک کا رن میں گزر ہوا

چلائے اہلِ شام کہ طالع قمر ہوا
ہنگامِ ظہر تھا پہ گمانِ سحر ہوا

جلوہ دکھایا برقِ تجلی ظہور نے
خورشید کو چھپا دیا چہرے کے نور نے

غش ہو گیا کوئی کوئی گر کر سنبھل گیا
صلِّ علیٰ کسی کی زباں سے نکل گیا

خجلت سے آفتاب کا نقشہ بدل گیا
چمکا جو نور دھوپ کا جوبن بھی ڈھل گیا

دریائے نورِ حق کا فقط اوج موج تھا
سب پست تھے زمیں کے ستارے کا اوج تھا

صحرا کو شمع حسن نے تابندہ کر دیا
جو مردہ دل تھے دم میں انھیں زندہ کر دیا

ذروں کو آفتاب درخشندہ کر دیا
گردوں کو اُس زمین نے شرمندہ کر دیا

پایہ زمیں کا عرش کے ہمدست ہو گیا
جلوے سے اوج کا ہکشاں پست ہو گیا

اللہ رے نبیرۂ مشکلکشا کی شان
تھی جس کے عضو عضو سے پیدا خدا کی شان

حیراں تھے لوگ دیکھ کے اُس مہ لقا کی شان
حمزہ کا رعب و حیدر صفدر کی شان

پاکیزگی نسب میں بزرگی صفات میں
شبیر ہی کلام حسن بات بات میں

کچھ حسن بچپنے کا تو کچھ آمد شباب
وہ گل سا جسم اور وہ چہرے کی آب و تاب

اپنی جگہ یہ خال کے نقطے ہیں انتخاب
پتلی کا نور جن کی سیاہی سے ہے عیاں

گردن کی ضو میں طور تجلی طور کے
سب عضو تن ڈھلے ہوئے سانچے میں نور کے

دل پاک روح پاک نظر پاک جسم پاک
طینت میں آب خلد تھا اور کربلا کی خاک

غرفوں سے جس کے حسن کی حوروں کو جھانک تاک
یوسف جو دیکھ لے تو کہے روح فدا ک

نام اس کا لوح پر جو قلم نے رقم کیا
سو بار پڑھ کے سورۂ نور اس پہ دم کیا

کیا دخل چار ہو جو کسی نے ادب کی آنکھ
رکھتی تھی رعب یہ نہ عجم نہ عرب کی آنکھ

لاکھوں تھے اس طرف پہ جھپکتی تھی سب کی آنکھ
غصہ ستم کا قہر کی چتون غضب کی آنکھ

پانی تھا خوف جاں سے جگر ہر دلیر کا
آہو شکار کرتے تھے میداں میں شیر کا

غل تھا رسول پاک کے ثانی کو دیکھنا
حسن بہار باغ جوانی کو دیکھنا

کھلتے ہیں گل شگفتہ بیانی کو دیکھنا
یہ سب تو ہے پہ غنچہ دہانی کو دیکھنا

نازک لب اس صفت کے دہن اس طریق کا
خاتم پہ جڑ دیا ہے نگینہ عقیق کا

کچھ عمر بھی نہیں ابھی اٹھارواں ہے سال
یہ باغ کس بہار میں ہوتا ہے پائمال

قامت ہے یہ کہ سرو گلستان اعتدال
ماں باپ دیکھ دیکھ کے کیونکر نہ ہوں نہال

آنکھوں کے سامنے جو یہ قامت نہ ہوئے گی
بتلاؤ ماں کے دل پہ قیامت نہ ہوئے گی

زخمی جو ہوگی تیر سے یہ چاندسی جبیں
پٹکے گی سر کو خاک پہ بانوئے دل حزیں

تیغوں سے جب کٹینگے یہ رخسار نازنیں
پیٹینگے دونوں ہاتھوں سے منہ اپنا شاہ دیں

سینہ چھدے پسر کا تو کیا دل کو کل پڑے
ایوب بھی جو ہو تو کلیجا نکل پڑے

ناگاہ فوج کیں سے عمر نے کیا کلام
یہ وقت کا رزار ہے اے ساکنان شام

بس ہے یہی بساط شہنشاہ خاص و عام
مارا گیا یہ شیر تو مر جائیں گے امام

لوٹو جناب فاطمہ زہرا کے باغ کو
ٹھنڈا کرو حسین کے گھر کے چراغ کو

تصویر مصطفےٰ کی مٹائے گا آج جو
کہتا ہوں میں کہ صاحب جاگیر ہوگا وہ

محبوب کبریا کے مشابہ ہے گر تو ہو
اب مصلحت یہی ہے کہ مہلت اُسے نہ دو

ہے اس سے کیا مراد حسیں ہے کہ نیک ہے
دو لاکھ اس طرف ہیں دلاور وہ ایک ہے

دنیا نہ جائے دین کا گر ہو تو ہو ضرر
ٹکڑے کرو اسے کہ یہ دشمن کا ہے پسر

تم آبدیدہ ہو لب خشک اُس کے دیکھ کر
قطرہ نہ دوں میں گھٹنیوں اصغر بھی آئے گر

غیر از یزید اور کوئی حکمراں نہ ہو
اولاد مرتضےٰ میں کسی کا نشاں نہ ہو

ہاں غازیو نہ اس کی جوانی کا غم کرو
نیزے پہ نیزے مارو ستم پر ستم کرو

برچھی اُٹھاؤ ہاتھوں میں تیغیں علم کرو
نخل مراد سبط نبی کو قلم کرو

بیٹا نہ جب رہا تو کدھر جائینگے حسین
گھوڑے سے یہ گرے گا تو مر جائیں گے حسین

چھد جائے گا سناں سے جو اس شیر کا جگر
تڑپیں گے کیا زمیں پہ شہنشاہ بحر و بر

ڈیوڑھی سے ماں پکارے گی ہے ہے مرا پسر
نکلے گی خیمہ گاہ سے زینب برہنہ سر

حضرت تو پیٹتے ہوئے لاشے پہ آئینگے
ہم لوٹنے کو خیمۂ اقدس میں جائیں گے

یہ گلعذار دختر حیدر کی جان ہے
بہنوں کی زندگی ہے برادر کی جان ہے

بابا کی روح ہے تن مادر کی جان ہے
نے جان کرو اسے کہ یہ سب گھر کی جان ہے

جوشن یہی ہے بازوئے برنا و پیر کا
بعد اس کے خاتمہ ہے صغیر و کبیر کا

یہ سُن کے فوج کیں ہوئی آمادۂ نبرد
درِ دلِ حسین کا تھا ایک کو نہ درد

غل سن کے ہو گیا شہِ والا کا رنگ زرد
کانپے جو پاؤں بیٹھ گئے بھر کے آہ سرد

ماں گر پڑی زمیں پہ پھوپھی بلبلا گئی
بدلی ستم کی واں علی اکبر پہ چھا گئی

قرنا پکی سپاہ میں طبل و خا بجا
باندھے پرے سواروں نے بڑھ بڑھ کے جا بجا

پیدل چلے نبرد کو باجے بجا بجا
چلّائے اہلِ بیت کہ ہی ہی یہ کیا بجا

حضرت پکارے لال پہ اعدا کے ریلے ہیں
رانڈو دعا کرو علی اکبر اکیلے ہیں

لڑنے کو اس طرف سے عدو سب کے سٹ بڑھے
تنہا ادھر سے اکبرِ عالی نسب بڑھے

چومے قدم نہیب نے جھک کر یہ جب بڑھے
گویا پئے جہاد امیرِ عرب بڑھے

دہشت سے فوجِ شام کی بدلی سمٹ گئی
قدرت خدا کی دن جو بڑھا رات گھٹ گئی

ڈھالوں کو رکھ کے چہروں پہ گر پڑے حسود
گو تھے کئی ہزار پہ کیا ان کی ہست و بود

تھرّا گیا تمام جنود و سقر و رود
نورِ خدا کے سامنے ظلمت کی کیا نمود

عبرت سپاہِ شام پہ وہ چند ہو گئی
باجوں کی فوجِ کیں کے صدا بند ہو گئی

جرّار کی زرہ پہ لگے جب کئی خدنگ
صفدر نے پڑھ کے فاتحہ لی تیغ شعلہ رنگ

چمکا اک آئنہ کہ ہوئی فوجِ شام دنگ
دکھلائے تیغ تیر نے بجلی کے رنگ ڈھنگ

تھی کس کو تابِ صاعقۂ شعلہ بار کی
یاد آ گئی ہر اک کو چمک ذوالفقار کی

تھم تھم کے یوں گیا صفِ اعدا پہ وہ دلیر
جاتا ہی واں واں کر کے غزالوں پہ جیسے شیر

غازی جو بھوکے پیاس میں تھا زندگی سے سیر
کشتوں کے پشتے ہو گئے دم میں دموں کے ڈھیر

اک سیل زور شور سے آئی گزر گئی
ثابت نہ یہ ہوا صفِ اول کدھر گئی

جب یہ بڑھے لہو تنِ اعدا کا گھٹ گیا
باقی تھا جو حساب تو لاشوں سے پٹ گیا

لشکر میں فرد فرد کا چہرہ جو کٹ گیا
بس دفعۃً سپاہ کا دفتر الٹ گیا

سر داخلِ خزانۂ سرکار ہو گئے
پہلا ہی جائزہ تھا کہ بے کار ہو گئے

چہرے پہ ایک کے نہ بحالی نظر پڑی
جو صف بھری ہوئی تھی وہ خالی نظر پڑی

سر پر سبھوں کے تیغِ ہلالی نظر پڑی
سوے جنوب فوجِ شمالی نظر پڑی

غل تھا کہ تیغ تیز نہیں موت آتی ہے
کیونکر قدم تھمیں کہ زمیں سرکی جاتی ہے

ٹکڑے پڑے تھے خاک پہ بھالے اِدھر اُدھر
چھپتے تھے ڈر کے برچھیوں والے اِدھر اُدھر

پیشِ نظر تھے خون کے تھالے اِدھر اُدھر
ابتر تھے دشت کیں میں رسالے اِدھر اُدھر

ملتا تھا فصل کا نہ ٹھکانا نہ باب کا
شیرازہ کھل گیا تھا ستم کی کتاب کا

بڑھ کر کسی نے وار جو روکا سپر کٹی
چار آئنہ کٹا زرہِ خیرہ سر کٹی

نیزے کی ہر گرہ صفتِ نیشکر کٹی
سینہ کٹا جگر ہوا زخمی کمر کٹی

رہوار بھی دو نیم میانِ مصاف تھا
اِن سب کے بعد مُنہ کو جو دیکھا تو صاف تھا

وہ گھاٹ باڑھ اور وہ اُس کی چمک دمک
کانپی کبھی زمین کبھی تھرّا گئے فلک

شعلہ میں یہ چمک تھی نہ بجلی میں یہ لپک
ہر ضرب میں سما سے تلاطم تھا تا سمک

کو ہن میں حواس بجا تھے نہ ایک کے
گاڑے میں سمٹتی تھی گھٹنوں کو ٹیک کے

سیدھی چلی وہ جب صفِ دشمن اُلٹ گئی
باقی تھی جتنی عمر تہِ تیغ کٹ گئی

اگر زمیں پہ جب سوے گردوں پلٹ گئی
بجلی سے رعد رعد سے بجلی لپٹ گئی

گرتے تھے جن زمین پہ منہ ڈھانپ ڈھانپ کے
ہٹتے تھے جبرئیل امیں کانپ کانپ کے

ملتا نہ تھا صفوں میں علم کا نشاں کہیں
چلّے کہیں تھے شست کہیں اور کماں کہیں

نیزے کہیں تھے ڈانڈ کہیں اور سناں کہیں
جمدھر کہیں کمند کہیں برچھیاں کہیں

اک اک سیاہ رو کا جگر داغ داغ تھا
جنگل تمام ڈھالوں کے پھولوں سے باغ تھا

چکی گری اُٹھی اِدھر آئی اُدھر گئی
خالی کیے پرے تو صفیں خوں میں بھر گئی

کاٹے کبھی قدم کبھی بالائے سر گئی
ندّی غضب کی تھی کہ چڑھی اور اُتر گئی

اِک شور تھا یہ کیا ہے جو قہرِ صمد نہیں
ایسا تو روزِ نیل میں بھی جزر و مد نہیں

سر خود سروں کے چنبر گردن سے اُڑ گئے
ہاتھ آستیں سے اُڑ گئے سر تن سے اُڑ گئے

ڈر ڈر کے سب پرند نشیمن سے اُڑ گئے
پائی جو راہ طائر جاں سن سے اُڑ گئے

تھے قتل عام پر علی اکبر تُلے ہوئے
رستے تھے بند زخموں کے کوچے کھلے ہوئے

اللہ رے دو آبۂ تیغ دو دم کا کاٹ
آفت تھی جس کی باڑھ قیامت تھا جس کا گھاٹ

مقتل سے تا بہ نہر تھا دریائے خوں کا پاٹ
ہر دم تھی اس کو تازہ لہو چاٹنے کی چاٹ

سختی کو جوڑ بند کے کب مانتی تھی وہ
ہر استخواں کو مغز قلم جانتی تھی وہ

آئی جدھر پلٹ کے صفوں کو بچھا گئی
تن سے اُڑا دیا وہیں سر جس کو پا گئی

ہر اک کڑی کو نرم سمجھ کر چبا گئی
فولاد کی زرہ کو اشارے میں کھا گئی

چار آئنہ کا کاٹ اسی پر حوالہ تھا
ذکر اُس کا کیا ہے خود تو منہ کا نوالہ تھا

یا را قرار کا تھا نہ صورت فرار کی
پیدل کی موت تھی تو خرابی سوار کی

روئیں تنوں کو تاب نہ تھی ایک وار کی
ٹکڑے تھے دم کے ہاتھ یہ گھائی تھی چار کی

آگے بڑھے تو منہ وہیں کٹ جائے گیو کا
بجلی کی تھی کڑک کہ طمانچہ تھا دیو کا

اُتری زمیں پہ وہ سر دشمن پہ جب چڑھی
دم بھر میں آب تیغ کی ندی غضب چڑھی

اک شور تھا صفوں میں کہ کب اُتری یہ کب چڑھی
سب کو بخار تیغ سے لرزے کی تب چڑھی

مقتل سے بھاگنے پہ تنک ظرف تُل گئے
کانپے یہ نیزہ باز کہ سب بند کھُل گئے

زندہ کسی کو تیغ دو دم چھوڑتی نہ تھی
پیاسی یہ تھی کہ جسم میں دم چھوڑتی نہ تھی

نے دم لیے گلا کوئی دم چھوڑتی نہ تھی
بھاگیں کہاں کہ موت قدم چھوڑتی نہ تھی

خود وہ دیے جو لڑتے تھے گھوڑوں کو داب کے
بیڑی قدم میں بن گئے حلقے رکاب کے

قعر سقر میں کشتہ ضرب نخست تھے
نے سر ہوئے بہت جو لڑائی میں چست تھے

قبضہ میں تھا نہ زور نہ بازو درست تھے
کھینچیں کسے کمانوں کے بازو بھی سست تھے

ہر کج نہاد تیر اجل کا نشانہ تھا
شانے بھی تھے قلم یہ نیا شاخسانہ تھا

تیغوں کو ڈر کے عربدہ جو پھینکنے لگے
مغفر سروں کے مثل سبو پھینکنے لگے

حلقے کماں کے سب لب جو پھینکنے لگے
تنکا سمجھ کے تیر عدو پھینکنے لگے

ترکش بھی اہل ظلم کے آفت رسیدہ تھے
چلے بھی کش مکش میں کماں سے کشیدہ تھے

کرتے تھے فتح جنگ کو جو ایک آن میں
رعشہ تھا اُن کے ہاتھ میں لکنت زبان میں

اُلجھاتے تھے کمند یکینے کمان میں
ترکش میں تیغیں رکھتے تھے نیزوں کو میان میں

تلوار رکھ کے ہاتھ سے منہ ڈھانپ لیتے تھے
آتی تھی تیغ جب تو سپر پھینک دیتے تھے

بڑھتے تھے جو پرے سے بڑے بول بول کے
پہلے اُنھیں کو مار لیا رول رول کے

حملہ کیا جو تیغ دودم تول تول کے
ہتھیار سب نے پھینک دیئے کھول کھول کے

اس شان سے کبھی نہ عجم نہ عرب لڑے
دو دن کی پیاس میں علی اکبر غضب لڑے

دہشت سے کتنے ڈوب کے دریا میں مر گئے
اس گھاٹ پر جو آئے سو اُن کے اُتر گئے

رستہ تھا ایک اِدھر وہ گئے یا اُدھر گئے
پھر پھر کے ہر طرف سے میان سقر گئے

ناراُن کے اشتیاق میں آب اُن کی آگ میں
پھینکا ہوا نے آب میں پانی نے آگ میں

وہ حرب وہ تہکو وہ شان ہیبری
نعرے وہ زور و شور کے وہ ضربت حیدری

وہ تیغ خونچکاں وہ جلال غضنفری
راکب جو رشک حور تو رہوار بھی پری

چالاک آہوان ختن اس قدر نہ تھے
اُڑ جاتا تھا ہما کی طرح اور پر نہ تھے

باریک جلد وہ کہ نظر آئے تن کا خوں
کُنڈے کو دیکھ کر مہ نو ہوئے سرنگوں

رفتار میں وہ سحر کہ پریوں کو ہو جنوں
غنچے بھی کچھ بڑے ہیں کنوتی کو کیا کہوں

قرباں ہزار جاں فرس بے نظیر پر
سو فار دو چڑھے ہوئے ہیں ایک تیر پر

کوتاہ و گرد و صاف کنوتی کمر کفل
کیا خوشنما کشادگی سینہ و بغل

سیماب کی طرح نہیں آرام ایک پل
پھرتا تھا اس طرح کہ پھرے جس طرح سے کل

راکب نے سانس لی کہ وہ کوسوں روانہ تھا
تار نفس بھی اُس کے لیے تازیانہ تھا

وہ جست و خیز و سرعت و چالاکی سمند
سانچے میں تھے ڈھلے ہوئے سب اس کے جوڑ بند

سُم قرصِ ماہتاب سے روشن ہزار چند
نازک مزاج و شوخ و حشیم و سربلند

گرہل گئی ہوا سے ذرا باگ، اڑ گیا
پتلی سوار کی نہ پھری تھی کہ مڑ گیا

آہو کی جست شیر کی آمد پری کی چال
کبکِ دری خجل دلِ طاؤس پائمال

سبزہ سبک روی میں قدم کے تلے نہال
اک دو قدم میں بھول گئے چوکڑی غزال

جو آگیا قدم کے تلے گرد بر دھا
چھل بل غضب کی تھی کہ چھلاوا بھی گرد تھا

بجلی کبھی بنا کبھی رہوار بن گیا
آیا عرق تو ابرِ گہربار بن گیا

گہ قطب گاہ گنبدِ دوار بن گیا
نقطہ کبھی بنا کبھی پرکار بن گیا

حیراں تھے اُس کے گشت پہ لوگ اُس ہجوم کے
تھوڑی سی جا میں پھرتا تھا کیا جھوم جھوم کے

جب اس جری نے قتل کیے پانچسو جواں
ہر صف سے ہر پرے سے اٹھا شورِ الاماں

چلایا ابن سعد سیہ قلب و سخت جاں
نکلیں وہ دس ہزار کماندار ہیں کہاں

جہان

برچھی کا اب ہی کام نہ تلوار چاہیے
اِس نوجواں پہ تیروں کی بوچھار چاہیے

فاقہ ہے تین روز کا سو لہ پہر کی ہیں
دیکھے نہ بیرہ اسد اللہ کے حواس

دریا سے تم قریب ہو اور اس قدر ہراس
برساؤ تیر دور سے جاؤ نہ اُس کے پاس

بپھرے ہوئے اسد کہیں تلوار کھاتے ہیں
جب اُٹھ سکے نہ شیر تو نزدیک جاتے ہیں

یہ سُن کے تشنہ لب پہ چلے چار سو تیر
پتھر عقب سے پڑنے لگے رو بروسے تیر

آتے تھے فوج فوج سپاہِ عدو سے تیر
سب سرخ تھے شبیہ نبی کے لہو سے تیر

مقتل میں کیا ہجوم تھا اُس نورِ عین پر
پروانے گر رہے تھے چراغِ حسین پر

سینے پہ تیر کھا کے اُٹھایا جو را ہوار
بجلی چمک کے ہو گئی گویا فلک کے پار

سر خاک پر گرانے لگی تیغ آبدار
تیروں کو پھینک پھینک کے بھاگے خطا شعار

حملہ کیا تھا جن پہ رُخ اُن کے تو پھر گئے
پر پہ پلٹ کے برچھیوں والوں میں گر گئے۔

یوں آگیا سناٹوں میں وہ آسمان جناب
ہو جس طرح خطوط شعاعی میں آفتاب

سوکھی زباں میں پڑ گئے کانٹے بغیر آب
طاقت بھی فرطِ ضعف سے دینے لگی جواب

آمد ہوئی جو غش کی سرِ پاک جھک گیا
واحسرتا کہ ہاتھ بھی لڑنے سے رک گیا

اِس حال میں بھی تیغ سے کیں بیچیاں قلم
لیکن جگر پہ لگ گیا اک نیزۂ ستم

زخم جگر سے بہنے لگا خون دم بدم
نکلے ہوئے رکابوں سے تھرّاتے تھے قدم

کھینچا جو اُس نے سینے سے نیزہ کمال کے ساتھ
دو پارۂ جگر نکل آئے سناں کے ساتھ

نیزہ لگا کے بھاگ چلا تھا وہ نابکار
قربانِ جراتِ پسرِ شاہِ نامدار

زخمِ سناں تھا سینۂ انور کے وار پار
ماری شقی کو دوڑ کے اک تیغِ ابدار

پہونچوں سے اُس کے ہاتھ قلم ہو کے گر پڑے
لیکن فرس سے آپ بھی خم ہو کے گر پڑے

گرنا تھا بس کہ سر پہ لگا گرزِ ہی ستم
یوں جھک گئے کہ ہوتے ہیں سجدے میں جیسے خم

رکھدی گلے پہ شیث نے شمشیرِ تیز دم
تلوار اک پڑی کہ ہوئیں پسلیاں قلم

غل تھا کرو نہ رحم تنِ پاش پاش پر
دوڑا دو گھوڑے اکبرِ مہرو کی لاش پر

حضرت کھڑے تھے خیمے کی پچھڑے ہو طناب
سُن کر یہ غل ہی نہ دلِ ناتواں کو تاب

ناگاہ آئی رن سے صدا اے فلک جناب!
بیٹا جہاں سے جاتا ہے اب آیئے شتاب

لاشے پہ ظلم و جور بدافعال کرتے ہیں
گھوڑوں سے اہلِ کیں ہیں پامال کرتے ہیں

سُن کر یہ استغاثۂ فرزندِ خوش خصال
سیدنے آہ کی کہ ہلا عرش ذوالجلال

کھولے جناب فاطمہ کی بیٹیوں نے بال
بانو پکاری خیر تو ہے اے علی کے لال

ہی ہی پسر سے کون سی مادر بچھڑ گئی
صاحب بتاؤ کیا مری بستی اُجڑ گئی

نیزے سے کس کے لال کا زخمی ہوا جگر
کرتے ہیں کس کی لاش کو پامال اہلِ شر

کہتا ہے کون رن میں تڑپ کر پدر پدر
اب گھر سے میں نکلتی ہوں ہے ہے سکینہ کہہ کر

پردا نہ مجھ سے کیجیے سب جانتی ہوں میں
آواز یہ اُسی کی ہے پہچانتی ہوں میں

بانو کو تسمیں دے کے چلے شاہِ نامدار
وہ پیاس اور وہ دھوپ کا صدمہ وہ اضطرار

دل تھا اُلٹ پلٹ تو کلیجہ تھا بے قرار
اُٹھتے تھے اور زمین پہ گرتے تھے بار بار

چلاتے تھے شبیہ کہ اکبر ہم آتے ہیں
گھبرائیو نہ اے علی اکبر ہم آتے ہیں

بیٹا پکار و پھر کہ بصارت میں فرق ہے
اے نورِ عین جسم کی طاقت میں فرق ہے

تم یہ نہ جانیو کہ محبت میں فرق ہے
زخمی ہے قلب روح کی راحت میں فرق ہے

داغِ جگر ملا ہیں گودی میں پال کے
کس کو دکھاؤں اپنا کلیجہ نکال کے

آؤں کدھر کو اے علی اکبر جواب دو
چلا رہی ہے ڈیوڑھی پہ مادر جواب دو

اکبر برائے خالقِ اکبر جواب دو
بیٹا جواب دو مرے دلبر جواب دو

گرتے ہیں ہم ثواب کا ہاتھوں سے کام لو
بیٹا ضعیف باپ کے بازو کو تھام لو

کچھ سوجھتا نہیں میں کدھر جاؤں کیا کروں
اے نورِ چشم تجکو کہاں پاؤں کیا کروں

مضطر ہے جان و دل کسے سمجھاؤں کیا کروں
کیونکر پسر کو ڈھونڈ کے میں لاؤں کیا کروں

پایا تھا مدتوں میں جسے خاک چھان کے
وہ لعل ہم نے کھویا جنگل میں آن کے

بس اب خبر حسین کی لے جلد اے اجل
اے جسمِ زار زیست کا باقی نہیں محل

اے جانِ ناتواں تنِ مجروح سے نکل
ہاں اے نفس چھری کی طرح سے گلے پہ چل

چھوٹے نہ اس کا ہاتھ جو پیری کی آس ہو
لاشہ بھی لاشۂ علی اکبر کے پاس ہو

جنگل سے نے ہوا اس پھرے نہر پر گئے
واں بھی جو وہ گہر نہ ملا سوے بر گئے

دوڑے کسی طرف تو کسی جا ٹھہر گئے
تھالے ملے لہو کے برابر جدھر گئے

ٹپکا ہوا زمیں پہ جگر کا لہو ملا
لیکن کہیں نہ وہ پسرِ ماہرو ملا

جا کر صفوں کے پاس پکارے بااشک و آہ
ہے کس طرف مرے علی اکبر کی قتل گاہ

اے ظالمو یہ شب ہے کہ دن ہو گیا سیاہ
کس ابر میں چھپا ہے مرا چودھویں کا ماہ

بتلاؤ جان ہے کہ نہیں جسم زار میں
زخمی پڑا ہے شیر مرا کس کچھار میں ؟

لاش پسر کو ڈھونڈھتے تھے شاہ بحر و بر
پلٹنے کی جا ہی کہ ہنستے تھے اہلِ شر

کہتا تھا شمر ای پسرِ سید البشر
کس کو حضور ڈھونڈھتے ہیں مر گیا پسر

خود ڈھونڈھ لیجیے جسدِ پاش پاش کو
بتلائینگے نہ ہم علی اکبر کی لاش کو

یہ سُن کے کھینچ لی شہِ والا نے ذوالفقار
چمکی جو برقِ تیغ تو بھاگے ستم شعار

شہ کو نظر پڑا علی اکبر کا راہوار
چلائے ای عقاب کدھر ہی ترا سوار

دکھلادے مجکو لاش مرے نورِ عین کی
کس دشت میں پڑی ہی بضاعت حسین کی

ملنے دے اِن کا بوں کے حلقوں سے چشمِ نم
ہی ہی اسی میں تھے مرے فرزند کے قدم

بوسے تری لگام کے لوں میں اسیرِ غم
اکبر کے ہاتھ میں تھی یہی باگ ہی ستم

ہی ہی وہ ہاتھ پاؤں مرے آفتاب کے
قرباں تری لگام کے صدقے رکاب کے

گھوڑے نے ہنہنا کے سوئے دشت کی نظر
یعنی کہ لاش آپکے پیارے کی ہی ادھر

جاتا تھا آگے آگے وہ تازی بچشمِ تر
گھوڑے کے پیچھے پیچھے تھے سلطانِ بحر و بر

جنگل میں لاشۂ پسرِ نوجواں ملا
وہ مہ لقا ملا تو مگر نیم جاں ملا

دیکھی عجیب حالتِ فرزندِ نوجواں
پیکاں گلے میں ہونٹوں پہ نکلی ہوئی زباں

تن پہ جراحتِ تبر و خنجر و سناں
گردن تھی کج پھری ہوئی آنکھوں کی پتلیاں

ٹاپوں سے مرکبوں کی جراحت پھٹے ہوئے
چہرہ سفید خاک میں گیسو اٹے ہوئے

ہچکی کے ساتھ کہتے ہیں ڈھا کے چشمِ تر
ای جانِ جسمِ زار میں او رایک دم ٹھہر

ای موت نے وطن کی جوانی پہ رحم کر
ای درد تھم ذرا کہ پھٹا جاتا ہی جگر

پھر ایک بار سیدِ والا کو دیکھ لوں
مہلت بس اتنی دے کہ میں بابا کو دیکھ لوں

دشمن کو بھی نہ بیٹے کا لاشہ کبھی دکھائے
حضرت زمیں پہ گر کے پکارے کہ ہائے ہائے

زندہ رہے یہ پیر جواں یوں جہاں سے جائے
ای لالِ بیکسی کے فاقہ میں زخم کھائے

شاید جگر کے زخم سے تم بے قرار ہو
زخمی تمھاری چھاتی پہ بابا نثار ہو

کیوں کھینچتے ہو پاؤں کو اے میرے گلعذار
کیوں ہاتھ اُٹھا اُٹھا کے پٹکتے ہو بار بار

آنکھیں تو کھول دو کہ مرا دل ہے بے قرار
بیٹا تمھاری ماں کو تمھارا ہے انتظار

بہنیں کھڑی ہیں در پہ بڑے اشتیاق میں
اکبر تمھاری ماں نہ جیے گی فراق میں

غش میں سنا جو ہیں علی اکبر نے ماں کا نام
کس یاس کی نگاہ سے دیکھا سوے خیام

سوکھی زباں دکھا کے یہ بولا وہ تشنہ کام
شدت یہ پیاس کی ہے کہ دشوار ہے کلام

اب اور کوئی دم کا پسر مہمان ہے
امداد یا حسین کہ پانی میں جان ہے

فرمایا شہ نے اے علی اکبر میں کیا کروں
پانی نہیں ہے مجکو میسر میں کیا کروں

گھیرے ہیں نہر کو یہ ستمگر میں کیا کروں
کچھ بس نہیں مرا مرے دلبر میں کیا کروں

اعدا نہ دینگے بوند اگر لاکھ کد کریں
بیٹا تمھاری ساقی کوثر مدد کریں

حضرت یہ کہتے تھے کہ چلا خلق سے پسر
اتنی زباں ہلی کہ خدا حافظ اے پدر

ہچکی جو آئی تھام لیا ہاتھوں سے جگر
اُنگڑائی لے کے رکھدیا شہ کے قدم پہ سر

آباد گھر لٹا شہِ والا کے سامنے
بیٹے کا دم نکل گیا بابا کے سامنے

لکھتا ہے ایک راوی غمگین و پُر ملال
یعنی اِدھر ہوا علی اکبر کا انتقال

نکلی حرم سے ایک زنِ فاطمہ جمال
گویا جناب سیدہ کھولے ہوئے تھیں بال

تھی اِس طرح سے رُخ پہ ضیا اُس جناب کے
حلقہ ہو جیسے نور کا گرد آفتاب کے

چلاتی تھی ارے پیارا ہے کس طرف
اے آسماں وہ عرش کا تارا ہے کس طرف

اے ابر شام چاند ہمارا ہے کس طرف
اے ارض کربلا وہ سدھارا ہے کس طرف

ہے ہے سناں سے جان گئی میہمان کی
میت کدھر کو ہے مرے کڑیل جوان کی

اے مے لبے گیسوؤں والے کدھر ہے تو
ہے ہے مرے غریبی کے پالے کدھر ہے تو

داری کہاں لگے تجھے بھالے کدھر ہے تو
کیونکر پھوپھی جگر کو سنبھالے کدھر ہے تو

اٹھارھواں برس تھا کہ موت آگئی تجھے
اے نورِ عین کس کی نظر کھا گئی تجھے

ہی ہی مرے سعید و رشید و متین جواں
خوش رو جوان غریب جواں مہ جبیں جواں

صفدر جواں شکیل جواں نازنیں جواں
کس نے تجھے مروڑ لیا اے حسیں جواں

آغاز تھیں میں ابھی ایسے مسن نہ تھے
بچے مرے ابھی ترے مرنے کے دن نہ تھے

یہ بین کرتی جاتی تھی وہ سوختہ جگر
سیدانیوں کا غول تھا پیچھے برہنہ سر

جاتی تھی بے حواس ادھر سے وہ نوحہ گر
آئے اُدھر سے لاش لیے شاہ بحر و بر

دیکھا لہو رواں جو تن پاش پاش سے
سب بی بیاں لپٹ گئیں اکبر کی لاش سے

ہاں شاہ دیں کے تعزیہ دارو بکا کرو
ہاں اے ع کے دوست کے پیارو بکا کرو

ماتم میں ہاتھ سینہ پہ مارو بکا کرو
اکبر جہاں سے اُٹھ گئے یارو بکا کرو

سمجھو شریک بزم شہ مشرقین کو
دے لو جوان بیٹے کا پرسا حسین کو

اولاد والو درد کرو شہ کے دل کا یاد
نہ آج کی خبر ہی نہ ہی کل کا اعتماد

کیسے تڑپتے ہوئینگے شبیر خوش نہاد
بیٹا جہاں سے اُٹھ گیا ناشاد و نامراد

خوش رو تھے خوش مزاج تھے شیریں بیان تھے
پیتو جوانو اکبر مہرو جوان تھے

ہی ہی حسین آپ کا دلبر بچھڑ گیا
فریاد ہی شبیہ پیمبر بچھڑ گیا

واحیف و اویلا و دریغ و لا و ور بچھڑ گیا
درداو حسرتا علی اکبر بچھڑ گیا

مظلومیت پہ تشنہ دہانی پہ روئینگے
جب تک جئیں گے اُس کی جوانی پہ روئینگے

آقا انیس ہند میں کب تک پھرے تباہ
گھٹتی ہی عمر بڑھتے چلے جاتے ہیں گناہ

ضعف اس برس بہت ہی اجل آ نہ جائے آہ
بلوائیے غلام کو اے میرے بادشاہ

قرب مزار شاہ دو عالم نصیب ہو
بس کربلا میں ایکی محرم نصیب ہو

مرثیہ ۱۴

طے کر چکے حسین جو راہِ نواب کو
مقتل نظر پڑا شہِ گردوں کاب کو

الفت جواں کی خاک سے تھی اس جناب کو
اِک عید ہو گئی خلفِ بوتراب کو

دل مثلِ غنچہ واں کی ہوا کھا کے کھل گیا
رستہ ریاضِ خلد میں جانے کا مل گیا

صحرا پہ ہر طرف شہِ دیں نے نگاہ کی
سب تھم گئی سپاہ شہِ کم سپاہ کی

فرمایا آج چھٹ گئے ایذا سے راہ کی
ہاں اب کرو پسند جگہ خیمہ گاہ کی

آگے کہیں جائینگے اس ارضِ پاک سے
الفت ہماری خاک کو ہے یاں کی خاک سے

مشتاق اس نواح کا تھا فاطمہ کا لال
رہتا تھا خواب میں بھی اسی دشت کا خیال

آفاق میں یہ ارضِ مقدس ہے بے مثال
سبزہ یہاں کا رحمتِ خالق سے ہے نہال

ابتک کسی صدف کو نہ ایسے گہر ملے
گردوں کو ایک اس کو بہتر قمر ملے

شکرِ خدا کہ رنجِ سفر سے ہوا فراغ
غربت کے اشتیاق میں بھولا وطن کا داغ

خاطر شگفتہ ہو گئی اور دل ہے باغ باغ
طبقہ یہ حشر تک نہیں ہونے کا بے چراغ

حاصل ملے گا حشر میں اس کارِ وکشت کا
روئے زمیں پہ ہے یہی ٹکڑا بہشت کا

عالم میں قدر و منزلت اس کی سوا ہوئی
گر داس کی بہر چشمِ ملک توتیا ہوئی

ہر درد کی خدا کے کرم سے دوا ہوئی
یہ خاکِ پاک آج سے خاکِ شفا ہوئی

تیغِ عذابِ حق سے لحد میں پناہ ہو
طوفاں میں پاس ہو تو نہ کشتی تباہ ہو

کی سرورِ بوستانِ حسن نے یہ گفتگو
آتی ہے اس زمیں کے گلوں سے دلہن کی بو

اکبر یہ بولے تھی ہمیں صحرا کی آرزو
عباس سے یہ کہنے لگے شاہِ نیک خو

ہاں کونسی جگہ تمھیں بھائی پسند ہے
اُس شیر نے کہا کہ ترائی پسند ہے

دریا کو دیکھ دیکھ کے لہرا رہا ہے دل
پانی بھی خوشگوار ہوا بھی ہے معتدل

مولا قدم پکڑتی ہے کچھ یاں کی آب و گل
بہتر ہے گر خیام ہوں ساحل کے متصل

پانی سے ہاتھ منہ کو نہ زنہار دھوئیں گے
جاگے بہت ہیں پانوں کو پھیلا کے سوئیں گے

فرمایا شہ نے خیر جو اللہ کی رضا
موقع ہو جس جگہ وہیں خیمہ کرو بپا

آرام سے غریب مسافر کو کام کیا
رہتے ہیں دھوپ میں بھی بہت بندۂ خدا

دو چار دن میں عمر کی مدت تمام ہے
میداں سے پھر غرض ہے نہ دریا سے کام ہے

زینب نے جب یہ سرورِ دیں سے سنا کلام
محمل سے یوں پکاری کلیجے کو تھام تھام

کیوں چلتے چلتے آپ نے یاں روک لی لگام
بھیا اِدھر تو آؤ یہ ہے کونسا مقام

بستی بھی ہے کوئی کہ یہی ایک نہر ہے
اس دشت پُرخطر میں اُترنا تو ہے

جنگل میں ہے بشر کے لیے سو طرح کا ڈر
اٹھتے ہیں بار بار بگولے اِدھر اُدھر

دن کٹ گیا تو ہوئے گی شب کس طرح بسر
لشکر میں غل ہے گا درندوں کا رات بھر

بچے بھی مارے ہول کے تر ہیں پسینے میں
میرا تو دل ابھی سے اُچھلتا ہے سینے میں

اس سرزمیں کے گل نظر آتے ہیں مجھکو خار
نشتر سے کم نہیں گلِ جاں کو یہ برگ و بار

یہ باد تند تیر سی ہوتی ہے دل کے پار
اس بن کی خاک سے مری خاطر ہے غبار

کیا رنگ آگے دیکھیے قسمت دکھاتی ہے
یاں کی زمیں سے خون کی بو مجھکو آتی ہے

لوگو مجھے بتاؤ یہ دریا ہے یا سراب
کاسے سروں کے ہیں کہ یہ ہیں ساغرِ حباب

موجوں کو دیکھ دیکھ کے ہے دل کو پیچ و تاب
ڈوبا ہے کون شور ہے کیسا میانِ آب

دھاریں لہو کی مل گئیں دریا کی موج میں
لہریں یہ ہیں کہ چلتی ہیں تلواریں فوج میں

پوچھو کسی سے مسلمِ مظلوم کی خبر
تربت مرے غریب مسافر کی ہے جدھر

بچوں کے اُس کے کیا یہیں کاٹے گئے ہیں سر
لاشے بہا دے اُسی دریا میں کھینچ کر

رنج و غم و الم کی گھٹا دل پہ چھائی ہے
اماں کے پیٹنے کی صدا مجھکو آئی ہے

یوں نہر کی ترائی میں کوئی ہو نوحہ گر
مرتا ہو جس طرح سے کسی کا جواں پسر

صاف آتی ہو صدا کہ خدا تجھ پہ ہو پدر
یاں سوے گا تو اے مرے عباس نامور

وسواس کا مقام ہو جاگہ قلق کی ہو
پہچانتی ہوں میں یہ صدا شبیرِ حق کی ہو

غش کھا کے اب میں گرتی ہوں تجھ میں نہیں حواس
عباس کو بلاؤ کہ آئین ہن کے پاس

اصغر بلک رہا ہو سکینہ کو ہو ہراس
خیمے یہاں ہوئے تو ہوئی زندگی یاس

نقشہ وہ پھر گیا مری چشمِ پُرآب میں
ایسا ہی دشت تھا جسے دیکھا تھا خواب میں

آنکھوں میں اشک بھر کے یہ بولے شہِ زمن
اُترو یہیں کہ خوف کی جاگہ نہیں ہن

یہ نہر علقمہ ہو یہ کربلا کا بن
آئے اسی کے شوق میں ہم چھوڑ کر وطن

رہنے میں اس جگہ کے ضرر کیا فقیر کا
خیمہ یہاں ہوا تھا جنابِ امیر کا

کچھ مال و زر نہیں کہ تلف کا ہو جس کے ڈر
یکساں ہو نے وطن کے لیے شہر و دشت و بر

مسکن یہی نہ میں سے یہی نے گھروں کا گھر
کیا جانیں اس مقام سے ہو کس طرف سفر

انساں کو چاہیے کہ گناہوں سے پاک ہو
شاید ہماری خاک اسی بن کی خاک ہو

یہ سُن کے بنت فاطمہ نے کی جگر سے آہ
بولیں پہ کربلا ہی تو لو ہم ہوئے تباہ

ہی ہی حسین کو نہ ملے گی کہیں پناہ
ڈونگے گا بحرِ خوں میں دو عالم کا بادشاہ

سر پر اُڑاؤ بیبیو اس سرزمیں کی خاک
شیشے میں رکھ گئے ہیں محمد یہیں کی خاک

اُترے فرس سے حضرتِ عباسِ نیک نام
بٹھلائے اونٹ خیمے کے سب کھینچ کر زمام

فراش چاہتے تھے کہ برپا کریں خیام
تلواریں کھینچے گھاٹ پہ آپہونچی فوجِ شام

زینب کے دل پہ ظلم کی شمشیر پھر گئی
شہ کی نظر میں موت کی تصویر پھر گئی

گھوڑا بڑھا بڑھا کے لعینوں نے یہ کہا
بتلاؤ کس نے حکم اُترنے کا یاں دیا

ہٹ جاؤ ابنِ سعد کے خیمے کی ہو یہ جا
ڈھونڈو کنوئیں کہیں تمھیں دریا سے کام کیا

گرمی میں بند ہووے گا پانی امام پر
ہو گا نہ کل ہوا کا گزر اس مقام پر

چھپ جائے گی سپاہ کی کثرت سے زمیں
موسم وہ ہے کہ اُتریں گے سب نہر کے قریں

دریا بھی سوکھ جائے تو اُس کا عجب نہیں
جلدی کنارہ کش ہوں گے سنتے ہی شاہ دیں

دُنیا میں آج شام کے حاکم کا زور ہے
یاں دوپہر سے شمر کے آنے کا شور ہے

برہم ہوئے یہ سُنتے ہی عباس خوش خصال
غازی کو شیرِ حق کی طرح آگیا جلال

قبضہ پہ ہاتھ رکھ کے یہ بولا علی کا لال
اب یاں سے ہم کو کوئی ہٹا دے یہ کیا مجال

حملہ کریں چڑھا کے اگر آستین کو
ہم آسماں سمیت اُلٹ دیں زمین کو

دیکھیں ہٹا لو دو نہیں ہٹنے کے یاں سے ہم
برپا کریں گے اب تو یہیں خیمۂ حرم

گرواں بہت ہے فوج تو ہم بھی نہیں ہیں کم
آلِ نبی بڑھا کے ہٹاتے نہیں قدم

ہم اور خوفِ جان سے لڑائی کو چھوڑ دیں
دیکھا نہیں کہ شیر ترائی کو چھوڑ دیں

گو فوج کم امامِ دلاور کے ساتھ ہے
روحِ رسول نائبِ حیدر کے ساتھ ہے

عباس سا غلام برادر کے ساتھ ہے
لاکھوں تو لے سکیں یہ زمیں کے ساتھ ہے

غصّے کے وقت جاں کو نہیں جاں سمجھتے ہیں
ہم ایک اور لاکھ کو یکساں سمجھتے ہیں

یاں سے کہیں بتول کا پیارا نہ جائے گا
ہم وہ نہیں کہ جان کو وارا نہ جائے گا

لاشہ بھی اُٹھ کے یاں سے ہمارا نہ جائیگا
مر کر بھی ہاتھ سے یہ کنارا نہ جائے گا

رکھتے ہیں اس زمیں کے لیے سر کو ہات پر
قبضہ ہے تا بحشر ہمارا فرات پر

اعدا پکارے تب کہ نہ مانینگے ہم یہ بات
اُترے گی آکے فوج ہماری لبِ فرات

بولا یہ سُن کے بازوے سلطانِ کائنات
ہٹ جاؤ میرا ہاتھ ہے دستِ خدا کا ہات

کیا تم کو ضربِ تیغ علی کی خبر نہیں
آگے بڑھا قدم تو کسی تن پہ سر نہیں

ہٹ ہٹ کے کھینچنے لگے تیغوں کو اہلِ شر
عباس نے بھی رکھ دیا قبضہ پہ ہاتھ اِدھر

زینب پکاری پیٹ کے مُنھ سے ردا سر
بھائی خدا کے واسطے بھائی کی لو خبر

للہ شیرِ بیشۂ حیدر کو روکیے
تلواریں کھنچ گئی ہیں برادر کو روکیے

عباس کو یہ بڑھ کے پکارے شہِ اُمم
کھینچو نہ تیغ روحِ علی کی تمھیں قسم

اچھا کنارِ نہر رہیں بانیِ ستم
خیمہ کرینگے اور کہیں یاں سے جا کے ہم

پہلے کرو وہ کام کہ جو فرضِ عین ہو
نے چین ہوں تو ہم ہوں اُمت کو چین ہو

غصّہ یہ کس پہ میری طرف تم کرو نظر
تم کو ہٹا سکے کوئی کس کا ہی یہ جگر

پہچانتے نہیں تھیں بھائی یہ اہلِ شر
جانے دو آؤ دور کرو دھیان ہی کدھر

منظور ناولیوں کو ہی پانی کا آسرا
کوثر ہی اپنی تشنہ دہانی کا آسرا

بیکس ہیں ہم کو تیغ پکڑنا نہ چاہیئے
غربت میں قافلے سے بچھڑنا نہ چاہیئے

گر جان پر بنے تو بگڑنا نہ چاہیئے
اُمت سے نانا جان کی لڑنا نہ چاہیئے

شکلِ حباب خلق میں آخر فنا تو ہی
دریا اگر قریب نہ ہوگا خدا تو ہی

کیوں کانپتے ہو غیظ سے ابرو پہ کیوں ہو بل
مالک ہو تم تمھارا ہی دریا یہ ہی عمل

ہمت میں فرق کچھ نہ شجاعت میں ہی خلل
غصّہ کو تھام لو یہ نہیں جنگ کا محل

مانو مرا کہا میں تمھارا امام ہوں
غازی نے سر جھکا کے کہا میں غلام ہوں

سمعاً و طاعتاً نہیں طاقت کہ دوں جواب
ذرّے کو تاب کیا ہی بھلا پیشِ آفتاب

بخشی ہی عزت آپ نے اے آسماں جناب
ہٹتا نہ اس نمیں سے کبھی ابنِ بوتراب

ارشاد ہو جو کچھ مرے حق میں قبول ہی
حکمِ حضور حکمِ خدا و رسول ہی

بندہ ہوں جاں نثار ہوں یا شاہ بحر و بر
مولا عدول حکمی کی کیا تاب کیا جگر

دیدیں گر اُن کو آپ مرے ہاتھ باندھ کر
ہمراہ ہوں غلام کی صورت جھکا کے سر

گر یہ بدی کریں نہ شہِ کائنات سے
سر اپنا کاٹ دوں میں انھیں اپنے ہات سے

فرمایا شہ نے میں ترے ہاتوں کے ہوں نثار
سر میرا تیرے سر پہ تصدق ہزار بار

ہی ابنِ فاطمہ کی کمر تجھ سے استوار
بولا وہ باوفا کہ غلامی ہی افتخار

ہاں یہ ملال ہی کہ سر اُن کے کٹے نہیں
تینوں کے سامنے سے کبھی ہم ہٹے نہیں

حضرت کے حکم سے تو لیا میں نے ہاتھ تھام
ہٹ جائیں پہلے یہ تو ہٹے آپ کا غلام

حضرت نے ہاتھ اُٹھا کے کہا اے سپاہِ شام
ہٹ جاؤ ورنہ سب ابھی ہو جاؤ گے تمام

لاکھوں ہو گر تو ہو اسے ٹوکا نہ جائے گا
بگڑے گا پھر یہ شیر تو روکا نہ جائے گا

جس وقت یہ سُنے شہِ ذی جاہ کے کلام
پسپا ہوئی سمجھ کے غنیمت سپاہِ شام

بھائی کو ساتھ لیکے پھرے سید الانام
سر کو جھکا کے رہ گئے عباس نیک نام

کہتے تھے راہ میں کہ نہ وار اپنا چل گیا
افسوس ہے کہ ہاتھ سے دریا نکل گیا

وقت ایسا اب نہ آئے گا یا سیدِ اُمم
گرمی میں پیاس لگتی ہے بچوں کو دم بدم

پانی بھی چھا گلوں میں بہت رہ گیا ہے کم
فرمایا شہ نے چاہیئے اللہ کا کرم

پانی کے بند کرنے پہ وہ ہیں تُلے ہوئے
جنت کے در ہماری طرف ہیں کھلے ہوئے

یہ کہہ کے آیا دھوپ میں زہرا کا آفتاب
برپا ہوئے خیامِ امامِ فلک جناب

حقا تھی موجِ رحمتِ حق جس کی ہر طناب
نے چوبۂ فلک نظر آنے لگا حباب

صحن اُس کا سب بتول کے پیاروں سے بھر گیا
اِک آسمان تھا کہ ستاروں سے بھر گیا

خیمہ میں اُترے یاں تو شہِ عرش بارگاہ
آ آ کے اُس طرف بھی اُترنے لگی سپاہ

کوسوں علم کھلے تھے جدھر کیجیے نگاہ
یاں تک کہ بند ہو گئی چاروں طرف سے راہ

فوجوں سے تا بہ صبح زمیں رن کی بھر گئی
اِک رات میں چڑھی ہوئی ندی اُتر گئی

اِس کثرتِ سپاہ پہ ناگہ ہوئی یہ دھوم
آ پہونچا شام سے پسرِ سعد نحس و شوم

جس کے جلو میں لاکھ سواروں کا ہے ہجوم
اکثر ہیں یکہ تاز جوانانِ شام و روم

بس کھل گیا نہ طورِ صفائی کا ہوئے گا
اب کل سے بند و بست لڑائی کا ہوئے گا

یہ ذکر تھا کہ دور سے ظاہر ہوئے نشان
اُمڈا زمیں پہ ظلم کا دریائے بے کراں

موجوں کی طرح سب تھیں صفیں پیش و پس رواں
لہراتے تھے ہوا سے علم مثلِ بادباں

ہلتا تھا دشت کیں دہل اس طرح بجتے تھے
باجوں کا تھا یہ شور کہ بادل گرجتے تھے

جنگی وہ رومیوں کے پرے شامیوں کے دل
خوفِ خدا نہ جن کو نہ اندیشۂ اجل

مکار و اہلِ نار و دغا باز پُر دغل
شکلیں مہیب دیو سے قد ابروؤں پہ بل

بدخواہِ خاندانِ رسالت پناہ تھے
ایسے جلے ہوئے تھے کہ پہرے سیاہ تھے

تلواریں کھینچے بڑھ کے جمے دو طرف سوار
غل ہو گیا سلامی کے باجوں کا ایک بار

ڈنکے کی دم بدم تھی صدا آسماں کے پار
آگے بڑھے چلو یہ نقیبوں کی تھی پکار

گھوڑوں پہ گرد و پیش رئیسانِ شام تھے
زریں کمر جلو میں کئی سو غلام تھے

اُترا قریبِ خیمہ فرس سے وہ خیرہ سر
سر پہ لگا یا دوڑ کے خادم نے چترِ زر

پہلے تو اپنی فوج پہ ظالم نے کی نظر
بولا کسی سے پھر وہ سوئے نہر دیکھ کر

خیمہ ہے کس طرف کو شہِ خوش خصال کا
دریا پہ تو عمل نہیں زہرا کے لال کا

خولی نے تب کہا کہ ہماری طرف ہے نہر
آئے تھے یاں اُترنے کی خاطر امامِ دہر

فرماتے تھے یہ نہر تو ہے میری ماں کا مہر
ہم نے اُٹھا دیا اُنھیں لیکن بہ جبر و قہر

عباس مستعد تھے سبھوں سے لڑائی کو
شبّیر پھیر لے گئے سمجھا کے بھائی کو

وہ دھوپ میں ہے خیمۂ زرنگارِ حسین
راحت نہ رات کو ہے کوئی دم نہ دن کو چین

پہروں علی کی بیٹیاں روتی ہیں کر کے بین
آفت میں مبتلا ہے محمد کا نورِ عین

بچوں کی مارے پیاس کے حالت عجیب ہے
خیمہ نہ سایہ میں ہے نہ دریا قریب ہے

بولا شقی کہ کتنی ہے فوجِ شہِ اُمم
سُنتے تھے واں سپاہِ حسینی کی حوم ہم

اُس نے کہا حسین کے یاور بہت ہیں کم
فاقوں کے مارے دم میں کسی کے نہیں ہے دم

ایسی نہ فوج کچھ ہے نہ ایسے نشان ہیں
میں نے تو خود گنا ہے کیا اسّی جوان ہیں

ہے ایک علم یہ قلّتِ لشکر کا ہے نشاں
یہ حال ہے لُٹا ہوا جیسے ہو کارواں

اُردو میں جنسِ غم کے سوا جنس ہے گراں
غلہ کی یہ کمی ہے کہ ہے قحطِ آب و نان

اسوار بھی قلیل پیادے بھی تھوڑے ہیں
کل سترہ تو اونٹ ہیں اور بیس گھوڑے ہیں

مطبخ ہی سرد آگ کا اُس میں نہیں ہے نام
بچے ہوئے گرم سے بے تاب ہیں تمام

خاک آبدار خانے میں اُڑتی ہے صبح و شام
کیونکر لڑینگے بیکس و مظلوم و تشنہ کام

یاں سیکڑوں کمانیں ہیں فوجِ امیر میں
دو دو گرینگے خاک پہ ایک ایک تیر میں

یہ سب غلط سُنا تھا کہ ہے لشکرِ کثیر
کچھ نوجوان ہیں طفل ہیں کچھ اور کچھ ہیں پیر

ہیں اُن میں سات آٹھ تو لڑکے کئی صغیر
بس جانینگے دو ٹاپوں سے ہنگامِ دار و گیر

کیا چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی طاقت دکھائینگے
اُن سے تو نیچے بھی سنبھالے نہ جائینگے

کیا جانے دل میں سوچے تھے کیا شاہِ کربلا
مقتل میں کھینچکر اُنھیں لے آئی ہے قضا

لشکر تو یہ قلیل اور اس فوج سے وغا
عمریں ہیں چھوٹی چھوٹی بھلا وہ لڑینگے کیا

کچھ آزمودہ کار نہیں کچھ سُن نہیں
اُن کے ابھی تو گھر سے نکلنے کے دن نہیں

ہم سِن سکل مصطفےٰ کو تو اٹھارھواں ہے سال
تیرہ برس کا ہے ابھی شبّر کا نونہال

نو دس برس کے ہوئینگے زینب کے دونوں لال
ہاں اک جواں ہیں حضرتِ عباس خوش خصال

چھوٹے ہیں اور سب کوئی ان میں جواں نہیں
خط اک طرف میں بھی کسی کی عیاں نہیں

سُنتا ہوں میں ہیں دو پسر شاہِ نامدار
بیمار اُن میں ایک ہے اور ایک شیر خوار

زینب کے دو ہیں تین حسن کے ہیں گلعذار
دس ہیں عقیل و مسلم و حیدر کے یادگار

زہرا کے جان و دل ہیں محمد کے پیارے ہیں
بیسترہ تو چاند ہیں باقی ستارے ہیں

بتیس سب سوار شہ دیں کے پاس ہیں
اب رہ گئے پیادے سو دو کم پچاس ہیں

آفت میں مبتلا ہیں مگر باحواس ہیں
غازی ہیں سرفروش ہیں اور حق شناس ہیں

کھانے کا ہے خیال نہ پانی کی فکر ہے
سجدے ہیں اور دعائیں ہیں اور حق کا ذکر ہے

بولا وہ تب کہ ہونگے جواں لاکھ کی ہزار
خولی نے کی یہ عرض کہ ممکن نہیں شمار

ہیں تین چار کوس کے گرد و پیش سب سوار
ایک ایک جواں ہے رستمِ میدانِ کارزار

کیا کوئی لڑ سکے گا قیامت کی فوج ہے
لشکر کی ہیں صفیں کہ سمندر کی موج ہے

پیدل ہیں اک طرف تو رسالے ہیں اک طرف
خنجر ہیں ایک سمت تو بھالے ہیں اک طرف

جانباز ہاتھ قبضوں پہ دالے ہیں اک طرف
اور دس ہزار برچھیوں والے ہیں اک طرف

سب لوگ فکرِ قتلِ شہنشاہِ دیں میں ہیں
کھینچے ہوئے کمانوں کو سرکش کمیں میں ہیں

ہاتھوں میں پہلوانوں کے ہیں گرز گاؤ سر
ضربت سے جن کے ٹوٹتی ہے کوہ کی کمر

ہر جا بچھی ہوئی ہیں کمندیں اِدھر اُدھر
کالی گھٹا سی چھائی ہے ڈھالوں کی ہر طرف

سب لوگ جا بجا پئے قتل و ستیز ہیں
تیغیں بھی ہیں اوپی ہوئی خنجر بھی تیز ہیں

بھالا ہلا کے کوئی یہ کہتا ہے بار بار
نوکِ اس کی سینۂ علی اکبر کے ہوگی پار

کہتا ہے کس غرور سے اک شام کا سوار
آئے تو رن میں حضرتِ شبر کا یادگار

اب کوئی دم میں گھر کی صفائی ہے
تلوار آج زہر میں میں نے بجھائی ہے

تیغا اُٹھا کے کوئی یہ کہتا ہے بد مزاج
قیمت ہے اُس کی شام کا اور روم کا خراج

دریا پہ اُن کو لائے تو پانی کی احتیاج
عباسؓ نامدار کے کاٹوں گا ہاتھ آج

جب دولتِ علی کو قضا لوٹ جائے گی
فرزندِ فاطمہ کی کمر ٹوٹ جائے گی

کہتا ہے کوئی تیر کو چلّے میں جوڑ کے
گزرے گا یہ گلا علی اصغر کا توڑ کے

سوئیں گے جب زمین پہ جھولے کو چھوڑ کے
دونوں کڑے اُتاروں گا پہونچے مروڑ کے

اصغر کا طوق اپنے پسر کو پہناؤں گا
سوغات کربلا سے یہی لیکے جاؤں گا

سُنتا تھا میں کہ کہتا تھا اک شخص برملا
گھوڑے سے جب گرینگے شہنشاہ کربلا

جو فاطمہ کے دودھ کی دھاروں سے ہے پلا
چھاتی پہ چڑھ کے کاٹوں گا اُس شاہ کا گلا

وارث نہ کوئی ہوئے گا سیّد کی لاش کا
لوٹوں گا سب لباس تنِ پاش پاش کا

کوفے کے لوگ کرتے ہیں آپس میں سیخن
اب بعدِ فتح بازوئے زینب ہے اور رسن

سر پر ردا نہ ہوگی کہ بھائی کو دے کفن
خیمہ جلا کے لوٹیں گے اسبابِ پنجتن

ہے آرزو کہ دولتِ آلِ عبا ملے
دیکھیں کسے علی کی لہو کی ردا ملے

بولا خبر یہ سُن کے وہ بانیِ ظلم و جور
کل تک ابھی تو شام سے آئے گی فوج اور

حاکم ہیں آج زیرِ فلک ہی ہمارا دور
سر کاٹ لیں گے صلح کا ہو گا اگر نہ طور

فرصت اب ایک دم کی نہ ان و حسین کو
بیعت اگر کریں تو اماں دو حسین کو

بولا کوئی کہ ہُوا انھیں بیعت سے اجتناب
مرنے کو راہِ حق میں سمجھتے ہیں وہ ثواب

کہنے لگا وہ تیرہ دروں کھا کے پیچ و تاب
ہاں اب خیامِ شہ میں پہونچنے نہ پائے آب

پیاسوں پہ تیر یاں سے بھی پڑتے ہیں کس طرح
دیکھیں حسین لاکھوں سے لڑتے ہیں کس طرح

یہ کہہ کے اپنے خیمہ میں آیا وہ خیرہ سر
یاں غازیوں نے رات عبادت میں کی بسر

ظاہر ہوئی جو رن میں شبِ قتل کی سحر
پڑھ کر نمازِ شہ نے کسی جنگ پر کمر

گردوں نشیں سروں کو بہم پیٹنے لگے
بکھرا کے بال اہلِ حرم پیٹنے لگے

زینب تھی نے حواس پریشاں تھے سر کے بال
چلاتی تھی وہائی ہے یا شیر ذوالجلال

روتے روتے دیکھ کے حضرت بہن کا حال
غل تھا کہ مرنے جاتا ہے خیر النسا کا لال

فرما کے الوداع ہر اک سوگوار سے
خیمے سے نکلے شاہِ پیمبر مزار سے

جب صدر زیں پہ دوشِ نبی کا لکیں چڑھا
خاتم پہ جیسے دُرِ نجف کا نگیں چڑھا

گویا کہ آسمان پہ خندیو زمیں چڑھا
غل پڑ گیا جہاد پہ ضرغامِ دیں چڑھا

ایک ایک رخ پہ قدرتِ حق کا ظہور تھا
لشکر نہ تھا حسین کا دریائے نور تھا

مجرے کو جھک گئے رکھا باندھ کر پرا
حضرت نے سر پہ ہاتھ عجب پیار سے دھرا

ہنسکر نظر عزیزوں کی جانب جو کی ذرا
سب باغِ فاطمہ نظر آیا ہرا بھرا

تھے اس طرح جوانوں میں لڑکے ملے ہوئے
ہوں جس طرح سے پھول چمن میں کھلے ہوئے

ہنگام صبح تھی عجب اُس باغ پر بہار
جوں غنچہ مسکراتا تھا اک ایک گلعذار

لٹکے ہوئے تھے چہروں پہ گیسوئے پیچدار
گھوڑے ہوا تو نکہت گل تھے وہ شہسوار

شملے چھٹے جہاد پہ کمریں کسے ہوئے
خوشبو سے تن کی عطر میں کپڑے بسے ہوئے

قد چھوٹے چھوٹے سرو گلستانِ اعتدال
شمشاد جن کے سایۂ قامت سے پائمال

چہرے برنگ لالہ شجاعت سے لال لال
رُخ صاف صاف جن پہ نمایاں خطا نہ خال

کیا خل نورِ حسن میں خالِ سیاہ کو
نقطہ کی احتیاج نہیں مہر و ماہ کو

گلدستۂ حسین میں اکبر سا گلبدن
قربان جس کے تن کی نزاکت پہ یاسمن

سنبل کو لائے پیچ میں وہ زلفِ پُر شکن
غل تھا کہ تنگ تر کہیں غنچہ سے ہو دہن

مطلب کھلا ہوا ہو خطِ سبزہ رنگ کا
یہ حاشیہ لکھا ہو اسی متنِ تنگ کا

تھی گرچہ پیاس سے دلِ نازک کو نے کلی
لیکن شگفتہ تھا وہ گلِ گلشنِ علی

یوں مسکرائے بات شجاعت کی جب چلی
جیسے کھلی ہوئی ہو گلِ سُرخ کی کلی

خوشبو مہک گئی چمنِ کائنات میں
بولے تو پھول جھڑنے لگے بات بات میں

کیا رو ہلالِ عید کا ابرو کے سامنے
بیجا ہے ذکرِ مشک کا گیسو کے سامنے

آئینہ دنگ آئینہ رو کے سامنے
پانی گلاب جسم کی خوشبو کے سامنے

مضمون صفاتِ قد کا قیامت سے لڑ گیا
قامت کے آگے سروِ خجالت سے گڑ گیا

عباس نامدار جوانوں میں لاجواب
قد سرو باغِ حسن تو رخ مثلِ آفتاب

حمزہ کا زور جعفرِ طیار کا شباب
شبّر کا خُلق شان و شکوہِ ابوتراب

لڑنے کو فوجِ کیں سے بہادر نکلا ہوا
سر پر نشانِ دیں کا پھریرا کھلا ہوا

چڑھ چڑھ کے مرکبوں پہ بڑھے جب وہ گلعذار
اُس دم فرس پہ قبلۂ عالم ہوئے سوار

مہمیز کی مگر نہ بڑھا واں سے راہوار
حضرت کے مُنہ کو تکتا تھا پھر پھر کے بار بار

کوہِ الم گرا تھا دلِ دردناک پر
آنکھوں سے اُس کے اشک ٹپکتے تھے خاک پر

آزردہ ہو کے اُس سے یہ بولے شہِ اُمم
تو ساتھ گر نہ دے تو پیادے ہی جائیں ہم

بولا یہ کانپ کانپ کے وہ اسپِ خوش قدم
قدموں کو میں نہ چھوڑوں گا جب تک ہے دم میں دم

میری طرف حضور نہ رُک رُک کے دیکھیے
مولا مرے قدم کی طرف جھک کے دیکھیے

جھک کر جو پشت زیں سے شہ دیں نے کی نظر
دیکھا سموں سے لپٹی ہے زینب برہنہ سر

کہتی ہے آنکھیں مل کے قدم پر وہ نوحہ گر
ای ذوالجناح دختر زہرا پہ رحم کر

پاؤں گی پھر نہ فاطمہ کے نورِ عین کو
لے جانہ تو بہن سے بچھڑا کر حسین کو

پچھلے سموں پہ رکھے ہے سر دوسری بہن
پکڑے ہے شکار بند کو ہے بیوۂ حسنؑ

رو کے ہے راہ زوجۂ عباس صف شکن
گھونگٹ دھرے ہے بال پہ کٹ کی ردا بن

صدمے سے تھرتھری ہے تنِ خوش خرام میں
ڈالے ہے ننھے ہاتھ سکینہ لگام میں

گردن سے لپٹی کہتی ہے بانوے نامدار
صدقے میں تیرے ای مرے آقا کے راہوار

کرتا ہے مجھکو رانڈ محمد کا یادگار
کام آکہ ہوں علی کی بہو میں جگر فگار

مرجاؤں گی میں ساتھ جو وارث کا چھٹ گیا
آگے قدم بڑھا تو مرا راج لٹ گیا

اُترے قدم رکابوں سے حضرت نکال کر
ہاتھوں سے خود بہن کو اُٹھایا سنبھال کر

رو کر کہا ابھی سے نہ زینب بیحال کر
بولی وہ ہاتھ شاہ کی گردن میں ڈال کر

کچھ زور نے قراری دل سے نہ چل سکا
بھائی میں کیا کروں نہ کلیجہ سنبھل سکا

فرمایا تم کو فاطمہ کی روح کی قسم
جاؤ ابھی تو آئینگے مقتل سے پھر کے ہم

بچوں کو ساتھ لے کے چلے پیٹتے حرم
رستے سے پھر کے بولی یہ زینب شکیم نم

تسکیں نہیں مرے دلِ پُر اضطراب کو
گھوڑے پہ تم چڑھو میں سنبھالوں رکاب کو

عباس نے کہا کہ نہیں آپ کا یہ کام
خدمت کے واسطے ابھی حاضر ہے یہ غلام

تنہا ہمارے بعد جو رہ جائینگے امام
تب تھامیو رکاب شہنشاہ تشنہ کام

حیدر نے دی صدا کہ ادھر دل حزیں بھی ہے
زہرا ابھی ہے رکاب میں روح الامیں بھی ہے

روتے ہوئے فرس پہ چڑھے بادشاہ دیں
تھے پشت زیں پہ شاہ کہ خاتم پہ تھا نگیں

رخسار آفتاب تو مہتاب تھی جبیں
کوسوں فروغ حسن سے روشن ہوئی زمیں

جن کے تنوں میں جان نہ تھی زندہ ہو گئے
ذرے زمیں پہ اختر تابندہ ہو گئے

میداں میں جب سواریِ شاہِ اُمم چلی
کس شان سے جلو میں سپاہِ حشم چلی

فتح و ظفر ادب سے قدم بوسِ قدم چلی
بدلی ہوا نسیم ریاضِ ارم چلی

سر تاجِ عرش تھا جو مکیں صدرِ زین پر
قدسی پروں کو فرش کیے تھے زمین پر

جوں جوں قدم بڑھاتا تھا سرور کا خوش خرام
بنتے تھے نقشِ سم سے زمیں پر مہ تمام

تھا ارض کربلائے معلےٰ کا یہ کلام
گو فرش تھی یہ اب میں ہوئی عرش احتشام

ذرّوں کا اُس زمیں کے فلک پر دماغ تھا
ہر سنگ ریزہ رشکِ دہِ شب چراغ تھا

بچھی تھی اِک نور کی چادر جو دور دور
ہنستا تھا کہکشاں پہ یہ جاہ و کو تھا غرور

ہنستے تھے روئے مہر پہ ذرّوں میں تھا یہ نور
ہر سنگ ریزہ کہتا تھا میں ہوں چراغِ طور

تھا یہ زمیں کا قول کہ عنبر سرشت ہوں
کہتی تھی گرد نکہتِ باغِ بہشت ہوں

وہ صبح اور وہ جلوۂ خورشیدِ خاوری
وہ صاف صاف آئنۂ چرخِ اخضری

وہ نور اور وہ شانِ جوانانِ حیدری
راکب ہر اک ملک تھا تو مرکب ملک پری

صدقے سواریِ شہِ گردوں رکاب کے
گویا ستارے جاتے تھے ساتھ آفتاب کے

پہنچا جو اس حشم سے خدیوِ جہانِ دین
صف باندھ کر کھڑے ہوئے سب اطرافِ دین

کھولا نشانِ مرتضوی نے نشانِ دین
غل پڑ گیا کہ آج دوبالا ہے شانِ دین

قدسی سب اُٹھ کھڑے ہوئے تعظیم کے لیے
طوبیٰ کا سر بھی جھک گیا تسلیم کے لیے

ظاہر میں گرچہ تھے رفقا شاہ کے قلیل
پیشِ خدا مگر وہ حقیقت میں تھے جلیل

جرات میں نے نظیر شجاعت میں بے عدیل
سر گرمِ جاں دینے پہ سب صورتِ خلیل

فاقوں میں صبر و شکر سے دل اُن کے سیر تھے
جانباز تھے جری تھے مجاہد تھے شیر تھے

سر پر عمامے چاندسی پیشانیوں پہ نور
حاضر گلا کٹانے کو سب شاہ کے حضور

لب برگِ گل سے سوکھے ہوئے پیاس کا وفور
یکتا ہر اک مگر نہ تکبر نہ کچھ غرور

پیرو امام کے تھے نہ کیوں خوش طریق ہوں
آقا حسین سا ہو تو ایسے رفیق ہوں

ہر دم فروتنی کا لبوں پر کلام تھا
شکر خدا سے اُن کی زبانوں کو کام تھا

ایک ایک دل سے عاشقِ شاہِ انام تھا
آنکھوں میں نشۂ حبِ امام تھا

ہر حال میں وہ لوگ رضا جوئے شاہ تھے
رُخ اُن کے مثلِ قبلہ نما سوئے شاہ تھے

ذی جاہ و ذی جلالت و ذی فہم و ذی شعور
شایق ریاضِ خلد کے مشتاقِ وصلِ حور

ہر شخص نشۂ حبِ علیؑ میں چور
ذکرِ علےٰ نور سے پیشانیوں پہ نور

ذرہ نہ مہر و ماہ میں اور اُن میں فرق تھا
اِک اِک جوان حُسن کے دریا میں غرق تھا

ناگاہ فوجِ شام میں بجنے لگا دُہل
تیغیں کھچیں چمکنے لگے برچھیوں کے پھل

کڑکیں کمانیں آنے لگے ناوکِ اجل
شیروں کے تیروں پہ پڑے اُلٹے فن بھی بل

تن تن کے ہونٹ چاب کے تھرّا کے رہ گئے
تیروں کے زخم شاہ کو دکھلا کے رہ گئے

بولے یہ رنگ دیکھ کے شبیرِ خوش نہاد
ہاں اے مجاہدو رہِ حق میں کرو جہاد

جوں غنچہ کھل گئے وہ جواں ہو کے شاد شاد
سُرخی لبوں پہ آگئی پایا گلِ مُراد

بڑھ بڑھ کے پیدلوں نے سواروں سے جنگ کی
ایک ایک تشنہ لب نے ہزاروں سے جنگ کی

جس غول پر جھپٹ کے گئے صورتِ اسد
بھاگے وہ لوگ چھوڑ کے دشتِ ستم کی حد

لاکھوں میں اُن کا وار کوئی کر سکا نہ رد
نعرہ ہر ایک ضرب پہ تھا یا علی مدد

دوڑتے تھے وہ مجمعِ قومِ جہول میں
گھوڑوں کو عرض میں تو سواروں کو طول میں

کس کس دلاوری سے وہ خاصانِ رب لڑے
اس شان سے کبھی نہ عجم نہ عرب لڑے

دریا کے سمتِ رُخ نہ کیا تشنہ لب لڑے
پیاسے تھے تین روز کے لیکن غضب لڑے

نے دست ہو گئے تو یہ جوہر دکھا گئے
لوہے کو مثلِ شیرِ درندہ چبا گئے

الحق تھے شیرِ بیشۂ ہیجا وہ صف شکن
مرنے کی یہ خوشی تھی کہ خنداں تھے زخمِ تن

کھا کھا کے تیر کہتے تھے وہ غیرتِ چمن
قربان بندہ پروری سرو و رزمن

غازی ستمگروں سے وغا کر کے مر گئے
حقِ نمک جو تھا وہ ادا کر کے مر گئے

Digitized by Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

جب داخلِ جناں ہوئے وہ خاصگانِ حق
برہم ہوئے نبی کے مرقع کے بھی ورق

فرزندِ فاطمہ کو نہایت ہوا قلق
صدمے سے ہو گیا رُخِ انور کا رنگ فق

چمکی جو اُن کی تیغ تو بجلی چمک گئی
شیروں کی آنکھ خوف کے مارے جھپک گئی

لڑکے ہوئے جو معرکہ آرائے کارزار
واں کے جواں نہ روک سکے نیچوں کے وار

پیدل نہ اُن کی ضرب سے بچتا تھا نہ سوار
کر دیتے تھے وہ ایک کو دو اور دو کو چار

چھوٹے سے نیچوں سے تمگر بتنگ تھے
گہ سر پہ گہ کمر پہ کبھی زیرِ تنگ تھے

لشکر میں اہلِ ظلم کے غل تھا کہ الاماں
دو بجلیاں چمکتی ہیں بھاگے کوئی کہاں

ان سے کہیں پناہ نہیں زیرِ آسماں
یہ کس کے شیر ہیں کہ نہیں جن کو خوفِ جاں

حضرت پکارتے تھے کہ دو دن کے پیاسے ہیں
جس کا پسر ہوں میں یہ اُسی کے نواسے ہیں

پامال کر کے فوج کو جب وہ ہوئے تمام
روشن کیا چراغِ حسنؑ نے تب اپنا نام

نکلا جہاد کرنے کو پھر بازوئے امام
ایسا لڑا کہ ڈوب گئی خوں میں فوجِ شام

روئے امامؑ اس کی جوانی کے واسطے
دریا پہ قتل ہو گیا پانی کے واسطے

رخصت ہوا پدر سے علی اکبرِ دلیر
لشکر کو سرکشوں کے کیا میں نے زیر

آخر ہجوم کر کے لیا ظالموں نے گھیر
برچھی جگر پہ چل گئی مارا گیا وہ شیر

صدمہ سے حال سبطِ نبیؐ غیر ہو گیا
تا ظہر سب کا خاتمہ بالخیر ہو گیا

تنہا کھڑے تھے دل کو سنبھالے ہوئے حسین
ہلتا تھا چرخ کہتے تھے جب ہائے نورعین

خیمے کے در پہ بیبیاں روتی تھیں کہہ کے مین
چلاتی تھی یہ فاطمہ زہرا بہ شور و شین

صدمے سہوں کلیجے پہ کس کس کے داغ کے
افسوس پھول جھڑ گئے سب میرے باغ کے

راوی نے یہ لکھا ہے کہ اُس دم بحالِ زار
لائے حسین ہاتھوں پہ اک طفلِ شیر خوار

دن کو ہوا قرآن مہ و مہر آشکار
مرجھا گیا تھا پیاس سے لیکن وہ گلعذار

تھا فرطِ غش سے ننھا سا منکا ڈھلا ہوا
باندھے ہوئے تھے مٹھیاں منہ تھا کھلا ہوا

چھوٹا سا ایک سبز عمامہ تھا زیب سر
ماتھا جھنڈولے بالوں میں ہالے میں جوں قمر

جُھٹی بھویں وہ جن پہ تصدق دلِ پدر
آنکھیں تو نرگسی پہ نقاہت زیادہ تر

سایہ میں دامنِ خلفِ بوتراب کے
رُخسار تھے کہ پھول کھلے تھے گلاب کے

پھیلا ہوا وہ آنکھوں میں کاجل اِدھر اُدھر
خشکیدہ ہونٹ موکے مژہ آنسوؤں سے تر

باچھوں سے تھا نمود جمے دودھ کا اثر
ہاتھوں میں نیلے ڈورے تھے ہیکل تھی سینہ پر

ننھے سے دل کو ماں سے بچھڑنے کا درد تھا
رن کی ہوائے گرم سے جسم اُس کا سرد تھا

ہچکی ہوئی تھی دشت میں گل کے بدن کی بو
اِن گورے گورے گالوں میں تھی یاسمن کی بو

شہ سونگھتے تھے دودھ بھرے اُس دہن کی بو
گویا لبوں سے آتی تھی نہر لبن کی بو

آتا رمِ مرگ پھول سے رُخ پر نمود تھے
ہچکی لگی ہوئی تھی مسوڑے کبود تھے

تھے لعل لب نگینہ یاقوتِ احمری
رنگیں ہے جن کے وصف میں باغ سخنوری

غنچہ کا مُنہ ہے کیا جو کرے اُن سے ہمسری
وہ خار یہ رگِ گلِ بستانِ حیدری

تھی نازکی میں اس پہ خزاں مارے پیاس کے
تالو سے لگ گئی تھی زباں مارے پیاس کے

روشن گلا تھا شمع تجلی طورِ حسن
مثلِ ستارۂ سحری تھا وہ نورِ حسن

گھیرے ہوئے تھا ننھی سی ہنسلی کو نورِ حسن
ہوتا ہے جس طرح مہ نو سے ظہورِ حسن

چھیدیں وہی گلا یہ لعینوں کے جی میں تھا
یاں کنٹھ بیٹھ جانے سے دم دو گھڑی میں تھا

کُرتا بدن میں آتا تھا اس رنگ سے نظر
پڑتی ہے اوس پھولوں پہ جیسے دمِ سحر

سینہ تھا صاف صورتِ آئینہ جلوہ گر
گرمی سے ہو گیا تھا شلوکہ عرق میں تر

چھاتی میں دمبدم جو دمِ سرد کا اٹکتا تھا
گھبرا کے ننھے ہاتھوں کو دیدے پٹکتا تھا

صدمے سے پیاس کے رخِ معصوم تھا جو زرد
حضرت فلک کو دیکھتے تھے بھر کے آہ سرد

ہچکی جب اُس کو آتی تھی اُٹھتا تھا دل میں درد
آنسو رواں تھے آنکھوں سے رخ پر جمی تھی گرد

پانی کی جستجو تھی شہِ خوش صفات کو
تکتے تھے چشمِ یاس سے نہرِ فرات کو

جاری یہ لب پہ تھا کہ نہ آیا تجھے حجاب
اے نہر مر گئے مرے بچے بغیر آب

دو دن سے خشک ہی چمنستانِ بوتراب
محشر میں دے گی ساقیِ کوثر کو کیا جواب

سیراب سب چرند و پرند اور پیاسے ہم
شکوہ ترا کرینگے رسولِ خدا سے ہم

یہ کہہ کے شامیوں کو صدا دی بچشمِ تر
کہنا ہی کچھ مجھے عمرِ سعد ہی کدھر

نکلا یہ سن کے فوج سے ظالم بکروفر
پہنے لباسِ فاخرہ باندھے ہوئے کمر

خادم تھے ساتھ ہاتھ میں عہدے لیے ہوئے
اور ایک شخص چتر کا سایہ کیے ہوئے

بولے دکھا کے بچے کو شاہِ فلک سریر
مرتا ہی پیاس سے یہ مرا کودکِ صغیر

پانی ملا ہی کل سے نہ ممکن ہوا ہی شیر
للہ اس غریب پہ کر رحم اے امیر

مہماں ہی کوئی آن کا ہونٹوں پہ جان ہی
اُس کا قصور کیا ہی کہ یہ بے زبان ہی

نالاں ہی تجھ سے روحِ رسولِ فلک اساس
اتنا بھی دل نہ سخت کر اے ناخدا شناس

موجود ہیں صراحیاں پانی کی تیرے پاس
اِک گھونٹ دے اسے کہ ہی سولہ پہر کی پیاس

بچے پہ ظلم صاحبِ ایماں سے دور ہی
چھوٹے سے میہمان کی خاطر ضرور ہی

برپا ہی اہلِ بیتِ محمد میں شور و شین
در پہ پھوپھی بلکتی ہی ماں کر رہی ہی بین

آنکھیں پھرائے دیتا ہی ابتو یہ نورِ عین
لایا ہی اس عطش میں ترے پاس ابنِ حسین

تجکو قسم ہی روحِ رسالت مآبؐ کی
ٹپکا دے اُس کے حلق میں اک بوند آب کی

یہ کہہ کے چپ ہوئے جو شہنشاہِ بحر و بر
دِل دشمنوں کے ہل گئے تھرا گئے جگر

رو یا جھکا کے سر پسرِ سعدِ خیرہ سر
فولاد موم ہو گیا اللہ رے اثر

مضطر تمام فوج کے پیر و جواں ہوئے
آنکھوں سے مرکبوں کے بھی آنسو رواں ہوئے

بولے یہ ابنِ سعد سے سردارِ فوجِ شام
واللہ اے امیر یہ ہی رحم کا مقام

دیتے ہیں اُس کو آب جو کافر ہو تشنہ کام
یہ بیکس و غریب تو سیّد اور امام

کچھ شرم بھی ہی شرطِ مسلماں کے واسطے
دے حکمِ آب اصغرِ ناداں کے واسطے

تب ابن سعد شمر سے کرنے لگا کلام
اصغر کو خود پلا دے تو پانی کا ایک جام

کہنے لگا بگڑ کے یہ وہ نطفۂ حرام
ہم کو نہیں ہے تابِ عتابِ امیرِ شام

پیاسا کریں گے ذبح ہم اس نونہال کو
پانی نہ دیں گے بانوئے بیکس کے لال کو

یہ کہہ کے ابنِ سعد کے کچھ کان میں کہا
حضرت کے سامنے سے ہٹا تب وہ بے حیا

آنسو بہا کے کہنے لگے شاہِ کربلا
سمجھا میں تیرے مکر کو اے بانیِ جفا

خیراب کچھ آرزو نہیں اس آبِ شت کی
لہرا رہی ہیں سامنے نہریں بہشت کی

فرما کے یہ حسین چلے سوئے خیمہ گاہ
گھوڑے بڑھا بڑھا کے ہوئی فوج سد راہ

تنہا کما کشوں میں گھرا فاطمہ کا ماہ
چھپٹے ادھر اُدھر پہ نہ پائی کہیں پناہ

چھایا ستم کا ابر شہِ نامدار پر
تیروں کا مینہ برسنے لگا شیر خوار پر

آئے جو ہر طرف سے شہِ بحر و بر پہ تیر
تلوار سے قلم کیے روکے سپر پہ تیر

غل تھا چلیں حسین کے لختِ جگر پہ تیر
آنے دیا نہ شاہ نے لیکن پسر پہ تیر

آنسو رواں تھے آنکھوں سے بچے کے حال پر
مثلِ کماں جھکے ہوئے تھے اپنے لال پر

پیہم پکارتے تھے شہِ آسماں جناب
یہ کیا خطا ہے روحِ نبی سے کرو حجاب

منہ پھیرتے تھے سب کوئی دیتا نہ تھا جواب
نکلا پرے سے حرملۂ خانماں خراب

جلدی کماں میں جوڑ کے سرکش نے تیر کو
تاکا گلوگاہِ قمر سے حلقِ صغیر کو

کتنا بچایا شہ نے اجل سے نہ بس چلا
کڑکی اُدھر کمان اِدھر چھد گیا گلا

آنسو بھر آئے آنکھوں میں منکا جو ہیں ڈھلا
آنکھوں سے شہ نے آنکھیں ملیں منہ سے منہ ملا

جو حسرتیں تھیں دل میں قضا نے نکال دیں
ننھی سی باہیں باپ کی گردن میں ڈال دیں

اِک آہ کر کے غش ہوئے سلطانِ بحر و بر
سینے میں فرطِ غم سے لہو ہو گیا جگر

رونے لگے صغیر کی صورت کو دیکھ کر
منہ رکھ دیا کھلے ہوئے منہ پر بچشمِ تر

چوما گلا چھدا ہوا اُس نونہال کا
ملنے لگے جبیں پہ لہو اپنے لال کے

کھینچا جو شہ نے تیر تو بچہ دہل گیا
خوں جوش کھا کے زخم گلو سے ابل گیا

مردہ ہوئے حیات کا نقشہ بدل گیا
ہچکی کے ساتھ ہونٹ کھلے دم نکل گیا

حضرت نے سر کو پیٹ کے اس طرح آہ کی
تڑپی لحد میں روح رسالت پناہ کی

ای اہل بزم پیٹنے رونے کی ہے یہ جا
او لاد والو ہے یہ دم نالہ و بکا

کیا شاہ دیں پہ ظلم ہوئے وا مصیبتا
گودی میں مر گیا چھ مہینے کا دلربا

پھٹ جائے کیوں جگر نہ شہ خوش خصال کا
ماتم اُدھر جواں کا اِدھر خرد سال کا

غصے سے حرملہ سے کہا یوں پکار کر
نازاں ہے تیر حلق پہ بچے کے مار کر

مجھ سے نکل کے جنگ اب ای بد شکار کر
آتا ہوں ننھی لاش لحد میں اُتار کر

سینے پہ میرے تیر لگاتا تو غم نہ تھا
بچہ مرا یہ ناقۂ صالح سے کم نہ تھا

یہ کہہ کے رو رہے تھے شہنشاہ بحر و بر
ناگہ پکاری ڈیوڑھی سے فضہ بچشم تر

یا شاہ اب نکلتی ہے بانو برہنہ سر
اصغر جو رو رہے ہوں تو لے آیئے اِدھر

بہنیں ہیں نے قرار پھوپھی بے حواس ہے
مادر کی گود خالی ہے جھولا اُداس ہے

چلائے منہ پھرا کے شہنشاہِ مشرقین
اصغر تو کوچ کر گئے لائے کسے حسین

فضہ یہ شہر بانو سے کہہ دے بشور و شین
گھر میں بس اب نہ آئے گا زہرا کا نورعین

جن کی تھیں طلب ہے وہ سوئے جناں گئے
جاتے ہیں ہم بھی اب ہیں اصغر جہاں گئے

یہ کہہ کے ذوالفقار سے کھودی ہیں زمیں
ہاتھوں سے کی سپرد لحد لاش نازنیں

تربت پہ منہ کو رکھ کے پکارے یہ شاہ دیں
اب سو و خواب چین سے ای میرے مہ جبیں

تم یہ نہ جانیو کہ ہمیں چھوڑے جاتے ہیں
ہم بھی تمہارے پاس کوئی دم میں آتے ہیں

یہ کہہ کے اُٹھے واں سے بحسرت امام پاک
رخسار پر لگی تھی مزار پسر کی خاک

بازو سے خوں رواں تھا گریباں چاک چاک
اعدا پہ کی نظر صفت شیر خشمناک

دل دشمنوں کے خنجر ابرو سے کٹ گئے
اُلٹی جو آستیں تو پرے سب اُلٹ گئے

نعرہ کیا تو رعد نے گردوں پہ کی فغاں
کھینچی جو تیغ برق پکاری کہ الاماں

اُٹھا جو ہاتھ کانپ گیا شیرِ آسماں
گردش جو دی تو سب تہ و بالا ہو جہاں

طبقے زمیں کے روحِ امیں کے پروں پہ تھے
یاں سر پڑے تھے خاک پہ اور تن سروں پہ تھے

جس صف پہ کوند کر وہ گری سر اُڑا دیئے
بازو کماں کشوں کے برابر اُڑا دیئے

پھل برچھیوں کے پھول سپر پر اُڑا دیئے
جو مرغ تیر اُدھر سے اُڑا پر اُڑا دیئے

جاں سرکشوں کی جانبِ ملکِ عدم چلی
ایسی ہوا بھی گلشنِ عالم میں کم چلی

شمشیرِ شہ کے وصف میں لکھتا ہوں چند بند
جوہر شناس بھی یہ کریں گے پسند بند

نیزہ کا جس نے باندھا بڑھا کر سمند بند
کاٹا علی کی تیغ نے گرتے ہی بند بند

کیا ضرب تھی کہ فتح کا دروازہ کھل گیا
اجزاءِ جسمِ نحس کا شیرازہ کھل گیا

بجلی سی کوند کر صفِ اعدا پہ جب گری
ہر سمت غل ہوا کہ وہ برقِ غضب گری

بیدم تھا جس پہ تیغِ شہِ تشنہ لب گری
کھلتا نہ تھا کب اُٹھ گئی اور سر پہ کب گری

چل پھر سے اُس کی فوج ستم دردناک تھی
گردوں پہ تھی کبھی تو کبھی زیرِ خاک تھی

دو لاکھ پر وہ تیغ برستی چلی گئی
ناگن کی طرح فوج کو ڈستی چلی گئی

بجلی سی دونوں باگوں پہ کستی چلی گئی
دم میں جلا کے خرمنِ ہستی چلی گئی

زخموں کو اُس نے آتشِ سوزاں بنا دیا
ہر نخلِ قد کو سروِ چراغاں بنا دیا

اُس تیغ کی برش سے زبردست زیر تھے
روباہ بن گئے تھے وہ دل جن کے شیر تھے

گوشوں میں چھپتے پھرتے تھے جتنے دلیر تھے
تودے تھے سرکشوں کے کمانوں کے ڈھیر تھے

غل تھا کہ اے نبی کے نواسے پناہ دے
اے دوشبانہ روز کے پیاسے پناہ دے

آئی ندائے غیب کہ اے ابنِ مرتضا
معنی یہی ہیں جنگ کے شاباش مرحبا

کس کا یہ منہ ہے تجھ سے کوئی کر سکے دغا
وعدے یہ بچنے کے مناسب ہے اے وفا

ہم منتقم ہیں ان سے نہ تو انتقام لے
اے صابروں کے فخر بس اب ہاتھ تھام لے

آوازِ غیب سنتے ہی تھرا گئے امام
کی ذوالفقار میان میں اور روک لی لگام

گردن پھرا کے منہ کو لگا تکنے خوشخرام
فرمایا تجھ سے ہوتا ہی خصمت یہ تشنہ کام

رک جا کہ خاتمہ ہو اجنگ و جدال کا
اب سر چڑھے گا نیزے پہ زہرا کے لال کا

رکنا تھا بس کہ چلنے لگے جھپٹوں کے وار
اک جسمِ نازنیں پہ چلے تیر دس ہزار

تیغوں سے ہاتھ کٹ گئے سر ہو گیا فگار
تیورا گیا وہ فاطمہ زہرا کا گلعذار

کھائی سناں جو غش میں دلِ دردناک پر
کرسی نشین عرش گرا فرش خاک پر

پہونچی جو ضرب پھٹ گئے زخمِ تنِ حسین
سب خاک خون میں بھر گیا پیراہنِ حسین

سر خاک پہ پٹکنے لگا تو سنِ حسین
سجدے کو سوے قبلہ جھکی گردنِ حسین

اعدا نے کائنات کا دفتر الٹ دیا
نیزوں سے لاشِ شہ کو زمیں پر الٹ دیا

بولا یہ فوج سے عمرِ سعد روسیاہ
رہتی ہی اب تو غش ہی محمد کا رشکِ ماہ

نکلے کہیں نہ خیمے سے زینب بانگ واہ
ہاں کاٹ لو سرِ پسرِ ضیغم الٰہ

راحت کے بعد فتح سرانجام کیجیو
زہرا کے گھر کو لوٹ کے آرام کیجیو

خولی علم کیے ہوے شمشیر کیں بڑھا
بڑھتے ہی اس کے اپنے پرے سے حسین ہٹا

خنجر کمر سے کھینچ کے شمرِ لعیں بڑھا
شہ کی طرف چڑھائے ہوے آستین بڑھا

زینب نے وی ہائی تو منہ کو پھرا لیا
زانو سے شہ کا سینۂ زخمی دبا لیا

پھیرا گلوے خشک پہ خنجر جو ایک بار
آثارِ صبحِ حشر ہوے رن میں آشکار

شہ رگ پہ جب پہنچ گئی تیغ ستم کی دھار
چلائے ہاتھ اٹھا کے امامِ فلک وقار

بیکس ہوں تشنہ کام ہوں تیغوں سے چور ہوں
یارب گواہ رہیو کہ میں بے قصور ہوں

یارب بحقِ گوہرِ دندانِ مصطفا
یارب بحقِ خونِ سرِ شاہِ مرتضا

یارب بحقِ حرمتِ زہرا و مجتبا
کچھ اور مانگتا نہیں اصغر کا خوں بہا

ہی تجھ سے التجا یہی مجھ دل ملول کی
اُمت کو بخشدے مرے نانا رسول کی

یہ کہتے تھے کہ حلق سے خنجر گزر گیا
خورشیدِ آسمانِ شرف خوں میں بھر گیا

دُنیا سے بادشاہِ اُمم کوچ کر گیا
چلائی فاطمہ کہ مرا شیر مر گیا

برپا ہو جب یہ حشر تو کیا دل کو کل پڑے
باہر سب اہلِ بیتِ محمدؐ نکل پڑے

زینب نے خیمہ گاہ سے باہر جو کی نظر
دیکھا اک آفتاب کو نیزے پہ جلوہ گر

لڑکی جو ساتھ تھی وہ پکاری بچشمِ تر
میں لُٹ گئی پھوپھی مرے بابا گئے کدھر

شہ ذبح ہو گئے نہ کسی کو خبر ہوئی
ہے ہے ذری سی عمر میں میں بے پدر ہوئی

بنتِ علی کی آنکھوں میں عالم ہوا سیاہ
ہاتھوں سے دل پکڑ کے کہا وا محمداؐ

مُنہ پیٹ کے زمیں پہ گری پھر بشکد آہ
چلائی ہائے خانۂ زہرا ہوا تباہ

ہم سب کے چین اب تہِ افلاک اُٹھ گئے
ہے ہے جہان سے پنجتنِ پاک اُٹھ گئے

ہے ہے شہیدِ خنجرِ ظلم و جفا حسین
ہے ہے گلو بریدۂ راہِ خدا حسین

ہے ہے غریب و بیکس و بے آشنا حسین
ہے ہے ذبیحِ ماریۂ وینوا حسین

ہے ہے لہو بھری ہوئی زلفیں لٹکتی ہیں
ہے ہے رگوں سے خون کی بوندیں ٹپکتی ہیں

لوٹا بلا کے گھر سے محمدؐ کی آل کو
پیاسا کیا شہید شہِ خوش خصال کو

ہے ہے دیا کفن بھی نہ زہرا کے لال کو
لو گو خبر کرو اسدِ ذوالجلال کو

دیکھیں بغور زخمِ تنِ پاش پاش کے
ٹکڑے اُٹھا ہیں آج کے بیٹے کی لاش کے

بس اے انیس حشر ہے مجلس میں اب خموش
سر پیٹتے ہیں عاشقِ سرور بصد خروش

ہے ماتمِ حسین کا بزمِ عزا میں جوش
کیا مرثیہ پڑھا کہ کسی میں نہیں ہے ہوش

فرما رہے ہیں شیرِ خدا مرحبا تجھے
دیتی ہے روحِ فاطمہ زہرا دُعا تجھے

مرثیہ (۱۵)

ای شمع قلم روشنی طور دکھا دے
ای لوح تجلی رُخِ حور دکھا دے

ای بحرِ طبیعت گہرِ نور دکھا دے
ای شاہدِ معنی رُخِ مستور دکھا دے

بزمِ غمِ شبیر میں وہ جلوہ گری ہو
خورشید جہاں تاب چراغِ سحری ہو

ای طبعِ رسا خلد کا گلزار دکھا دے
ای باغِ سخن گلشنِ نے خار دکھا دے

ای شمع زباں لمعہ انوار دکھا دے
ای حسنِ بیاں خوبیِ گفتار دکھا دے

لرزاں ہے قدم خامۂ اعجاز رقم کا
ہاں تیغِ زباں آج تو کر کام قلم کا

مانی کو بھی حیرت ہو وہ نقشہ نظر آئے
بہتا ہوا اک نور کا دریا نظر آئے

اللہ کی قدرت کا تماشہ نظر آئے
سب بزم کو حیدر کا سراپا نظر آئے

مہتاب تو کیا ہے رُخِ خورشید بھی فق ہو
جو بند ہو تصویرِ تجلی کا ورق ہو

ہے رتبہ مدحِ چمنِ فاطمہ عالی
ہاں باندھ لو گلدستۂ مضمونِ خیالی

ہر مصرعِ ثنا داب ہو اک پھولوں کی ڈالی
لفظوں کے بھی غنچے ہوں نزاکت سے نہ خالی

لبریز لطافت سے ہو رنگین سخن ایسا
رضواں بھی پکارے نہیں دیکھا چمن ایسا

خاموش! زباں دعویِ بیجا نہیں اچھا
ہو جس میں تکبر سخن ایسا نہیں اچھا

بس بس یہ غرور اور یہ دعویٰ نہیں اچھا
آپ اپنی ثنا واہ یہ شیوا نہیں اچھا

کم مایہ کمال اپنا جتا دیتا ہے اکثر
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے اکثر

خورشید کو کچھ حاجتِ زیور نہیں زنہار
پھولوں پہ کوئی عطر لگائے تو ہے بیکار

اعلیٰ ہے اگر جنس تو کیا حاجتِ اظہار
خود مشک ہو خوشبو نہ کہ خوشبو کہے عطار

جو بد ہے سو بد ہے جو نکو ہے وہ نکو ہے
چھپنے کی نہیں آپ اگر عود میں بو ہے

انساں کے لیے عجز ہی لازم ہے بہر کیف
ہے خانۂ دنیا میں ہر اک پیر و جواں ضیف

گر صاحبِ جوہر نہ چلے جھک کے تو صد حیف
خارج ہے اصالت سے وہ کشتی نہیں جو سیف

آفاق میں یوں فیضِ نگیں عام نہ ہوتا
ہوتا نہ فروتن تو کبھی نام نہ ہوتا

یارب مری فریاد میں تاثیر عطا کر
بلبل بھی پھڑک جائے وہ تقریر عطا کر

مطلع دوم

دولت کے عوض فقر کی جاگیر عطا کر
توفیقِ ثناخوانیٔ شبیر عطا کر

دعوے نہ سخن کا ہے نہ اعجاز بیاں ہوں
تو عالم و دانا ہے کہ میں ہیچمداں ہوں

ای باعثِ ایجادِ جہاں وقت مدد ہے
ای منتظمِ کون و مکاں وقت مدد ہے

ای خضرِ رہِ گم شدگاں وقت مدد ہے
ای دادرسِ پیر و جواں وقت مدد ہے

چلنا ہے دمِ تیغ دو دم پر کوئی دم کو
یوں ہاتھ پکڑ لے کہ نہ لغزش ہو قدم کو

ای قبلۂ کونین اعانت کی طلب ہے
ای ہادیٔ دارین ہدایت کی طلب ہے

ای بحرِ عطا ہمت و رحمت کی طلب ہے
ای نورِ خدا نورِ بصیرت کی طلب ہے

مقبول ہے وہ تو جسے منظور کرے گا
اس ذرہ کو خورشید ترا نور کرے گا

ای ساقیٔ کوثر مے فردوس عطا کر
ای عیسیٔ دوراں مرضِ دل کی دوا کر

ای دستِ خدا قلبِ مکدّر کی صفا کر
ای نورِ حق آئینۂ خاطر کی جلا کر

مستی میں نہ فکرِ خرد و ہوش کروں میں
کیفیتِ دنیا کو فراموش کروں میں

اندیشۂ توصیفِ شہنشاہِ امم ہے
زانو پہ سرِ فکر ہے سجدے میں قلم ہے

یہ راہ ہے باریک کہ لغزش میں قدم ہے
ای دستِ زبردستِ خدا وقتِ کرم ہے

خامے سے نہ کچھ طبعِ خداداد سے ہوگا
یہ مرحلہ طے آپ کی امداد سے ہوگا

بلبل سے کبھی وصفِ گل تر نہیں ممکن
آئینہ سے اوصافِ سکندر نہیں ممکن

دُرّے سے ثنائے شہِ خاور نہیں ممکن
جبریل سے تعریفِ پیمبر نہیں ممکن

مقدور کسے شیرِ الٰہی کی ثنا کا
ہو سکتا ہے بندے سے کہیں شکر خدا کا

ہی عرش جہاں فرش یہ کاشانہ ہی کس کا
ہر سو ہی تجلی یہ جلوخانہ ہی کس کا

جلتا ہی دلِ شمع یہ افسانہ ہی کس کا
سرگشتہ ہی مہتاب یہ پروانہ ہی کس کا

روشن ہی جہان جلوۂ نورِ ازلی ہی
ہاں بزم معلائے حسین ابن علی ہی

مجلس کا ہی ہے نور خوشا محفلِ عالی
حیدر کے مجبوں سے کوئی جانہیں خالی

عاشق ہیں سب اس کے جو ہی کونین کا والی
اثنا عشری پنجتنی شیعہ غالی

شیشہ نہ ہوں کیوں چار طرف جلوہ گری ہی
یہ بزم عزا آج ستاروں سے بھری ہی

اللہ رے رتبہ یہ فلک ہی کہ زمیں ہی
ہی عرش مکاں جس کا وہ آج اس میں مکیں ہی

جو دل ہی سو وابستہ لطف شہِ دیں ہی
مجلس ہی کہ گلدستۂ فردوس بریں ہی

یہ اوج یہ رتبہ کسی محفل کو ملا ہی
ان پھولوں کے قربان عجب باغ کھلا ہی

فرماتے ہیں شیعوں کے یہ حق میں شہِ اکرم
یہ بزم عزا ہوتی ہی جس گھر میں فراہم

بن جاتے ہیں اشک ان کے مرے زخموں کے مرہم
یہ لوگ ہیں سب میرے مصاحب مرے ہمدم

مرجاتا ہی کوئی تو بکا کرتا ہوں میں بھی
ان کے لیے بخشش کی دعا کرتا ہوں میں بھی

کیسا ہی گنہگار مرے میرا عزادار
ہی اس کے گناہوں سے فزوں رحمتِ غفار

فرماتے ہیں بخشش کی دعا احمدِ مختار
اللہ سے میں ہوتا ہوں بخشش کا طلبگار

گر نزع میں سختی ہو تو زہرا و نبی ہیں
اور قبر کی منزل میں شریک اس کے علی ہیں

کیوں مومنوں کیا فیض ہی کیا لطف و عطا ہی
کیا مرتبۂ اشک ہی کیا اجرِ بکا ہی

گوہر ہیں یہ وہ جن کا خریدار خدا ہی
جو کچھ ہی سو بس دوستیِ آلِ عبا ہی

دنیا پہ نہ دولت پہ توجہ ہی نہ زر پر
زہرا کی نظر پڑتی ہی اشکوں کے گہر پر

کیا اشکِ عزادار کا رتبہ کوئی جانے
یہ گنج گہر بخشتا ہی مردم کو خدا نے

کی ہی نظرِ عین عنایت شہدا نے
دکھلائینگے کیا کیا ثمر ان اشکوں کے دانے

یاں اس کا نہ عقدہ دلِ مضطر پہ کھلے گا
یا قبر پہ یا چشمۂ کوثر پہ کھلے گا

یاں اشک کا دانہ ہے تو واں دُرِّ ثمیں ہے
یاں آب ہے واں غازہ کشِ چہرۂ دیں ہے

یاں آنسوؤں کا تار ہے واں حبلِ متیں ہے
یاں قطرہ ہے واں خاتمِ جنت کا نگیں ہے

قطرہ ہے مگر بحر کو بھی گرد کرے گا
دوزخ کے شراروں کو یہی سرد کرے گا

جو لوگ ہیں بالیں پہ انھیں دوزخ سے نہیں باک
مُنہ اشکوں سے دھویا تو گناہوں سے ہوئے پاک

ہے دولتِ ایماں غمِ سبطِ شہِ لولاک
ہو جاتی ہے کیا بعد بکا طبع فرحناک

آنکھوں کی ضیا رُخ کی صفا دل کی جلا ہے
سب ایک طرف گلشنِ فردوس مُلا ہے

مہلت جو اجل دے تو غنیمت اسے جانو
آمادہ ہو رونے پہ سعادت اسے جانو

آنسو نکل آئیں تو عبادت اسے جانو
اندیا بھی ہو مجلس میں تو راحت اسے جانو

فاقے کیے ہیں دھوپ میں لب تشنہ رہے ہیں
آقا نے تمھارے لیے کیا ظلم سہے ہیں

تکلیف کچھ ایسی نہیں سایہ ہے ہوا ہے
پانی ہے خنک مروحہ کش بادِ صبا ہے

کچھ گرمیِ محشر کا بھی حال سُنا ہے
سر پیٹنے کا وقت کا ہے فریاد کی جا ہے

گزری ہے بیاباں میں وہ گرمی شہِ دیں پر
بھُن جاتا تھا دانہ بھی جو گرتا تھا زمیں پر

وہ گرم ہوا آہ وہ آندھی وہ بگولے
اُٹھے جو ترائی سے تو دم شیر کا پھولے

دو گام چلے گر تو ہرن چوکڑی بھولے
کیا تاب ہے اس کی جو کوئی سنگ کو چھولے

خاک اُڑ کے جمی جاتی تھی زلفوں پہ قبا پر
اس دھوپ میں سایہ بھی نہ تھا نورِ خدا پر

حدت تو یہ خورشید کی اور پیاس کا وہ حال
لب خشک تھے سونا لگیا تھا فاطمہ کا لال

سایہ نہ عَلَم کا تھا نہ عباس خوش اقبال
گہ رُخ پہ سپر روکتے تھے اور کبھی رومال

تھی دھوپ کڑی فاطمہ کے رشکِ چمن پر
تھی گرم زرہ جلتے تھے ہتھیار بدن پر

زلفیں وہ جنھیں سونگھتی تھی فاطمہ ہر شب
غیرت دہِ مشکِ ختن و عنبر و شہب

کہتے تھے جنھیں فاطمہ کا رشتۂ جاں سب
کیوں دل نہ پریشان ہو وہ مٹی میں اٹیں جب

آہوں کا دھواں کیوں نہ اُٹھے کون و مکاں سے
فریاد کہ باندھا انھیں خولی نے سناں سے

وہ چاندسی پیشانی نورانی شبیر
اندھیر ہی اس پر بن اشعت کا لگا تیر

سجدے کریں محراب حرم کی ہے یہ توقیر
اُن ابروؤں پر ہائے چلی ظلم کی شمشیر

آہو کو ستاتے نہیں دیندار حرم میں
آنکھیں وہ لہو روتی تھیں فرزندوں کے غم میں

وہ ریش جو ہالہ تھی تو چہرہ مہ انور
فاقوں سے تھا یہ زرد وہ تھی آنسوؤں سے تر

وہ پھول سے رخسار وہ لعل لب اطہر
اس کے لیے تلواریں تھیں اس کے لیے پتھر

دنداں دہن پاک میں سب رشک گہر تھے
گرزے تھے کئی روز کہ دنداں جگر تھے

وہ حلق جسے چومتے تھے احمد مختار
تیر اس کے لیے ہوتے تھے واں خنجر خونخوار

وہ دوش جو امت کا اٹھائے ہوئے تھا بار
لگتا تھا تبر اس پر کبھی اور کبھی تلوار

لڑنے کی نہ طاقت تھی شہ تشنہ گلو میں
ڈوبی ہوئی تھیں مچھلیاں بازو کی لہو میں

وہ شمع سر طور سی پر نور کلائی
اُس پر خط شمشیر دوہائی ہے دوہائی

مُنہ دیکھ لو صاف ایسی ہتھیلی میں صفائی
ہے سب پہ کھلی اُنگلیوں کی عقدہ کشائی

نسبت نہیں ناخن سے کبھی بدر کی ضو کو
ہفتہ میں دکھائے تو کوئی دس مہ نو کو

وہ سینۂ روشن کہ جو تھا مطلع انوار
گنجینۂ علم احدی مخزن اسرار

قرآن کو رکھ لیتے ہیں سر پر جو ہیں دیندار
کیا قہر ہے واں پانوں دہرے ستمگار

سینے پہ نہ تھا اس کا قدم حشر بپا تھا
ہو جاتی جو دنبالہ و بالا تو بجا تھا

عباس سے بھائی کا جو تھا صدمۂ جانکاہ
ٹکڑے تھا جگر ٹوٹ گئی تھی کمر شاہ

اس ضعف میں لغزش سے نہ وہ پانو تھے آگاہ
پایا تھا ثبات قدم پاک ید اللہ

سب خاک پہ بکھرے تو کلیجہ کے پڑے تھے
لاکھوں سے لڑائی تھی یہ بشاش کھڑے تھے

منہ کر کے سوے چرخ یہ فرماتے تھے ہر بار
عالم مری نیت سے ہے تو ای مرے مختار

گھر سے نہ علاقہ ہے نہ بچوں سے سروکار
ہر حال میں ہوں تجھ سے اعانت کا طلبگار

گو شاہ زمن ہوں پہ ترے در کا گدا ہوں
محتاج ہوں بیکس ہوں غریب الغربا ہوں

کس کس ترے احساں کا کروں شکر زباں سے
ہے ناطقہ عاجز کہ زیادہ ہے بیاں سے

واقف نہیں کوئی ترے اسرار نہاں سے
دشوار ہے عالم کی صفت ہیچمداں سے

پیاس آج کے دن کی مجھے مرغوب ہے مولا
جو تیری مشیت ہے وہی خوب ہے مولا

ہر دم ہے ترا لطف مرے حال کے شامل
پیدا کیا واں وحی جہاں ہوتی تھی نازل

بخشا وہ مکاں رہنے کو اے خالق عادل
نے اذن ملک جس میں نہ ہو سکتے تھے داخل

یہ لطف و عنایت ہے تری کون سے گھر پر
جبریل و سرافیل کھڑے رہتے تھے در پر

مانا تو دیا اشرفِ ذرّیتِ آدم
بالا شہِ مرداں سا دیا فخرِ دو عالم

ماں سیّدہ کون و مکاں ثانی مریم
بھائی وہ کہ تو جس کی بزرگی سے ہے محرم

دنیا میں کسی اور کا رتبہ ہے کب ایسا
نام ایسا گھر ایسا نسب ایسا حسب ایسا

ماں طاہرہ جد طیب و پاکیزہ پدر پاک
رحمت سے تری کیوں نہ ہوا ایسوں کا پسر پاک

گلشن کی زمیں پاک شجر پاک ثمر پاک
گھر پاک جگہ پاک صدف پاک گہر پاک

پھولے وہ شجر جس کو ثمردار کرے تو
جس قطرے کو چاہے درِ شہوار کرے تو

بچپن میں محمد نے زبان اپنی چوسائی
اب تک کسی نعمت میں وہ لذت نہیں پائی

قربان ہے احمد مختار کی جائی
جب دودھ چھٹا نعمتِ فردوس بھی کھائی

افلاک سے دن میں کئی بار آتے تھے جبریل
ڈوری مرے جھولے کی ہلا جاتے تھے جبریل

دم بھر کبھی تنہا نہ رہا آٹھ پہر میں
گہ دوشِ نبی پر گہے آغوشِ پدر میں

ماں ساتھ مرے ہوتی تھی پھرتا تھا جو گھر میں
پُتلی کی طرح رکھتے تھے سب مجھ کو نظر میں

اس رتبۂ اعلیٰ کا سزاوار میں کب تھا
مولا یہ تری چشمِ عنایت کا سبب تھا

تھا عید کو عریاں کہ عنایت ہوئی پوشاک
عمامہ و پیراہن و پاجامہ و رو پاک

مرکب جو نہ تھا اونٹ بنے سیّد لولاک
بالا رہا سب سے مرا رتبہ تہِ افلاک

یہ تختِ سلیماں کو نہ یہ تاج ملا تھا
بچپن میں مجھے رتبۂ معراج ملا تھا

رحمت ہوئی خورشید فلک کو پئے حیدر
یعنی نہ قضا ہوئی نمازِ شہِ صفدر

روزہ جو رکھا میں نے تو ای خالق اکبر
دن تھا پہ ہوئی رات چھپا مہرِ منور

منظور تھی خوردی میں نہ رگی مرکن کی
دن ہوگیا وہ شب کا تو یاں شب ہوئی دن کی

کیا عمر تھی جب سر سے اٹھا باپ کا سایا
دو بھائی تھے دو بہنیں تھیں اور رو میں پرایا

تھا تو جو نگہبان نو نہ اعدا نے ستایا
ماں باپ کا مرنا تری شفقت نے بھلایا

رحمت سے تری خلق کے مختار ہوئے ہم
دیکھی جو یتیمی دُرِ شہوار ہوئے ہم

دولت نہ مجھے دی گوہرِ عزت نہ مجھے بخشا
بابا کی طرح اوجِ شرافت نہ مجھے بخشا

مسند نہ مجھے دی تختِ امامت نہ مجھے بخشا
ان سب کے سوا تاجِ شفاعت نہ مجھے بخشا

اختر کو قمر قطرے کو گوہر کیا تو نے
ذرّہ تھا سو خورشیدِ منور کیا تو نے

انصار دیے وہ جو پیمبر نے نہ پائے
اصحاب وہ بخشے کہ جو حیدر نے نہ پائے

احباب وہ یکرنگ جو شبر نے نہ پائے
لوگ ایسے کسی صاحبِ لشکر نے نہ پائے

تیروں سے نہ تلواروں سے منہ پھیرتا تھا اُن کا
خادم کے پسینے پہ لہو گرتا تھا اُن کا

فرزند وہ امداد کیا حورِ شمائل
تھی جس کی زیارت کے سبب روشنیِ دل

خورشید زمیں برجِ شرف کاملِ کامل
یہ بھی تری امداد تھی اے خالقِ عادل

دولت یہ نہ ملتی جو خداوند نہ دیتا
کیا کرتا اگر تو مجھے فرزند نہ دیتا

اکثر ترے بندے ہیں کہ جن کے نہیں اولاد
نے فاتحہ خواں کوئی نہ فرزند نہ احفاد

کہتے ہیں کہ غمگین ہیں کبھی اور کبھی شاد
بچے ہوئے اور مر گئے اور گھر ہوا برباد

مرتے ہوئے دیکھا ہے برابر کے پسر کو
اس داغ کی قدر آج ہوئی میرے جگر کو

سو مرتے جو فرزند تو نے صبر نہ ہوتا
خادم کبھی اس اجر کو ہاتھوں سے نہ کھوتا

دامن کو ترے خوف میں اشکوں سے بھگوتا
اکبر کو میں فرزند سمجھ کر نہیں روتا

یوں تو وہ کلیجہ تھا مرا اور مراجی تھا
میں اس لیے روتا ہوں کہ بے مثل نبی تھا

بچھڑا تھا کبھی مجھ سے نہ وہ گیسوؤں والا
پیری کی عصا تھا وہی اور گھر کا اُجالا

جب چاند سی چھاتی پہ لگا ظلم کا بھالا
تھا سینے میں خادم کا کلیجہ تہ و بالا

اشک آنکھوں سے تھمتے نہیں تفتیدہ جگر ہوں
تو رحم کر اے خالقِ اکبر کہ بشر ہوں

دریا پہ جو عباس نے جان اپنی گنوائی
خادم کی کمر ٹوٹ گئی مر گیا بھائی

باعث تھا یہ لاشے پہ جو رقت بہت آئی
مولا مجھے یاد آ گئی بابا کی جدائی

صدمے سے نہ پھر ضبط کا یارا ہوا مجکو
پھر داغِ یداللہ دوبارا ہوا مجکو

تنہا ہوں بس اب کوئی نہیں مونس و ہمدم
موجود ہے تو سر پہ کچھ اس کا بھی نہیں غم

اب رنج نہ گھر کا ہے نہ اولاد کا ماتم
بہتر ہے گزر جائے تری یاد میں جو دم

وابستہ تسبیح رکھوں رشتۂ جاں کو
جب تک ہے دہن میں حرکت خشک زباں کو

گو روح کو راحت نہیں اور قلب کو آرام
ہے تقویتِ جان و دل و روح ترا نام

کم ہے ترے سجدے میں ہوں گر سحر و شام
قاصر ہے زباں شکر میں اے خالقِ علام

آنکھیں تری جانب ہیں تو دل تیری طرف ہے
گر تو اسے مقبول کرے عین شرف ہے

نے پیاس کا شکوہ ہے نہ فاقہ کی شکایت
ہر طرح ہے راضی پسرِ شاہ ولایت

وہ بھی ترا انعام تھا یہ بھی ہے عنایت
الطاف کا پایاں ہے نہ بخشش کی نہایت

وہ کونسی دولت ہے جو موجود نہیں ہے
ہاں ایک شہادت ہے سو اب وہ بھی قریں ہے

ہر چند کہ ہے سخت بہت ذبح کی منزل
تو چاہے تو ہو جائے گی آسان یہ مشکل

زانو جو رکھے سینۂ مجروح پہ قاتل
وہ صبر عطا کیجو کہ تڑپے نہ مرا دل

سجدہ تہِ شمشیر یہ ناشاد نہ بھولے
سب محو ہوں دل سے پہ تری یاد نہ بھولے

حضرت تو یہ کرتے تھے سخن صبر و رضا کے
بندھتے تھے اُدھر رن میں پڑے اہلِ جفا کے

چلاتا تھا یوں شمر کماں داروں میں آ کے
تا کے رہو سینہ کو امامِ دوسرا کے

یاں تک خلفِ شاہِ نجف آنے نہ پائے
یہ شیر ترائی کی طرف آنے نہ پائے

برچھے لیے ہاتھوں میں سواران جفاکار
بڑھ بڑھ کے صفِ جنگ میں چمکاتے تھے رہوار

آلودۂ خوں برچھیاں تولے ہوئے خونخوار
تھی ڈھال پہ ڈھال اور تھی تلوار پہ تلوار

لشکر کے جواں گرز گراں تولے ہوئے تھے
ہر صف میں علمدار نشاں کھولے ہوئے تھے

وہ غل عربی باجوں کا وہ بوق کے نالے
وہ شور رہوار سر پہ جو گردوں کو اٹھالے

رستم کی نہ طاقت تھی جو واں دم کو سنبھالے
دب جائے اگر دیو بھی آواز نکالے

پیدا تھی جلاجل سے اک افسوں کی آواز
جاتی تھی کئی کوس تلک کوس کی آواز

رو رو کے یہ پُر درد صدا دیتی تھی شہنا
اچھا نہیں سید کا لہو خاک پہ بہنا

فانی ہے زمیں اس پہ ہمیشہ نہیں رہنا
در پے نہ ہو مظلوم کے مانو مرا کہنا

دو روز کے پیاسے سے شہِ مظلوم کھڑے ہیں
اس غم سے کلیجے میں مرے چھید پڑے ہیں

چلے سے جو بدکیش ملانے لگے سوفار
خود چھیڑ کے گھوڑے کو بڑھے سیّد ابرار

فرمایا قسم ہے تمھیں اے قومِ ستمگار
کس شخص کا دو لبند ہوں میں بیکس و نا چار

انصاف سے کہدو کہ طلبگار ہوں جس کا
جد کس کا ہے تم سب کلمہ پڑھتے ہو کس کا

ہے کون گلِ سرسبدِ گلشن اسلام
آباد کن کعبۂ حق کاسرِ اصنام

آتی تھی کسے وحی الٰہی سحر و شام
جو نام خدا سے ہے بہم کس کا ہے وہ نام

جبریل امیں ہمدم و ہمراز ہے کس کا
قرآن جسے کہتے ہو اعجاز ہے کس کا

برپا علمِ نظم و نسق کر دیا کس نے
عالم کو سوئے کعبۂ حق کر دیا کس نے

رنگِ رخِ کفّار کو فق کر دیا کس نے
ہاں بدر کو انگشت سے شق کر دیا کس نے

لب ہل گئے جب نخلِ دعا میں ثمر آیا
انگشتِ شہادت کو اٹھا کر فجر آیا

بخشا کسے اللہ نے معراج کا پایا
سو مُردوں کو عیسیٰ کی طرح کس نے جلایا

پڑتا تھا نہ اس خاک پہ کس شخص کا سایا
جد کس کا ہے وہ سورۂ کوثر جسے آیا

کس رخ کو تجلی صفِ بدر عطا کی
دنیا میں کسے حق نے شب قدر عطا کی

۱۲ یعنی بروز ۱۱ محرم

سب بولے کہ اس بات سے واقف ہی زمانہ
لاریب ہیں محبوبِ خدا آپ کے نانا

روشن ہی شبِ ماہ سے معراج کا جانا
کافر ہی وہ اس بات کو جس نے نہیں مانا

وہ قبلۂ دیں باعثِ ایجادِ فلک ہی
آپ ان کے نواسے ہیں کچھ اس میں نہیں شک ہی

شبیر نے فرمایا کہ وہ کس کی ہی مادر
قرآں میں جسے حق نے کہا طاہر و اطہر

دنیا کا شرف زینتِ دیں عرش کا زیور
خاتونِ جہاں نورِ خدا بنتِ پیمبر

بھیجی ہی انھیں چادرِ تطہیر خدا نے
امت کے گنہ ڈھانپ دیئے جن کی ردا نے

کہنے لگے زینب شرم کہ اے خاصۂ قیوم
وہ آپ کی مادر ہیں یہ کس کو نہیں معلوم

سب جانتے ہیں ساکنِ شام و عرب و روم
وہ سیدہ معصوم ہی اور آپ بھی معصوم

زہرا کا پدر فخرِ رسولانِ سلف ہی
حوا کا نہ رتبہ ہی نہ مریم کا شرف ہی

اس حجتِ باری نے یہ فرمایا پھر اک بار
من بعد نبی کون ہی کونین کا سردار

کس کا ہی لقب شیرِ خدا حیدرِ کرار
اللہ نے بھیجی ہی کسے عرش سے تلوار

ہر جنگ میں کفار پہ ورکون رہا ہی؟
محبوبِ الٰہی کی سپر کون رہا ہی؟

آباد ہوئی کس کی عنایت سے رعایا
کس شاہ نے دینداروں کی بستی کو دکھایا

کس کے لیے اکملت لکم دینکم آیا
اتممت علیکم کا ملا ہی کسے پایا

یکتائے جہاں کون ہی جرأت میں سخا میں
وہ حصے ہی قرآنِ خدا کس کی ثنا میں

وہ کون ہی اللہ و نبی کو جو ہی پیارا
جو عرش کی زینت ہی وہ ہی کونسا تارا

ہی انفسنا انفسکم کس سے اشارا
اللہ نے کس گھر میں ستارے کو اتارا

اعلیٰ کسے فرمایا علی کس کو کہا ہی
اللہ نے قرآں میں ولی کس کو کہا ہی

طاعت سے جو افضل ہی اطاعت ہی وہ کس کی
پوچھے گا خدا جس کو محبت ہی وہ کس کی

پہونچا دے جو کوثر پہ رفاقت ہی وہ کس کی
جو اجرِ رسالت ہی مودت ہی وہ کس کی

انصاف کا اس وقت طلبگار ہوں تم سے
ہی کون مراد آیۂ لا اسئلکم سے

جوالیِ کونین ہی وہ کون ولی ہی
قرآن میں کس کے لیے وہ نصِ جلی ہی

وہ کون ہی جو شاہِ امامِ ازلی ہی
سب نے کہا برحق وہ علی ہی وہ علی ہی

برعکس ہیں جو لوگ وہی بانیِ شر ہیں
سب پر ہی یہ آئینہ کہ آپ اُن کے پسر ہیں

گردوں کی طرف دیکھ کے بولے شہِ بیکس
کافی ہی شہادت کو تری ذاتِ مقدس

یارب مجھے ان سے کوئی حجت نہ رہی بس
کرتے ہیں ستم دیدہ و دانستہ بہ ناکس

دکھ کونسا اور کونسی ایذا نہیں دیتے
مہمان ہوں اور پانی کا قطرا نہیں دیتے

جاہل نہیں سب ہیں مرے رتبے کے شناسا
خود اس کے مقر ہیں کہ نبی کا ہوں نواسا

اِس نہر سے پانی نہیں دیتے ہیں ذرا سا
شاہد مجھے کرتا ہوں کہ دو دن سے ہوں پیاسا

ٹکڑے ہو بدن یا تنِ شمشیر گلا ہو
اِس سب کے عوض حشر میں شیعوں کا بھلا ہو

سُن کر یہ سخن رونے لگے فوج کے نے پیر
مظلوم کی فریاد نے کی سنگ میں تاثیر

بولا پسرِ سعد کہ یا حضرتِ شبیرؑ
تنہا ہوے اب کیوں نہ کرو عجز کی تقریر

میداں سے ہٹاتے نہیں اس فوجِ گراں کو
ایسا ہی مرا رعب کہ لکنت ہی زباں کو

اِس عجز کو مانے گا نہ یہ لشکرِ سفاک
پھر کیا کریں گر ہو پسرِ سعد لولاک

سو مل گئے ہیں خاک میں ایسے گہرِ پاک
حاکم ہیں کہ ہی دور ہمارا تہِ افلاک

ڈرتے نہیں گر شکوہ بیدادکروگے
کیا ہوگا جو اللہ سے فریاد کروگے

عباس سے کہہ دو کہ مدد کرنے کو آئیں
جعفر کے پسر جوہرِ شمشیر دکھائیں

قاسم ہیں کدھر خون کے دریا جو بہائیں
اکبر سے کہو جنگ کریں برچھیاں کھائیں

اب آپ کی جرات کا بھی وہ طور نہیں ہی
شاید کوئی زینب کا پسر اور نہیں ہی

بیدرد نے چھڑکا جو نمک زخمِ جگر پر
طاری ہوا غصہ شہِ مرداں کے پسر پر

سُرخی سی نظر آنے لگی دیدۂ تر پر
کی تیز نظر قبضۂ شمشیرِ دوسر پر

شہ کی نظر غیظ نہ تھی قہرِ خدا تھا
شمشیرِ یداللہ جدا میان جدا تھا

خود تیغ علی شاہ کے اعجاز سے نکلی
فریاد دلِ فوجِ دغا باز سے نکلی

کس شان و تجمل سے کس انداز سے نکلی
پریوں کے بھی ہوش اُڑ گئے اس ناز سے نکلی

فانوس سے خود شمع تجلی نکل آئی
محمل سے تڑپتی ہوئی لیلی نکل آئی

تھیں تیغ کی دونوں جو زبانیں شرر افشاں
موسیٰ کا عصا کہتا تھا کوئی کوئی ثعبان

غل چار طرف تھا کہ رہے قدرتِ یزداں
ہیں ایک جگر دو مہ نو دست و گریباں

شہباز اجل بازوؤں کو تولے ہوئے ہے
پر اوجِ سعادت کے ہما کھولے ہوئے ہے

نعرہ کیا ہاں اے پسرِ سعدِ جفا کار
لے دیکھ تو ان کانپتے ہاتوں کا کوئی وار

ہر چند کہ ہے عجز ہی بندے کو سزاوار
مجبور نہیں لختِ دلِ احمدِ مختار

شاید مرا رتبہ تجھے معلوم نہیں ہے
وہ کونسی شے ہے کہ جو محکوم نہیں ہے

حاکم ہوں میں سب خلقِ خدا ہے مرے تابع
میں بابِ اجابت ہوں دعا ہے مرے تابع

مختار قدر ہوں میں قضا ہے مرے تابع
آتش مری محکوم ہوا ہے مرے تابع

قبضہ ہے مرا خاک کے ہر گنجِ نہاں پر
جاری ہے مرا حکم رواں آبِ رواں پر

آتش کو جو دوں حکم ابھی سب کو جلا دے
ہستی کے چراغوں کو ہوا دم میں بجھا دے

پانی کا یہ طوفاں ہو کہ عالم کو ڈبو دے
ہل ہل کے زمیں خاک زمانے کی اُڑا دے

ہستی ہو نہ پستی نہ مکیں ہو نہ مکاں ہوں
آثار اذا زلزلت الارض عیاں ہوں

ذرے سے کچھ بیم نہ دہشت ہے بلا سے
مضطر ہوں نہ دُکھ سے نہ ستم سے نہ بلا سے

خالف ہوں نہ جن سے نہ بشر سے نہ قضا سے
ہاں ایک جو ڈرتا ہوں تو ڈرتا ہوں خدا سے

کیا غم ہے اگر لاکھ سواروں کے پرے ہیں
روباہ کے لشکر سے کہیں شیر ڈرے ہیں

تو کیا ہے ترا رعب ہے کیا اوسکا ہے باک
میں پنجۂ حیدر کا ہوں اک شیرِ غضبناک

اُف کر دوں تو جل کر ترا لشکر ہو یہ خاشاک
مشتاقِ اجل ہوں مجھے مرنے سے نہیں باک

باتوں میں کروں بند فصیحانِ جہاں کو
یہ پیاس سے لکنت ہے مری خشک زباں کو

نازاں نہ ہوا ہی بانی ظلم و ستم و جور
مٹ جاتا ہی اک گردش افلاک میں یہ دور

تو آج جو حاکم ہی تو کل ہوگا کوئی اور
کیا ہوگئی کر دولت قاروں پہ ذرا غور

نمرود نہیں حشمت ضحاک نہیں ہی
ڈھونڈو جو خزانے میں تو اب خاک نہیں ہی

قیصر کا وہ افسر ہی نہ وہ تاج کیاں ہی
نے قصر خورنق کا مکیں ہی نہ مکاں ہی

آئینہ پئے روے سکندر نگراں ہی
چینی کی صدا یہ ہی کہ فغفور کہاں ہی

ٹھکرا کے جو چلتا ہی ہر اک راہگزر میں
سو بال شکستوں سے ہیں واں کاسۂ سر میں

جام سر جمشید تہ خاک ہی واژوں
کاؤس کی دولت ہی نہ گنجینۂ قاروں

فرّ تاج قباد آج ہی نے تخت فریدوں
دارا ہی نہ پرویز نہ خسرو ہی نہ گگلوں

دانا تھے پہ کس طرح پھنسے دام اجل میں
گھر وحشیوں کے بن گئے کسرے کے محل میں

مشہور ہی فرعونیوں کے غرق کا احوال
شدّاد کو کس طرح کیا مال نے پامال

وہ باغ کہ زر جس پہ کیا صرف مہ و سال
دیکھا بھی نہ اس کو کہ اجل آگئی دنبال

لوٹا ہی وہ گلشن کہ نہ پھل پائے گا ظالم
اب تو بھی جہنم میں یوہیں جائے گا ظالم

کیا غم مجھے عباس علمدار نہیں گر
چاہوں تو مدد کرنے کو آئیں ابھی حیدر

بہتر ہوا اس راہ میں گر مر گئے اکبر
خود سینہ سپر ہونے کو حاضر ہیں پیمبر

جعفر بھی شریک الم و یاس ہیں میرے
تو دور نہ جان ان کو یہ سب پاس ہیں میرے

پہچان تو میں کون ہوں او جاہل مطلق
او نگلی سے قمر کو مرے نانا نے کیا شق

نفریں کروں میں تو اڑے خلق سے رونق
طبقے سے زمیں کی برکت سلب کرے حق

فریاد جو میرے دل صد چاک سے نکلے
تا حشر نہ دانا کبھی اس خاک سے نکلے

فرما کے یہ جلوہ دیا تیغ دو زباں کو
عبرت ہوئی بجلی کے چمکنے سے جہاں کو

ہر نیزے نے اونچا کیا انگشت اماں کو
خود چھوڑ دیا سہم کے تیروں نے کماں کو

چڑھ سکتا ہی دنیا میں کوئی شیروں کے منہ پر
تیری نہ رہی خوف سے شمشیروں کے منہ پر

اِس شان سے لشکر پہ امامِ اُمم آئے
جیسے صفِ آہو پہ ہزبرِ اَجَم آئے

اتنا تو پکارے کہ خبردار ہم آئے
اِک دم میں ستمگر تہِ تیغِ دودم آئے

پل بندھ گئے لاشوں کے نہ اک پل ہوئی آخر
ثابت نہ ہوا کب صفِ اول ہوئی آخر

جب تیغِ علی قبلۂ عالم نے علم کی
اک برق سی میدان بلاخیز میں چمکی

اللہ ری بُرّش سیفِ شہنشاہِ اُمم کی
اعدا کو نظر آنے لگی راہ عدم کی

گلرنگ لہو سے جو ہر اک جسم شفق تھا
تھی دوپہر اور دامنِ صحرا شفق تھا

شمشیرِ یداللہ نے نئی چال دکھائی
سرداروں کی صف فوج کو پامال دکھائی

ہر بار چمک برق کی مثال دکھائی
سب خون سے مقتل کی زمیں لال دکھائی

جل جل کے بدن ناریوں کے مرمٹے تھے
ڈر ڈر کے سیہ کاروں کے منہ زرد ہوئے تھے

کٹ کٹ کے صفیں خاک پہ بے جان نظر آئیں
جو برچھیاں یاں جمع تھیں وہ واں نظر آئیں

نے چلہ کمانیں سرِ میداں نظر آئیں
ساری سپریں خون سے افشاں نظر آئیں

چلاتے تھے وہ ہوش نہ تھا خوف سے جن کو
فریاد کہ شب خون گرا فوج پہ دن کو

خالی نہ کوئی وار گیا تیغِ دوسر کا
ہاتھ اُڑ گئے گر پاؤں بچا کر کوئی سر کا

سینہ جو بچا اس سے کسی بانیِ شر کا
تھی عقدہ کشا کھول دیا بند کمر کا

تیغ اُس نے سپر اُس نے زرہ اُس نے نہ چھوڑی
دُو انگلیوں میں ایک گرہ اُس نے نہ چھوڑی

رہ رہ کے چمکتی تھی جو شمشیرِ قضا دم
غل ہوتا تھا پریوں میں کہ یا حافظ عالم

فوجیں تھیں بنی جان کی سب درہم و برہم
مضطر تھا ملک کانپتا تھا عرشِ معظم

جب برق چمکتی تھی سرک جاتے تھے جبریل
یا نیرِ خدا کہہ کے جھجک جاتے تھے جبریل

ناگاہ محمدؐ کی صدا آئی کہ شبیرؑ
اب عصر کا ہی وقت کرو میان میں شمشیر

یہ سنتے ہی بس تھم گیا وہ تابعِ تقدیر
تلوار کا تھمنا تھا کہ چھاتی پہ لگا تیر

تھا دھیان غلاموں کا جو اِس خاصِ خلق کو
بس روکا خدا لٹتے ہوئے دنیا کے ورق کو

حضرت پہ جھکے اہلِ ستم چار طرف سے
نیزے ہوئے بیکس پہ علم چار طرف سے

پڑنے لگی شمشیر دو دم چار طرف سے
بس گھر گیا اک کشتۂ غم چار طرف سے

تر خوں میں سرتا بقدم ہو گئے شبیر
برچھی جو لگی پشت پہ خم ہو گئے شبیر

جھکنا تھا کہ تیغوں کے برابر سے چلے وار
قدموں سے رکابیں بھی جدا ہو گئیں اک بار

جب گرنے لگا خاک پہ وہ بیکس و ناچار
زہرا کی صدا آئی کہ یا حیدرِ کرار

گھیرا ہے لعینوں نے اکیلا اسے پا کر
گرتا ہے مرا لال مدد کیجیے آ کر

گھوڑے نے جو دیکھا کہ سنبھلتے نہیں سرور
بس بیٹھ گیا ٹیک کے گھٹنوں کو زمیں پر

زخموں سے جو تھا چور تنِ سبطِ پیمبر
غش ہو گئے رہوار سے ریتی پہ اتر کر

افراطِ جراحت سے بدن رشکِ چمن تھا
سب فوج کے حربے تھے وہ اک شاہ کا تن تھا

دس سو تو کماں دار تھے اک سینۂ شبیر
برچھی کا جہاں زخم تھا لگتا تھا وہیں تیر

یا شاہِ نجف کہتے تھے جب پڑتی تھی شمشیر
چلاتی تھی دروازے سے یہ زینبِ دلگیر

تم کھاتے ہو تلواریں ہوئی جاتی ہوں بھائی
اب سینہ سپر ہونے کو میں آتی ہوں بھائی

اس وقت بھی شہ ہاتھ سے کرتے تھے اشارا
ہٹ جاؤ بہن گھر سے نکلیو نہ خدارا

رتبہ ہے فزوں مریم و حوا سے تمھارا
دم تن میں ہے جب تک نہیں یہ مجھکو گوارا

للہ نہ اس دم تنِ صد پاش پہ آنا
سر تن سے اتر لے تو مری لاش پہ آنا

تھی اڈوں میں ڈیوڑھی پہ عجب یہ وزاری
سر کھولے ہوئے روتی تھیں واں بیبیاں ساری

کہتی تھی سکینہ کہ پھوپھی جان میں واری
مجھکو تو دکھا دو مرے بابا کی سواری

یاں چھوڑ کے ہم سب کو چلے جائیں گے بابا
کیوں روتی ہو کیا گھر میں نہ اب آئینگے بابا

ڈیوڑھی سے ہٹو تن سے نکلتا ہے مرا دم
میں جاؤں وہاں رن میں جہاں ہیں شہِ عالم

کہتی تھی اسے تھامے ہوئے زینبِ پُر غم
اصغر کی طرح تیر نہ ماریں تمھیں اظلم

واں چلتی ہے تلوار کہاں جاؤ گی بی بی
بابا کو بس اب حشر کے دن پاؤ گی بی بی

ناموس نبی میں تو قیامت یہ تھی برپا
سر کھولے ہوئے بیٹھی تھی دختر زہرا

راوی نے یہ لکھا ہے کہ میں دیکھتا ہوں کیا
روتا ہوا اک طفل حسیں خیمے سے نکلا

آنکھیں کہیں آہو کی بھی آنکھوں سے بڑی تھیں
منہ چاند سا تھا ہنسلیاں گردن میں پڑی تھیں

چہرے پہ بھلی لگتی تھی کیا زلف مسلسل
ظاہر تھا کہ گھیرے ہے چاند کو بادل

تھا طوق گلو رشک ہلال شب اول
ہاتھوں میں کڑے کان میں دُر سینے پہ ہنسلی

کرتے کا عجب رنگ تھا اس گل بدن پر
معلوم یہ ہوتا تھا کہ شبنم ہے چمن پر

ماں ڈیوڑھی کے پردے کو اٹھا کر یہ پکاری
میں بھی نکل آتی ہوں کہاں جاتے ہو واری

پھر آؤ کہ نے تاب ہوں میں درد کی ماری
بیوہ ہوں کرو رحم غریبی پہ ہماری

کہنا مرا مانو نہ ارادہ کرو رن کا
میں واسطہ دیتی ہوں تمہیں روح حسنؑ کا

وہ کہتا تھا اماں ہمیں قسمیں نہ دلاؤ
ہم گھر میں نہ اب آئینگے تم خیمے میں جاؤ

قاسم کی طرح داغ ہمارا بھی اٹھاؤ
ماں کہتی تھی اک بات تو سن لو ادھر آؤ

لاکھوں میں کہاں جاتے ہو آن اکیلے
وہ کہتا تھا ہیں میرے چچا جان اکیلے

میداں میں چچا قتل ہوں ہم خیمے میں آئیں
جیتے رہیں بعد ان کے تو منہ کس کو دکھائیں

ہم سائے میں ہیں دھوپ میں وہ برچھیاں کھائیں
تینوں میں غم عمو کی سپر ہونے کو جائیں

بس صبر کرو قید ہوں کیا خیمے میں آکے
فردوس میں اب جاوینگے ہمراہ چچا کے

چلاتی تھی رو رو کے یہ بیوہ جگر افگار
صدقے میں ارادے کے ترے اے مرد دلدار

کس طرح لڑوگے نہ سپر پاس نہ تلوار
پھر آتر اس جنگ کے قابل نہیں زنہار

وہ کہتا تھا قربان شہنشاہ امم ہیں
کیا ہم علی اصغر سے بھی کچھ عمر میں کم ہیں

دروازے پہ خیمے کے تڑپتی رہی مادر
جنگاہ میں جا پہونچا وہ لخت دل شبر

بند آنکھیں تھیں اور جھومتے تھے مسند پیمبر
پلٹا پسر فاطمہ زہرا سے وہ دلبر

کہتا تھا کہ سب خوں سے بدن لال ہوا ہے
اے میرے چچا جان یہ کیا حال ہوا ہے

میں تھامے ہوں یا شاہ ذرا غش سے سنبھلیے
کیوں آپ جھکے جاتے ہیں زانو کو بدلیے

زخموں کا لہو چہرۂ انور پہ نہ ملیے
سر ننگے نکلتی ہیں پھوپھی خیمے میں چلیے

سب روتے ہیں اس وقت نہیں ہوش کسی کو
بیٹی ہیں یہ سینہ کہ غش آیا ہے چچی کو

فرمانے لگے کھول کے آنکھیں شہِ ذی جاہ
کیوں گھر سے نکل آئے یہ کیا تم نے کیا آہ

ان تینوں سے اے لال بچائے تمہیں اللہ
لو خیمے میں اب جاؤ کہ عمو ہے سرِ راہ

کٹتا ہے گلا تیغِ ستم سے کوئی دم میں
گھر میں تمہیں لے چلنے کی طاقت نہیں ہم میں

یہ کہتے تھے حضرت کہ بڑھا ایک جفا کار
چاہا کہ قریب آن کے حضرت پہ کرے وار

ہاتھ اُس نے سرِ شہ پہ سپر کر دیے اک بار
بچے کے کہاں ہاتھ کہاں ظلم کی تلوار

ریتی پہ وہ ننھے سے گرے ہاتھ جو کٹ کر
غش ہو گیا شبیرؑ کی گردن سے لپٹ کر

گودی میں اسے لیکے پکارے شہِ دلگیر
صدقے ترے ان دونوں کٹے ہاتھوں کے شبیر

گودی میں تڑپتا تھا کہ گردن میں لگا تیر
چلایا کہ قربان علی اصغر نے شبیر

لپٹا جو تڑپ کر وہ شہِ تشنہ گلو سے
تر ہو گئیں سب ہنسلیاں گردن کی لہو سے

مُنہ زرد ہوا جان نکلنے لگی تن سے
خوں ہچکیوں کے ساتھ اُگلتا تھا دہن سے

جس وقت سفر کر گیا ہستی کے چمن سے
رونے کی صدا آنے لگی قبرِ حسن سے

فردوس سے تا بصد افغاں نکل آئی
خیمے سے اِدھر خاک بسراں نکل آئی

بیٹھے تھے سوئے قبلہ دو زانو شہِ بے پر
جھکتے تھے کبھی غش میں اُٹھاتے تھے کبھی سر

تھے ذکرِ خدا میں کہ لگا تیر دہن پر
یاقوت بنے ڈوب کے خوں میں لبِ اطہر

بہہ آیا لہو تا بہ زنخدانِ مبارک
ٹھنڈے ہوئے دو گوہرِ دندانِ مبارک

نیزے کا بنِ وہب نے پہلو پہ کیا وار
کاندھے پہ چلی ساتھ زرارہ کی بھی تلوار

ناوک بنِ کاہل کا کلیجے کے ہوا پار
بازو میں در آیا تبرِ خونی خونخوار

تلوار سے وقفہ نہ ملا چند نفس کا
دم رُک گیا نیزہ جو لگا ابنِ انس کا

لکھا ہی کہ جب مر گیا لخت دل شبّر
بارہ ستم ایجاد بڑھے کھینچ کے خنجر

اک سیدہ نکلی در خیمے سے کھلے سر
مقنع تھا نہ برقع تھا نہ موزے تھے نہ چادر

چلائے لعیں خوف سے ہاتھ آنکھوں پہ دھر کے
لو فاطمہ آتی ہیں بچانے کو پسر کے

اِس بھیڑ میں آکر وہ ضعیفہ یہ پکاری
اے سبطِ نبی ابن علی عاشقِ باری

گھوڑا تو ہی کوتل کدھر اُتری ہی سواری
بھیّا بہن آئی ہی زیارت کو تمھاری

مرجاؤں گی حضرت کو جو پانے کی نہیں میں
نے آپ کے دیکھے ہوئے جانے کی نہیں میں

اس وقت شہِ دیں نے سنی زاری خواہر
جس وقت کہ تھا حلق مبارک تہِ خنجر

فرمایا اشارے سے کہ اے شمرِ ستمگر
زینب نکل آئی ہی ٹھہر جا ابھی دم بھر

آخر تو سفر ہوتا ہی اس دارِ محن سے
دو باتیں تو کر لینے دے بھائی کو بہن سے

مُنہ پھیر لیا شمر نے خنجر کو ہٹا کے
دی شہ نے یہ زینب کو صدا اشک بہا کے

تڑپاتی ہو بھائی کو بہن بلوے میں آکے
دیکھو گی کسے ہم تو ہیں پنجے میں قضا کے

اُٹھ سکتے نہیں جسم پہ تلواریں پڑی ہیں
گھبراؤ نہ اماں مرے پہلو میں کھڑی ہیں

دوڑی یہ صدا سُن کے یداللہ کی جائی
چلائی کہ دیدار تو میں دیکھ لوں بھائی

پر ہائے بہن بھائی تلک آنے نہ پائی
یاں ہو گئی سر تن سے جدا سید کے واری

قاتل کو نہ گردن کو نہ شمشیر کو دیکھا
پہونچی تو سناں پر سرِ شبیر کو دیکھا

سر دیکھ کے بھائی کا وہ بیکس یہ پکاری
دُکھ پائی بہن آپ کی مظلومی کے واری

خنجر سے یہ گردن کی رگیں کٹ گئیں ساری
تم مر گئے پوچھے گا خبر کون ہماری

آفت میں پھنسی آلِ رسولِ عربی کی
اب جائیں کہاں بیٹیاں زہراؑ و علیؑ کی

بھیّا مرا کوئی نہیں تم خوب ہو آگاہ
احمد ہیں نہ زہرا نہ حسن ہیں نہ یداللہ

ڈھا رس تھی بڑی آپ کی اے سرورِ ذیجاہ
چھوڑا مجھے جنگل میں یہ کیا قہر کیا آہ

چلتے ہوئے کچھ مجھ سے نہ فرما گئے بھائی
بھینا کو نجف تک بھی نہ پہونچا گئے بھائی

اے میرے شہیدانِ وفا جائے برادر
کس طرح مرے دل کو قرار آئے برادر
انساں پہ ستم یوں کبھی انساں نہیں کرتا
خاموش انیس اب کہ ہے دل سینے میں بے چین
اب حق سے دعا مانگ کہ اے خالقِ کونین
ناحق ہے عداوت انھیں اس ہیچمداں سے

کس سے ترا لاشہ بہن اٹھوائے برادر
پانی بھی نہ قاتل نے دیا ہائے برادر
حیواں کو بھی پیاسا کوئی بیجاں نہیں کرتا
لکھے نہیں جاتے ہیں جو زینب نے کیے بین
حاسد ہیں بہت دل کو عطا کر مرے تو چین
نے تیغ کٹے جاتے ہیں شمشیرِ زباں سے

رُباعی

ایک ایک قدم لغزشِ مستانہ ہے
سرمست ہیں حُبِّ ساقیِ کوثر سے

گلزارِ بہشت اپنا میخانہ ہے
آنکھیں شیشے ہیں قلب پیمانہ ہے

رُباعی

خاموشی میں یاں لذتِ گویائی ہے
نہ دوست کا جھگڑا ہے نہ دشمن کا فساد

آنکھیں جو ہیں بند عین بینائی ہے
مرقد بھی عجب گوشۂ تنہائی ہے

رُباعی

ہشیار کہ وقتِ سازو برگ آیا ہے
محتاج عصا ہوئے تو پیری نے کہا

ہنگامِ یخ و برف و تگرگ آیا ہے
چلیے اب چوبدارِ مرگ آیا ہے

مثنیہ ۱۶

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے
جلوہ کیا سحر کے رُخِ بے حجاب نے

دیکھا سوئے فلک شہِ گردوں رکاب نے
مُڑ کر صدا رفیقوں کو دی اس جناب نے

آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو
اُٹھو فریضۂ سحری کو ادا کرو

ہاں غازیو یہ دن ہے جدال و قتال کا
یاں خوں بہے گا آج محمد کی آل کا

چہرہ خوشی سے سُرخ ہے زہرا کے لال کا
گذری شبِ فراق دن آیا وصال کا

ہم وہ ہیں غم کریں گے ملک جن کے واسطے
راتیں تڑپ کے کاٹی ہیں اس دن کے واسطے

یہ صبح ہے وہ صبح مبارک ہے جس کی شام
یاں سے ہوا جو کوچ تو ہے خلد میں مقام

کوثر پہ آبرو سے پہونچ جائیں تشنہ کام
لکھے خدا نمازگزاروں میں اس کا نام

سب ہیں وہ سیدِ عصر یہ غل چار سو اُٹھے
دنیا سے جو شہید اُٹھے سُرخرو اُٹھے

یہ سُن کے بستروں سے اُٹھے وہ خدا شناس
اک اک نے زیبِ جسم کیا فاخرہ لباس

شانے محاسنوں میں کیے سب نے ہے ہراس
باندھے عمامہ آئے امامِ زماں کے پاس

رنگیں عبائیں دوش پہ کمریں کسے ہوئے
مشک و زباد و عطر میں کپڑے بسے ہوئے

سوکھے لبوں پہ حمدِ الٰہی رخوں پہ نور
خوف و ہراس و رنج و کدورت دلوں سے دور

فیاض حق شناس اولوالعزم ذی شعور
خوش فکر و بذلہ سنج و ہنر پرور و غیور

کانوں کو حسنِ صوت سے حظ بر ملا ملے
باتوں میں وہ نمک کہ دلوں کو مزا ملے

ساونت بُردبار فلک مرتبت دلیر
عالی منش سبا میں سلیماں وغا میں شیر

گردان دہر ان کی زبردستیوں سے زیر
فاقے سے تین دن کے مگر زندگی سے سیر

دنیا کو ہیچ و پوچ سراپا سمجھتے تھے
دریا دلی سے بحر کو قطرہ سمجھتے تھے

تقریر میں وہ رمز و کنائے کہ لاجواب
نکتہ بھی منہ سے گر کوئی نکلا تو انتخاب

گویا دہن کتابِ لغت کا ایک باب
سوکھی زبانیں شہدِ فصاحت سے کامیاب

لہجوں پہ شاعران عرب تھے مرے ہوئے
پستے لبوں کے وہ کہ نمک سے بھرے ہوئے

لب پر ہنسی گلوں سے زیادہ شگفتہ رو
پیدا تنوں سے پیرہنِ یوسفی کی بو

غلماں کے دل میں جن کی غلامی کی آرزو
پرہیزگار و زاہد و ابرار و نیک خو

پتھر میں ایسے لال صدف میں گہر نہیں
حوروں کا قول تھا کہ ملک ہیں بشر نہیں

پانی نہ تھا وضو جو کریں وہ فلک جناب
پُر تھی رخوں پہ خاک تیمم سے طرفہ آب

باریک ابر میں نظر آتے تھے آفتاب
ہوتے ہیں خاکسار غلامِ ابوتراب

مہتاب سے خجل کی صفا اور ہو گئی
مٹی سے آئنوں میں جلا اور ہو گئی

خیمے سے نکلے شہ کے عزیزانِ خوش خصال
جن میں کئی تھے حضرتِ خیر النسا کے لال

قاسم سا گلبدن علی اکبر سا خوش جمال
اک جا عقیل و مسلم و جعفر کے نونہال

سب کے رخوں کا نور سپہرِ بریں پہ تھا
اٹھارہ آفتابوں کا غنچہ زمیں پہ تھا

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی وہ نور
دیکھے تو غش کرے ارنی گوے اوج طور

پیدا گلوں سے قدرت اللہ کا ظہور
وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خواں طیور

گلشن خجل تھے وادیِ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

ٹھنڈی ہوا میں سبزۂ صحرا کی وہ لہک
شرمائے جس سے اطلس نگاریِ فلک

وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک
ہر برگِ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک

ہیرے خجل تھے گوہرِ یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

قربان صنعتِ قلمِ آفریدگار
تھی ہر ورق پہ صنعتِ ترصیع آشکار

عاجز ہے فکرتِ شعرائے ہنر شعار
ان صنعتوں کو پائے کہاں عقلِ سادہ کار

عالم تھا محو قدرتِ ربِ عباد پر
مینا کیا تھا وادیِ مینو سواد پر

وہ نور اور وہ دشت سہانا سادہ فضا
درّاج و کبک و تیہو[1] و طاؤس کی صدا

وہ جوشِ گل وہ نالۂ مرغانِ خوشنوا
سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا

پھولوں کے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبدِ گل فروش تھے

وہ دشت و نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار
پھولوں پہ جا بجا وہ گہرہائے آبدار

اُٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار
بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار

خواہاں تھے نخلِ گلشنِ زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم
کو کو کا شور نالۂ حق سر ہو کی دھوم

سبحان ربّنا کی صدا تھی علی العموم
جاری تھے وہ جوان کی عبادت کے تھے رسوم

کچھ گل فقط نہ کرتے تھے رب علا کی مدح
ہر خار کو بھی نوک زباں تھی خدا کی مدح

چیونٹی بھی ہاتھ اُٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار
اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار

یا حی یا قدیر کی تھی ہر طرف پکار
تسبیح تھی کہیں کہیں تہلیلِ کردگار

طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

کانٹوں میں اک طرف تھے ریاضِ نبی کے پھول
خوشبو سے جن کی خلد تھا جنگل کا عرض و طول

دنیا کی زیب زینتِ کاشانۂ بتولؑ
وہ باغ تھا لگا گئے تھے خود جسے رسول

ماہ عزا کے عشرۂ اول میں لٹ گیا
وہ باغیوں کے ہاتھ سے جنگل میں لٹ گیا

اللہ رے خزاں کے دن اس باغ کی بہار
پھولے سماتے تھے نہ محمد کے گلعذار

دولھا بنے ہوئے تھے اجل تھی گلوں کا ہار
جاگے وہ ساری رات کے وہ نیند کا خمار

راہیں تمام جسم کی خوشبو سے بس گئیں
جب مسکرائے پھولوں کی کلیاں بکس گئیں

وہ دشت اور وہ خیمۂ زنگار گوں کی شاں
گویا زمیں پہ نصب تھا اک تازہ آسماں

بیچو بہ سپہر بنے جس کا سائباں
بیت العتیق دیں کا مدینہ جہاں کی جاں

اللہ کے حبیبؐ کے پیارے اسی میں تھے
سب عرش کبریا کے ستارے اسی میں تھے

[1] تیہو = تیتر

گردوں پہ ناز کرتی تھی اس دشت کی زمیں
کہتا تھا آسمان دہم چرخ ہفتمیں

پردے تھے رشک پردۂ چشمان حور عیں
تاروں سے تھا فلک اسی خرمن کا خوشہ چیں

دیکھا جو نور شمسۂ کیواں جناب پر
کیا کیا ہنسی ہے صبح گل آفتاب پر

ناگاہ چرخ پر خط ابیض ہوا عیاں
تشریف جانماز پہ لائے شہ زماں

سجادے بچھ گئے عقب شاہ انس و جاں
صوت حسن سے اکبر مہر نے دی اذاں

ہر اک کی چشم آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی
گویا صدا رسول کی کانوں میں آ گئی

چپ تھے طیور جھومتے تھے وجد میں شجر
تسبیح خواں تھے برگ و گل و غنچہ و ثمر

محو ثنا کلوخ و نباتات و دشت و در
پانی سے منہ نکالے تھے دریا کے جانور

اعجاز تھا کہ دلبر شبیر کی صدا
ہر خشک و تر سے آتی تھی تکبیر کی صدا

ناموس شاہ روتے تھے خیمے میں زار زار
چپکی کھڑی تھی صحن میں بانوئے نامدار

زینب بلائیں لیکے یہ کہتی تھی بار بار
صدقے نمازیوں کے مؤذن کے میں نثار

کرتے ہیں یوں ثنا و صفت ذوالجلال کی
لوگو اذاں سنو مرے یوسف جمال کی

یہ حسن صوت اور یہ قرأت یہ شد و مد
حقا کہ افصح الفصحا ہے انہیں کا جد

گویا ہے لحن حضرت داؤد باخرد
یارب رکھ اس صدا کو زمانے میں تا ابد

شعبے صدا میں پنکھڑیاں جیسے پھول میں
بلبل چہک رہا ہے ریاض رسولؐ میں

میری طرف سے کوئی بلائیں تو لینے جائے
عین الکمال سے تجھے بچے خدا بچائے

وہ خوش بیاں کہ جس کی طلاقت دلوں کو بھائے
دو دو دن ایک بوند بھی پانی کی وہ نہ پائے

غربت میں پڑ گئی ہے مصیبت حسین پر
فاقہ یہ تیسرا ہے مرے نور عین پر

صف میں ہوا جو نعرۂ قدقامت الصلوٰۃ
قایم ہوئی نماز اٹھے شاہ کائنات

وہ نور کی صفیں وہ مصلی ملک صفات
قدموں سے جن کے ملتی تھی آنکھیں رہ نجات

جلوہ تھا تا بہ عرش معلے حسین کا
مصحف کی لوح تھی کہ مصلے حسین کا

قرآں کھلا ہوا کہ جماعت کی تھی نماز
بسم اللہ آگے جیسے ہوئیں تھے شہِ حجاز

سطریں تھیں یا صفیں عقبِ شاہِ سرفراز
کرتی تھی خود نماز بھی ان کی ادا پہ ناز

صدقے سحر بیاض پہ بین السطور کی
سب آیتیں تھیں مصحفِ ناطق کے نور کی

اُمید مغفرت ہے خدائے علیم سے
غیر از کرم کچھ اور نہ ہوگا کریم سے

لیکن ڈگیں نہ پاؤں رہِ مستقیم سے
پہلے اشارہ ہے یہ الف لام میم سے

جل للتیں یہی ہے نجات ان کے ہاتھ ہے
قرآں کا اور آلِ محمدؐ کا ساتھ ہے

باہم مکبّروں کی صدائیں وہ دلپسند
کرّوبیانِ عرش تھے سب جس سے بہرہ مند

ایماں کا نور چہروں پہ تھا چاند سے دوچند
خوفِ خدا سے کانپتے تھے سب کے بند بند

خم گردنیں تھیں سب کی خضوع و خشوع میں
سجدوں میں چاند تھے مہ نو تھے رکوع میں

اک صف میں سب محمد و حیدر کے رشتہ دار
اٹھارہ نوجواں ہیں اگر کیجیے شمار

پر سب جگر فگار و حق آگاہ و خاکسار
پیرو امام پاک کے دانائے روزگار

تسبیح ہر طرف تہِ افلاک انھیں کی ہے
جس پر درود پڑھتے ہیں یہ خاک انھیں کی ہے

دُنیا سے اُٹھ گیا وہ قیام اور وہ قعود
ان کے لیے تھی بندگیِ واجب الوجود

وہ عجز وہ طویل رکوع اور وہ سجود
طاعت میں نیست جانتے تھے اپنی ہست و بود

طاقت نہ چلنے پھرنے کی تھی ہاتھ پاؤں میں
گر گر کے سجدے کر گئے تنگوں کی چھاؤں میں

ہاتھ ان کے جب قنوت میں اٹھے سوئے خدا
خود ہو گئے فلک پہ اجابت کے باب وا

ٹھہرے اے آسمان ہلا عرشِ کبریا
شہپر تھے دونوں ہاتھ پر طائرِ دعا

وہ خاکسار محو تضرع تھے فرش پر
روح القدس کی طرح دعائیں تھیں عرش پر

فارغ ہوئے نماز سے جب قبلۂ انام
آئے مصافحے کو جوانانِ تشنہ کام

چومے کسی نے دستِ شہنشاہِ خاص و عام
آنکھیں ملیں قدم پہ کسی نے باحترام

کیا دل تھے کیا سپاہ رشید و سعید تھی
باہم معانقے تھے کہ مرنے کی عید تھی

سجدے میں شکر کے کوئی تھا مردِ باخدا
پڑھتا تھا کوئی حزن سے تر آں کوئی دعا

نعتِ نبی کہیں تھی کہیں حمدِ کبریا
مولا اُٹھا کے ہاتھ یہ کرتے تھے التجا

فاقوں پہ تشنہ کامی و غربت پہ رحم کر
یارب مسافروں کی جماعت پہ رحم کر

زاری تھی التجا تھی مناجات تھی اِدھر
واں صف کشی و ظلم و تعدی و شور و شر

کہتا تھا ابن سعد یہ جا جا کے نہر پر
گھاٹوں سے ہوشیار ترائی سے باخبر

دو روز سے ہے تشنہ دہانی حسین کو
ہاں مرتے دم بھی دیجو نہ پانی حسین کو

بیٹھے تھے جا نماز پہ شاہِ فلک سریر
ناگہ قریب آ کے گرے تین چار تیر

دیکھا ہر اک نے مُڑ کے سوئے لشکرِ شریر
عباسؑ اُٹھے تول کے شمشیر نے نظیر

پروانہ تھے سراجِ امامت کے نور پر
روکی ہر حضور کرامت ظہور پر

اکبر سے مُڑ کے کہنے لگے سرورِ زماں
تم جا کے کہدو خیمے میں اے ہمدمِ جاں

باندھے ہے سرکشی پہ کمر لشکرِ گراں
بچوں کو لیکے صحن سے ہٹ جائیں بیبیاں

غفلت میں تیرے کوئی بچہ تلف نہ ہو
ڈر ہے مجھے کہ گردنِ اصغر ہدف نہ ہو

کہتے تھے یہ پسر سے شہِ آسماں سریر
فضہ پکاری ڈر سے کہ اے خلق کے امیر

ہے ہے علی کی بیٹیاں کس جا ہوں گو شہ گیر
اصغر کے گاہوارے تک آ کر گرے ہیں تیر

گرمی میں ساری رات تو گھٹ گھٹ کے روئے ہیں
بچے ابھی تو سرد ہوا پا کے سوئے ہیں

باقر کہیں پڑا ہے سکینہ کہیں ہے غش
گرمی کی فصل یہ تب و تاب اور یہ عطش

دو رو کے سو گئے ہیں صغیرانِ ماہوش
بچوں کو لیکے یاں سے کہاں جائیں فاقہ کش

یہ کس خطا پہ تیر پیاپے برستے ہیں
ٹھنڈی ہوا کے واسطے بچے ترستے ہیں

اُٹھے یہ شور سن کے امامِ فلک وقار
ڈیوڑھی تک آئے ڈھالوں کو روکے فریق یار

فرمایا مُڑ کے چلتے ہیں اب بہرِ کردگار
کہیں کسو جہاد پہ منگواؤ راہوار

دیکھو فضا بہشت کی دل باغ باغ ہو
امت کے کام سے کہیں جلدی فراغ ہو

فرما کے یہ حرم میں گئے شاہ بحر و بر
ہونے لگیں صفوں میں کمر بندیاں اِدھر

جوشن پہن کے حضرتِ عباسِ نامور
دروازے پر ٹہلنے لگے مثلِ شیرِ نر

پرتو سے رُخ کے برق چمکتی تھی خاک پر
تلوار ہاتھ میں تھی سپر دوشِ پاک پر

شوکت میں شکتِ تاجِ سلیماں تھا خودِ سر
کلغی پہ لاکھ بار تصدق ہما کے پر

دستانے دونوں فتح کا مسکن ظفر کا گھر
وہ رعب لاماں وہ تہور کہ الحذر

جب ایسا بھائی ظلم کی تیغوں میں آ ڑ ہو
پھر کس طرح نہ بھائی کی چھاتی پہاڑ ہو

خیمے میں جا کے شہ نے یہ دیکھا حرم کا حال
چہرے تو فق ہیں اور کھلے ہیں سروں کے بال

زینب کی یہ دعا ہے کہ اے ربِّ ذوالجلال
بچ جائے اِس فساد سے خیر النسا کا لال

بانوئے نیک نام کی کھیتی ہری رہے
صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے

آفت میں ہے مسافرِ صحرائے کربلا
بیکس پہ یہ چڑھائی ہے سیّد پہ یہ جفا

غربت میں ٹھنگئی جو لڑائی تو ہو گا کیا
ان ننھے ننھے بچوں پہ کر رحم اے خدا

فاقوں سے جاں بلب ہیں عطش سے ہلاک ہیں
یا رب ترے رسول کی ہم آلِ پاک ہیں

سر پر ہیں اب علی نہ رسولِ فلک وقار
گھر لٹ گیا گزر گئیں خاتونِ روزگار

اماں کے بعد روئی حسن کو میں سوگوار
دنیا میں اب حسین ہے ان سب کا یادگار

تو داد دے مری کہ عدالت پناہ ہے
کچھ اُس پہ بن گئی تو یہ مجمع تباہ ہے

بولے قریب جا کے شہِ آسماں جناب
مضطر نہ ہو دعائیں ہیں تم سب کی مستجاب

مغرور ہیں خطا پہ ہیں یہ خانماں خراب
خود جا کے میں دکھاتا ہوں ان کو رہِ صواب

موقع نہیں ابھی فریاد و آہ کا
لاؤ تبرکات رسالت پناہ کا

معراج میں رسول نے پہنا تھا جو لباس
کشتی میں لائیں زینب اسے شاہ دیں کے پاس

سر پر رکھا عمامۂ سردارِ حق شناس
پہنی قبائے پاک رسولِ فلک اساس

بر میں درست و چست تھا جامہ رسول کا
رومالِ فاطمہ کا عمامہ رسول کا

شملے کے دو سرے جو پڑے تھے بصد وقار
ثابت یہ تھا کہ دوش پہ گیسو پڑے ہیں چار

بل کھا رہا تھا زلفِ سمن بو کا تار تار
جس کے ہر ایک مو پہ خطا و ختن نثار

مشک و عبیر و عود اگر ہیں تو ہیچ ہیں
سنبل کی اصل کیا ہے یہ گیسو کے پیچ ہیں

کپڑوں سے آ رہی تھی سول من کی بو
دولھا نے سونگھی ہوگی نہ ایسی دلہن کی بو

حیدر کی فاطمہ کی حسین و حسن کی بو
پھیلی ہوئی تھی چار طرف پنجتن کی بو

لٹ جھومتے تھے باغ میں رضوان بہشت میں
گل جھومتے تھے باغ میں رضوان بہشت میں

پوشاک سب پہن چکے جس دم شہِ زمن
لیکر بلائیں بھائی کی رونے لگی بہن

چلائی ہائے آج نہیں حیدر و حسنؑ
اماں کہاں سے لائے تمھیں اب یہ نئے وطن

رخصت ہوا رسول کے یوسف جمال کی
صدقے گئی بلائیں تو لو اپنے لال کی

صندوقِ اسلحہ کے جو کھولے شاہ نے
پیٹا منہ اپنا زینبِ عصمت پناہ نے

پہنی زرہ امامِ فلک بارگاہ نے
بازو پہ جو شنین پڑھے غزو جاہ نے

جوہر بدن کے حسن سے سارے چمک گئے
حلقے تھے جتنے اتنے ستارے چمک گئے

یاد آ گئے علی نظر آئی جو ذوالفقار
قبضے کو چوم کر شہ دیں رو دے زار زار

تولی جو لیکے ہاتھ میں شمشیر آبدار
شوکت نے دی صدا کہ تری شان کے نثار

فتح و ظفر قریب ہو نصرت قریب ہو
زیب اس کی تجھ کو ضربِ عدو کو نصیب ہو

باندھی کمر سے تیغ جو زہرا کے لال نے
پھاڑا فلک پہ اپنا گریباں ہلال نے

دستانے پہنے سرورِ قدسی خصال نے
معراج پائی دوش پہ حمزہ کی ڈھال نے

رتبہ بلند تھا کہ سعادت نشان تھی
ساری سپر میں مہرِ نبوت کی شان تھی

ہتھیار ادھر لگا چکے آقائے خاص و عام
تیار ادھر ہوا علمِ سیّد انام

کھولے سروں کو گرد تھیں بیدانیاں تمام
روتی تھی تھامے چوبِ علم خواہرِ امام

تینیں کمر میں دوش پہ شملے پڑے ہوئے
زینب کے لال زیرِ علم آ کھڑے ہوئے

گردانے دامنوں کو قبا کے وہ گلعذار
مرفق تک آستینوں کو اُلٹے بصد وقار

جعفر کا رعب و دبدبۂ شیر کردگار
بوٹا سے اُن کے قد پہ نمودار و نامدار

آنکھیں ملیں علم کے پھریرے کو چوم کے
رایت کے گرد پھرنے لگے جھوم جھوم کے

گہ ماں کو دیکھتے تھے گہ جانب علم
نعرہ کبھی یہ تھا کہ نثارِ شہِ امم

کرتے تھے دونوں بھائی کبھی مشورے بہم
آہستہ پوچھتے کبھی ماں سے وہ ذی حشم

کیا قصد ہے علی ولی کے نشان کا
اماں کسے ملے گا علم نانا جان کا

کچھ مشورہ کریں جو شہنشاہِ خوش خصال
ہم بھی محق ہیں آپ کو اس کا ہے خیال

پاس ادب سے عرض کی ہم کو نہیں مجال
اس کا بھی خوف ہے کہ نہو آپ کو ملال

آقا کے ہم غلام ہیں اور جاں نثار ہیں
عزت طلب ہیں نام کے اُمیدوار ہیں

نے مثل تھے رسول کے لشکر کے سب جواں
لیکن ہمارے جد کو نبی نے دیا نشاں

خیبر میں دیکھتا رہا منہ لشکر گراں
یا یا علم علی نے مگر وقتِ امتحاں

طاقت میں کچھ کمی نہیں گو بھوکے پیاسے ہیں
پوتے انھیں کے ہم ہیں انھیں کے نواسے ہیں

زینب نے تب کہا کہ تمھیں اس سے کیا ہے کام
کیا دخل مجھ کو مالک و مختار ہیں امام

دیکھو نہ کیجو نے ادبانہ کوئی کلام
بگڑوں گی میں جو لوگے علم کا زباں سے نام

لو جاؤ بس کھڑے ہو الگ ہاتھ جوڑ کے
کیوں آئے ہو یہاں علی اکبر کو چھوڑ کے

سر کو ہٹو بڑھو نہ کھڑے ہو علم کے پاس
ایسا نہ ہو کہ دیکھ لیں شاہِ فلک اساس

کھوتے ہو اور آئے ہو تم مرے حواس
بس قابل قبول نہیں ہے یہ التماس

رونے لگو گے تم جو بُرا یا بھلا کہوں
اس ضد کو بچپنے کے سوا اور کیا کہوں

عمر قلیل اور ہوسِ منصبِ جلیل
اچھا نکالا قد کے بھی بڑھنے کی کچھ سبیل

ماں صدقے جائے گرچہ یہ ہمت کی ہے دلیل
ہاں اپنے ہم سنوں میں تمھارا نہیں عدیل

لازم ہے سوچے غور کرے پیش و پس کرے
جو ہو سکے نہ کیوں بشر اس کی ہوس کرے

اِن ننھے ہاتھوں ہاتھوں سے اُٹھے گا یہ علم
نکلیں تنوں سے سبط نبی کے قدم بہ دم
رخصت طلب اگر ہو تو میرا کام ہے
پھر تم کو کیا بزرگ تھے گر فخر روزگار
جوہر وہ ہیں جو تیغ کرے آپ آشکار
تم کیوں کہو کہ لال خدا کے ولی کے ہیں
کیا کچھ علم سے جعفر طیار کا تھا نام
بگڑی لڑائیوں میں بس آئے انھیں سے کام
بیجاں ہوئے تو نخل وغا نے ثمر دیئے
لشکر نے تین روز نہ ہمت اُٹھائی جب
مرحب کو قتل کر کے بڑھا جب وہ شیر رب
اکھڑا وہ یوں گراں تھا جو در سنگ سخت سے
نرغے میں تین دن سے ہے مشکلکشا کا لال
پوچھا نہ یہ کہ کھولے ہیں کیوں تم نے کس کے بال
غمخوار تم مرے ہو نہ عاشق امام کے
ہاتھوں کو جوڑ جوڑ کے بولے وہ لالہ فام
واللہ کیا مجال جواب لبیں علم کا نام
فوجیں بھگا کے گنج شہیداں میں سوئینگے
بس کہہ کے یہ ہٹے جو سعادت نشاں پسر
دیتے ہو اپنے مرنے کی پیارو مجھے خبر
کیا صدقے جاؤں ماں کی نصیحت بھی لگی

چھوٹے قدوں میں سب سے سنوں میں سبھوں سے کم
عہدہ یہی ہے بس یہی منصب یہی حشم
ماں صدقے جائے آج تو مرنے میں نام ہے
زیبا نہیں ہے وصف اضافی پہ افتخار
دکھلا دو آج حیدر و جعفر کی کار زار
فوجیں پکاریں خود کہ نواسے علی کے ہیں
یہ بھی تھی اک عطائے رسول فلک مقام
جب کھینچتے تھے تیغ تو ہلتا تھا روم و شام
ہاتھوں کے بدلے حق نے جو اُن کے پر دیئے
بخشا علم رسولِ خدا نے علی کو تب
در بند کر کے قلعہ کا بھاگی سپاہ سب
جس طرح توڑ لے کوئی پتّا درخت سے
اماں کا باغ ہوتا ہے جنگل میں پائمال
میں لُٹ رہی ہوں اور تمھیں منصب کا ہے خیال
معلوم ہو گیا مجھے طالب ہو نام کے
غصّے کو آپ تھام لیں اے خواہر امام
کھلجائے گا لڑینگے جو یہ باوفا غلام
تب قدر ہوگی آپ کو جب ہم نہ ہوئینگے
چھاتی بھر آئی ماں نے کہا تھام کر جگر
ٹھہرو ذرا بلائیں تو لے لے یہ نوحہ گر
بچو یہ کیا کہا کہ جگر پر چھری لگی

زینب کے پاس آکے یہ بولے شہِ زمن
کیوں تم نے دونوں بیٹیوں کی باتیں سُنیں بہن

شیروں کے شیر عاقل و جرار وصف شکن
زینب وحید عصر ہیں دونوں یہ گلبدن

یوں دیکھنے کو سب ہیں بزرگوں کے طور ہیں
تیور ہی ان کے اور ارادے ہی اور ہیں

نو دس برس کے سن میں یہ جرات یہ ولولے
بچے کسی نے دیکھے ہیں ایسے بھی من چلے

اقبال کیونکر ان کے نہ قدموں سے مُنہ ملے
کس گود میں بڑے ہوئے کس دودھ سے پلے

بے شک یہ وارثہ دار جناب امیر ہیں
پر کیا کہوں کہ دونوں کی عمریں صغیر ہیں

بس جس کو تم کہو اسے دیں فوج کا عَلَم
کی عرض جو صلاح شہِ آسماں حشم

فرمایا جب سے اُٹھ گئیں زہرائے باکرم
اُس دن سے تم کو ماں کی جگہ جانتے ہیں ہم

مالک ہو تم بزرگ کوئی ہو کہ خرد ہو
جس کو کہو اسی کو یہ عہدہ سپرد ہو

بولیں بہن کہ آپ بھی تو لیں کسی کا نام
ہے کس طرف توجہ سردار خاص و عام

گر مجھ سے پوچھتے ہیں شہِ آسماں مقام
قرآں کے بعد ہے تو علی ہی کا کچھ کلام

شوکت میں قد میں شان میں ہمسر کوئی نہیں
عباسِ نامدار سے بہتر کوئی نہیں

عاشق غلام خادم دیرینہ جاں نثار
فرزند بھائی زینتِ پہلو وفا شعار

جرار یادگارِ پدر فخرِ روزگار
راحت رساں مطیع و نمودار و نامدار

صفدر ہے شیر دل ہے بہادر ہے نیک ہے
ہمشکل سیکڑوں میں ہزاروں میں ایک ہے

آنکھوں میں اشک بھر کے یہ بولے شہِ زمن
ہاں تھی یہی علی کی وصیت بھی اے بہن

اچھا بلائیں آپ کدھر ہے وہ وصف شکن
اکبر چچا کے پاس گئے سُن کے یہ سخن

کی عرض انتظار ہے شاہِ غیور کو
چلیے پھوپھی نے یاد کیا ہے حضور کو

عباس آئے ہاتھوں کو جوڑے حضورِ شاہ
جاؤ بہن کے پاس یہ بولا وہ دیں پناہ

زینب وہیں علم لیے آئیں بہ عز و جاہ
بولے نشاں کو لیکے شہِ عرش بارگاہ

ان کی خوشی وہ ہے جو رضا پنجتن کی ہے
لو بھائی لو عَلَم یہ عنایت بہن کی ہے

رکھکر علم پہ ہاتھ جھکا وہ فلک وقار
ہمشیر کے قدم پہ مَلا منہ بہ افتخار

زینب بلائیں لیکے یہ بولیں کہ میں نثار
عباس فاطمہ کی کمائی سے ہوشیار

ہو جائے آج صلح کی صورت توکل چلو
ان آفتوں سے بھائی کو لیکر نکل چلو

کی عرض میرے جسم پہ جس وقت تک ہے سر
ممکن نہیں ہے یہ کہ بڑھے فوج بدگہر

تیغیں کھنچیں جو لاکھ تو سینہ کروں سپر
دیکھیں اُٹھا کے آنکھ یہ کیا تاب کیا جگر

ساونت ہیں پسر اسد ذوالجلال کے
گر شیر ہو تو پھینکدیں آنکھیں نکال کے

منہ کرکے سوئے قبر علی پھر کیا خطاب
ذرّے کو آج کر دیا مولا نے آفتاب

یہ عرض خاکسار ہے بس یا ابوتراب
آقا کے آگے میں ہوں شہادت سے کامیاب

سر تن سے ابن فاطمہ کے روبرو گرے
شبیر کے پسینے پہ میرا لہو گرے

یہ سُن کے آئی زوجۂ عباس نامور
شوہر کی سمت پہلے لگکیوں سے کی نظر

لیں سبط مصطفےٰ کی بلائیں بچشم تر
زینب کے گرد پھر کے یہ بولی وہ نوحہ گر

فیض آپ کا ہے اور تصدق امام کا
عزّت بڑھی کنیز کی رتبہ غلام کا

سر کو لگا کے چھاتی سے زینب نے یہ کہا
تو اپنی مانگ کوکھ سے ٹھنڈی رہے سدا

کی عرض مجھ سی لاکھ کنیزیں ہوں تو فدا
بانوئے نامور کو سہاگن رکھے خدا

بچے جبیں ترقی اقبال وجاہ ہو
سایہ میں آپ کے علی اکبر کا بیاہ ہو

قسمت وطن میں خیر سے پھر شہ کو لیکے جائے
یثرب میں شور ہو کہ سفر سے حسین آئے

اُم البنین جاہ و حشم سے پسر کھلائے
جلدی شب عروسی اکبر خدا دکھائے

مہندی تمہارا لال ملے ہاتھ پاؤں میں
لاؤ دلہن کو بیاہ کے تاروں کی چھاؤں میں

ناگاہ آکے بالی سکینہ نے یہ کہا
کیسا ہے یہ ہجوم کدھر ہیں مرے چچا

عہدہ علم کا ان کو مبارک کرے خدا
لوگو مجھے بلائیں تو لینے دو اک ذرا

شوکت خدا بڑھائے مرے عمو جان کی
میں بھی تو دیکھوں شان علی کے نشان کی

عباس مسکرا کے پکارے کہ آؤ آؤ
عمو نثار پیاس سے کیا حال ہے بتاؤ

بولے لپٹ کے وہ کہ مری مشک لیتے جاؤ
اب تو علم ملا تمھیں پانی مجھے پلاؤ

تحفہ کوئی نہ دیجے نہ انعام دیجیے
قربان جاؤں پانی کا اک جام دیجیے

باتوں پہ اس کی روتی تھیں سیدانیاں تمام
کی عرض آ کے ابن حسن نے کہ یا امام

ابنوہ ہے بڑھی چلی آتی ہے فوج شام
فرمایا آپ نے کہ نہیں ذکر کا مقام

عباس اب علم لیے باہر نکلتے ہیں
ٹھہرو بہن سے مل کے گلے ہم بھی چلتے ہیں

ڈیوڑھی پہ خادمانِ محل کی ہوئی پکار
آتے ہیں اب حضور خبردار ہوشیار

خلعت پہن رہے ہیں علمدارِ نامدار
نذریں خوشی کی دینے کو حاضر ہوں جاں نثار

بھائی بڑا ہے سر پہ تو سایہ ہے باپ کا
عہدہ جوان بیٹے نے پایا ہے باپ کا

ناگہ بڑھے علم لیے عباسِ باوفا
دوڑے سب اہلِ بیت کھلے سر برہنہ پا

حضرت نے ہاتھ اٹھا کے یہ اک ایک سے کہا
لو الوداع اے حرمِ پاک مصطفےٰ

صبح شبِ فراق ہے پیاروں کو دیکھ لو
سب مل کے ڈوبتے ہوئے تاروں کو دیکھ لو

شہ کے قدم پہ زینبِ زار و حزیں گری
بانو پچھاڑیں کھا کے پسر کے قریں گری

کلثوم تھرتھرا کے بروئے زمیں گری
باقر کہیں گرا تو سکینہ کہیں گری

اُجڑا چمن ہر اک گلِ تازہ نکل گیا
نکلا علم کہ گھر سے جنازہ نکل گیا

دیکھی جو شانِ حضرتِ عباس عرش جاہ
آگے بڑھی علم کے پس از تہنیت سپاہ

نکلا حرم سرائے دو عالم کا بادشاہ
نشتر بدل تھی بنت علی کی فغان و آہ

رہ رہ کے اشک بہتے تھے رخ پہ جناب کے
شبنم ٹپک رہی تھی گلِ آفتاب سے

مولا چڑھے فرس پہ محمد کی شان سے
ترکش لگا یا ہرنے پہ کس آن بان سے

نکلا یہ جن و انس و ملک کی زبان سے
اُترا ہے پھر زمیں پہ براق آسمان سے

سارا چلن خرام میں کبک دری کا ہے
گھونگھٹ نئی دولھن کا ہے چہرہ پری کا ہے

غصّے میں انکھڑیوں کے اُبلنے کو دیکھیے
جوبن میں جھوم جھوم کے چلنے کو دیکھیے

سانچے میں جوڑ بند کے ڈھلنے کو دیکھیے
تھم کر کنوتیوں کے بدلنے کو دیکھیے

گردن میں ڈالیں ہاتھ یہ پریوں کو شوق ہے
بالا دوی میں اوس کو ہما پر بھی فوق ہے

تھم کر ہوا چلی فرسِ خوش قدم بڑھا
جوں جوں وہ سوئے دشت بڑھا اور دم بڑھا

گھوڑوں کی پیش سواروں نے باگیں علم بڑھا
رایت بڑھا کہ سرو ریاضِ ارم بڑھا

پھولوں کو لیکے بادِ بہاری پہنچ گئی
بستانِ کربلا میں سواری پہنچ گئی

پنجہ ادھر چمکتا تھا اور آفتاب ادھر
اُس کی ضیا تھی خاک پہ ضو اس کی عرش پر

زر ریزیِ علم پہ ٹھہرتی نہ تھی نظر
دولھا کا رُخ تھا سونے کے سہرے میں جلوہ گر

تھے دو طرف جو دو علم اس ارتفاع کے
اُلجھے ہوئے تھے تار خطوطِ شعاع کے

اللہ ری سیاہ خدا کی شکوہ وشاں
بجھنے لگے جو دو ضلالت کے بھی نشاں

کمریں کسے علم کے تلے ہاشمی جواں
دنیا کی زیب دین کی عزّت جہاں کی جاں

ایک ایک دو دمان علی کا چراغ تھا
جس کو بہشت پر تھا تفوق وہ باغ تھا

لڑکے وہ سات آٹھ سہی قد سمن عذار
گیسو کسی کے چہرے پہ دو اور کسی کے چار

حیدر کا رُعب نرگسی آنکھوں سے آشکار
کھیلیں جو نیچوں سے کریں شیر کا شکار

تیروں کی سمت چاند سے سینے تنے ہوئے
آئے تھے عید گاہ میں دولھا بنے ہوئے

غرفوں سے حوریں دیکھ کے کرتی تھیں یہ کلام
دنیا کا باغ بھی ہے عجب پُر فضا مقام

دیکھو درود پڑھ کے سوئے لشکرِ امام
ہمشکلِ مصطفےٰ ہے یہی عرش احتشام

رایت لیے وہ لال خدا کے ولی کا ہے
اب تک جہاں میں ساتھ نبی و علی کا ہے

دُنیا سے اُٹھ گئے تھے جو پیغمبرِ زماں
ہم جانتے تھے حسن سے خالی ہے سب جہاں

کیونکر سوئے زمین نہ جھکے پیرِ آسماں
پیدا کیا ہے حق نے عجب حسن کا جواں

سب خوبیوں کا خاتمہ بس اس حسیں پہ ہے
محبوبِ حق ہیں عرش پہ سایہ زمیں پہ ہے

ناگاہ تیر اُدھر سے چلے جانبِ امام
گھوڑا بڑھا کے آپ نے حجت بھی کی تمام

نکلے اِدھر سے شہ کے رفیقانِ تشنہ کام
بے سر ہوئے پروں میں سرانِ سیاہ شام

بالا کبھی تھی تیغ کبھی زیرِ تنگ تھی
اک اک کی جنگ مالکِ اشتر کی جنگ تھی

نکلے پئے جہاد عزیزانِ شاہ دیں
نعرے کیے کہ خوف سے ہلنے لگی زمیں

روباہ کی صفوں پہ چلے شیرِ خشم گیں
کھینچی جو تیغ بھول گئے صف کشی لعیں

بجلی گری پروں پہ شمال و جنوب کے
کیا کیا لڑے ہیں شام کے بادل میں ڈوب کے

اللہ رے علی کے نواسوں کی کارزار
دونوں کے نیچے تھے کہ چلتی تھی ذوالفقار

شانہ کٹا کسی نے جو روکا سپر پہ وار
گنتی تھی زخمیوں کی نہ کشتوں کا کچھ شمار

اتنے سوار قتل کیے تھوڑی دیر میں
دونوں کے گھوڑے چھپ گئے لاشوں کے ڈھیر میں

وہ چھوٹے چھوٹے ہاتھ وہ گوری کلائیاں
آفت کی پھرتیاں تھیں غضب کی صفائیاں

ڈر ڈر کے کاٹتے تھے کماں کش کنائیاں
فوجوں میں تھیں نبی و علی کی دھائیاں

شوکت[1] ہویدا ہوتی تھی جنابِ امیر کی
طاقت دکھا دی شیروں نے زینبؑ کے شیر کی

کس حسن سے حسن کا جوانِ حسینؑ لڑا
گھر گھر کے صورتِ اسدِ خشمگیں لڑا

دو دن کی بھوک پیاس میں وہ مہ جبیں لڑا
سہرا لٹکے یوں کوئی دولھا نہیں لڑا

حملے دکھا دیئے اسدِ کردگار کے
مقتل میں سو گئے ارزق شامی کو مار کے

چمکی جو تیغ حضرتِ عباس عرش جاہ
روح الامیں پکارے کہ اللہ کی پناہ

ڈھالوں میں چھپ گیا پسرِ سعد روسیاہ
کشتوں سے بند ہو گئی امن و اماں کی راہ

جھپٹا جو شیر شوق میں دریا کی سیر کے
لے لی ترائی تینوں کی موجوں میں پیر کے

نے سر ہوئے موکلِ سرچشمۂ فرات
ہل چل میں مثلِ موج صفوں کو نہ تھا ثبات

دریا میں گر کے ڈوب گئے کتنے بدصفات
گویا حباب ہو گئے تھے نقطۂ حیات

عباس بھر کے مشک کو یوں تشنہ لب لڑے
جس طرح نہر واں میں امیرِ عرب لڑے

[1] شوکت ہویدا ہوتی تھی جنابِ امیر کی ۱۲

آفت تھی حربہ و ضربِ علی اکبر دلیر
سب سر بلند پست تھے بر دست سب تھے زیر
سر اُن کے اُترے تن سے جو تھے رن چڑھے ہوئے
تلواریں برسیں صبح سے نصف النہار تک
کانپا کیے پروں کو سمیٹے ہوئے ملک
ڈھالوں کا دور برچھیوں کا اوج ہو گیا
لاشے سبھوں کے سبط نبی خود اُٹھا کے لائے
دشمن کو بھی نہ دوست کی فرقت خدا دکھائے
اتنے پہاڑ گر پڑیں جس پر وہ خم نہ ہو
لاشے تو سب کے گرد تھے اور بیچ میں امام
افسردہ و حزین و پریشان و تشنہ کام
اعدا کسی شہید کا جب نام لیتے تھے
پوچھو اسی سے جس کے جگر پر ہوں اتنے داغ
فرصت نہ اب بکا سے نہ ماتم سے انفراغ
پڑتی تھی دھوپ سب کے تنِ پاش پاش پر
مقتل سے آئے خیمہ کے در پر شہِ زمن
پردے پہ ہاتھ رکھ کے پکارے بصد محن
پھر ایک بار اس مہِ انور کو دیکھ لیں
خیمے سے دوڑی آلِ پیمبر برہنہ سر
بچے کو لیکے بیٹھ گئے آپ خاک پر
غم کی چھری چلی جگرِ چاک چاک پر

غصے میں جھپٹے صید پہ جیسے گرسنہ شیر
جنگل میں چار سمت ہوئے زخمیوں کے ڈھیر
عباس سے بھی جنگ میں کچھ تھے بڑھے ہوئے
ہلتی رہی زمین لرزتے رہے فلک
نعرے نہ پھر وہ تھے نہ وہ تیغوں کی تھی چمک
ہنگامِ ظہر خاتمۂ فوج ہو گیا
قاتل کسی شہید کا سر کاٹنے نہ پائے
فرماتے تھے بچھڑ گئے سب ہم سے ہائے ہائے
گر سو برس جیوں تو یہ مجھ بہم نہ ہو
ڈوبی ہوئی تھی خوں میں نبی کی قبا تمام
برچھی تھی دل کو فتح کے باجوں کی دھوم دھام
تھرا کے دونوں ہاتھوں سے دل تھام لیتے تھے
اک عمر کا ریاض تھا جس پر لٹا وہ باغ
جو گھر کی روشنی تھے وہ گل ہو گئے چراغ
چادر بھی اک نہ تھی علی اکبر کی لاش پر
پر شدتِ عطش سے نہ تھی طاقتِ سخن
اصغر کو گاہوارے سے لے آؤ اے بہن
اکبر کے شیر خوار برادر کو دیکھ لیں
اصغر کو لائیں ہاتھوں پہ بانوئے نوحہ گر
منہ سے ملے جو ہونٹ تو چونکا وہ سیمبر
سنبھالا لیا حسین نے زانوئے پاک پر

بچے سے ملتفت تھے شہِ آسماں سریر
تھا اس طرف کمیں میں بنِ کاہل شریر

مارا جو تین پھال کا اس نے حیلے تیر
بس دفعتاً نشانہ ہوئی گردنِ صغیر

تڑپا جو شیر خوار تو حضرت نے آہ کی
معصوم ذبح ہو گیا گودی میں شاہ کی

جس دم تڑپ کے مر گیا وہ طفلِ شیر خوار
چھوٹی سی قبر تیغ سے کھودی بحالِ زار

بچے کو دفن کر کے پکارا وہ ذی وقار
ای خاک پاک حرمت مہماں نگاہ دار

دامن میں رکھ اسے جو محبت علی کی ہے
دولت ہے فاطمہ کی امانت نبی کی ہے

پہلے پہل چھٹا ہے یہ ماں کی کنار سے
واقف نہیں ہے قبر کی شبہائے تار سے

ای قبر ہوشیار مرے گلعذار سے
گردن چھدی ہوئی ہے بچانا نثار سے

سیّد ہے لال حضرت خیر النسا کا ہے
معصوم ہے شہید ہے بندہ خدا کا ہے

یہ کہہ کے آئے فوج پہ تولے ہوئے حسام
آنکھیں لہو تھیں رونے سے چہرہ تھا رخ فام

زیبِ بدن کیے تھے بصد عز و احتشام
پیراہن مطہرِ پیغمبرِ انام

حمزہ کی ڈھال تیغ شہِ لافتا کی تھی
بر میں زرہ جناب رسول خدا کی تھی

رستم تھا درع پوش کہ پاکھر میں را ہوار
جرار بردبار سبک رو وفا شعار

کیا خوشنما تھا زین طلا کار و نقرہ کار
اکسیر تھا قدم کا جسے مل گیا غبار

خوش خو تھا خانہ زاد تھا دل نژاد تھا
شبدیز بھی سخی تھے فرس بھی جواد تھا

گرمی کا روزِ جنگ کی کیونکر کروں بیاں
ڈر ہے کہ مثلِ شمع نہ جلنے لگے زباں

وہ لوں کہ الحذر وہ حرارت کہ الاماں
رن کی زمیں تو سرخ تھی اور زرد آسماں

آبِ خنک کو خلق ترستی تھی خاک پر
گویا ہوا سے آگ برستی تھی خاک پر

وہ لوں وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب
کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب

خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب
خیمے تھے جو جابلوں کے تپتے تھے سب کے سب

اڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

جھیلوں سے چارپائے اُٹھتے تھے تا بہ شام
مسکن میں مچھلیوں کے سمندر کا تھا مقام

آہو جو کاہلے تھے تو چیتے سیاہ فام
پتھر گھپل کے رہگئے تھے مثلِ موم خام

سُرخی اُڑی تھی پھولوں سے سبزی گیاہ سے
پانی کنوؤں میں اُترا تھا ساے کی چاہ سے

آبِ رواں سے مُنہ نہ اُٹھاتے تھے جانور
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر اِدھر اُدھر

مردم تھی سات پردوں کے اندر عرق میں تر
خس خانہ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر

گر چشم سے نخل کے ٹھہر جاے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پاے نگاہ میں

کوسوں کسی شجر میں نہ گل تھے نہ برگ و بار
ایک ایک نخل جل رہا تھا صورتِ چنار

ہنستا تھا کوئی گل نہ لہکتا تھا سبزہ زار
کانٹا ہوئی تھی سوکھ کے ہر شاخ بار دار

گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے
پتے بھی مثلِ چہرۂ مدقوق زرد تھے

شیر اُٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے
آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے

آئینہ مہر کا تھا مکدّر غبار سے
گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلہ جوالہ کا گماں
انگارہ تھے حباب تو پانی شرر فشاں

مُنہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں
تہ پر تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں

پانی تھا آگ گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

آئینۂ فلک کو نہ تھی تاب و تب کی تاب
چھپنے کو برق چاہتی تھی دامنِ سحاب

سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کو اضطراب
کافورِ صبح ڈھونڈھتا پھرتا تھا آفتاب

بھڑکی تھی آگ گنبدِ چرخِ اثیر میں
بادل چھپے تھے سب کرۂ زمہریر میں

امن و سکوں تھا دامنِ رحمت پناہ میں
تھی دامنِ رسول تلے سایۂ علم

شعلے جگر سے آہ کے اُٹھتے تھے دم بدم
اودے تھے لب بیان میں کانٹے کمر میں خم

نے آب تیسرا تھا جو دن میہمان کو
ہوتی تھی بات بات میں لکنت زبان کو

گھوڑوں کو پانی کرتے تھے سیراب سب سوار
آتے تھے اونٹ گھاٹ پہ باندھے ہوئے قطار

پیتے تھے آبِ نہر پرند آکے بے شمار
صفّے زمیں پہ کرتے تھے چھڑکاؤ بار بار

پانی کا دام و دد کو پلانا ثواب تھا
اک ابنِ فاطمہ کے لیے قحطِ آب تھا

سر پر لگائے تھا پسرِ سعد چترِ زر
خادم کئی تھے مروحہ جنباں ادھر اُدھر

کرتے تھے آب پاش مکرر زمیں کو تر
فرزندِ فاطمہ پہ نہ تھا سایۂ شجر

وہ دھوپ دشت کی وہ جلال آفتاب کا
سونا لگا گیا تھا رنگِ مبارک جناب کا

کہتا تھا ابنِ سعد کہ اے آسماں جناب
بیعت جو تب کیجیے اب بھی تو حاضر ہے جامِ آب

فرماتے تھے حسین کہ او خانماں خراب
دریا کو خاک جانتے ہیں ابنِ بوتراب

فاسق ہے پاس کچھ تجھے اسلام کا نہیں
آبِ بقا ہو یہ تو مرے کام کا نہیں

کہدوں تو خوان لیکے خود آئیں ابھی خلیل
چاہوں تو سلسبیل کو دم میں کروں سبیل

کیا جامِ آب کا تو مجھے دے گا او ذلیل
نے آبرو حسیں ستم گر دنی بخیل

جس پھول پر پڑے ترا سایہ وہ بو نہ دے
کھلوائے قصد تو تو کبھی رگ لہو نہ دے

گر جم کا نام لوں تو ابھی جام لیکے آئے
کوثر ہیں رسول کا احکام لیکے آئے

روح الامیں زمیں پہ مرا نام لیکے آئے
لشکر ملک کا فتح کا پیغام لیکے آئے

چاہوں جو انقلاب تو دُنیا تمام ہو
اُلٹے زمیں یوں کہ نہ کوفہ نہ شام ہو

فرما کے یہ نگاہ جو کی سوئے ذوالفقار
ٹھوکر کے پچھلے پاؤں ہٹا وہ ستم شعار

مظلوم پر صفوں سے چلے تیر بے شمار
آواز کوسِ حرب ہوئی آسماں کے پار

نیزے اُٹھا کے جنگ پہ اسوار تل گئے
کالے نشان فوجِ سیہ رو کے کھل گئے

وہ دھوم طبلِ جنگ کی وہ بوق کا خروش
کر ہو گئے تھے شور سے کروبیوں کے گوش

تھرائی یوں زمیں کہ اُڑے آسماں کے ہوش
نیزے ہلا کے نکلے سواران درع پوش

ڈھالیں تھیں یوں سروں پہ سواران شوم کے
صحرا میں جیسے آئی گھٹا جھوم جھوم کے

جب رن میں تیغ توں کے سلطانِ دیں بڑھے
گیتی کے تھام لینے کو روح الامیں بڑھے

مانندِ شیر نر کہیں ٹھہرے کہیں بڑھے
گویا علی اُلٹتے ہوئے آستیں بڑھے

جلوہ دیا جری نے عروسِ مضاف کو
مشکل کشا کی تیغ نے چھوڑا غلاف کو

کاٹھی سے اس طرح ہوئی وہ شعلہ خو جدا
جیسے کنارِ شوق سے ہو خوبرو جدا

مہتاب سے شعاع جدا گل سے بو جدا
سینے سے دم جدا رگِ جاں سے لہو جدا

گرجا جو رعد ابر سے بجلی نکل پڑی
محمل میں دم جو گھٹ گیا لیلیٰ نکل پڑی

آئے حسین یوں کہ عقاب آئے جس طرح
کافر پہ کبریا کا عتاب آئے جس طرح

تابندہ برق ہوئے سحاب آئے جس طرح
دوڑا فرس نشیب میں آب آئے جس طرح

یوں تیغ تیز کوند گئی اس گروہ پر
بجلی تڑپ کے گرتی ہے جس طرح کوہ پر

گرمی میں برق تیغ جو چمکی شرر اڑے
جھونکا چلا ہوا کا جو سن سے تو سر اڑے

پر کالۂ سپر چوادھر اور اُدھر اُڑے
روح الامیں نے صاف یہ جانا کہ پر اُڑے

ظاہر نشان اسم عزیمت اثر ہوئے
جن پر علی لکھا تھا وہی پر سپر ہوئے

جس پر چلی وہ تیغ دو پارا کیا اسے
کھنچتے ہی چار ٹکڑے دوبارا کیا اسے

واں بھی جدھر اجل نے اشارا کیا اسے
سختی بھی کچھ پڑی تو گوارا کیا اسے

زیں تھا نہ فرس تھا نہ اسوار زین پر
کڑیاں زرہ کی بکھری ہوئی تھیں زمین پر

آئی چمک کے غول پہ جب سر گرا گئی
دم میں جمی صفوں کو برابر گرا گئی

ایک ایک قصر تن کو زمیں پر گرا گئی
سیل آئی زور شور سے جب گھر گرا گئی

آپہونچا اس کے گھاٹ پہ جو مر کے رہ گیا
دریا لہو کا تیغ کے پانی سے بہ گیا

اس آب پر یہ شعلہ فشانی خدا کی شان
پانی میں آگ آگ میں پانی خدا کی شان

خاموش اور تیز زبانی خدا کی شان
استادہ آب میں یہ روانی خدا کی شان

لہر آئی جب اُتر گیا دریا چڑھا ہوا
نیزوں، تھا ذوالفقار کا پانی بڑھا ہوا

قلب و جناح میمنہ و میسرا تباہ
جنباں زمیں صفیں تہ و بالا پر اتباہ
بازار بند ہو گئے جھنڈے اکھڑ گئے
فوجیں ہوئیں تباہ محلے اجڑ گئے

اللہ ری تیزی و برش اس شعلہ رنگ کی
چمکی سوار پر تو خبر لائی تنگ کی
پیاسی فقط لہو کی طلبگار جنگ کی
حاجت نہ سان کی تھی اسے نہ سنگ کی
خوں سے فلک کو لاشوں سے مقتل کو بھرتی تھی
سو بار رزمیں چرخ پہ چڑھتی اترتی تھی

تیغ خزاں تھی گلشن ہستی سے کیا اسے
گھر جس کا خود اجڑ گیا بستی سے کیا اسے
وہ حق نما تھی کفر پرستی سے کیا اسے
جو آپ سر بلند ہو پستی سے کیا اسے
کہتے ہیں راستی جسے وہ غم کے ساتھ ہے
تیزی زباں کے ساتھ برش دم کے ساتھ ہے

سینے پہ چل گئی تو کلیجہ لہو ہوا
گویا جگر میں موت کا ناخن فرو ہوا
چمکی تو الامان کا غل چار سو اٹھا
جو اس کے منہ پہ آ گیا لے آبرو ہوا
رکتا تھا ایک وار نہ دس سے نہ پانچ سے
چہرے سیاہ ہو گئے تھے اس کی آنچ سے

بچھ بچھ گئیں صفوں پہ صفیں وہ جہاں چلی
چمکی تو اس طرف اودھر آئی وہاں چلی
دونوں طرف کی فوج پکاری کہاں چلی
اس نے کہا یہاں وہ پکارا وہاں چلی
منہ کس طرف ہے تیغ دونوں کو خبر نہ تھی
سر گر رہے تھے اور تنوں کو خبر نہ تھی

دشمن جو گھاٹ پر تھے وہ دھوئے تھے جان سے
گردن سے سر الگ تھا جدا تھے نشان سے ہاتھ
توڑا کبھی جگر کبھی چھیدا سناں سے ہاتھ
جب کٹ کے گر پڑیں تو پھر آئیں کہاں سے ہاتھ
اب ہاتھ دستیاب نہ تھے منہ چھپانے کو
ہاں پاؤں رہ گئے تھے فقط بھاگ جانے کو

اللہ رے خوف تیغ شہ کائنات کا
زہرہ تھا آب خوف کے مارے فرات کا
دریا میں حال یہ تھا ہر اک بد صفات کا
چارہ فرار کا تھا نہ یارا ثبات کا
غل تھا کہ برق گرتی ہے ہر درع پوش پر
بھاگو خدا کے قہر کا دریا ہے جوش پر

ہر چند مچھلیاں تھیں زرہ پوش سر بسر
منہ کھولے چھپتی پھرتی تھیں لیکن ادھر ادھر

بھاگی تھی موج چھوڑ کے گرداب کی سپر
تھے تہ نشین نہنگ مگر آب تھے جگر

دریا نہ تھمتا خوف سے اس برق تاب کے
لیکن پڑے تھے پاؤں میں چھالے حباب کے

آیا خدا کا قہر جدھر سن سے آ گئی
کانوں میں لاماں کی صدا رن سے آ گئی

دو کر کے خود زمین پہ جوشن سے آ گئی
کھنچتی ہوئی زمین پہ توسن سے آ گئی

بجلی گری جو خاک پہ تیغ جناب کی
آئی صدا زمین سے یا بو تراب کی

پس پس کے کشمکش سے کمانیں ادھڑ گئیں
چلّے تو سب چڑھے رہے بازو اتر گئے

گوشے کٹے کمانوں کے تیروں کے پر گئے
مقتل میں ہو سکا نہ گزارا گزر گئے

دہشت سے ہوش اڑ گئے تھے مکر و وہم کے
سوفار کھول دیتے تھے منھ سہم سہم کے

تیر افگنی کا جن کی ہر اک شہر میں تھا شور
گوشہ کہیں نہ ملتا تھا ان کو سوائے گور

تاریک شب میں جن کا نشانہ تھا پائے مور
لشکر میں خوف جاں نے انھیں کر دیا تھا کور

ہوش اڑ گئے تھے فوج ضلالت نشان کے
پیکاں میں زہ کو رکھتے تھے سوفار جان کے

صف چیریں پروں پہ پر سے پیش و پس گرے
اسوار پر سوار فرس پر فرس گرے

اٹھ کر زمیں سے پانچ جو بھاگے تو دس گرے
مخبر پہ پیک پیک پہ مر کر عسس گرے

ٹوٹے پرے شکست بنائے ستم ہوئی
دنیا میں اس طرح کی بھی اک فتا و کم ہوئی

غصے تھا شیر شرزۂ صحرائے کربلا
چھوڑے تھا گرگ منزل و مائے کربلا

تیغ علی تھی معرکہ آرائے کربلا
خالی نہ تھی سروں سے کہیں جائے کربلا

بستی بسی تھی مردوں کی قریے اجاڑ تھے
لاشوں کی تھی زمین سروں کے پہاڑ تھے

غازی نے رکھ لیا تھا جو شمشیر کے تلے
تھی طرفہ کش مکش فلک پیر کے تلے

چھٹتی تھی سر جھکائے کماں تیر کے تلے
سہمے تھے سب پہ گوشۂ امن و اماں نہ تھا

اس تیغ بے دریغ کا جلوہ کہاں نہ تھا

چاروں طرف کمانِ کیانی کی وہ ترنگ
رہ رہ کے ابر شام سے تھی باش خدنگ

وہ شور و صیحۂ فرسِ ابلق و سرنگ
وہ لوں وہ آفتاب کی تابندگی وہ جنگ

پھنکتا تھا دشتِ کیں کوئی دل تھا نہ چین سے
اس دن کی رات کوئی پوچھے حسین سے

سقے پکارتے تھے یہ مشکیں لیے اُدھر
بازارِ جنگ گرم ہی ڈھلتی ہی دوپہر

پیاسا جو ہو وہ پانی سے ٹھنڈا کرے جگر
مشکوں پہ دوڑ دوڑ کے گرتے تھے اہلِ شر

کیا آگ لگ گئی تھی جہانِ خراب کو
پیتے تھے سب حسین ترستے تھے آب کو

گرمی میں پیاس تھی کہ پھنکا جاتا تھا جگر
اُف اُف کبھی کہا کبھی چہرے پہ لی سپر

آنکھوں میں ٹیس اٹھی جو پڑی دھوپ پر نظر
چھٹے کبھی ادھر کبھی حملہ کیا اُدھر

کثرتِ عرق کے قطروں کی تھی روئے پاک
موتی برستے جاتے تھے مقتل کی خاک پر

سیراب پھپتے پھرتے تھے پیاسے کی جنگ سے
چلتی تھی ایک تیغِ علی لاکھ رنگ سے

چمکی جو فرق پر تو نکل آئی تنگ سے
رُکتی تھی ذی سپر سے نہ آہن نہ سنگ سے

خالق نے منہ دیا تھا عجب آب و تاب کا
خود اس کے سامنے تھا پھپھولا حباب کا

سہمے ہوئے تھے یوں کہ کسی کو نہ تھی خبر
پیکاں کدھر ہی تیر کا سوفار ہی کدھر

مردم کی کش مکش سے کمانوں کو تھا یہ ڈر
گوشوں کو ڈھونڈھتی تھیں زمین پر جھکا کے سر

ترکش سے کھینچے تیر کوئی یہ جگر نہ تھا
جس نے کہ سر پہ ہاتھ رکھا تن پہ سر نہ تھا

گھوڑے کی وہ تڑپ وہ چمک تیغِ تیز کی
سو سو صفیں کچل گئیں جب جست و خیز کی

لاکھوں میں تھی نہ ایک کو طاقت ستیز کی
تھی چار سمت دھوم گریز و گریز کی

آری جو ہو گئیں تھیں وہ سب ذوالفقار سے
تیغوں نے منہ پھیر لیے تھے کارزار سے

اللہ ری لڑائی میں شوکت جناب کی
سونلائے رنگ میں تھی ضیا آفتاب کی

سوکھے تھے لب کہ پنکھڑیاں تھیں گلاب کی
تصویر ذوالجناح پہ تھی بو تراب کی

ہوتا تھا غل جو کرتے تھے نعرے لڑائی میں
بھاگو کہ شیر گونج رہا ہی ترائی میں

پھر تو یہ غل ہوا کہ دہائی حسینؑ کی
اللہ کا غضب تھا لڑائی حسینؑ کی

دریا حسین کا ہے ترائی حسینؑ کی
دُنیا حسین کی ہے خدائی حسینؑ کی

بیڑا بچایا آپ نے طوفاں سے نوح کا
اب رحم واسطہ علی اکبر کی روح کا

اکبر کا نام سن کے جگر پر لگی سناں
آنسو بھر آئے روک لی ہموار کی عناں

مڑ کر پکارے لاش پسر کو شہِ زماں
تم نے نہ دیکھی جنگِ پدر اے پدر کی جاں

قسمیں تمھاری روح کی یہ لوگ دیتے ہیں
لو اب تو ذوالفقار کو ہم روک لیتے ہیں

چلایا ہاتھ مار کے زانو پہ ابنِ سعد
اے وا فضیحتا یہ ہزیمت ظفر کے بعد

زیبا دلاوروں کو نہیں ہے خلافِ وعد
اک پہلواں یہ سُنتے ہی گرجا مثالِ رعد

نعرہ کیا کہ کرتا ہوں حملہ امام پر
اے ابن سعد لکھ لے ظفر میرے نام پر

بالافد و کلفت و تنومند و خیرہ سر
روئیں تن و سیاہ دروں آہنی کمر

ناوک پیامِ مرگ کے ترکش اجل کا گھر
تیغیں ہزار ٹوٹ گئیں جس پہ وہ سپر

دل میں بدی طبیعتِ بد میں بگاڑ تھا
گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پہ پہاڑ تھا

ساتھ اُس کے اور اسی قد و قامت کا ایک یل
آنکھیں کبود رنگ سیہ ابروؤں پہ بل

بدکار و بدشعار و ستمگار و پر دغل
جنگ آزما بھگائے ہوئے لشکروں کے دل

بھالے لیے کسے ہوئے کمریں ستیز پر
نازاں وہ ضرب گرز پہ یہ تیغ تیز پر

کھنچ جائے شکل حرب وہ تدبیر چاہیئے
دشمن بھی سب مقر ہوں وہ تقریر چاہیئے

تیزی زباں میں صورتِ شمشیر چاہیئے
فولاد کا قلم دمِ تحریر چاہیئے

نقشہ کھنچے گا صاف صفِ کارزار کا
پانی دوات چاہتی ہے ذوالفقار کا

لشکر میں اضطراب تھا فوجوں میں کھلبلی
سادات نے جو اس ہزبر سا دھنی بلی

ڈر تھا کہ لو حسین بڑھے تیغ اب چلی
غل تھا ادھر ہیں مرحب و عنتر ادھر علی

کون آج سربلند ہو اور کون پست ہو
کس کی ظفر ہو دیکھیے کس کی شکست ہو

آواز دی یہ ہاتفِ غیبی نے تب کہ ہاں
بسم اللہ ای امیرِ عرب کے سرورِ جاں

اُٹھی علی کی تیغِ دو دم چاٹ کر زباں
بیٹھے درست ہو کے فرسِ پر شہِ زماں

واں سے وہ شور بخت بڑھا نعرہ مار کے
پانی بھر آیا منہ میں ادھر ذوالفقار کے

لشکر کے سب جواں تھے لڑائی میں جی لڑائے
وہ بد نظر تھا آنکھوں میں آنکھیں ادھر گڑائے

ڈھالیں لڑیں سپاہ کی یا ابر گڑگڑائے
غصے میں آ کے گھوڑے نے بھی دانت کڑکڑائے

ماری جو ٹاپ ڈپ کے ہٹے ہٹ لعیں کے پاؤں
ماہی پہ ڈگمگا گئے گاؤ زمیں کے پاؤں

نیزہ ہلا کے شاہ پر آیا وہ خود پسند
مشکل کشا کے لال نے کھولے تمام بند

تیر و کماں سے بھی نہ ہوا جب وہ بہرہ مند
چلّہ ادھر کھنچا کہ چلی تیغِ سر بلند

وہ تیر کٹ گئے جو دراتے تھے سنگ میں
گوشے نہ تھے کماں میں نہ پیکاں خدنگ میں

ظالم اُٹھا کے گرز کو آیا جناب پر
طاری ہوا غضب خلفِ بوتراب پر

مارا جو ہاتھ پاؤں جما کر رکاب پر
بجلی گری شقی کے سرِ پُر عتاب پر

بد ہاتھ میں شکست ظفر نیک ہاتھ میں
ہاتھ اُڑ کے جا پڑا کئی ہاتھ ایک ہاتھ میں

کچھ دست پاچہ ہو کے چلا تھا وہ نابکار
پنجے سے پر اجل کے کہاں جا سکے شکار

واں اُس نے بائیں ہاتھ میں لی تیغِ آبدار
یاں سر سے آئی پشت کے مہروں پہ ذوالفقار

قربان تیغ تیز شہِ نامدار کے
دو ٹکڑے تھے سوار کے دو راہوار کے

پھر دوسرے پہ گرز اُٹھا کر پکارے شاہ
کیوں ضربِ ذوالفقار پہ تو نے بھی کی نگاہ

سرشار تھا شرابِ تکبر سے روسیاہ
جاتا کہاں کہ موت تو رکھے ہوئے تھی راہ

غل تھا اسے اجل نے بڑھایا جو گھیر کے
لو دوسرا شکار چلا منہ میں شیر کے

آتا تھا وہ کہ اسپِ شہِ دیں پلٹ پڑا
ثابت ہوا کہ شیرِ گرسنہ جھپٹ پڑا

تیغہ شقی نے ڈھال پہ مارا تو پٹ پڑا
ضربت پڑی کہ گنبدِ دوّار پھٹ پڑا

پیوند صدر زیں جسد و فرق ہو گیا
گھوڑا زمیں میں سینے تلک غرق ہو گیا

پریوں سے قاف چھوٹ گیا اور جنوں سے گھر
شیروں سے دشت گگ سے بن اڑ دروں سے در

شاہین و کبک چھپ گئے اک جا ہلا کے سر
اُڑ کر گرے جزیروں میں جنگل کے جانور

سمٹے پہاڑ منھ کو جو دامن سے ڈھانپ کے
سیمرغ نے گرا دیئے پر کانپ کانپ کے

آئی صدائے غیب کہ شبیر مرحبا
اِس ہاتھ کے لیے تھی یہ شمشیر مرحبا

یہ آبرو یہ جنگ یہ توقیر مرحبا
دکھلا دی ماں کے دودھ کی تاثیر مرحبا

غالب کیا خدا نے تجھے کائنات پر
بس خاتمہ جہاد کا ہے تیری ذات پر

بس اب نہ کر وغا کی ہوس اے حسین بس
دم لے ہوا میں چند نفس اے حسین بس

گرمی سے ہانپتا ہے فرس اے حسین بس
وقت نماز عصر ہے بس اے حسین بس

پیاسا لڑا نہیں کوئی یوں اژدہام میں
اب اہتمام چاہیئے امت کے کام میں

لبیک کہہ کے تیغ رکھی شہ نے میان میں
پلٹی سپاہ آئی قیامت جہان میں

پھر سرکشوں نے تیر ملائے کمان میں
پھر کھل گئے اپٹ کے پھریرے نشان میں

بیکس حسینؑ ظلم شعاروں میں گھر گئے
مولا تمھارے لاکھ سواروں میں گھر گئے

سینے پہ سامنے سے چلے دس ہزار تیر
چھاتی پہ لگ گئے کئی سو ایک بار تیر

پہلو کے پار برچھیاں سینے کے پار تیر
پڑتے تھے دس جو کھینچتے تھے تن سے چار تیر

یوں تھے خدنگ ظل الٰہی کے جسم پر
جس طرح خار ہوتے ہیں ساہی کے جسم پر

چلتے تھے چار سمت سے بھالے حسین پر
ٹوٹے ہوئے تھے برچھیوں والے حسین پر

یہ دُکھ نبی کے گود کے پالے حسین پر
قاتل تھے خنجروں کو نکالے حسین پر

تیر ستم نکالنے والا کوئی نہ تھا
گرتے تھے اور سنبھالنے والا کوئی نہ تھا

لاکھوں میں ایک بیکس و دلگیر ہائے ہائے
فرزند فاطمہ کی یہ توقیر ہائے ہائے

بھالے وہ اور وہ پہلوئے شبیر ہائے ہائے
وہ زہر میں بجھائے ہوئے تیر ہائے ہائے

غصے میں تھے جو فوج کے سرکش بھرے ہوئے
خالی کیے حسین پہ ترکش بھرے ہوئے

وہ گرد تھے جو بھاگتے پھرتے تھے وقت جنگ
اک سنگ دل نے پاس سے مارا جبیں پہ سنگ

صدمے سے زرد ہو گیا سبط نبی کا رنگ
ماتھے پہ ہاتھ تھا کہ گلے پر لگا خدنگ

تھاما گلا جناب نے ماتھے کو چھوڑ کے
نکلا وہ تیر حلق مبارک کو توڑ کے

کھا ہی تین پھال کا تھا ناوک ستم
منہ کھل گیا الٹ گئی گردن کا جو دم

کھینچی چھری گلے کی طرف سے بچشم نم
بھالیں کنالیں پشت کی جانب سے ہو کے خم

اُبلا جو خوں نکلتا ہوا دم ٹھہر گیا
چلو رکھا جو زخم کے نیچے تو بھر گیا

دشمن تھا شہ کا اور سلمی عدو سے دیں
سر پر لگائی تیغ کہ شق ہو گئی جبیں

ماری جگر پہ ابن انس نے سنان کیں
بھاگا گرو کے کوکھ میں برچھی کو اک لعیں

گھوڑے پہ ڈگمگا کے جو حضرت نے آہ کی
تھرا گئی ضریح رسالت پناہ کی

گرتے ہیں اب حسین فرس پر سے ہی غضب
نکلی رکاب پائے مطہر سے ہی غضب

پہلو تہی کا فتہ ہوا خنجر سے ہی غضب
غش میں جھکے عمامہ گرا سر سے ہی غضب

قرآن رحل زیں سے سر فرش گر پڑا
دیوار کعبہ بیٹھ گئی عرش گر پڑا

گر گر کبھی اٹھے کبھی کھا ز میں پہ سر
اُگلا کبھی لہو تو سنبھالا کبھی جگر

حسرت سے کی خیام کی جانب کبھی نظر
کروٹ کبھی تڑپ کے ادھر لی کبھی اُدھر

اٹھ بیٹھے جب تو زخموں سے برچھی کے پھل گرے
تیر اور تن میں گڑ گئے جب منھ کے بل گرے

جنگل سے آئی فاطمہ زہرا کی یہ صدا
اُمت نے مجکو لوٹ لیا وا محمدا

اس وقت کون حق محبت کرے ادا
ہی ہی یہ ظلم اور دو عالم کا مقتدا

انیس سو ہیں زخم تن چاک چاک پر
زینب نکل حسین تڑپتا ہی خاک پر

پردہ الٹ کے بنت علی نکلی ننگے سر
لرزاں قدم خمیدہ کمر غرق خوں جگر

چاروں طرف پکارتی تھی سر کو پیٹ کر
ای کربلا بتا ترا مہمان ہی کدھر

اماں قدم ابھی اٹھتے نہیں تشنہ کام کے
پہونچا وہ لاش پر سے بازو کو تھام کے

اس وقت سب جہان مری آنکھوں میں ہے سیاہ
لوگو خدا کے واسطے مجکو بتاؤ راہ

سیدکدھر پتا ہی اماں کدھر ہیں آہ
کس سمت ہی نبی کے نواسے کی قتل گاہ

شعلے دل و جگر سے نکلتے ہیں آہ کے
یہ کون نام لیتا ہی میرا کراہ کے

کس نے صدا یہ دی کہ ہین اس طرف نہ آؤ
بس اب سفر قریب ہی بلند گھر میں جاؤ

اب ڈوبتی ہی آل رسول خدا کی ناؤ
یا مرتضےٰ غریبوں کے بیڑے کو تم بچاؤ

اب چھوڑیو نہ دشت بلا میں حسینؑ کو
یا فاطمہ چھپالو ردا میں حسینؑ کو

بنت علی تو پیٹتی پھرتی تھی ننگے سر
کٹتا تھا نور چشم علی کا گلا ادھر

زینب کو منع کرتے تھے ہرچند اہل شر
لیکن وہ دوڑی جاتی تھی بھائی کی لاش پر

پہونچی جو قتل گاہ میں اس روک ٹوک پر
دیکھا سر حسینؑ کو نیزے کی نوک پر

نیزے کے نیچے جاکے پکاری وہ سوگوار
سیدتری لہو بھری صورت کے میں نثار

ہی ہی گلے پہ چل گئی بھیا چھری کی دھار
بھولے ہین کو ای اسد حق کی یادگار

صدقے گئی کٹا گئے گھر وعدہ گاہ میں
جنبش لبوں کو ہی ابھی یاد الٰہ میں

بھیا سلام کرتی ہی خواہر جواب دو
چلا رہی ہی دختر حیدر جواب دو

سوکھی زباں سے بہر پیمبر جواب دو
کیوں کر جیئے گی زینب مضطر جواب دو

جز مرگ درد ہجر کا چارا نہیں کوئی
میرا تو اب جہاں میں سہارا نہیں کوئی

بھیا میں اب کہاں سے تمھیں لاؤ کیا کروں
کیا کہہ کے اپنے دل کو میں سمجھاؤں کیا کروں

کس کی دہائی دوں کسے چلاؤں کیا کروں
بستی پرائی ہی میں کدھر جاؤں کیا کروں

دنیا تمام اجڑ گئی ویرانہ ہو گیا
بیٹھوں کہاں کہ گھر تو عزا خانہ ہو گیا

ہی ہی تمھارے آگے نہ خواہر گزر گئی
بھیا بتاؤ کیا تہ خنجر گذر گئی

آئی صدا نہ پوچھو جو ہم پر گذر گئی
صد شکر جو گزر گئی بہتر گذر گئی

سر کٹ گیا ہمیں تو الم سے فراغ ہی
گر ہی تو بس تمھاری جدائی کا داغ ہی

گھر لوٹنے کو آئے گی اب فوج نابکار
کہیو نہ کچھ زباں سے بجز شکر کردگار

خیمے میں جبکہ آگ لگا دیں ستم شعار
رہیو مری یتیم سکینہ سے ہوشیار

بیمار ہو وہ خستہ جگر اپنی جان سے
باندھے نہ کوئی اس کا گلا ریسمان سے

بس اے انیس ضعف سے لرزاں ہے بند بند
عالم کو یادگار رہینگے یہ چند بند

نکلے قلم سے ضعف میں کیا کیا بلند بند
عالم پسند بند ہیں سلطاں پسند بند

یہ فصل اور یہ بزم عزا یادگار ہے
پیری کے ولولے میں خزاں کی بہار ہے

رُباعی

گر لاکھ برس جیے تو پھر مرنا ہے
پیمانۂ عمر ایک دن بھرنا ہے

ہاں توشۂ آخرت مہیا کر لے
غافل تجھے دُنیا سے سفر کرنا ہے

رُباعی

کس طرح کرے نہ ایک عالم افسوس
جی بھر کے کیا نہ شہ کا ماتم افسوس

کیا جلد گزر گئے یہ دس دن غم کے
یوں صاحبو ہو گیا محرّم افسوس

رُباعی

قاسم کو عدو نے خوں میں جب لال کیا
شبیرؑ نے یہ کہہ کے عجب حال کیا

تابوت پہ جس کے باپ کے اے تیر
گھوڑوں کے سموں سے اس کو پامال کیا

مرثیہ ۱۷

جب خاتمہ بخیر ہوا فوج شاہ کا
کوثر پہ قافلہ گیا پیاسی سپاہ کا

گھر لُٹ گیا جنابِ رسالت پناہ کا
خاک اُڑ رہی تھی حال یہ تھا بارگاہ کا

بھائی نہ وہ رفیق نہ وہ نورِ عین تھے
دو تھے نہیں رونے والیاں تھیں اک حسین تھے

ڈیوڑھی وہ صبح تک تھے دو دستہ جہاں سوار
خادم ہے واں کوئی نہ کوئی ہے فیق و یار

وہ لوں وہ دوپہر کی تپش اور وہ غبار
پردہ ہوا سے سر کو ٹپکتا تھا بار بار

آفت تھی بیکسی تھی مصیبت تھی یاس تھی
نے فوج بادشاہ تھا ڈیوڑھی اُداس تھی

وہ گھر کہ جس میں لاتے تھے جبریلِ وحی رب
واں تیر فوجِ ظلم سے آتے تھے ہے غضب

نہوڑائے سر کھڑے تھے شہنشاہِ تشنہ لب
تر تھا جواں پسر کے لہو سے لباس سب

لب پیاس سے کبود تھے رخسار زرد تھے
مولا کی ایک جان تھی اور لاکھ درد تھے

فرماتے تھے کہ واہ یہ تاخیر اے اجل
اکبر کے بعد کونسا تھا زیست کا محل

اب مجکو اک برس کے برابر ہے ایک پل
موت آئے اب یہ ہے شجر زندگی کا پھل

اک جا چھری گلوں پہ جو چلتی تو خوب تھا
یہ جان اُن کے ساتھ نکلتی تو خوب تھا

اُٹھتا نہیں حسین سے اب بارِ زندگی
اے موت اب گرا کہیں دیوارِ زندگی

جیتے رہیں وہ جو ہیں طلبگارِ زندگی
اب دق ہے اپنی جان سے بیمارِ زندگی

عبرت کی جا ہے خاک میں رنگِ چمن ملے
زندہ ہو باپ اور نہ پسر کو کفن ملے

کی خوب سیر باغِ جہاں خوب پھل ملے
ہو عید اب گلے سے جو تیغِ اجل ملے

ممکن نہیں کہ خلق میں چین ایک پل ملے
دنیا میں آج اُن کو نپایا جو کل ملے

جنت میں پیاس تشنہ دہانوں کو لے گئی
افسوس خوب چن کے جوانوں کو لے گئی

ہاہی کہاں وہ گوہرِ بحرِ شرف گئے
جو میرے پاس رہتے تھے وہ کس طرف گئے

قاسم سدھارے جیسے ہی ان کے خلف گئے
سارے مرے چنے ہوئے دیہہ بخش گئے

کیا تفرقہ یہ لشکرِ شاہی میں پڑ گیا
میں قافلے سے چھٹ کے تباہی میں پڑ گیا

ہم سب کے بعد خلق سے جانے کو رہ گئے
سر پیٹنے کو خاک اُڑانے کو رہ گئے

پیری میں آہ ٹھوکریں کھانے کو رہ گئے
اس نوجواں کا داغ اُٹھانے کو رہ گئے

بیٹا کہاں خبر جو دمِ انتقال لے
آتا نہیں جو گرتے ہوئے کو سنبھال لے

فرما کے یہ جو گھر میں گئے شاہِ خوش خصال
محبوبِ حق کی آل کا دیکھا عجیب حال

بیٹھے ہوئے ہیں سب صفِ ماتم پہ کھو بال
برپا ہی شورِ ماتمِ فرزندِ خوش جمال

بانو قریبِ مرگ ہی زینب ہلاک ہی
سینے تو سب کبود ہیں بالوں پہ خاک ہی

بہنیں پکارتی تھیں کہ بیرن ترے نثار
اب تک تو گھر میں آتے تھے مقتل سے چند بار

بہیّا سُنگھا دو نکہتِ گیسوئے مشکبار
اُس بھینی بھینی بو کے لیے دل ہی بے قرار

آئے نہ عمو جان کا پُرسا بھی دینے کو
کیا نے کہے چلے گئے صغرا کے لینے کو

شہ نے کہا بہشت میں ہیں اکبرِ حسیں
صغرا کہاں ہماری ہی اُن کو خبر نہیں

رخصت کرو حسین کو اے زینبِ حزیں
خیمے تک آ نہ جائے کہیں فوجِ اہلِ کیں

لادو رسولِ پاک کا رختِ کہن ہمیں
پہنا دو اپنے ہاتھ سے زینب کفن ہمیں

بیخود تھی غم میں نورِ نظر کے وہ دلفگار
سمجھی نہ کچھ کہ کون یہ روتا ہی زار زار

جب یہ سُنا کھڑا ہی محمد کا یادگار
ماتم کی صف پہ گر پڑی اُٹھ کر وہ سوگوار

رو کر کہا نہ پاؤں نہ قابو میں ہاتھ ہیں
کیوں صاحبو کہو علی اکبر بھی ساتھ ہیں

پر خوں جبیں پہ ٹھوے کپڑے بدن پہ خاک
چادر سیاہ ایک گریباں ہزار چاک

سر بھی جگر بھی سینہ پُر خوں بھی دردناک
بیکس بہن کے حال پہ روئے امامِ پاک

فرمایا آئیں کیا کہ سناں دل پہ کھائے ہیں
ہم اُن کی لاش چھوڑ کے رخصت کو آئے ہیں

میں کیا ہوں ایک عبد نحیف و ضعیف و زار
قدرت نہ زندگی کی نہ مرنے پہ اختیار

حاضر ہوں جب بلائے کہ حاکم ہے کردگار
ہے اُس کی ذات راحم و غفار و پردہ دار

منظور پرورش ہے جو سب کی کریم کو
رانڈوں کو بھولتا ہے نہ طفل یتیم کو

جو معرضِ فنا میں ہوں کیا اُن کا آسرا
میں ہوں تو کیا ہوں مالک و مختار ہے خدا

اُٹھ جائیں بھائی بھانجے یا ہوں پسر جدا
صابر اُسی سے صبر کی کرتے ہیں التجا

وہ قید میں نہ گھر کی تباہی پہ روتے ہیں
روتے ہیں گر تو خوفِ الٰہی میں روتے ہیں

وہ کہتے تھے کہ جان نکل لے تو جائیے
خنجر اجل کا حلق پہ چل لے تو جائیے

مضطر ہے دل یہ سن کا سنبھل لے تو جائیے
اچھا ذرا سکینہ بہل لے تو جائیے

بالوں پہ خاک اڑاؤں منہ آنسوؤں سے دھوتو لوں
جاؤ بھائی میں تجھے جی بھر کے رو تو لوں

بولی قدم پہ گر کے یہ بانوئے خوش خصال
اے جانِ فاطمہ خلفِ شیر ذوالجلال

فرمایئے تو ساتھ چلے یہ شکستہ حال
رُخ پر نقاب ڈال کے بکھرا کے سر کے بال

عزت اب اس کنیز کی ہے ہاتھ آپ کے
پردہ مرا رہے جو مروں ساتھ آپ کے

مجدھار میں ہے ناؤ طلاطم ہے آشکار
موجیں ستم کی آتی ہیں طوفاں میں بار بار

اے ناخدائے کشتی امت ترے نثار
بیکس کا ڈوبتا ہوا بیڑا لگا دے پار

رحم اب کہ بیقراری بسمل کا وقت ہے
حلال مشکلات یہ مشکل کا وقت ہے

بانو کے اضطراب پہ روئے شہِ امم
فرمایا ناگوار ہے صاحب تمہارا غم

بانو اسیر و بیکس و بے آشنا ہیں ہم
یاور نہ بھائی بند نہ لشکر نہ وہ علم

موت اپنی خود طلب نہ کرے وہ تو کیا کرے
جس کا کوئی نہ ہو نہ مرے وہ تو کیا کرے

لازم ہے تم کو صبر یہ ہے صبر کا مقام
مالک کی ہے اسی میں خوشی اور اسی میں نام

یاں گھر لٹے کہ قید میں جانا ہو سب کے شام
ہر دم رہے زبان کو شکر خدا سے کام

دیں یہ تمہارا ساتھ تم ان سب کے ساتھ ہو
میرا یہی ہے ساتھ کہ زینب کے ساتھ ہو

یہ کہہ کے نکلے خیمے سے شبیرِ دلفگار
دیکھا کھڑا ہی ڈیوڑھی پہ اسپ وفا شعار

گردن پہ ہاتھ پھیر کے بولا وہ نامدار
طاقت نہ ہو تو جائے پیادہ ترا سوار

یہ گردشِ فلک یہ جفائے زمانہ ہی
تو بھی تو تین روز سے نے آب و دانہ ہی

مُنہ رکھ کے شہ کے بازو پہ بولا وہ باوفا
اے شہسوارِ دوش محمد ترے فدا

کچھ حق نمک خوری کا مجھ سے ہوا ادا
فاقہ ہو جب کہ آپ کو مولا تو میں ہوں کیا

جیواں ہوں پر نہ ترکِ رفاقت کروں گا میں
جیتا ہوں گر تو آپ کے آگے مروں گا میں

پھیلا کے دونوں ہاتھ جھکا وہ سوئے زمیں
گھوڑے پہ جلوہ گر ہوا حیدر کا نازنیں

پر نور ہو گیا رُخِ انور سے صدر زیں
مرکب پہ تھے حسین کہ خاتم پہ تھا نگیں

شور درود غرب سے تا شرق ہو گیا
بیٹھے جو تنکے آپ فرس برق ہو گیا

بوئے بہشت لیکے نسیمِ سحر چلی
آگے فرس کے فتح تو پیچھے ظفر چلی

خود سر پہ چتر بن کے ضیائے قمر چلی
گھوڑا چلا کہ فتح کی گویا خبر چلی

غرفوں سے حوریں دیکھتی تھیں شہسوار کو
پر یاں طبق لیے تھیں سروں پر نثار کو

ہاتوں پہ زر ہیں سب گل خودرو لیے ہوئے
دوڑی صبا بہشت کی خوشبو لیے ہوئے

تیغ و سپر جو ہیں شہِ خوشخو لیے ہوئے
غل ہی کہ ہاں نجات کا پہلو لیے ہوئے

شبیر تو امام ہی ابنِ امام ہی
گر غیظ آگیا تو یہ دُنیا تمام ہی

بجلی کی صو دکھاتی ہی رُخ کی چمک اُدھر
خود عرش اُس طرف نگراں تھا فلک اُدھر

ڈر سے سما ادھر تھا ہراساں سمک اُدھر
جناتُ اس طرف تھے صف آرا ملک اُدھر

کچھ کہکشاں سے بڑھ گئی تھی شان راہ کی
غل تھا سواری جاتی ہی شاہوں کے شاہ کی

جھکتے تھے جب صفوف ملائک ملے سلام
ہنس کر جواب دیتے تھے مولا خاص و عام

جن ہوتے تھے جو خم پئے تسلیم و احترام
رکھتے تھے سر پہ ہاتھ امامِ فلک مقام

مطلب یہ صاف تھا کہ مدد ناگوار ہی
میرا یہ سرا مانتِ پروردگار ہی

شرمندہ ہی جبین میں سے قمر کا نور
پیدا ہوا ہی زلف سے شب کی سحر کا نور

صل علیٰ یہ نور ہی خیر البشر کا نور
پروانہ روشنی پہ ہی جس کی نظر کا نور

دیکھو نشانِ سجدہ جبینِ جناب پر
غنچہ ہی نیلوفر کا گل آفتاب پر

کیا خوشنما ہیں چہرے پہ گیسو کو دیکھیے
شب اور آفتاب کے پہلو کو دیکھیے

دو راتیں اک سحر رخِ نیکو کو دیکھیے
جنگل تمام بس گیا خوشبو کو دیکھیے

چہرے کی ضو سے دشت پر آشوب عش ہی
ساری زمین پہ عنبر سارا کا فرش ہی

ابرو ہی یا کھنچی ہوئی حیدر کی ذوالفقار
یہ مو بھرے ہوئے نہیں جوہر ہیں آشکار

قرباں کماں ہلالِ فلک مرتبت نثار
آنکھوں پہ جن کی جا ہی یہ ایسی ہیں ذی وقار

پیوستہ منکسر ہیں وہ جو ارجمند ہیں
اتنی فروتنی بھی ہی جتنی بلند ہیں

آنکھوں کو کیجیے عین تو عینِ خطا ہی یہ
پردے نہ کیوں ہوں سات کہ نورِ خدا ہی یہ

سب کو ہی چشمداشت کہ عین عطا ہی یہ
بیمار خود پہ سب کے مرض کی دوا ہی یہ

سرخوش ہی جام ان کی جو الفت کا پی گیا
دیکھا نگاہِ لطف سے جس کو وہ جی گیا

احساں بھی حیا بھی مروت بھی قہر بھی
خود موت بھی حیات بھی امرت بھی زہر بھی

بینا بھی نکتہ سنج بھی دانائے دہر بھی
تسنیم بھی بہشت بھی کوثر کی نہر بھی

سر شرم سے جھکائے ہی نرگس ریاض میں
جنت سوا دیں ید بیضا بیاض میں

آہو شکار و تیر و کماں دار و شیر گیر
ہشیار و خوش نگاہ و سخن سنج و دلپذیر

خونریز و جاں فریب و دلاویز و بے نظیر
قبضے میں ابروؤں کے کمانیں مژہ کے تیر

جس سادہ دل کو ان کی سیاہی کی یاد ہو
ناخواندہ بھی اگر ہو تو روشن سواد ہو

ذرہ نواز و زہد نما صاحب امتیاز
طنّاز و شوخ یگین و گراں خواب و سرفراز

حق بین و پاکباز و خدا بین و بے نیاز
بیدار و داغ دادہ خونبار و غم طراز

گرداس کے پھریہ کعبۂ ایماں کا طوف ہی
بس ای انیسؔ بس نظرِ بد کا خوف ہی

اللہ رے رعب شیر ہرن ہو گئے ہیں سب
خود دل شکستہ قلعہ شکن ہو گئے ہیں سب

آماج خوف تیر فگن ہو گئے ہیں سب
خم صورتِ کماں ہمہ تن ہو گئے ہیں سب

آنکھیں ملائیں کب یہ شریروں کی تاب ہے
کس دل کو اس نگاہ کے تیروں کی تاب ہے

شیرِ خدا کے شیر سے کیونکر ہو چار آنکھ
وہ گربہ چشم اور یہ آہو شکار آنکھ

خورشید فاطمہ سے ملائیں ہزار آنکھ
عاجز ہے جھپکی جاتی ہے بے اختیار آنکھ

گھورے کوئی تو حاصل عین الکمال ہے
خود اس کی آنکھ پنجۂ مژگاں نکال لے

گر کوئی شوخ چشم و جفا جو نظر لگائے
یوں پہونچے چشم زخم کہ ظالم نہ تاب لائے

عین الکمال کی سر میداں سزا وہ پائے
انگشت بن کے موئے مژہ چشم میں سمائے

بینا کہیں کہ کھوئی بصیرت بصیر نے
مردم کہیں کہ عین خطا کی شریر نے

کیا نور ہے رخ خلفِ بوتراب پر
یہ ہے عرق کہ عطر کے قطرے گلاب پر

کچھ تیرگی سی آگئی ہے آب و تاب پر
سونا چڑھاؤ پھر ورق آفتاب پر

آئے جلال میں نہ جلالت حضور کی
تشبیہ ہے خدا و محمدؐ کے نور کی

کیوں منہ کو پھیرتا ہے خجل ہو کے آفتاب
شرمندہ ہو گا اپنی چمک کھو کے آفتاب

آنکھیں ملے اٹھا ہے اگر سو کے آفتاب
لازم ہے آئے سامنے منہ دھو کے آفتاب

گر چاہتا ہو عرش سے سر اس کا جا ملے
کہدو کہ ارض پاک کے ذروں میں آملے

درج دہن پہ لعل و عقیق یمن نثار
غنچے نثار پھول تصدق چمن نثار

حسنِ بیاں پہ طوطی شکر شکن نثار
شور نمک پہ شاعر شیریں سخن نثار

فقروں میں لطف باتوں میں لذت بھری ہوئی
قرآن کی طرح ہے فصاحت بھری ہوئی

توبہ تنافرِ کلمات اور یہ دہن
جملے صحیح شستہ و رفتہ ہر اک سخن

پھولا ہوا فصاحتِ الفاظ کا چمن
تقریر وہ سمجھ لیں جسے صاف مردوزن

معنی کا بھی یہ حال ہے حسنِ قبول سے
خوشبو سحر کو جیسے نکلتی ہے پھول سے

لفظوں میں یوں ہی معنی روشن کی آب و تاب
جس طرح عکس آئینہ میں جام میں گلاب

مضمون میں تناسبِ الفاظ لاجواب
تصریح بھی فصیح کنائے بھی انتخاب

یاں منتہی وہ سب ہیں جو علم و کمال ہیں
صل علیٰ یہ مصحفِ ناطق کے لال ہیں

دنداں کواکبِ فلکِ عز و شانِ حُسن
گر ہیں تو بس یہی ہیں زمانہ میں جانِ حسن

خالق نے موتیوں سے بھرا ہی دہانِ حسن
خود لال ہی صفات ہیں جن کی بانِ حسن

کوسوں ضیا ہی وادیِ مینو سرشت میں
گویا چمک رہے ہیں ستارے بہشت میں

بتیس[۳۲] دُر وہ لعبتِ محبوبِ کردگار
اختر چمک سے جن کی خجل برقِ شرمسار

براق و درفشان و ضیا بار و آبدار
بھولا ہیں ان بھوں سے ہی ان کا فروں وقار

ہیرے نہیں نجومِ سعادت اثر نہیں
یہ تیرِ فاطمہ کے ہیں قطرے گہر نہیں

وہ ریشِ پاک اور وہ چہرے کی آب و تاب
نکلا ہی چیر کر شبِ یلدا کو آفتاب

کچھ جا بجا جو کھل گیا ہی ریش کا خضاب
رخصت ہی دل رہے ہیں گلے پیری و شباب

تا وقتِ عصر اور زمانِ حیات ہی
اب زندگی میں کوئی نہ دن ہی نہ رات ہی

سینے کا آئینہ ہی کہ نورِ خدا کا گھر
یا وہ مدینہ علم کا حیدر ہی جس کا در

اس صدر میں بھرے ہوئے ہیں رازکے گہر
آئندہ و گذشتہ کی سب ہی انھیں خبر

پنہاں جو دل میں ہی اُسے پہچانتے ہیں یہ
جو نے زباں ہیں اُن کی زباں جانتے ہیں یہ

ذکرِ گلو جو ہی تو گلے میں رکا ہی دم
حوروں کی گردنیں ہیں اسی جا ادب سے خم

لیتے ہوں بوسے جن کے رسولِ فلک حشم
افسوس اُس گلے پہ چلا خنجرِ ستم

سوکھی رگیں گلوے مبارک کی کٹ گئیں
افلاک گر پڑے نہ زمینیں اُلٹ گئیں

پیہم زباں دکھا کے کہا آب آب
ای وا محمدا نہ کسی نے دیا جواب

قطرے سے بھی زبان نہ ہوئی آہ کامیاب
آخر تڑپ کے رہ گیا وہ آسماں جناب

جلتی زمیں پہ لاشِ شہِ نیک خو رہی
گردن گلے سے کٹنے پہ بھی قبلہ رو رہی

وہ سر رکھا خدا نے شفاعت کا جس پہ تاج
گردن وہ بزمِ لم یزلی کا جو ہی سراج

وہ صدر جسکے علم کی عالم کو احتیاج
وہ ہاتھ جسکے خیر و عطا کا ہوا رواج

دشمن تو لاکھ اور اکیلے حضور تھے
سارے یہ غیظ و ظلم کی تیغوں سے چور تھے

وہ پاؤں معرکہ سے کبھی جو نہیں ہٹے
وہ کیا ہٹیں ہٹے تو صفِ فوج کیں ہٹے

دشوار ہی یہ امر کہ رکن رکیں سے ہٹے
سرکیں نہ آسمان ہٹے یا زمیں ہٹے

مسکن سے منہ پہاڑ کبھی موڑتے نہیں
ثابت قدم جو ہیں وہ جگہ چھوڑتے نہیں

گھر کا خدا کے رکن و رکیں ہی کہاں ہٹے
نقش اس قدم کا نقشِ نگیں ہی کہاں ہٹے

یہ لنگر سفینۂ دیں ہی کہاں سے ہٹے
یہ قطبِ آسمان و زمیں ہی کہاں ہٹے

زور اس سے آسماں کا بھی چلتا نہیں کبھی
نقطہ ہی دایرے سے نکلتا نہیں کبھی

اس دبدبے سے لشکرِ پیماں شکن میں آئے
جیسے شکار کھیلنے کو شیر بن میں آئے

یا بلبلِ اشتیاق میں گل کے چمن میں آئے
غل پڑ گیا ہٹو اسد اللہ رن میں آئے

اگلی صفیں الٹ گئیں یوں پچھلی فوج پر
طوفاں میں موج گرتی ہی جس طرح موج پر

بھڑکے فرس پرے ہوئے ابتر علم ہٹے
بڑھتے ہوئے جوانیِ ظلم و ستم ہٹے

نامی نشان چھوڑ کے ثابت قدم ہٹے
دریا ہٹا کہ فوج کے بادل بہم ہٹے

بھاگڑ میں خاک اڑ کے جو سوئے فلک گئی
لشکر میں غل ہوا کہ زمیں بھی سرک گئی

چلّے ہیں چیونٹیوں سے سراسر چھٹے ہوئے
افسر سے فوج فوج سے افسر چھٹے ہوئے

خالی ہیں مورچال تو سنگر چھٹے ہوئے
غربت میں یاد کرتے ہیں سب گھر چھٹے ہوئے

تلوار اگر کھنچے تو خدا کی پناہ ہی
دیکھو یہ سب کرشمۂ تیغِ نگاہ ہی

ہل چل کو دیکھ کر یہ پکارا وہ حق شناس
اے اہلِ شام اک مقدس سے یہ ہراس

سب مر گئے امید کسی کی ہی اب اس
اک میں ہوں اور حسرت و اندوہ و درد و یاس

ماتم میں اپنی فکر نہ لڑکوں کا ہوش ہی
خنجر سے کاٹ لو کہ یہ سر بارِ دوش ہی

کیوں بھاگتے ہو بیکس و تنہا کی جنگ کیا
جب مر گیا ہو دل تو وغا کی امنگ کیا

نے دست و پا دکھائے لڑائی کا ڈھنگ کیا
طاقت ہو گر تو شیر ہی پھر کیا۔ پلنگ کیا

پر خیر کیا ہیں تم سے عوض لوں عناد کا
لڑ لونگا کچھ کہ حکم ہی مجھ کو جہاد کا

یہ سُن کے پھر چلائے پرے فوجِ شام نے
کالے نشان کھل گئے لشکر کے سامنے

چھوڑا ادھر نیام علی کی حسام نے
جلوہ دیا عروسِ ظفر کو امام نے

گھونگھٹ ہٹا تو برق سی چمکی لڑائی میں
نقدِ حیات لینے لگی رونمائی میں

گھوڑا جو پھاند کر صفِ اوّل سے مل گیا
تھا صاعقہ کہ شام کے بادل سے مل گیا

وہ پیلا جو فوج کے اس دل سے مل گیا
نے برگ و بر ہوئے یہ ثمر پھل سے مل گیا

پھرتے ہوئے سروں پہ نہ سر تھے نہ ہاتھ تھے
گویا چھری لیئے ملک الموت ساتھ تھے

وہ تیغ تیز جب صفِ ثانی سے مل گئی
خفت ہر اک کو اُس کی گرانی سے مل گئی

لذت چھری کی تیز زبانی سے مل گئی
دریا کی باڑھ گھاٹ کے پانی سے مل گئی

چمکی جو سر پہ برق تو نے فرق ہو گئے
دریا میں خوں کی تا بکمر غرق ہو گئے

کھا کھا گئی صفوں کو جدھر آئی ذوالفقار
گہ چھپ گئی تو گاہ نظر آئی ذوالفقار

سر پر چمک کے تا بہ کمر آئی ذوالفقار
زیں کاٹ کر زمیں پہ اُتر آئی ذوالفقار

یوں صبر پنجتن میں گرفتار ہو گئے
اک جوش میں سوار و فرس چار ہو گئے

وہ مُنہ کہ الحذر وہ روانی کہ الاماں
وہ گھاٹ الحفیظ وہ پانی کہ الاماں

وہ دم وہ خم وہ تیز زبانی کہ الاماں
وہ دل شکن وہ دشمنِ جانی کہ الاماں

ناز اُس کے سب کو بھائے کہ شیشے پگھلے لگے
چھوڑے نہ نے لہو پیے جس کے گلے لگے

تھی دستگاہ خاص اُسے قتلِ عام میں
نے دم ہوا جو آگیا جوہر کے دام میں

کس کس ادا سے چلتی تھی فوجِ شام میں
دونوں زبانیں ایک سی تھیں اپنے کام میں

کیا بس چلے کسی کا ہوا جب بُری چلے
چلتی تھی یوں گلوں پہ کہ جیسے چھری چلے

جوہر میں فرد تھی یہ زبانیں ملی تھیں زوج
وہ شور اُس کے آب کا وہ جوہروں کی موج

پستی میں تھی کبھی کبھی جاتی تھی سوے اوج
بجلی غضب کی کوندرہی تھی میانِ فوج

کرتی تھی کارِ تیغ چمک ذوالفقار کی
پر تو میں تیزیاں تھیں سروہی کی وار کی

وہ فوج کا ہجوم وہ گرمی وہ لوں وہ بن
دریا پہ شیر پانی پیتے تھے دشت میں ہرن

بھڑکی تھی آگ جل رہے تھے ناریوں کے تن
مثلِ صدف تھے زخم بھی کھولے ہوئے دہن

ڈوبا تھا وہ پسینے میں جو سینہ زور تھا
فوجوں میں ذوالفقار کے پانی کا شور تھا

ابتر صفیں تھیں کینہوروں کی ادھر اُدھر
جانیں ہوا تھیں فتنہ گروں کی اِدھر اُدھر

چھائی تھی اک گھٹا سپروں کی اِدھر اُدھر
بوچھار تھی زمیں پہ سروں کی اِدھر اُدھر

غل تھا اثر ہی گھاٹ میں دریا کی باڑھ کا
برسا ہی نصف تپ کے مہینا اساڑھ کا

کاٹا سر اس کا اُس کا جگر چاک کر دیا
بجلی کی اور آگ نے چالاک کر دیا

جس پر گری جلا کے اُسے خاک کر دیا
قصہ جو دین و کفر میں تھا پاک کر دیا

شرما کے شرک و کفر نے سر کو فرو کیا
اسلام شاد تھا کہ مجھے سرخرو کرو

اللہ رے جنگ میں شہِ ذیقدر کی شکوہ
جس جا قدم جمے نہ ہٹے پھر مثال کوہ

قہرِ خدا تھی برہمی طبعِ حق پژوہ
نے خوف جاں تھا کوئی مجمع کوئی گروہ

حملوں میں ساری شان خدا کے ولی کی ہے
فوجوں میں شور تھا یہ لڑائی علی کی ہے

ساعد سے کچھ بلند جو کر لی تھی آستیں
فانوس سے بڑھا ہوا تھا نورِ شمع دیں

نعرے نہ کہیے گونجتا تھا شیرِ خشم گیں
جنبش میں آسمان تھی زلزل میں تھی زمیں

دستِ علی تھے ہاتھ حسینِ دلیر کے
قبضے میں انگلیاں تھیں کہ ناخن تھے شیر کے

وہ آستیں چڑھی ہوئی ساعد وہ صاف صاف
اُگلی ہوئی تھی میان سے شمشیرِ خوش غلاف

ضربت کا شور قاف سے پہونچا تھا تا قاف
وہ تہلکہ وہ زلزلہ وہ دی مصاف

ڈر تھا کہ پاؤں گاہ کاہی سے ہٹ نہ جائے
دہشت زمیں کو تھی کہ زمانہ الٹ نہ جائے

زور آوارانِ روئے زمیں کس طرح بڑیں
وہ انگلیاں کہ باب میں خیبر کے جو دڑائیں

تلوار کیسی آنکھ اُٹھا کر اگر ڈرائیں
زہرے ہوں آب سامنے سو شیر بھی گڑ جائیں

اے تو بہ جانور ہی اسد گو دلیر ہی
آنکھیں یہ اُس کی ہیں کہ جو حیدر کا شیر ہی

غصّے میں سب کھڑے ہوئے ہیں ریش کے جوبال
زیر و زبر ہیں صاف پئے مصحفِ جمال

نقطے عیاں ہیں سورۂ والشمس پر کہ خال
سرخی کے مدّ کہ آنکھوں کے ڈورے ہیں لال لال

وہ خط وہ رنگ چہرۂ تاباں کھلا ہوا
دیکھو دھرا ہی رحل پہ قرآں کھلا ہوا

کیا مدح ہو حسین کی جنگ و جدال کی
تصویر بن گئی تھی علی کے جلال کی

وہ آوجاؤ شہپر ضیغم خصال کی
روندا جو یہ پرا تو وہ صف پائمال کی

اُن اُبلی انکھڑیوں کے اشارے غضب کے تھے
چل پھرتی قہر کی تو طرارے غضب کے تھے

حیرت میں یکہ تاز تھے سب شام و روم کے
پھرتی تھی برق گرد قدم چوم چوم کے

سیر اُس کی دیکھتے تھے شناسا نجوم کے
پھرتا تھا اُس ہجوم میں کیا جھوم جھوم کے

حیراں سیاہ گوش تو چیتے خموش تھے
شیروں میں جان تھی نہ چکاروں میں ہوش تھے

جم کر اِدھر اُڑا اُدھر اُترا وہ جا پڑا
نکلا اُدھر صفوں سے وہ پلٹا یہ آپڑا

جب اُس پہ رو میں سایۂ زلفِ دوتا پڑا
سمجھا کہ تازیانۂ موجِ ہوا پڑا

تسمہ ہر اک جو باگ کا تھا ناگ ہو گیا
آنکھیں اُبل پڑیں یہ مزاج آگ ہو گیا

گرما کے سب رگوں میں لہو دوڑنے لگا
فرفر کی دونوں نتھنوں سے آنے لگی صدا

اُٹھنے لگے زمین پہ جم جم کے دست و پا
غصّہ کہ مجھ تک آ کے کدھر رہ گئی ہوا

نزدیک تھا کہ پھاند کے ندی کے پار ہو
روکے وہی حسین سا جو شہسوار ہو

آہو کی آنکھ شیر کی چتون غضب کی چال
وہ یال تھے کہ حور نے بکھرا دیے تھے بال

گردن کے خم کو دیکھ کے ہو سرنگوں ہلال
پوچھے کوئی سوار سے شائستگی کا حال

اُڑ کر زمیں تلک کبھی گر وقتِ دم گئی
جب بس کہا چمکتی ہوئی برق تھم گئی

خوش خو و خوش خرام و خوش اندام و خوش لگام
خوش رو و خوش جمال و اوانہم و تیز گام

جانادر و شوخ چشم و سبک و خجستہ گام
گل پوش و تیز ہوش و سمن گوش و سرخ فام

غانی تھا سرفراز تھا عالی دماغ تھا
گویا ہوا کی دوش پہ اک زندہ باغ تھا

چالاکیاں بھی غیظ بھی غربت بھی جنگ بھی
بالا دوئی براق کی دلدل کا ڈھنگ بھی

بر میں اسد بھی بحر و غا میں نہنگ بھی
گھوڑا بھی شیر نر بھی ہرن بھی پلنگ بھی

ہی آگ کا مزاج تو سرعت ہوا کی ہی
اضداد اتنے جمع ہیں قدرت خدا کی ہی

وہ سازاور وہ زین مرصع کی زیب و زین
اس میں ہوا میں ارض و سما کا تھا فرق وہین

کلغی سے سر کی صاف عیاں ذوالفقارین
سینے میں دل قوی تھا کہ ہیں پشت پر حسین

دعوے کہ میں براق کی توقیر پائے ہوں
ناز اس پہ ہی کہ بار امامت اٹھائے ہوں

وہ چھوٹی چھوٹی کانچیاں گول گول سم
سرعت وہ تھی کہ عقل تھی یونانیوں کی گم

طاؤس کی طرح جو وغا میں چنور تھی دم
آتی تھی آسمان سے ندا مد نظلہم

پھرنا تجھے نصیب ہو راہ ثواب میں
قایم یہ دونوں پاؤں ہیں اس رکاب میں

وہ گشت اور وہ اس کے طرارے وہ آؤ جاؤ
پانی پہ گر حباب تو آب رواں میں ناؤ

گھونگھٹ میں دیکھ پائے اگر چال کا بناؤ
دولھا کے دل میں پھر نہ رہے کچھ دلھن کی چاؤ

دعوے غلط خرام میں کبک دری کا ہی
اس باد پا کے سائے میں جلوہ پری کا ہی

کوئی ہی وہ تدرو ہی کیا اس کی چال کیا
طاؤس کیا ہما ئے سعادت خصال کیا

کیا پیک عقل شاطر وہم و خیال کیا
اس کے قدم کی گرد کو پہونچے مجال کیا

دیکھی نہیں کسی نے یہ چھل بل سمند میں
پارا بھرا ہوا ہی ہر اک جوڑ بند میں

پیکاں ہیں دو کنوتیاں ہنگام دار و گیر
حلقے سے یوں نکلتا ہی جیسے کماں سے تیر

روئیں وہ نرم جلد وہ باریک و بے نظیر
چینی پرند جس کے مقابل نہ ہی حریر

ایسی سبکدوی نہیں دیکھی شہاب میں
دوڑے تو فرق آئے نہ مخمل کی خواب میں

ہر چند تیز رو ہی بہت اد ہم مسلم
پر اُس کی شوخیوں کو یہ کیونکر کرے رقم

کچھ کچھ مدد کی بھی روانی ہوئی ہی کم
دوڑا بہت تو ذہن کا بھی بھر گیا ہی دم

تازی کوئی ہو بات تو لطفِ کلام ہی
بس اے قلم ٹھہر تری تر کی تمام ہی

گھوڑے سے بھی بڑھی ہوئی تھی تیغ انگوں
جب ہاتھ اُٹھا تو قبضے سے ٹپکا زمیں پہ خوں

اُلٹی ہوئی صفوں میں نشاں سب تھے سرنگوں
دہشت سے زرد تھا بنِ سعد سیہ دروں

اک شور تھا جو لہر ہی اس کی وہ ناگ ہی
گھوڑے بھگاؤ تیغ کے پانی میں آگ ہی

سر کاٹ کر جو تیغ علی ولی پھری
دل پر خفی پھری تو جگر پر جلی پھری

تھی شاخ نخل فتح کہ پھولی پھلی پھری
کس کس ہنر سے رن میں گلوں پر چلی پھری

بگڑا نہ پھر بناؤ وہ جب سے سجی گئی
قامت سے راستی و ادا سے بجی گئی

دہشت سے اُس کی سخت جگر کانپتے تھے سب
پتا ہوے تھے برگ شجر کانپتے تھے سب

قدسی وہاں سے دور تھے پر کانپتے تھے سب
دریا میں تھے نہنگ مگر کانپتے تھے سب

ساتوں طبق جو ہلتے تھے خوفِ رشت سے
گاوِ زمیں لپٹتی تھی ماہی کی پشت سے

نے سر تھے وہ سوار جو بڑھتے تھے خیل خیل
پر تیغ مرتضےٰ کو نہ اصلا تھا خیف و میل

جوہر چمک دکھاتے تھے سب صورت سہیل
آتی تھی شور سے سوے دریا لہو کی سیل

آفت بپا تھی خانۂ تن سب خراب تھے
موجیں تھیں دست و پا کی سروں کے حباب تھے

اک شور تھا کہ آئی ہی آفت جہان پر
انساں زمیں پہ وق تھے ملک آسمان پر

ہونٹوں پہ دم اجل کی حرارت زبان پر
دہشت سے آبنی تھی جنوں کی بھی جان پر

پریوں میں شور تھا کہ اجل سر پہ آئی ہی
جلد آیئے جناب سلیماں دوہائی ہی

تلوار رن میں گر کسی سر ہنگ سے چلی
ظالم کا دم نکل گیا اس ڈھنگ سے چلی

جس پر چلی وہ تیغ نئے رنگ سے چلی
سر پر سوار کے جو پڑی تنگ سے چلی

مدت کا تال میل تھا برسوں کا ساتھ تھا
جیسی وہ ذوالفقار تھی ویسا ہی ہاتھ تھا

فاصر تھے اُن کے عزم جو تھے بانیٔ فساد
رشتے تھے قطع اُٹھ گیا تھا اُنس و اتحاد

ہر دم اشارہ کرتی تھی تیغِ ظفر نہاد
سب مجھ کو سرگزشتِ جہادِ علی ہے یاد

ٹکڑے کیا ہے عمر سے نامی نہنگ کو
پھیلے ہوئے ہوں خیبر و خندق کی جنگ کو

جس غول کی طرف وہ سلیماں حشم پھرا
تلوار کا نہ منھ نہ فرس کا قدم پھرا

چمکی اُدھر اُدھر رخِ اہلِ ستم پھرا
جس صف پہ آئی سطرِ غلط پر قلم پھرا

صحت پہ حرف آگیا مجبور ہو گئے
سر تن سے مثلِ نقطۂ شک دور ہو گئے

وہ ہاتھ کی صفائیاں وہ تیغ کی چمک
ہلتے تھے دل سما سے تزلزل تھا تا سمک

وہ آب و تاب گھاٹ کی وہ باڑھ کی دمک
تھا آبِ شور تیغ ہر اک زخم پر نمک

منہ اپنے زخم کھولے تھے لطفِ عزا یہ تھا
بسمل بھی ہونٹ چاٹ رہے تھے مزا یہ تھا

رکتی نہ تھی وغا میں کسی درعہ پوش سے
گرتی تھی تیغ ہاتھ سے اور ڈھال دوش سے

اُلجھا ہو سکا نہ رن میں کسی سرفروش سے
خود حرز بن گئی تھی وہ جوہر کے جوش سے

غل تھا چلی یہ جس پہ وہ دامِ اجل میں ہے
بھاگو دعائے سیفی اسی کی عمل میں ہے

اللہ رے رعب نعرۂ مولائے خوش خصال
لرزاں تھیں برچھیاں قدمِ پیر کے مثال

پلٹی ہوئی تھیں پشت سے ڈھالوں کا تھا یہ حال
تینوں کے جوہروں سے کھڑے ہو گئے تھے بال

گوشوں کو ڈھونڈھتی تھیں کمانیں مصاف میں
خنجر بھی منھ چھپائے ہوئے تھے غلاف میں

افتادہ تھے زمیں پہ نشانہائے سربلند
لاشوں سے راہ امن و اماں ہو گئی تھی بند

تھرّاتے تھے جو ڈر سے لعینوں کے بند بند
پرچم علم کے کرتے تھے اعدا پہ ریش خند

جب ہم سہم کر قدر انداز روتے تھے
سوفار کے ہنسی سے نہ لب بند ہوتے تھے

ہر دم چمک دمک تھی زیادہ پرش مزید
لوہے کو اس کے مان گیا لشکرِ یزید

اس فوج میں بجا تھی جو تھی دہشتِ شدید
نازل اُسی کے شان میں ہے سورۂ حدید

سفاک تھی اوپی ہوئی تھی بیدریغ تھی
جو عرش ذوالجلال سے اتری وہ تیغ تھی

گہ سر پہ گاہ سینے پہ گاہے گلو پہ تھی
جوہر کا تھا خیال نگہ آبرو پہ تھی

دریا پہ تھی نہ اُس کی نظر آبجو پہ تھی
ہاں تھی اگر تو جنگ میں رغبت لہو پہ تھی

کانوں سروں کو در پئے قتل عدو رہوں
مطلب یہ تھا کہ معرکہ میں سرخرو رہوں

کاری جواں سپاہ کے ناکارہ ہو گئے
پانچوں حواس سبعۂ سیارہ ہو گئے

ٹکڑے کئی کمانوں کے آوارہ ہو گئے
پیکان تیر غنچۂ رصد پارہ ہو گئے

سر کی وہ جب کہ برچھیوں سے پھل گرا لیے
خنجر تو کیا تھے تیغوں نے بھی منھ پھرا لیے

گر طبع میں کسی کی روانی ہوئی تو کیا
کیا کہہ سکے گا تیز زبانی ہوئی تو کیا

بالفرض قوتِ ہمدانی ہوئی تو کیا
مثلِ انیس سحر بیانی ہوئی تو کیا

فقروں کا ذوالفقار کے مطلب ادا نہ ہو
کٹ جائے ساری عمر تو اُس کی ثنا نہ ہو

پھرتا ہے پتلیوں کے اشاروں پہ راہوار
اس صف کے بیچ میں ہے کبھی اُن پرے کے پار

قربان اُس جلال کے اُس عزم کے نثار
اِک ہاتھ میں ہے تیغ سپر اک میں ذوالفقار

انگشت مصطفےٰ ہے اُدھر بدر اس طرف
شمس الضحےٰ اُدھر ہے شب قدر اس طرف

دار الامان کعبۂ نصرت تھی وہ سپر
پشت و پناہ شاہ ولایت تھی وہ سپر

لاریب فیہ سایۂ رحمت تھی وہ سپر
حقا سوادِ اعظم شوکت تھی وہ سپر

پرتو فگن تھی یوں کبھی روئے جناب پر
آجائے جیسے ابرِ سیہ آفتاب پر

آفت تھی ہر پرے میں لڑائی تھی ہر طرف
تلوار سے صفوں کی صفائی تھی ہر طرف

روحوں کی قالبوں سے جدائی تھی ہر طرف
پیغمبر خدا کی دوہائی تھی ہر طرف

دانتوں میں خس پکڑ کے عدو کو کڑکتے تھے
شقے علم کے امن کی چادر ہلاتے تھے

غل تھا کہ اے نبی کے نواسے اماں اماں
گرمی میں تین روز کے پیاسے اماں اماں

اب روک لے یہ ہاتھ وغا سے اماں اماں
سید بچا لے قہرِ خدا سے اماں اماں

یاں سے خطا اُدھر سے ہمیشہ عطا ہوئی
بچے کو ہم نے تیر سے مارا خطا ہوئی

نکلا سپاہ شام سے بل کھا کے ایک گیو
قامت میں عمر و زور میں مرحب قوی میں دیو

عفریت جس کے ڈر سے کرے دشت میں غریو
اقلیم مکر و مملکت خدع کا خدیو

بل ابروؤں پہ زخم بدن پر پڑے ہوئے
اکثر لڑائیوں میں عرب کی لڑے ہوئے

سر میں غرور دل میں بدی طبع میں فساد
بد کار و بدمزاج و سلح شور و بدنہاد

شیر خدا سے بغض دلی آل سے عناد
کچھ درد دیں نہ رحم نہ ایماں نہ اعتقاد

پیرو تھا شمر کا تو ثنا خوان یزید کا
مرتد مرید خاص تھا دیو مرید کا

غصے میں ابن سعد سے بولا وہ روسیاہ
نامرد تجھسا اور یہ سالاریِ سپاہ

خود بھاگ گر بتاتا ہی تو بھاگنے کی راہ
فوجوں کا کیا قصور ہی لشکر کا کیا گناہ

کشتی پہ ہو رئیس تو بیشک دغا کریں
سردار پیشہ ہی نہ کرے گر تو کیا کریں

اُس سے یہ دُور جو غم سے ہو نزدیک مرگ کے قریب
تنہا نہ کوئی بھائی ہی جس کا نہ اب جیب

محتاج و فاقہ کش وطن آوارہ و غریب
بیکس عزیز مردہ جفاکش بلا نصیب

دانا سوائے اشک فشانی ملا نہیں
غربت میں تین روز سے پانی ملا نہیں

بازو شکستہ چھید جگر میں کمر میں خم
بیٹی کے رانڈ ہونے کا ماتم پسر کا غم

اک جان لاکھ تیر یہ تلواریں ایک دم
ابتک گرا نہیں یہ تھمے کس طرح قدم

طاقت نہ قلب میں ہی نہ ہاتوں میں زور ہی
پھر اس پہ الاماں کا ہزاروں میں شور ہی

اُس اضطراب میں پسر سعد نے کہا
لشکر کے پاؤں اُٹھ گئے میرا قصور کیا

دعوے مقابلہ کا اگر ہی تجھے تو جا
فرزند مرتضےٰ سے کچھ آسان نہیں وغا

قبضے میں اس کے زور خدا کے ولی کا ہی
تو ہی پناہ مانگ کہ بیٹا علی کا ہی

مغرور نے کہا کہ میں جاتا ہوں دیکھ تو
میداں میں رستمی جو دکھاتا ہوں دیکھ تو

حیدر کے دل کا خون بہاتا ہوں دیکھ تو
سر کاٹ کر حسین کا لاتا ہوں دیکھ تو

کیا بات ہی شکست ابھی دے کے آؤنگا
حمزہ کی ڈھال تیغ علی لیکے آؤنگا

ڈھاتا شقی نے باندھ کے کھولا کمند کو
نیچا کیا وہیں سے سنانِ بلند کو

قبضے میں رکھ کے دستِ تعدی پسند کو
کوڑا کیا مثالِ تہمتنِ سمند کو

بڑھتے ہی اک غریو اُٹھا اُس سپاہ سے
مرحب چلا نبرد کو شیرِ الٰہ سے

کرکا کے اپنے گھوڑوں کو گرد آ گئے سوار
تھا بیچ میں وہ اور حسینِ فلک وقار

فخریہ شعر پڑھ کے پکارا وہ نابکار
بسم اللہ ای نبیرۂ محبوبِ کردگار

افراسیاب و رستمِ میدانِ جنگ ہوں
شیرِ خدا ہیں آپ تو میں بھی پلنگ ہوں

چھپتے تھے اژدہے مری ہیبت سے غار میں
مستاح و شیر شرزہ جبال و بحار میں

رستم کو باندھ لیتا ہوں میں کارزار میں
سہراب میں یہ زور نہ اسفندیار میں

پھینکا ہے میں نے سامنے برناؤ پیر کے
ڈھالوں کو روئیوں کی طرح چیر چیر کے

گیتی کے چار دانگ میں برپا ہے میرا شور
پنجے سے میں نے توڑ دیئے سرکشوں کے زور

بہرام ڈر سے کانپ رہا ہے میانِ گور
سیمرغ و فیل دہ پر پشہ یہ پائے مور

یاں زال کی نہ کچھ ہے حقیقت نہ گیو کی
تسمے سے باندھ لاتا ہوں گردن کو دیو کی

فرمایا آپ نے یہ تعلی ہے کیا ضرور
چپ رہ کہ تجکو پست نہ کردے ترا غرور

آپ اپنی مدح واہ رے کم ظرف و بے شعور
تیرا نہیں یہ فہم غلط بین کا ہے قصور

دعوے کوئی درست نہیں بے دلیل کے
جوہر کھنچے پہ کھلتے ہیں تیغ اصیل کے

خوش بو کا اپنی گل نے کہا ہے کبھی بیاں
شیریں ہوں میں شکر کبھی کرتی ہے یہ عیاں

کھلتی ہے آپ مشک کی بوقتِ امتحاں
کیسا جھکا ہے اتنی بلندی پہ آسماں

سایہ بڑا ہے تجھ سے بگولہ دراز ہے
البتہ خاکسار جو ہے سرفراز ہے

پیدا کیا ہے ایک سے بہتر خدا نے ایک
دارِ فنا میں کوئی جو بد ہے تو کوئی نیک

مانا کہ تو شجاع ہے سب سے فزوں و لیک
یہ سر عزیز ہے نہ سرک جا قدم نہ ٹیک

گر پیل ہے تو آگے سلیماں کے مور ہے
اس دستِ رعشہ دار میں حیدر کا زور ہے

جعلی ہے سب یہ لاف و گزاف دروغ گو
افسانہ جانتے ہیں اسے ہیں شجاع جو

اُو ہرزہ کار جھوٹ نہ بک آبرو نہ کھو
مشہور ہے کہ ایک پہ بھاری ہیں ان میں دو

روکے ہیں جس نے فوج کے ریلے یہیں ہیں وہ
لڑتے ہیں لاکھ سے جو اکیلے یہیں ہیں وہ

ہم اپنی جراتوں کے گواہوں کو گر بلائیں
قرآن لیکے عرش سے قدسی یہیں پہ آئیں

خود اپنے پرکٹے ہوئے روح الامیں دکھائیں
بزدل جو ہیں وہ شیروں کی نظروں میں کیا سمائیں

پتھر پہ جوف نیزۂ حیدر کو دیکھ لے
کھل جائے گا ابھی درِ خیبر کو دیکھ لے

حملہ کیا یہ سنتے ہی ظلمت نے نور پر
پھینکی کمند آنکھ بچا کر حضور پر

آئی چمک کے تیغ جو اس پُرغرور پر
گویا کہ برق کوند گئی کوہ طور پر

قربان دست تیغ شہِ ارجمند کے
کٹ کر اسی پہ جا پڑے حلقے کمند کے

خاطی بڑھا کمان کیانی میں رکھ کے تیر
چلّے کو کھینچ لایا بنا گوش تا شریر

دہنی طرف اُڑا جو سمند فلک سریر
حلقے کے بیچ میں تھی زہے تیغ بے نظیر

جو ہر عجیب قطع کے اُس کی زباں میں تھے
چلّہ نہ تیر میں تھا نہ گوشے کماں میں تھے

کعبہ ادھر تھا جلوہ نما اور اُدھر کنشت
دوزخ تھا اُس لعین کی طرف اس طرف بہشت

نیزے کی ڈانڈ پر جو رکھا اُس نے دستِ شت
چمکی نئے طریق سے تیغِ قضا سرشت

ششدر ہوئی وہ فوج جو محوِ نظارہ تھی
راہیں بھی سب تھیں قطع سناں بھی دوپارہ تھی

پھر گرز گاوِ سر کو اُٹھایا شریر نے
لی ہاتھ میں سپر شہِ گردوں سریر نے

روکی وہ ضرب ڈھال پہ اُس قلعہ گیر نے
گویا دکھایا زور جنابِ امیر نے

ظالم کے ہوش سر سے اُڑے کچھ بن پڑی نہ
یاں ہاتھ کج ہوا نہ جبیں پر شکن پڑی

دہنے میں لیکے تیغ کے ساتھ آپنے سپر
جھٹکا دیا جو گرز کو بائیں سے تھام کر

گویا در آئی ناخن گیرا ہی شیر نر
دست لعیں سے چھوٹ گیا گرز گاوِ سر

عاجز تھا ہر طرح وہ حسین دلیر سے
یہ گاؤ زوریاں کہیں چلتی ہیں شیر سے

فرمایا خود سری نے تجھے کر دیا ہے کور
دیکھا ہمارے بازوے زخمی کا تو نے زور

قوت وہ دے تو پیل کو پامال کر دے مور
بیجا تھا یہ غرور یہ نخوت یہ زور و شور

انکار تیغ برق تجلی نہ کیجیو
توبہ کر اب کلام تعلی نہ کیجیو

مغرور نے حسام کو کھینچا مثال سام
منھ کھولے اژدہے کی طرح رہ گیا نیام

میدانیوں میں غل تھا کہ ہے روز رنگ و نام
ہاں اب لڑا دے جان کو ای پہلوان شام

گو بن کے چند بار لڑائی بگڑ گئی
سکہ ہے پھرتا جو کوئی ضرب پڑ گئی

ای شہسوار ملک سخن صفدری دکھا
گیتی کو زلزلہ ہو وہ زور آوری دکھا

جمعیت سپاہ کی پھر ابتری دکھا
ہاں زور و شور معرکہ حیدری دکھا

کٹ جائیں رنگ سینۂ اعدا فگار ہوں
پڑھنے میں دونوں لب جو کھلیں ذوالفقار ہوں

گھوڑا ہو واں جہاں رسائی ہوا کی ہو
جو نکلے منھ سے لفظ وہ قدرت خدا کی ہو

مصرع ہر ایک تیغ شہ لافتا کی ہو
جو چوٹ ہو بندھی ہوئی مشکل کشا کی ہو

نقشا ہو صاف تیغ علی کی صفائی کا
دکھلا دوں ہر ورق میں مرقع لڑائی کا

یوں کوند کوند کر صف اعدا پہ آ ے جائے
ہر استواں کو مثل ہما تیغ کھا ے جائے

جب تک کہ دم ہے خون کا دریا بہا ے جائے
نے جوہروں کو جوہر ذاتی دکھا جائے

غل ہو نزاع اٹھ گئی فتنہ فرو ہوا
ٹکڑے گریں زمیں پہ تو جانے کہ دو ہوا

ای تیغ آبدار زباں اور تیز ہو
سرگرم کشت و خون و قتال و ستیز ہو

دریا لہو کا وادی ہنگامہ خیز ہو
لگ جائے آگ دشت میں یوں شعلہ ریز ہو

کوثر علی سے پاؤں گا حلہ بتول سے
ہاں جنگ فتح کر کے صلہ لوں رسول سے

جب حکم ہو کہ مانگ لے کیا مانگتا ہے تو
گر کر کہوں قدم پہ کہ دنیا میں آبرو

ارشاد گر ہوا اور بھی کوئی ہے آرزو
اس دم کروں یہ عرض کہ یا شاہ نیکخو

سب کچھ ہے اختیار بہ شہ مشرقین میں
مسکن جناں میں قبر جوار حسین میں

مرتب اُدھر ہی شیر کا فرزند اس طرف
عمر اُس طرف نبی کا جگر بند اس طرف

اُس سمت ہی غلام خداوند اس طرف
کلمے غرور کے ہیں اُدھر پند اس طرف

ناصر کہاں عزیزوں کی لاشیں بھی دہیں
تلوار ہی سپر ہی فرس ہی حضور ہیں

گھوڑے کو اُس نے گشت پہ ڈالا پُر و دُور
کس غیظ سے ہلانے لگا سیف بے شعور

سن سن ہوا پہ ہاتھ لگا کر وہ پُر غرور
ایناں بتا رہا تھا وہیں سے سوئے حضور

جب اُس کے ساتھ کے سفاغل مچاتے تھے
رہ رہ کے قبلہ و دجہاں مسکراتے تھے

تعریف بے محل نے بڑھایا جو اُس کا دل
گھوڑا اُڑا کے آ گیا حضرت کے متصل

دونوں طرف سے چلنے لگے وار جاں گسل
تیغوں کی برق و شرق سے بجلی ہوئی خجل

عبرت ہوئی کہ خون شجاعوں کے گھٹ گئے
ڈھالوں کے پُرزے اُڑ گئے دستانے کٹ گئے

ٹوٹی وہ تیغ اُدھر یہ چمک کر اُدھر گئی
پستی سے یہ پھری تو وہ بالائے سر گئی

بجلی سی کوند کر یہ بڑھی وہ ٹھہر گئی
ندی تھی ایک دم میں چڑھی اور اُتر گئی

آنچ اس کے تیوروں کو شفق کی جلاتی تھی
اُس تیغ کی ہوا بھی یہاں پر نہ آتی تھی

سیماب تھی ہوا تھی چھلاوا تھی راہوار
اُس کو نہ چین تھا نہ اسے ایک جا قرار

قربان ذوالجناح شہنشاہِ نامدار
جاتا تھا یوں حریف کے گھوڑے پہ بابار

جس طرح جائے شیر گرسنہ غزال پر
ہر بار تھیں کلائیاں گھوڑے کے یال پر

ملتی ہوئی کنوتیاں لال آنکھیں منہ میں کف
بجلی سا اس طرف تھا کبھی گاہ اُس طرف

حیراں تھی اس کی تیز روی پر اُدھر کی صف
نتھنوں سے تھی نفس کی صدا یا شہِ نجف

ظالم سے معرکہ جو پڑا تھا لڑائی کا
مطلب یہ تھا کہ وقت ہی مشکل کشائی کا

گھوڑا کبھی نہ پھول کی جس پر چھڑی پڑی
کھولی گرہ وہ تیغ نے جب کلبھڑی پڑی

ضرب اُس کی جو پڑی وہ زرہ پر کڑی پڑی
فوجوں میں شور تھا کہ لڑائی بڑی پڑی

قوت علی کی ہاتھ میں ہی اس دلیر کے
کیونکر بچائیں صید کو پنجے سے شیر کے

تلوار اُدھر چمک کے چلی آنکھ اِدھر لڑی
پتلی سے پتلی اور نظر سے نظر لڑی

آری تھی وہ جو تیغ سے تیغِ دوسر لڑی
آپس اس قدر بڑھی کہ سپر سے سپر لڑی

ظالم کے سر پہ تیغ کا قبضہ جو پھر پڑا
جھجکا تو خود فرقِ ستم گر سے گر پڑا

بولے یہ مسکرا کے حسین فلک حشم
تھا وار سرسری سرِ گردن کو کر نہ خم

جھک کر اُٹھالے خود جو ہے سر زنش کا غم
سر جنگ ہو چلی نہ اُٹھانا بس اب قدم

آجم کے لڑکہ ہم بھی تو دیکھیں ہنر ترا
بھاگا تو پاؤں گھوڑے کے ہوں گے نہ سر ترا

کھینچی جو اُس نے باگ سمٹنے لگا سمند
سمجھے امام پاک کہ بھاگا یہ خود پسند

گر یوں نکل گیا تو کہینگے یہ ہوشمند
کس فکر میں تھے شاہ عدو گیر و صید بند

نے زخم کھائے صاف جفا جو نکل گیا
پنجے میں آکے شیر کے آہو نکل گیا

مغفر اُٹھا کے تیغ سے بولے امام دیں
لے جنگ سر ہی فرق پہ رکھ خود آہنیں

شہ کی طرف اُٹھا کے بصد غیظ تیغ کیں
مغفر کو بائیں ہاتھ سے لینے لگا لعیں

دیتے ہی خود دست مبارک جو مڑ گیا
مغفر تو ہاتھ میں رہا سر تن سے اُڑ گیا

پستی میں آئی بڑھ کے جو وہ تیغِ پر شرر
گھوڑے کے پاؤں کٹ گئے مثلِ خیار تر

اسوار جو کھڑے تھے وہ بھاگے اِدھر اُدھر
پھر پھر کے اضطراب میں کہتے تھے اہلِ شر

بھاگو جلا نہ دے کہیں آ کر اس کی دھار کی
بچھا کیے ہوئے ہی چمک ذوالفقار کی

فلقے میں دیر تک جو لڑے شاہِ تشنہ کام
غرقِ عرق تھے کانپ رہا تھا بدن تمام

ہاتوں سے چھوڑ دی تھی جو رہوار کی لگام
آنکھیں تھیں بند ہانپتا تھا اسپ تیز گام

غش میں سوارِ دوش نبی کا یہ حال تھا
نے تھامے خود فرس سے اُترنا محال تھا

دیکھا جو یہ کہ بھاگ گئے رن سے حیلہ ساز
تلوار رکھ کے میان میں بولے شہِ حجاز

مہلت ہے اے حسین پڑھو عصر کی نماز
یہ آخری ہے بندگیِ رب نے نیاز

فکرِ نجاتِ امت خیر البشر کرو
سوکھی زباں کو ذکرِ الٰہی میں تر کرو

ناگاہ سوئے لاشِ پسر جا پڑی نظر
چلّائے دل کو تھام کے سلطانِ بحر و بر

اکبر اُٹھو کہ گھوڑے سے گرتا ہے باپ پدر
سوتے ہو تم دھرے ہوئے رخسار خاک پر

بھولے پدر کو نیند میں قربان آپ کے
آؤ نمازِ عصر پڑھو ساتھ باپ کے

بیٹے ہو تم امام کے پوتے امام کے
کام آؤ مرتے دم پدرِ تشنہ کام کے

آتے ہیں پھر پلٹ کے پرے فوجِ شام کے
بٹھلا دو قبلہ رو مرے ہاتوں کو تھام کے

جاتی رہی نماز بھی اعدا جو پھر پڑیں
رعشہ ہے خود فرس سے جو اتریں تو گر پڑیں

عباس نامدار ترائی سے اٹھ کے آؤ
دھکتا ہے قلب جل رہے ہیں سب جگر کے گھاؤ

چھڑکو مری زرہ پہ جو پانی کہیں سے پاؤ
چلتے ہوئے عدم کے مسافر سے مل تو جاؤ

ہم سب کے کام آئے ہیں بیٹے ہیں روئے ہیں
بارہ پہر ہوئے کہ نہ لیٹے نہ سوئے ہیں

کیا بافضا یہ سر وڑائی ہے اب اُٹھو
ہم جاں بلب ہیں ختم لڑائی ہے اب اُٹھو

نرغے میں فوجِ ظلم کے بھائی ہے اب اُٹھو
عباس دھوپ چہرے پہ آئی ہے اب اُٹھو

غفلت کی تم کو نیند ہے شبیر کیا کرے
میری طرح کسی کو نہ بیکس خدا کرے

تم جب سے چھوٹے ساعد و بازو میں درد ہے
گردن میں سر میں آنکھ میں ابرو میں درد ہے

دل میں کمر میں سینے میں پہلو میں درد ہے
رگ رگ میں کیا ہر ایک بنِ مو میں درد ہے

ہر مرتبہ لڑے ہیں لہو میں نہائے ہیں
پیری میں نوجوانوں کے لاشے اٹھائے ہیں

چلّایا فوج کو پسرِ سعدِ نابکار
لو رکھ لی میان میں شہِ والا ذوالفقار

پلٹے پرے سواروں کے لیکر رسالہ دار
دو غول باندھے آئے کماندار دس ہزار

تیر افگنوں نے تیغوں میں بھالوں میں گھر گئے
تنہا حسین برچھیوں والوں میں گھر گئے

فریاد ہے وہ فوج کا دل اور اک حسین
وہ لے شمار تیغوں کے پھل اور اک حسین

وہ تیر جانستاں وہ جدل اور اک حسین
وہ سیکڑوں پیامِ اجل اور اک حسین

فوجوں میں شام کی مہ تاباں گھرا ہوا
بیکس بھی وہ کہ جس سے زمانہ پھرا ہوا

ڈوبے ہوئے تھے خون میں گیسو حسین کے
آنکھوں پہ کٹ کے آپڑے بازو حسین کے

زخمی ہیں دونوں ساعد و بازو حسین کے
تیروں نے چھان ڈالے تھے پہلو حسین کے

تینیں اوپنی ہوئیں جو برابر سے چل گئیں
غش آگیا قدم سے رکابیں نکل گئیں

مسند کے مرتبے کو نجانا ہزار حیف
تیروں سے صدر پاک کو چھانا ہزار حیف

شانے تھے ناوکوں کا نشانا ہزار حیف
مظلوم کو وہ برچھیاں کھانا ہزار حیف

ٹوٹے تھے سب رسول کے پیارے حسین پر
کیا وقت پڑ گیا تھا تمہارے حسین پر

گرتے ہیں آپ کون سنبھالے کوئی نہیں
سینے سے کون تیر نکالے کوئی نہیں

بیجان پڑے ہیں گود کے پالے کوئی نہیں
سب مر چکے ہیں چاہنے والے کوئی نہیں

بیکس ہیں اور سامنا فوج عدو کا ہے
مُنہ جس کا دیکھتے ہیں وہ پیاسا لہو کا ہے

کیونکر کہوں کہ عرش خدا خاک پر گرا
خیر النسا کا ماہ لقا خاک پر گرا

سرتاج بادشاہ و گدا خاک پر گرا
زیں سے اُلٹ کے راہ نما خاک پر گرا

وہ دو ہزار زخم تن چاک چاک پر
کیا گزری ہو گی جبکہ گرے ہونگے خاک پر

گڑے جاتے ہیں حال یہ ہے تن کا ہے غضب
اب مرحلہ ہے خنجر و گردن کا ہے غضب

پانی کا واں ہے کام کہ آہن کا ہے غضب
لوسا منا ہے شمر سے دشمن کا ہے غضب

اُس کے شریک فوج میں بارہ شریر ہیں
یاں اک گلا ہے جس پہ کئی زخم تیر ہیں

فضہ نے جا کے خیمے میں رانڈوں کو دی خبر
ہے ہے مرے خزادہ کا کٹتا ہے تن سے سر

بستر سے اُٹھ کے گر پڑے سجاد نوحہ گر
خیمے سے نکلیں بیبیاں بچوں کو چھوڑ کر

گر گر کے دوڑتی تھیں کہ مل لوں حسین سے
ملتا تھا عرش حضرت زینب کے بین سے

مانند آفتاب لرزتا تھا جسم پاک
جائیں کدھر وہ فوج وہ صحرائے ہولناک

سر پر عصا بہ ہاتھ میں موزے رداپہ خاک
لٹکے ہوئے تھے دونوں طرف پیرہن کے چاک

عابد کا نور عین رداتھامے ساتھ تھا
اک ہاتھ میں یتیم سکینہ کا ہاتھ تھا

چلاتی تھی ارے مرا بھائی ہے کس طرف
دریا کدھر ہے خوں کا ترائی ہے کس طرف
رستا دے اے زمین کہ فلک کی ستائی ہوں
بیبی پہ مصطفےٰ کے جگر کا لہو گرا
سید گرا امام گرا نیک خو گرا
تاب اُٹھنے بیٹھنے کی کہاں ہاتھ پاؤں میں
میں سیدہ ہوں رحم مری بیکسی پہ کھاؤ
دنیا میں تم خوشی رہو عقبیٰ میں چین پاؤ
یاں لٹ گئے فلک نے یہ دُکھ ہم پہ ڈالے ہیں
آتی تھی جس میں وحی وہ گھر ہے ہمارا گھر
تاروں میں برج شمس و قمر ہے ہمارا گھر
حاکم ہے بر خلاف وطن ہم سے چھٹ گیا
نے خانماں ہے تشنہ دہن ہے غریب ہے
اب دوست ہے کوئی نہ کوئی اب حبیب ہے
تم سب کو پاس چاہیے اس ذی وقار کا
اے قبر مصطفےٰ کے مجاور ترے نثار
اے تشنہ کام و صابر و شاکر ترے نثار
آئے تھے کربلا میں شہادت کے واسطے
صدقے میں تیری لاش کے اے گلبدن حسین
اے جاں بلب حسین امام زمن حسین
پیاسے گلے سے خنجر شمر لعیں ملا

لوٹی ہوئی علی کی کمائی ہے کس طرف
سونے کی جا حسین نے پائی ہے کس طرف
میں اپنے پیارے بھائی سے ملنے کو آئی ہوں
اے آسماں زمین پہ ابتک نہ تو گرا
وہ کعبۂ زمین و زماں قبلہ روگرا
شاید نماز پڑھتے ہیں تیغوں کی چھاؤں میں
اے اہل قریہ بنت نبی کی مدد کو آؤ
سید کدھر ہے خون میں غلطاں مجھے بتاؤ
اے بھائیو مدینے کے ہم رہنے والے ہیں
علم نبی کے شہر کا در ہے ہمارا گھر
تیغ عذاب حق کی سپر ہے ہمارا گھر
ہے ہے وہی بھرا ہوا گھر آج لٹ گیا
بیکس ہے داغ دیدہ ہے آفت نصیب ہے
اپنے وطن سے دور ہے تم سے قریب ہے
خادم بہ ہے تمہارے نبی کے مزار کا
اے بیکس و غریب و مسافر ترے نثار
اے دین حق کے حامی و ناصر ترے نثار
اک دن میں گھر لٹا دیا اُمت کے واسطے
اے تشنہ لب حسین غریب الوطن حسین
اے فاقہ کش حسین اسیر محن حسین
پانی بھی مرتے وقت بلا یا نہیں ملا

شہ کے کراہنے کی جو آنے لگی صدا
دوڑی اُدھر بنی کی نواسی برہنہ پا

دیکھا بہن نے بھائی کا کٹتے ہوئے گلا
غم سے کلیجہ پھٹ گیا زہرا کی جائی کا

آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کے گری بنتِ مرتضیٰ
اس نے تو دیکھا نیزے پہ سر اپنے بھائی کا

بس اے انیسؔ قلب و جگر کو نہیں قرار
آگے نہ لکھ مصیبتِ شبیرؑ نامدار

یہ بزم اور یہ آج کا پڑھنا ہے یادگار
رعشہ ہے دست و پا میں لرزتا ہے جسم زار

وہ یوں پڑھے جسے نہ ہو طاقت کلام کی
تائید ہے حسین علیہ السلام کی

رُباعی

شمعوں کی طرح دلوں کو جلتے دیکھا
آہوں کا دھواں مُنہ سے نکلتے دیکھا

افسوس کہ میداں میں بنی قاسم نے
دیکھا جسے اس کو ہاتھ ملتے دیکھا

رُباعی

کس غم میں یہ لذّت ہے جو اس غم میں ہے
سینے کو سرورِ شہ کے ماتم میں ہے

ہر چشم یہ کہتی ہے دکھا کر دُرِ اشک
رونے کا مزا ماہِ محرم میں ہے

مرثیہ (۱۸)

کیا زخم ہے وہ زخم کہ مرہم نہیں جس کا
کیا درد ہے جز دل کوئی محرم نہیں جس کا

کیا داغ ہے جلنا کوئی دم کم نہیں جس کا
کیا غم ہے کہ آخر کبھی ماتم نہیں جس کا

کس داغ میں صدمہ ہے فراقِ تن و جاں کا
وہ داغ ضعیفی میں ہے فرزندِ جواں کا

جب باغ جہاں اکبر ذی جاہ سے چھوٹا
پیری میں برابر کا پسر شاہ سے چھوٹا

فرزند جواں لختِ یداللہ سے چھوٹا
کیا اختر خورشید لقا ماہ سے چھوٹا

تصویر غم و درد سراپا ہوئے شبیرؑ
ناموس میں ماتم تھا کہ تنہا ہوئے شبیر

ہے ہے علی اکبر کا اُدھر شور تھا گھر میں
اندھیر تھی دنیا شہِ والا کی نظر میں

فرماتے تھے سوزش ہے عجب داغِ پسر میں
اُٹھتا ہے دھواں آگ بھڑکتی ہے جگر میں

پیغامِ اجل اکبر ناشاد کا غم ہے
عاجز ہے بشر جس سے وہ اولاد کا غم ہے

اُس گیسوؤں والے کے بچھڑ جانے نے مارا
افسوس بڑھاضعف گھٹا زور ہمارا

دنیا میں محمدؐ کا یہ ماتم ہے دوبارا
عالم سے عجب جانِ جہاں آج سدھارا

چادر بھی نہیں لاشۂ فرزندِ حسیں پر
کس عرش کے تارے کو سلا آئے زمیں پر

پیری پہ میری رحم کر اے خالقِ ذوالمن
طے جلد ہو اب مرحلۂ خنجر و گردن

قتلِ علی اکبر کی خوشی کرتے ہیں دشمن
تجھ پر میرے اندوہ کا سب حال ہے روشن

مظلوم ہوں مجبور ہوں مجروحِ جگر ہوں
تو صبر عطا کر مجھے یارب کہ بشر ہوں

پھر لاشۂ اکبر نظر آئے تو نہ روؤں
بر چھی جو کلیجے میں در آئے تو نہ روؤں

دل دردِ محبت سے بھر آئے تو نہ روؤں
سو بار جو منھ تک جگر آئے تو نہ روؤں

شکوہ نہ زباں سے غمِ اولاد میں نکلے
دم تن سے جو نکلے تو تری یاد میں نکلے

اک عمر کی دولت تھی جسے ہاتھ سے کھویا
ہر وقت رہا میں تری خوشنودی کا جویا

پالا جسے گودی میں وہ یوں خاک پہ سویا
میں لاش پہ بھی خوف سے تیرے نہیں رویا

قسمت نے جوانوں کو سبکدوش کیا ہے
مجھکو تو اجل نے بھی فراموش کیا ہے

اس حال سے روتے ہوئے داخل ہوئے گھر میں
تر تھی تنِ انور کی قبا خون پسر میں

سوزش دلِ پروغ میں ہے درد جگر میں
خم آگیا تھا بارِ مصیبت سے کمر میں

پنہاں تھا جو فرزندِ جگر بند نگہ سے
موتی رخِ انور پہ ٹپکتے تھے مژہ سے

بانو سے کہا رو کے خوشا حال تمہارا
صرف رہِ معبود ہوا مال تمہارا

مقبول ہوئی نذر یہ اقبال تمہارا
سجدے کرو پروان چڑھا لال تمہارا

دل خوں ہے کلیجے میں سناں کھا کے پھرے ہیں
ہم اُس کی امانت اُسے پہونچا کے چلے ہیں

جیتے تھے تو آخر علی اکبر کبھی مرتے
گر بیاہ بھی ہوتا تو زمانے سے گزرتے

سینے سے کلیجے کو جدا ہم جو نہ کرتے
بگڑے ہوئے اُمت کے نہ پھر کام سنورتے

گر حلق سے اُس شیر کے شمشیر نہ ملتی
یہ اجر نہ ہاتھ آتا یہ توقیر نہ ملتی

اکبر نے تو جاں اپنی جوانی میں گنوائی
تھی کونسی ایذا جو نہ اُس لال نے پائی

افسوس کہ پیری میں ہمیں موت نہ آئی
تلوار نہ سر پر نہ سناں سینے پہ کھائی

غم کھائینگے خونِ دلِ مجروح پینگے
کیا زور ہے جب تک وہ جلائے کا جینگے

دستور ہے مرتا ہے پدر آگے پسر کے
پہلے وہ اُٹھے تھامنے والے تھے جو گھر کے

اب کون اُٹھائے گا جنازے کو پدر کے
افسوس لحد بھی نہ ملے گی ہمیں مر کے

سر نیزے پہ اور دشت میں تن ہوگا ہمارا
خاک اڑکے پڑے گی یہ کفن ہوگا ہمارا

زینب سے کہا رخت کہن لاؤ تو پہنیں
ملبوس شہنشاہِ زمن لاؤ تو پہنیں

موت آگئی اب سر پہ کفن لاؤ تو پہنیں
کپڑے جو پھٹے ہوں وہ بہن لاؤ تو پہنیں

سرکٹ کے جو تن وادیِ پرخار میں رہ جائے
شاید یہی پوشاک تنِ زار میں رہ جائے

اللہ نے بچپن میں میرے ناز اُٹھائے
طفلی میں کسی نے شرف ایسے نہیں پائے

عریاں تھا کہ جبریلِ امیں عرش سے آئے
فردوس کے حلّے مرے پہنانے کو لائے

بیکس ہوں دل افگار ہوں آوارہ وطن ہوں
میں ہوں وہی شبیر کہ محتاجِ کفن ہوں

ناشاد بہن پاؤں پہ گر کر یہ پکاری
ماں جائے برادر تری غربت کے میں واری

بن بھائی کی ہوتی ہے یداللہ کی پیاری
گھر لٹ گیا کیونکر نہ کروں گریۂ وزاری

رونے کو بخت تک بھی کھلے سر ننگی میں
خالی یہ بھرا گھر ہوا اور مر نہ گئی میں

بچپن تھا کہ اماں سے ہوئی پہلے جدائی
نانا کے لیئے ماتمی صف میں نے بچھائی

روتی تھی پدر کو کہ سفر کر گئے بھائی
یثرب بھی چھٹا دیس سے پردیس میں آئی

غم دیکھوں بڑے بھائی کا ماں باپ کو روؤں
قسمت میں یہ لکھا تھا کہ میں آپ کو روؤں

فرمایا کہ دُنیا میں نہیں موت سے چارا
رہ جاتے ہیں ماں باپ بچھڑ جاتا ہے پیارا

ہجرِ علی اکبر تھا کسی کو بھی گوارا
وہ مر گئے اور کچھ نہ چلا زور ہمارا

دیکھا جسے آباد وہ گھر خاک بھی دیکھو
اب خاتمۂ پنجتنِ پاک بھی دیکھو

کس کس کی نہ دولت پہ زوال آگیا زینب
پابند رضا تھا تو شرف پا گیا زینب

دُنیا سے گیا جو تنِ تنہا گیا زینب
کھلتا نہیں وہ پھول جو مرجھا گیا زینب

جو منزلِ ہستی سے گیا پھر نہیں ملتا
یہ راہ وہ ہے جس کا مسافر نہیں ملتا

میں کون ہوں اک تشنہ لب و بیکس و محتاج
بندہ تھا خدا کا سو ہوا ہوں میں طلب آج

وہ کیا ہوئے جو لوگ تھے کونین کے سرتاج
نہ حیدرِ کرار ہیں نہ صاحبِ معراج

کچھ پیٹنے رونے سے نہ ہاتھ آئے گا زینب
آیا ہے جو اس دہر میں وہ جائے گا زینب

کس طرح وہ بیکس نہ اجل کا ہو طلبگار
ناصر نہ ہو جس کا کوئی دُنیا میں نہ غمخوار

اک جانِ حزیں لاکھ مصیبت میں گرفتار
اکبر ہیں نہ قاسم ہیں نہ عباسِ علمدار

کوشش ہے کہ سجدہ تہِ شمشیر ادا ہو
تنہائی کا مرنا ہے خدا جانے کیا ہو

قاتل جو چھری خشک گلے پر مرے پھیرے
خالص رہے نیت کوئی تدبیر نہ گھیرے

کٹنے میں رگوں کے یہ سخن لب پہ ہو میرے
قربان حسین ابن علی نام پہ تیرے

بہنوں کی نہ ہو فکر نہ بچوں کی خبر ہو
اس صبر سے سر دوں کہ مہم عشق کی سر ہو

فرما کے یہ ہتھیار سجے آپ نے تن پر
غل پڑ گیا شاہِ شہدا چڑھتے ہیں رن پر

احمد کی قبا آپ نے پہنی جو کفن پر
پیدا ہوا اک جلوۂ نو رختِ کہن پر

اللہ رے خوشبو تنِ محبوبِ خدا کی
پھولوں کی مہک آگئی کلیوں سے قبا کی

وہ پھول سے رخسار گلابی وہ عمامہ
تعریف میں خود جس کی سراقندہ ہے خامہ

وہ زرد عبا نور کی وہ نور کا جامہ
برسوں جو لکھیں ختم نہ ہو مدح کا نامہ

کپڑے تنِ گلرنگ کی خوشبو سے بسے تھے
ٹوٹی کمر امت کی شفاعت پہ کسے تھے

شمشیر ید اللہ لگائی جو کمر سے
سر پیٹ کے زینب نے ردا پھینک دی سر سے

سمجھاتے ہوئے سب کو چلے آپ جو گھر سے
بچوں کی طرف تکتے تھے حسرت کی نظر سے

اُس غل میں جدا شہ سے نہ ہوتی تھی سکینہ
پھیلائے ہوئے ہاتھوں کو روتی تھی سکینہ

شہ کہتے تھے بی بی ہمیں رو کر نہ رولاؤ
پھر پیار کریں ہم تمھیں منہ آگے تو لاؤ

وہ کہتی تھی ہمراہ مجھے لیلو تو جاؤ
میں کیا کروں میداں میں اگر جا کے نہ آؤ

نیند آئے گی جب آپ کی بو پاؤنگی بابا
میں رات کو مقتل میں چلی آؤنگی بابا

فرمایا نکلتی ہیں سیدانیاں باہر
چھاتی پہ سلائینگی تمھیں بات کو مادر

وہ کہتی تھی سوئینگے کہاں پھر علی اصغر
فرماتے تھے بس ضد نہ کر و صدقے میں تم پر

شب ہوئے گی اور دشت میں ہم پہنچینگے بی بی
اصغر میرے ساتھ آج وہیں سوئینگے بی بی

وہ کہتی تھی بس دیکھ لیا آپ کا بھی پیار
میں آپ سے بولوں گی نہ اب یا شہِ ابرار

اچھا نہ گر کہیے جلد آنے کا اقرار
مر جائے گی اس شب کو تڑپ کر یہ دل زار

کیسی ہیں یہ باتیں مرا دل رہتا ہے بابا
گھر چھوڑ کے جنگل میں کوئی سوتا ہے بابا

اصغر کبھی ساتھ آپ کے اب تک نہیں سوئے
بہلا لیا اماں نے اگر چونک کے روئے

شفقت تھی مجھی پر کہ یہ نئے چین ہوئے
یہ پیار ہو جس پر اسے یوں ہاتھ سے کھوئے

جیتے رہیں فرزند کہ سب سخت جگر ہیں
میں آپ کی بیٹی ہوں وہ اماں کے پسر ہیں

شہ کہتے تھے صدمہ دلِ مضطر پہ ہے بی بی
ہفتم سے تباہی میرے سب گھر پہ ہے بی بی

اعدا کا یہ گرش سبطِ پیمبر پہ ہے بی بی
جس نے تمھیں پیدا کیا وہ سر پہ ہے بی بی

چھوٹے نہ وہ جو صبر کا جادہ ہے سکینہ
ماں باپ سے پیارا اُس کا زیادہ ہے سکینہ

لو روؤ نہ اب صبر کرو باپ کی جانی
کچھ دیتی ہو عباس کو پیغام زبانی

اودے ہیں لبِ لعل پہ ہے تشنہ دہانی
ملتا ہے تو بی بی کے لیے لاتے ہیں پانی

محبوبِ الٰہی کے نواسے ہیں سکینہ
ہم بھی تو کئی روز کے پیاسے ہیں سکینہ

دنیا ہے یہ شادی ہے کبھی اور کبھی آلام
راحت کی کبھی صبح مصیبت کی کبھی شام

یکساں نہیں ہوتا کبھی آغاز کا انجام
وہ دن گئے کرتی تھیں جو اس چھاتی پہ آرام

ضد کر کے نہ اب رات کو رویا کرو بی بی
جب ہم نہ ہوں تم خاک پہ سویا کرو بی بی

سمجھا کے چلے آپ سکینہ کو غش آیا
غل تھا کہ اُٹھا سر سے شہنشاہ کا سایا

ڈیوڑھی سے جو نکلا اسد اللہ کا جایا
رہوارِ سبک سیر کو روتا ہوا پایا

کس عالمِ تنہائی میں سیّد کا سفر تھا
بھائی نہ بھتیجا نہ ملازم نہ پسر تھا

سائے کی طرح جو نہ جدا ہوتی تھی دم بھر
وہ رات کی جاگی ہوئی سوتی ہے زمیں پر

گردوں کی طرف دیکھ کے فرماتے تھے سرور
تو سر پہ ہے تنہا نہیں فرزندِ پیمبر

کچھ کام نہ اس بیکس و ناشاد سے ہوگا
جو ہوگا وہ مولا تری امداد سے ہوگا

فرما کے یہ مولا جو قریبِ فرس آئے
نصرت کو صفیں باندھے ملک پیش و پس آئے

فریاد کناں جن بھی مثالِ جرس آئے
جنگل سے ہٹے پانچ جو دستے تو دس آئے

ڈھالیں لیے سب ہاتھوں کو قبضوں پہ دھرے تھے
لشکر سے جنوں کے بھی کئی دشت بھرے تھے

تھی قوم نبی جان بھی سرداری کو حاضر
فوجوں کے طلاے تھے خبرداری کو حاضر

لشکر تھا فرشتوں کا جگرداری کو حاضر
جبریل تھے خود غاشیہ برداری کو حاضر

تولے ہوئے نیزوں کو لڑائی پہ تلے تھے
رہوار تو ابلق تھے علم سبز کھلے تھے

اصرار کیا سب نے پہ حضرت نے نہ مانا
جز حق مددِ غیر کو رد کرتے ہیں دانا

وہ شاہ کہ جس کے یدِ قدرت میں زمانا
کون آیا گیا کون یہ مطلق بھی نہ جانا

بندہ وہی بندہ ہے جو راضی ہو رضا پر
اوروں سے اُسے کیا جسے تکیہ ہو خدا پر

کی عرض ملائک نے کہ یا سیّدِ ابرار
ہم آپ کے نانا کی مدد کرتے تھے ہر بار

فرمایا وہ خواہاں تھے کہ مغلوب ہوں کفّار
میں اپنی شہادت کا خدا سے ہوں طلبگار

جان آج ہماری کسی صورت نہ بچے گی
بالفرض بچا میں تو پھر اُمّت نہ بچے گی

زعفر نے یہ کی عرض بصد اشک فشانی
ہو حکم تو لے آؤں ابھی نہر سے پانی

کچھ کام تو لے اے اسد اللہ کے جانی
فرمایا کہ مطلق نہیں اب تشنہ دہانی

دریا جو خود آئے گا تو لب تر نہ کرونگا
احمد کا نواسا ہوں تو پیاسا ہی مرونگا

جس وقت فلک پر ہو عیاں ماہِ محرم
ہر تعزیہ خانے میں بپا ہو میرا ماتم

جو بیبیاں ہیں روئیں گھروں میں مجھے باہم
مردوں میں یہ ہو شور کہ ہے ہے شہِ عالم

سب پیر و جواں روئیں یہ انجام ہو میرا
مظلوم حسین ابنِ علی نام ہو میرا

دنیا میں مرے گا جو کسی شخص کا بھائی
یاد آئے گی عباس کی اور میری جدائی

جان اپنی بھتیجے نے کسی کے جو گنوائی
روئے گا کہ قاسم نے سناں سینہ پہ کھائی

اولاد کا ماتم جسے ناشاد کرے گا
اکبر کے جواں مرنے کو وہ یاد کرے گا

دس روز شب و روز ہو غل ہائے حسینا
صدقے ترے اے فاطمہ کے جائے حسینا

زخم تبر و تیر و سناں کھائے حسینا
سب پانی پئیں اور نہ تو پائے حسینا

جب پانی پئیں اشک فشانی کو نہ بھولیں
بچے بھی میری تشنہ دہانی کو نہ بھولیں

زینب نے پکارا میرے مال جائے برادر
ناشاد بہن لینے رکاب آئے برادر

اب کوئی مددگار نہیں ہائے برادر
صدقے ہو بہن گرتھیں پھر پائے برادر

غش آئے گا دو گام پیادہ جو بڑھو گے
اس ضعف میں رہوار پہ کس طرح چڑھو گے

حضرت نے صدا دی کہ نہ خواہر نہ نکلنا
جب تک کہ میں زندہ رہوں ہاں ہر نہ نکلنا

للہ بہن کھولے ہوئے سر نہ نکلنا
سر کھول کے کیا اوڑھ کے چادر نہ نکلنا

کہا تم نے کہا دل میرا تھرا گیا زینب
بھائی کی مناجات میں فرق آگیا زینب

رخصت ہوئے روتے ہوئے سارے مکان سے
گھوڑے پہ چڑھا تھم کے وہ کونین کا محسن

آفت کا وہ تھا وقت قیامت کا وہ تھا دن
سایا نہ کسی جا تھا نہ پانی کہیں ممکن

عباس کے حملے جو لعیں دیکھ چکے تھے
دریا بھی نظر بند تھا یوں گھاٹ کے تھے

وہ دوپہر اُس دشت کی اور دن کا وہ ڈھلنا
وہ گرم زرہ اور وہ ہتھیاروں کا جلنا

وہ گرد کا مقتل میں تتق لوں کا وہ چلنا
وہ بن میں پہاڑوں سے شراروں کا نکلنا

گرمی سے فرس میں بھی نہ وہ تیزگی تھی
پیاسے تھے حسین آگ زمانے کو لگی تھی

فوجوں کے برابر جو شہِ بحر و بر آئے
اللہ ری تمازت کہ پسینے میں تر آئے

غصے میں جو ہلتے ہوئے ابرو نظر آئے
غل تھا کہ علی تول کے تیغ دوسر آئے

حُسنِ خمِ ابرو تھا دوبالا مہ نو سے
چہرے میں زیادہ تھی منیا مہر کی ضو سے

چہرہ وہ کہ رضواں تو دکھائے چمن ایسے
جنت کے گلستاں میں نہیں گلبدن ایسے

لب بند ہوئے جاتے ہیں شیریں دہن ایسے
ہے شور جہاں میں نمک ایسا سخن ایسے

قرآں نہ اُترآتا تو قرأت بھی نہ ہوتی
یہ خلق نہ ہوتے تو فصاحت بھی نہ ہوتی

منظورِ نظر گیسوئے رخسارۂ تاباں
ظلمت کی سحر گیسوئے رخسارۂ تاباں

ہالے میں قمر گیسوئے رخسارۂ تاباں
مشک و گلِ تر گیسوئے رخسارۂ تاباں

دیکھے نہ کبھی نور سحر دیکھ کے ان کو
دو راتوں میں دو چاند نظر آتے ہیں دن کو

آئینہ کا کیا منہ جو جبیں سے ہو مقابل
مہتاب کہوں گر تو وہ ناقص ہی یہ کامل

چہرے پہ کلف صاف یہ ہی عیب میں داخل
خورشید بھی اصلا نہیں تشبیہہ کے قابل

ہمسر ہوں وہ کیونکر کوئی نسبت نہیں جن کو
یہ رات کو پیشانی سے محجوب وہ دن کو

آراستہ لشکر ہی اُدھر ملتے ہیں بھالے
قبضوں پہ ہیں چالاک جواں ہاتھوں کو ڈالے

بدکیش ہیں واں تیروں کو ترکش سے نکالے
فوجوں پہ تو فوجیں ہیں رسالے پہ رسالے

خنجر وہ کلیجے پہ جو زہر لے کے پھرے ہیں
شاہِ شہدا قلعۂ آہن میں گھرے ہیں

تلواریں لیے دشمن جاں ایک طرف ہیں
گھوڑے پہ شہِ کون و مکاں ایک طرف ہیں

تیر ایک طرف گرزِ گراں ایک طرف ہیں
آپ ایک طرف لاکھ جواں ایک طرف ہیں

سر کٹنے کا دھڑکا نہیں وسواس نہیں ہی
فوجوں سے وغا اور کوئی پاس نہیں ہی

بے سایہ جو ہی لاشۂ ہم شکل پیمبر
بکسے ہوئے ہیں دھوپ میں زخم تن انور

واحسرت و درد اکہ نہیں لاش پہ چادر
سوتے ہیں لبِ نہر علمدارِ دلاور

تنہا جو وہ ساونت ہزاروں سے لڑا ہی
مارا ہوا اک شیر ترائی میں پڑا ہی

فرماتے ہیں گرمی کی بس اب مجکو نہیں تاب
میں تین شب و روز سے جنگل میں ہوں بے آب

مرجھائے ہیں سب باغِ علی کے گلِ شاداب
کیونکر وہ جیے جس سے بچھڑ جائیں یہ احباب

صابر ہوں میں ایسا ہی غش آ نہیں جاتا
ان پھولوں کو اس دھوپ میں دیکھا نہیں جاتا

اتنی مجھے مہلت دو کہ قبریں تو بناؤں
سیدانیوں سے بہر کفن چادریں لاؤں

اس خاک میں ان چاند کے ٹکڑوں کو چھپاؤں
یہ دفن ہوں میں قبر نہ پاؤں تو نہ پاؤں

قطرہ کوئی نہر سے پیاسے کو نہ دینا
مٹی بھی محمد کے نواسے کو نہ دینا

کیا اُن سے عداوت جو گئے دار فنا سے
کوتاہ ہیں چلنے سے قدم ہاتھ وغا سے

مطلب انھیں دریا سے نہ کچھ سرد ہوا سے
رحم اُن کا طریقہ ہی جو ڈرتے ہیں خدا سے

مہماں سے لڑے بھی تو یہ سب حق پہ لڑے ہیں
آخر یہ بشر ہیں کہ جنے گور پڑے ہیں

مرتا ہی مسافر کبھی بستی میں کوئی گر
سب لوگ اُسے غسل و کفن دیتے ہیں مل کر

قرآں کوئی پڑھتا ہی کہ یٰسیں تھا ہے پر
لے آتا ہی تربت پہ کوئی پھولوں کی چادر

غم کرتے ہیں سب فاتحہ خوانی میں سیوم کو
سید ہیں یہ اور شرم نہیں آتی ہی تم کو

اس میں کئی بچے تھے کہ نکلے تھے نہ گھر سے
نازک ہیں صباحت میں زیادہ گل تر سے

اُفتادہ ہیں اس دھوپ میں یہ تین پہر سے
پوچھے کوئی یہ درد و الم میرے جگر سے

نرغہ ہی کہ تلواروں میں دم لے نہیں سکتا
زندہ ہوں میں اور اُن کو کفن دے نہیں سکتا

یہ سُن کے پکارا پسرِ سعدِ بد افعال
کیسا کفن اور کیسی لحد فاطمہ کے لال

اکبر ہوں کہ ہوں قاسم و عباس خوش اقبال
ہم گھوڑوں کی ٹاپوں سے کریں گے اُنھیں پامال

سینوں پہ گل زخم ابھی اور کھلیں گے
سجّاد کو ٹکڑے بھی نہ لاشوں کے ملیں گے

حضرت نے کہا دور ہو او ظالم مردود
اللہ شہیدوں کی حفاظت کو ہی موجود

یہ وہ ہیں کہ زہرا و نبی جن سے ہیں خوشنود
ہر لاش کو گھیرے ہوئے ہی رحمتِ معبود

قبروں میں بھی جنت کے چمن ان کو ملیں گے
فردوس کے حلّوں کے کفن ان کو ملیں گے

میں دیر سے آمادہ ہوں تلوار کو تولے
کہدے کہ علم فوجِ صفین باندھ کے کھولے

ماروں اُنھیں پھوٹیں کہیں کچ دل کے پھپولے
سر تن سے اُڑا دوں کوئی اب منھ سے جو بولے

آرام سفر کر گیا راحت نہیں باقی
بڑھتا ہوں کہ بس اب کوئی حجت نہیں باقی

یہ فوج ہی کیا آگ کا دریا ہو تو جھیلیں
کیا ڈر اُنھیں بچپن میں جو تلواروں سے کھیلیں

اُلٹیں صفتِ کاہ اگر کوہ کو ریلیں
کوفہ تو ہی کیا شام کو اور روم کو پیلیں

چاہیں تو زمیں کے ابھی ساتوں طبق اُلٹیں
یوں اُلٹیں کہ جس طرح ہوا سے ورق اُلٹیں

کہتے ہیں جسے اہلِ زمیں گنبدِ گرداں
نہ وہ ورقے میں اک جزو کتابِ شہِ مرداں

ہم آج ہیں عالم میں قضا فہم و قدرداں
حق بین و حق آگاہ و سخن سنج و ہنرداں

کس امر میں تقلیدِ محمد نہیں کرتے
فاقوں میں سوال فقرا رد نہیں کرتے

اللہ نے کونین کی شاہی ہمیں دی ہے
امداد رسولوں کی میرے باپ نے کی ہے

مجھ میں بھی وہی دل وہی شوکت وہی جی ہے
سر برسے ہیں جب تیغ علی میان سے لی ہے

سر تن سے کٹے جب تو ہم جنگ کی سر ہے
مر جائے یہ عزت یہ بہادر کی ظفر ہے

ہم دولت دنیا کبھی گھر میں نہیں رکھتے
تو فیر زر و مال نظر میں نہیں رکھتے

رکھتے ہیں قدم خیر میں شر میں نہیں رکھتے
کچھ اور بجز تیغ کمر میں نہیں رکھتے

نذر رہ معبود تن و سر ہے ہمارا
زیور ہے یہی اور یہی زر ہے ہمارا

شہر اس کی تپ و تاب سے ویرانے ہوئے ہیں
جب چکے ہے یہ دیو بھی دیوانے ہوئے ہیں

منھ وہ ہے کہ تلواروں میں دندانے ہوئے ہیں
لوہا وہ کہ جبریل جسے مانے ہوئے ہیں

کر دیتی ہے شب دشمن ایماں کے دلوں کو
چڑھ آتی ہے تپ اس کے شراروں سے خنوں کو

برباد اسی تیغ سے سر کٹ کے ہوئے ہیں
جاں بر جو ہوئے بھاگ کے یا ہٹ کے ہوئے ہیں

عاجز ہے ذرہ خود بھی سر پٹکے ہوئے ہیں
اب تک پر جبریل میں لٹکے ہوئے ہیں

باعث یہ نہ ہوتا تو پھر آرام نہ لیتے
تھا خاتمہ گر ہاتھ علی تھام نہ لیتے

مشہور جہاں عمرو علی کی ہے لڑائی
زور اس کا کہ یہ دیو نے قوت نہیں پائی

خندق کے ادھر آتے ہی تلوار جو کھائی
گویا تھی مہینوں سے تن و سر میں جدائی

لاشہ کا ادھر ڈھیر سر نخس ادھر تھا
خندق کو جو دیکھا تو لہو تا بہ کمر تھا

کب میان سے شمشیر دو سر لی نہیں ہم نے
لڑنے میں کبھی منہ پہ سپر لی نہیں ہم نے

جب تک کہ زمیں خون سے بھر لی نہیں ہم نے
کچھ اپنے سر و تن کی خبر لی نہیں ہم نے

شمشیر و سپر بعد ظفر کھولتے ہیں ہم
جب صاف ہو میداں تو کمر کھولتے ہیں ہم

پیغام قضا تیغ ید اللہ کو جانو
ہمتائے علی فاطمہ کے ماہ کو جانو

بینائی ہو تو کوہ گراں کاہ کو جانو
عاجز نہ کبھی بندۂ اللہ کو جانو

انگشت سے حلقے کو مروڑا ہے علی نے
خیبر کا دراک ہاتھ سے توڑا ہے علی نے

اللہ رے زور دیدۂ پاکیزہ و طاہر
آثار اذا زلزلت الارض تھے ظاہر

کھاتے تھے سدا نانِ جویں خلق ہی ما ہر
کچھ زر نہ سماتا تھا نظر میں نہ جواہر

اسباب شہنشاہ دو عالم یہی بس تھا
قرآن تھا یہ تلوار تھی بس ایک فرس تھا

بھاتا تھا شریک فقرا شاہ کو ہونا
بھولا نہیں راتوں کو مناجات میں رونا

ہی یاد یہیں بوریے پر راتوں کو سونا
بستر تھا وہی دن کا وہی شب کا بچھونا

اک ریزۂ زر خانۂ حیدر سے نہ نکلا
دُنیا سے اُٹھے جب تو کفن گھر سے نہ نکلا

پانی بھی ملک کوثر و تسنیم کا لائے
جبریل امیں عرش سے روتے ہوئے آئے

پیوند پہ پیوند جو ملبوس میں پائے
سر پیٹ کے ہم بھائیوں نے اشک بہائے

جو کچھ تھا وہ قبل اپنے شہنشاہ نے بھیجا
کافور نبی نے کفن اللہ نے بھیجا

اللہ ہی عالم کہ وہی حال ہی میرا
ریتی پہ پڑا ہی جو زر و مال ہی میرا

یہ گوہر و یاقوت ہی یہ لعل ہی میرا
اس دشت میں جو مال ہی یا مال ہی میرا

آرام پس از رنج و محن بھی نہ ملے گا
مجکو تو کسی روز کفن بھی نہ ملے گا

ہم اپنے جو لشکر کے پرے تم کو دکھائیں
تم کیا ہو نبی جاں کی جانیں ابھی جائیں

جرار کبھی تاب ٹھہرنے کی نہ لائیں
مر جائیں ہزاروں تو ہزاروں کو عش آئیں

منظور ملائک کی جو امداد کروں میں
اک اپنے لیے لاکھوں کو برباد کروں میں

میں نے تو بھرے گھر کو تمھارے لیے چھوڑا
دربار پیمبر کو تمھارے لیے چھوڑا

اُس قبر منور کو تمھارے لیے چھوڑا
بیماری میں دختر کو تمھارے لیے چھوڑا

نہ ماں کے نہ پہلو میں بڑے بھائی کے جا ہو
قسمت میں یہ تھا سب سے مری قبر جدا ہو

سچ ہی سخن حق میں عجب ہوتی ہی تاثیر
تھرّائے جگر رونے لگے فوج کے بے پیر

مولا نے سنبھل کر جو رکھی دوش پہ شمشیر
ہنسکر پسر سعد پکارا کہ چلیں تیر

اک حشر بپا ہوگا جو یہ شیر لڑے گا
سر خاک پہ لوٹیں گے بڑا کھیت پڑے گا

نقارۂ رزمی پہ پڑی چوب یکایک
تھرّانے لگا دشت پر آشوب یکایک

تلوار جو کھنچیں زہر میں سر ڈوب یکایک
لشکر سے بڑھے فوج کے سر کوب یکایک

رحم آیا نہ اعدا کو ولی ابن ولی پر
نرغہ ہوا مظلوم حسین ابن علی پر

غل طبل کا قرنا کی وہ آواز ڈرانی
زہرے جسے سن سن کے ہوئے جاتے تھے پانی

کالے وہ علم شام کے لشکر کی نشانی
وہ تیر جگر دوز کمانیں وہ کیانی

اک تیر سے مرجانے میں عرصہ نہیں کھنچتا
رستم سے بھی جن کا کبھی چلّہ نہیں کھنچتا

تلوار ادھر سید ابرار نے کھینچی
یا تیغ دو سر حیدر کرار نے کھینچی

تصویر اجل برق شرر بار نے کھینچی
گردن طرف غار ہر اک مار نے کھینچی

گھبرا گئی صدمہ یہ ہوا گاؤ زمیں پر
سر رکھ دیے جھک جھک کے پہاڑوں نے زمیں پر

آثار نمایاں ہوئے خالق کے غضب کے
شیروں نے ترائی سے کنارا کیا دب کے

چونک اٹھے وہ سوتے تھے جو جاگے ہوئے شب کے
دل ہل گئے رنگ اڑ گئے کفار عرب کے

سردار قدم گاڑے تھے ہر چند زمیں پر
گر گر گئے کھل کھل کے کمر بند زمیں پر

نعرہ کیا بڑھ کر شہ دیں نے کہ خبردار
لشکر سے کہا شمر لعیں نے کہ خبردار

صیحہ کیا جبریل امیں نے کہ خبردار
ماہی سے کہا گاؤ زمیں نے کہ خبردار

گیتی نہیں پھر گریہ زد و کشت رہے گی
شاخیں مری ہونگی نہ تری پشت رہے گی

جنگل میں پہاڑوں کے جگر خوف سے کانپے
گرنے لگے پتے یہ شجر خوف سے کانپے

گھڑیال تھے پانی میں مگر خوف سے کانپے
تھے دور اولی چشمہ پر خوف سے کانپے

گو قوت پرواز خداداد تھی اُن کو
روداد پر روح امیں یاد تھی اُن کو

چلاتے تھے ہر صف میں نقیبان جفاکیش
ہاں غازیو اس وقت بڑی جنگ ہے درپیش

فرزند علی ہے یہ جگر خستہ و دل ریش
سر کرتے ہیں سرورے سے ہم کو ظفر اندیش

کوشش کی گھڑی جان لڑا دینے کا دن ہے
صفین کے کشتوں کے عوض لینے کا دن ہے

مولائے اُمم لشکرِ پُرکید پر آئے
انبوہِ عناد و حسد و سید پر آئے

گر عمر پہ آئے تو کبھی زید پر آئے
یوں آئے کہ جس طرح اسد صید پر آئے

ہل چل تھی کہ طوفان میں جہاز آتا ہے جیسے
تیغ آتی تھی کجھنک پہ باز آتا ہے جیسے

سر گرنے لگے جسم سے چلنے لگی تلوار
چار آئینے میں جا کے نکلنے لگی تلوار

افعی کی طرح زہر اُگلنے لگی تلوار
پی پی کے لہو رنگ بدلنے لگی تلوار

پانی نے اثر زہرِ ہلاہل کا دکھایا
ہر ضرب میں جلوہ حق و باطل کا دکھایا

ہر غول میں غل تھا یہ لڑائی بھی نئی ہے
انبار سر و تن میں صفائی بھی نئی ہے

سر تن سے اُترتے ہیں چڑھائی بھی نئی ہے
یہ گھاٹ نیا ہے یہ ترائی بھی نئی ہے

چھپنے کی جگہ دامنِ صحرا میں نہیں ہے
یہ باڑھ غضب کی کسی دریا میں نہیں ہے

تلواریں جو عاری ہیں تو لے آپ سنانیں
بیکار کمیں میں ہیں کمینوں کی کمانیں

اک منہ میں اُسے حق نے جو دو دی ہیں زبانیں
اس رزم کو جو صیف زباں ہوں ہی جانیں

مطلب تھا کہ اب دین کو کامل یہ کرے گی
دو شرک کو اور کفر کو باطل یہ کرے گی

برباد ی ہوئی کفر کے لشکر کی اسی سے
گردن نہ بچی عمر سے خود سر کی اسی سے

کچھ چل نہ سکی مرحب و عنتر کی اسی سے
چولیں ہیں ہٹیں ڈھیلی در خیبر کی اسی سے

میدان ہر اک معرکہ میں ہاتھ ہے اس کے
قبضے کی طرح فتح و ظفر ساتھ ہے اس کے

جو سایۂ شمشیر ظفر یاب میں آیا
ماہی کی طرح موت کے قلاب میں آیا

فی الفور خلل ریست کے اسباب میں آیا
جو آگیا کادے میں وہ گرداب میں آیا

کچھ مطلب دل ہاتھ بھی لڑے سے نہ نکلا
دریا بھی دمِ تیغ کے دھارے سے نہ نکلا

جب مثل سموم آکے نکل جاتی تھی سن سے
پتوں کی طرح خاک پہ سر گرتے تھے تن سے

جو شیر تھے میداں کے ہرن ہو گئے رن سے
وحشی بھی چلے جاتے تھے بھاگے ہوئے بن سے

افعی نہ فقط ڈر کے دراڑوں میں چھپے تھے
دب دب کے درندے بھی پہاڑوں میں چھپے تھے

اللہ ری مولا کی ہزاروں سے لڑائی
فوجوں سے وغا ظلم شعاروں سے لڑائی

پرخاش پیادوں سے سواروں سے لڑائی
لشکر کی حدیں چار ہیں چاروں سے لڑائی

انبوہ میں سرگرم زد و کشت کہیں تھے
جو صف سے بڑھا تیغ بکف آپ وہیں تھے

مقتل میں کوئی خاک پہ دم توڑ رہا تھا
باغی کوئی ہستی کا چمن چھوڑ رہا تھا

ہٹ ہٹ کے کوئی وسطِ ادب چھوڑ رہا تھا
گھوڑے کی اُدھر باگ کوئی موڑ رہا تھا

تلوار کے سائے سے ڈرے جاتے تھے اعدا
بھاگڑ تھی کہ پس پس کے مرے جاتے تھے اعدا

لاشیں تھیں دس اک لاش پہ سر گرتے تھے سر پر
پاؤں پہ کبھی ہاتھ تو سینے تھے کمر پر

چار آئینے شانوں پہ کٹے تیر تبر پر
خنجر تھے انھیں کے جو پھرے اُن کے جگر پر

بے چلّے کماں گرز گراں مشت کے نیچے
تیغیں تہ گردن سپر بیں پشت کے نیچے

سیدھے جو نشاں تھے انھیں کیا تیغ نے اُلٹا
اس صف کو بچھا کر وہ پرا تیغ نے اُلٹا

لشکر کا ورق وقتِ وغا تیغ نے اُلٹا
گردن بھی الگ تھی جو گلا تیغ نے اُلٹا

جو صاحبِ دفتر تھا وہ مقتل سے ہٹا تھا
جس فرد کے چہرے پہ نظر کی وہ جدا تھا

چلاتے تھے گر گر کے یہ جن بیر علم کے
جانوں کو بچاؤ کہیں پھر تیغ نہ چمکے

جل جاتے ہیں سایہ سے اسی برقِ دودم کے
رن پٹتا ہی لڑتے ہیں جس کھیت میں جم کے

ہیں سیف خدا عرش سے تیغ اُتری ہوا اُن کو
جانیں وہی ان شیروں سے ہو سامنا جن کو

غالب کوئی ان پر کسی صورت نہیں رہتا
قایم قدم صاحب جرات نہیں رہتا

نے سر ہی جو پابندِ اطاعت نہیں رہتا
کلمہ نہ پڑھے جو وہ سلامت نہیں رہتا

حملوں سے یہ ہونٹوں پہ اگر جان نہ لائے
کافر تھے وہ جن جو وہاں ایمان نہ لائے

شیرانِ سد قلعہ شکن گونج رہا تھا
جنبش تھی پہاڑوں کو یہ رن گونج رہا تھا

قرنا سے اُدھر چرخِ کہن گونج رہا تھا
نعروں سے اِدھر ظلم کا بن گونج رہا تھا

غل تھا کہ لہو خوف سے گھٹ جانے کا دن ہے
بھاگو یہی گیتی کے اُلٹ جانے کا دن ہے

کیا تیغ کی تعریف کرے کوئی زباں سے
جن مانگیں اماں جان کی جس آفتِ جاں سے

واں قطع سخن خوب جو باہر ہو بیاں سے
دھوئے ہوئے گوہر ہیں زباں لائے کہاں سے

یوں تیغ کبھی عرش سے اُتری ہے کسی کو
ہادیہ وہ خدا نے جسے بھیجا تھا علی کو

سر کاٹ کیا فرق پہ جس حال میں پہونچی
چہرے پہ جو گھوڑے کے پڑی ہال میں پہونچی

مچھلی تھی کہ جوشن کے کبھی جال میں پہونچی
پنجے کے اُڑانے کے لیے ڈھال میں پہونچی

سمجھا یہ ہر اک برق گری دشمن دیں پر
پنجہ تو سپر میں تھا کلائی تھی زمیں پر

اعضائے سواران تن و مند جدا تھے
نیزے تھے تو کیا جسم کے سب بند جدا تھے

بیٹوں سے جدا باپ سے فرزند جدا تھے
کیا وصل ہے پیوند سے پیوند جدا تھے

تنہا نہ سر اہل ستم کاٹ دیئے تھے
تلوار نے رشتے بھی بہم کاٹ دیے تھے

ہاتھ اٹھتا تھا جب تا بہ فلک جاتی تھی بجلی
گرتی تھی سروں پر تو کڑک جاتی تھی بجلی

جب بڑھتی تھی تلوار سرک جاتی تھی بجلی
اس پار سے اُس پار چمک جاتی تھی بجلی

گرجے ہیں پہ اس طرح مسلسل نہیں گرجے
نعرے ہیں کہ ایسے کبھی بادل نہیں گرجے

شمشیر عدو کش کی ہوا کے وہ تھپیڑے
ڈوبے ہوئے تھے خون میں اس فوج کے بیڑے

گھوڑے کو بڑھانے کے لیے کیا کوئی چھیڑے
بوچھار سروں کی وہ لہو کے وہ ڈریڑے

ساون نہیں برسا ہے کہ بھادوں نہیں برسا
مینہ برسا ہی ہر سال مگر یوں نہیں برسا

ڈھالوں کی گھٹا کا وہ اُدھر جھوم کے آنا
تلوار کی بجلی کا چمکتے ہوئے جانا

جنگل کی سیاہی تھی کہ تیرہ تھا زمانا
دریا کا کنارا تھا کہ جیحوں کا مہانا

یوں سیل کبھی جانب صحرا نہیں آتی
ایسی کبھی برسات میں بھیا نہیں آتی

سب تھے سپر انداختہ تلوار کے آگے
دو چار کے پیچھے تھے تو دو چار کے آگے

یوں موت تھی اُس صاعقہ کردار کے آگے
جس طرح پیادہ چلے اسوار کے آگے

غل تھا وہ ہٹیں کھیت سے جو آگے بڑھے ہیں
سرنڈر کرو آپ لڑائی پہ چڑھے ہیں

تلواریں ہزاروں ہیں پہ نایاب یہی ہے
بجلی جسے کہتے ہیں وہ بیتاب یہی ہے
اس تال کو اس میل کو اس ساتھ کو دیکھو
ایسا ہے لڑائی کا چلن ہاتھ میں کس کے
دیکھا ہے بنے ساختہ بن ہاتھ میں کس کے
تلوار تو کیا انگلیاں دو تیغ دوسر ہیں
بجھ بجھ گئے بجلی سی چمک کر جدھر آئی
کٹ کٹ گئے سینے سے سرک کر جدھر آئی
آفت تھی قیامت تھی بھلا وہ تھی پری تھی
سہمے ہوئے تھے مارسیہ کڈلیاں مارے
غل تھا کہ جلا دینگے جہاں کو یہ شرارے
تلوار کے پانی سے یہ آتش زدگی ہے
ڈوبا تھا کوئی اور کوئی خون میں تر تھا
ڈھالیں تھیں نہ ساعد تھے نہ بازو تھے نہ تھا
یوں باغ کی رونق کبھی جاتے نہیں دیکھی
جو برچھیاں بے پھل تھیں خجالت سے گڑی تھیں
تھیں کند سنانیں بھی جو بیزے میں گڑی تھیں
ریتی پہ کٹی ڈھالوں کا پشتارہ ہوا تھا
ٹکڑے ہیں کمانیں قدر انداز کریں کیا
نے تیر ہیں ترکش کا دہن باز کریں کیا
چلّے بھی تو گوشوں کی طرح ساتھ نہیں ہیں

بازو در نصرت کا یہی باب یہی ہے
ہے باڑھ پہ دریا ہمہ تن آب یہی ہے
تلوار کو کیا دیکھتے ہو ہاتھ کو دیکھو
ہے زور شہ قلعہ شکن ہاتھ میں کس کے
یہ کاٹ یہ گردش ہے یہ کن ہاتھ میں کس کے
ہاتھوں کی لکیریں نہیں تعویذ ظفر ہیں
جل جل گئے شعلہ سی لپک کر جدھر آئی
مر مر گئے مقتل میں لچک کر جدھر آئی
جوہر نہ کہو موتیوں سے مانگ بھری تھی
ہرنوں میں تھے جو شیر تو چیتوں میں چکارے
دنیا کی تباہی کے یہ انداز ہیں سارے
مسکن سے چلو آگ بیاباں میں لگی ہے
ہر نخل قد اس معرکہ میں زیر و زبر تھا
پتی تھی نہ شاخیں نہ شجر تھا نہ ثمر تھا
ایسی بھی خزاں آج تک آتے نہیں دیکھی
عاری تھیں وہ تلواروں سے تیغیں جو لڑی تھیں
جوشن پہ بھی ایسی کبھی کڑیاں نہ پڑی تھیں
ہر پارۂ چار آئینہ صد پارہ ہوا تھا
آفت کا نشانہ ہیں فسوں ساز کریں کیا
اڑ جائیں پر تیر تو پرواز کریں کیا
جس پاس کماں رہ گئی ہے ہاتھ نہیں ہیں

رحم ایک جگہ ہی تو عتاب ایک جگہ ہی
اِک جا ہی ظفر فتح کا باب ایک جگہ ہی

برق ایک جگہ ہی تو سحاب ایک جگہ ہی
حیرت کی ہی جا آتش و آب ایک جگہ ہی

وہ نار جسے خون کی روانی نہ بجھائے
یہ آگ وہی ہی جسے پانی نہ بجھائے

جس فرق پہ یہ صاعقہ کردار گری ہی
سر تن سے گرا ہاتھ سے تلوار گری ہی

اک بار کہیں برقِ شرر بار گری ہی
سو بار یہ اُٹھی ہی تو سو بار گری ہی

ٹالے یہ بلا سر سے جو کوئی تو قدم لیں
اتنی بھی تو مہلت نہیں ملتی ہی کہ دم لیں

مولا سا کوئی سائف سیاف نہیں ہی
صف کونسی ایسی ہی کہ جو صاف نہیں ہی

دنیا میں عدالت نہیں انصاف نہیں ہی
ایسا تو کوئی قاف سے تا قاف نہیں ہی

دکھلا گئے جوہر تھے جو خالق کے ولی کے
نہ قبل لڑا یوں نہ کوئی بعد علی کے

اللہ ری لڑائی میں سبک تازیِ شبدیز
شہباز بھی ہی قائل جانبازیِ شبدیز

وہ سینہ وہ گردن وہ سرافرازیِ شبدیز
وہ آنکھ وہ چہرہ وہ خوش اندازیِ شبدیز

جس طرح فرو رہتی ہی مایوس کی گردن
گردن سے یوہیں جھکتی ہی طاؤس کی گردن

آہو جو کہوں اس کو تو آہو ہی چکارا
ساتھ اُس کے ہما کو نہیں پرواز کا یارا

وہ نعل وہ ہر کیل وہ سم معرکہ آرا
پتلی وہ پری سمجھے جسے آنکھ کا تارا

دیکھی ہی سموں میں کسی گھوڑے کے یہ خوبی
اک جا ہیں ستارے بھی قمر بھی مہِ نو بھی

اللہ ری جانداریِ شبدیز وغا میں
تلوار کے چلنے سے بھی تھا تیز وغا میں

دل کا تھا اشارا اُسے ہمہیز وغا میں
ہر نعل تھا شمشیرِ شرر ریز وغا میں

ہاتھ اُس کے جدھر آئے اجل پا گئی اُس کو
اک ٹاپ پڑی جس پہ زمیں کھا گئی اُس کو

تلوار کے مانند نہ بھرتا تھا دمِ اُس کا
گردن وہ مہِ نو سی وہ منکے کا خم اُس کا

دریا سے روانی میں فزوں تر قدمِ اُس کا
کس طرح لکھے وصف کمیتِ قلمِ اُس کا

دوڑاؤں کہاں تک فرسِ ہن سا کو
کہدو کسی شاعر نے جو باندھا ہو ہوا کو

غل تھا کہ چھلاوے میں یہ چھل بل نہیں دیکھی
پھرتی ہوئی یوں آج تلک کل نہیں دیکھی

باریک یہ جلد اور یہ ہیکل نہیں دیکھی
ایسی تو کبھی خواب میں مخمل نہیں دیکھی

نازک ہے کہ مہمیز کی طاقت نہیں رکھتا
ابریشمِ چینی یہ ملاحت نہیں رکھتا

جو رگ ہے عوض خوں کے دھنک سے بھری ہے
جلدی جو ہے سب جلد بھی جودت سے بھری ہے

شعلے کی طرح طبع شرارت سے بھری ہے
اُبلی ہوئی ہر آنکھ شجاعت سے بھری ہے

اُڑ جاتا تھا ہر چھوں میں محل جست کا پاکر
تلواروں کے پنجے سے نکل جاتا تھا اکثر

جس جا پہ پھرے برق کی واں جلوہ گری کیا
چلنے میں ہوا کیا ہے نسیم سحری کیا

یہاں اوجِ سعادت کا ہما کیا ہے پری کیا
طاؤس ہے کیا نسر ہے کیا کبکِ دری کیا

راکب جو ذرا چھیڑ دے اُس برق شیم کو
سائے کو نہ وہ پائے نہ یہ گرد قدم کو

اُس صف کو اُلٹ کر اِدھر آیا اُدھر آیا
فوجوں کو پلٹ کر اِدھر آیا اُدھر آیا

جوں شیر جھپٹ کر اِدھر آیا اُدھر آیا
بجلی سا سمٹ کر اِدھر آیا اُدھر آیا

تھمتا ہے چھلاوا بھی مگر یہ نہیں تھمتا
طایر بھی ٹھہر جاتا ہے پر یہ نہیں تھمتا

پامال نہ ہوں پھول جو گلزار پہ دوڑے
سم ترنہ ہوں گر قلزم خار پہ دوڑے

اِس طرح رگِ ابرِ گہربار پہ دوڑے
جس طرح کہ نغمہ کی صدا تار پہ دوڑے

اغراق ہے یہاں کچھ نہ تسلی شعرا کی
کافی ہے یہ تعریف کہ قدرت ہے خدا کی

اک ظالمِ شامی سپہ شوم سے نکلا
غدار بڑے ٹھاٹھ بڑی دھوم سے نکلا

لڑنے کے لیے خاصۂ قیوم سے نکلا
کشتوں کا عوض لینے کو معصوم سے نکلا

دو بھائی بھی اُس کے شہ والا سے لڑے تھے
سر اُن کے کہیں جسم کہیں رن میں پڑے تھے

غصے سے غضب بس کہ تھیں خونخوار کی آنکھیں
بجلی سے جھپکتی تھیں نہ غدار کی آنکھیں

دیکھی جو نہ تھیں حیدرِ کرار کی آنکھیں
مستِ مئے نخوت تھیں جفاکار کی آنکھیں

سر کاٹے سر دار کا سودا تھا پہ سر میں
غرہ کہ تہمتن نہ سماتا تھا نظر میں

سر طبلکِ معکوس جبیں حد سے فزوں تنگ
غدّار و سلحشور و جفا پیشہ و سر ہنگ

کہنے کو بشر پر قد و قامت کا نیا ڈھنگ
حیراں شبِ ظلمات ہو یہ تیرگیِ رنگ

پہلے سے یہ کالا تھا منہ اُس دشمنِ رب کا
بن جائے تو اعکس سے آئینہ حلب کا

لال آنکھیں وہ ظالم کی وہ مُنہ قہر سے کالا
شب ایک طرف دن کو ڈرے دیکھنے والا

قد دیو کے قامت سے بلندی میں دوبالا
دانتوں کی کبودی دہنِ مار کا چھالا

شیر اُس کی صدا سُن کے لرز جاتے تھے بن میں
فاسد تھی ہوا رن کی یہ بدبو تھی بدن میں

وہ ڈھال کہ جو سینۂ رستم کو چھپا لے
تلوار کا مُنہ ایسا کہ فولاد کو کھا لے

نیزہ وہ کہ مرحب کو جو مرکب سے اُٹھا لے
گرز ایسا کہ عنتر جسے مشکل سے سنبھالے

کج طبع کا سر جائے پہ کینے کو نہ چھوڑے
خنجر وہ کہ سالم کبھی سینے کو نہ چھوڑے

مولا نے کہا اپنے ارادے کی خبر دے
آنکھوں سے اُٹھا نشۂ پندار کے پردے

بو جاتے ہیں اُس تخم کو دانا جو ثمر دے
غرّہ یہ ترا تجھکو کہیں پست نہ کر دے

دنیا میں نہیں کچھ عملِ نیک سے بہتر
پیدا کیا اللہ نے ایک ایک سے بہتر

لڑنا ہی تو بڑھ عصر کا ہنگام قریں ہی
اب سجدۂ معبود کی مشتاق جبیں ہی

لشکر ہی ترے ساتھ ادھر کوئی نہیں ہی
عباس سا غازی ہی نہ اکبر سا حسیں ہی

فاقہ ہی جدا پیاس جدا ضعف جدا ہی
اب میں ہوں یہ تلوار ہی اور سر پہ خدا ہی

یہ سنتے ہی سفاک نے بھالے کو سنبھالا
تلوار کو چمکا کے بڑھے سیّدِ والا

آپہونچا تھا سینے کے قریں ظلم کا بھالا
فرزندِ یداللہ نے عجب ہاتھ نکالا

کیا جانیے بجلی تھی کہ تیغِ دو زباں تھی
نہ ہاتھ میں بھالا تھا نہ بھالے میں سناں تھی

حضرت نے کہا حول سے دم اُس کا جو پھولا
کافی تھا ترے قتل کو اک تیغ کا ہولا

سنتے تھے کہ نیزے میں ہے بھالے کا بھی طولا
جو بند کہ تھے یاد اُنھیں خوف سے بھولا

نہ ہاتھ میں طاقت تھی نہ نیزے میں تکاں تھی
نیزہ تھا کہ تنکا تھا قلم تھا کہ سناں تھی

جھنجلا کے کہا اُس نے کہ یا شاہ سرافراز
سرہنگ نہ مجھسا ہی نہ سرکش نہ سرانداز

طاقت پہ مجھے فخر تھا نیزے پہ مجھے ناز
کیا جانیئے یہ سحر تھا یا آپ کا اعجاز

چمکی تھی کہاں تیغ کدھر چل کے پھری تھی
مجھ پر کبھی اس طرح کی بجلی نہ گری تھی

حضرت نے کہا سحر نہ جان اس کو ستمگر
اعجاز دکھائیں تو نہ ہو تو نہ یہ لشکر

ہیں سیف خدا کوئی ہما سا نہیں ہمسر
ان ہاتھوں میں شمشیر دو دستی کے ہیں جوہر

ہر وقت یہاں ورد زباں نادعلی ہی
بجلی نہیں یہ ضرب ہوا یجاد علی ہی

ظالم نے اُدھر گرز گراں سر کو اُٹھایا
ثابت یہ ہوا دیو نے لنگر کو اُٹھایا

نہ ہاتھ میں لی ڈھال نہ جوشن کو اُٹھایا
مولا نے فقط تیغ دو پیکر کو اُٹھایا

اُڑتے ہوئے دیکھا جو ہوا میں شہروں کو
سمٹا لیا تھرا کے فرشتوں نے پروں کو

شبدیز قریب آگئے گھوڑے کو ڈپٹ کے
شبدیز اُدھر سے اِدھر آتا تھا پلٹ کے

ہر چند بچاتا رہا ضربت کو وہ ہٹ کے
پر کالہ گرز اڑنے لگے تیغ سے کٹ کے

باقی تھا جو کچھ گرز وہ دو ہو گیا آخر
فتنہ جو اُٹھا تھا وہ فرو ہو گیا آخر

اے سیفِ یداللہ صفائی مجھے دکھلا
خیبر میں جو گزری وہ لڑائی مجھے دکھلا

دریائے شجاعت کی ترائی مجھے دکھلا
اے دستِ خدا عقدہ کشائی مجھے دکھلا

ہاں فتح کا اور تیرا سدا ساتھ رہا ہی
ہر جنگ میں میدان ترے ہاتھ رہا ہی

یا شیرِ خدا سیف دو دم دیجئے مجھکو
یا شاہِ نجف طبل و علم دیجئے مجھکو

سر بر نہ ہو لشکر وہ حشم دیجئے مجھکو
میداں جو نہ چھوڑے وہ قلم دیجئے مجھکو

نیزے سے سیہ شام کے ہٹتے نظر آئیں
سب فوج کے چہرے ابھی کٹتے نظر آئیں

کوثر کا بھرا جام پلا دیجئے مولا
بالائے ولا اور ولا دیجئے مولا

پھر غنچۂ خاطر کو کھلا دیجئے مولا
شمشیر فصاحت کو جلا دیجئے مولا

میں وہ نہیں یا خلق میں انصاف نہیں ہی
مدت سے جو چپ ہوں تو زباں صاف نہیں ہی

گو پیر ہوں پر زورِ جوانی ہے ابھی تک
سوکھے ہوئے دریا میں روانی ہے ابھی تک

دنداں نہیں پر تیز زبانی ہے ابھی تک
قبضے میں وہ تیغِ صفہانی ہے ابھی تک

جوہر ہیں وہی باڑھ وہی گھاٹ وہی ہے
کہنہ تو ہے شمشیر مگر کاٹ وہی ہے

اس گھر کے وغا کرنے کا سب ڈھنگ دکھا دے
جس طرح علی لڑتے تھے وہ جنگ دکھا دے

تلوار کی بجلی کو تہِ تنگ دکھا دے
راکب کو بھی مرکب کو بھی چو رنگ دکھا دے

ٹھہرے نہ کہیں زیں سے جو مرکب کے نکلے
دو تین دجب خاک میں پھل ڈوب کے نکلے

لو غور سے چلتی ہوئی صمصام کو دیکھو
نے رونقیِ ظالمِ ناکام کو دیکھو

تیغ و سپرِ شاہِ خوش انجام کو دیکھو
اعجاز ہے اک جا سحر و شام کو دیکھو

قرباں رُخِ تابانِ شہِ جن و بشر کے
خورشید میں بیچ میں ہے شام و سحر کے

منہ سُرخ ہے سب خاطرِ اقدس ہے جو برہم
رخساروں پہ بل کھا رہے ہیں گیسوئے پرخم

ابرو میں ہے چلتی ہوئی تلوار کا عالم
پتلی کا یہ ہے رعب کہ تھرّاتے ہیں ضیغم

لو دیکھ لو اس صاحبِ شمشیر کی آنکھیں
غصّے میں نہ دیکھی ہوں اگر شیر کی آنکھیں

دبتا ہے سرکتا ہے سمٹتا ہے وہ ظالم
گھوڑے کے قریب آکے پلٹتا ہے وہ ظالم

بڑھ آتے ہیں جب آپ تو ہٹتا ہے وہ ظالم
رد ہوتا ہے جب وار تو کٹتا ہے وہ ظالم

شمشیر کلیجے پہ چھری پھیرے ہوئے ہے
بھاگے تو کدھر جائے اجل گھیرے ہوئے ہے

غل تھا کبھی دیکھی نہیں رد و بدل ایسی
چلتی نہیں تلوار کبھی برمحل ایسی

اب ہوگی زمانے میں نہ جنگ و جدل ایسی
ہاتھ ایسا زبردست تو برقِ اجل ایسی

بل جسم میں کس ہاتھ میں تلوار میں جس ہے
سو سر کا جو دشمن ہو تو اک وار میں بس ہے

جب چلتی ہے سن سے شرارے نکلتے ہیں ہوا میں
ذرّے بھی ادھر سے اُدھر اڑتے ہیں ہوا میں

کاٹے ہوئے تیروں کے پر اڑتے ہیں ہوا میں
پرکالۂ قرصِ سپر اڑتے ہیں ہوا میں

کچھ شبہ و تشکیک غلط اس پہ نہیں ہے
اُس ڈھال کے سونکڑے میں خط اس پہ نہیں ہے

تلوار چمک کر ادھر آئی جو اُدھر سے
برسی تو زرہ گر گئی خود اُڑ گیا سر سے

چہرے سے جہلم کھل گئی زنجیر کمر سے
پہلو سے سپر میں تھی کلائی پہ سپر سے

دُنیا سے اسے رشتۂ تقدیر نے کھویا
دستانوں کو بھی ہاتھ سے نے پیر نے کھویا

مولا کی طبیعت جو ذرا جوش پر آئی
تلوار اجل بن کے زرہ پوش پر آئی

گر فرق پہ چمکی تو کبھی دوش پر آئی
آفت کمر و صدر و تن و توش پر آئی

جانے کی جہاں سے خبر آتی ہے کسی کو
گرتی ہوئی بجلی نظر آتی ہے کسی کو

سر پر جو پڑی تیغ جبیں سے اُتر آئی
کیا ذکر جبیں صدر لعیں سے اُتر آئی

بڑھ کر کمر دشمن دیں سے اُتر آئی
کیا بند کمر خانۂ زیں سے اُتر آئی

خوں بھی نہ تن توسن چالاک سے نکلا
بجلی سا چمکتا ہوا پھل خاک سے نکلا

تکبیر کا نعرہ جو کیا آپ نے تن کے
صاف آئی صدا بیچ سے یہ چرخ کہن کے

اے سخت جگر بادشہ قلعہ شکن کے
لڑتے ہیں یونہیں فوج سے جو شیر ہیں بن کے

تو صبر میں ایوب خوش انجام ہے شبیر
اب سجدے میں جھک عصر کا ہنگام ہے شبیر

سُن کر یہ صدا آپ نے تلوار کو روکا
تلوار کو کیا برق شرر بار کو روکا

نے چین تھا پر اسپ وفادار کو روکا
گردوں کی طرف دیکھ کے رہوار کو روکا

فرمایا کہ جینے سے دل اب تنگ ہے گھوڑے
تھم جا کہ بس اب خاتمۂ جنگ ہے گھوڑے

اب سینے کو وقف تبر و تیر کرینگے
اب طاعت معبود کی تدبیر کرینگے

اب عصر کی نیت میں نہ تاخیر کرینگے
اب سجدۂ باری تہ شمشیر کرینگے

ایذا ہو کہ دُکھ سہل ہے سب راہ خدا میں
سر دے کے بس اب جائینگے درگاہ خدا میں

عاشق کو نہیں دوری معشوق گوارا
سر جلد کٹاؤ یہ ہے خالق کا اشارا

مشتاق اجل ہے اسد اللہ کا پیارا
اب خنجر نے آب ہے اور حلق ہمارا

طالب ہوں رضامندی رب دوسرا کا
صد شکر کہ وقت آگیا وعدے کی وفا کا

یہ کہہ کے رکھی میان میں شبیر نے تلوار
حکم شہِ والا سے کھڑا ہو گیا رہوار

بجلی جو تھمی ہونے لگی تیروں کی بوچھار
دو لاکھ کے نرغے میں گھرے سیّدِ ابرار

مجروح ہوا صدر بھی زخمی ہوا سر بھی
چلنے لگیں تیغیں بھی سناں بھی تبر بھی

کیوں چرخ یہ حال اُس کا جو ہو خلق کا والی
اک چاند پہ اُمڈی یہ گھٹا ظلم کی کالی

وہ ناوکِ دل دوز وہ جسمِ شہِ عالی
حلقہ کوئی جوشن کا نہیں تیر سے خالی

طاری ہی غشی دل کو سنبھالا نہیں جاتا
اک تیر بھی سینے سے نکالا نہیں جاتا

مظلوم مسافر پہ یہ بیداد صد افسوس
اک جان ہزاروں ستم ایجاد صد افسوس

ٹوٹے ہوئے ہیں پیاسے پہ جلا د صد افسوس
شہ کی کوئی سُنتا نہیں فریاد صد افسوس

جز نیزہ و تیغ و تبر آتا نہیں کوئی
فرزند محمد کو بچاتا نہیں کوئی

بیجاں ہیں رہوار پہ آقائے خوش اوقات
بند آنکھیں ہیں خوں بہتا ہی کی جاتی نہیں بات

سر پیٹتے ہیں اہل حرم لٹتے ہیں سادات
حامی نہیں کوئی کوئی پرساں نہیں ہیہات

حال شہ آوارہ وطن دیکھ رہی تھی
تلواروں میں بھائی کو بہن دیکھ رہی تھی

لو خاک پہ گھوڑے سے گرے سبطِ پیمبر
تھرّائی زمیں ہلنے لگا عرش منوّر

سر پیٹتی مقتل کو چلی زینبِ مضطر
یاں شمر ستمگار بڑھا کھینچے خنجر

سر ننگے بنِ خط سے شہ مرداں نکل آئے
مرقد سے نبی چاک گریباں نکل آئے

چلائے ملائک کہ قیامت ہوئی برپا
گھبرا کے درختوں سے اُڑے طائر صحرا

آندھی ہوئی اک غرب کی جانب سے ہویدا
تھرّانے لگے کوہ اُبلنے لگے دریا

تیرہ ہو لون اُٹھنے لگی خاک جہاں میں
غل ہائے حسینا کا اُٹھا کون و مکاں میں

اُس حشر میں احمد کی نواسی کا یہ تھا حال
گرتی تھی کبھی اُٹھتی تھی گھبرائے ہوئے بال

چلاتی تھی سر پیٹ کے اے فاطمہ کے لال
ہے ہے تمہیں تلواروں میں گھیرے ہیں بدافعال

کیا کیا مجھے صدمے یہ جدائی نہیں دیتی
لاش آپ کی زینب کو دکھائی نہیں دیتی

بھیّا مجھے رستہ نہیں ملتا کدھر آؤں
کیونکر تمھیں جلادوں کے پنجے سے چھڑاؤں

بھیّا تمھیں اس بھیڑ میں کس طرح سے پاؤں
سب قتل ہوئے بہر مدد کس کو بلاؤں

کیا ہے کہ جو نانا کی سواری نہیں آئی
بھیّا مجھے آواز تمھاری نہیں آئی

میں کس کو پکاروں کہ ترس پیاسے پہ کھاؤ
لی جن سے زمیں مول انھیں لوگوں کو بلاؤ

اے اہلِ زراعت تمھیں امداد کو آؤ
لٹتی ہوئی کھیتی کو محمد کی بچاؤ

کام آؤ غریبوں کے تو احساں ہے تمھارا
یہ نئے وطن اس دشت میں مہماں ہے تمھارا

شہ نے جو سنی زاری زینب تہ خنجر
گھبرا کے صدا دی کہ ادھر آؤ نہ خواہر

کیا قہر ہے تم رن میں چلی آئیں کھلے سر
مشغول ہے امت کی دعا میں یہ برادر

مطلوب رضامندیِ معبود ہے زینب
تنہا نہیں اللہ تو موجود ہے زینب

کس طرح اٹھیں سینۂ زخمی پہ ہے جلاد
نانا مجھے گودی میں لیے کرتے ہیں فریاد

اماں مرے پہلو میں ہیں اے زینبِ ناشاد
روتے ہیں بڑے بھائی بھی یہ دیکھ کے بیداد

گریاں وحزیں خاصۂ قیوم کھڑے ہیں
بابا بھی سرہانے مرے مغموم کھڑے ہیں

یہ سنتے ہی دوڑی طرفِ لاش مضطر
چلائی کہ ہمشیر بھی آتی ہے برادر

لاشے پہ نہ پہونچی تھی کہ برپا ہوا محشر
دیکھا کہ لیے جاتا ہے قاتل سرِ سرور

سب تیر اسی طرح سے سینے میں گڑے ہیں
اور جلتی زمیں پر شہِ دلگیر پڑے ہیں

ہاں پیٹ کے سر روئیں وہ جو اہلِ عزا ہیں
یاں احمدِ مختار بھی سرگرمِ بکا ہیں

مقتل میں کھلے سر حرمِ شیرِ خدا ہیں
خاک اڑتی ہے جنباں طبقِ ارض و سما ہیں

سرکٹ چکا لختِ دلِ زہرا و علی کا
اب لٹتا ہے ملبوسِ کہن سبطِ نبی کا

عمامۂ حضرت لیے جاتا ہے کوئی آہ
بھاگا ہے کوئی لیکے عبائے شہِ ذی جاہ

ہاتھوں سے قبا کھینچ رہا ہے کوئی گمراہ
عریاں ہے زمیں پر تنِ فرزندِ یداللہ

اب لشکرِ کیں لاش کو پامال کرے گا
بعد اس کے ستم لاش پہ حمال کرے گا

خاموش انیس آگے نہیں طاقتِ تحریر
عالم جسے روتا ہو وہ مظلوم ہو شبیر

خالق سے دعا مانگ کہ اے مالکِ تقدیر
دکھلا نہ مجھے آنکھوں سے مزارِ شہِ دلگیر

محسوب ہوں زوارِ امامِ دوسرا میں
مر جاؤں تو مدفن ہو جوارِ شہدا میں

سلام

مرا رازِ دل آشکارا نہیں
وہ دریا ہوں جس کا کنارا نہیں

وہ گل ہوں جدا سب سے ہے جس کا رنگ
وہ بو ہوں کہ جو آشکارا نہیں

وہ پانی ہوں شیریں نہیں جس میں شور
وہ آتش ہوں جس میں شرارا نہیں

بہت زال دُنیا نے دیں بازیاں
میں وہ نوجواں ہوں کہ ہارا نہیں

فقیروں کی مجلس ہے سب سے جدا
امیروں کا یاں تک گزارا نہیں

سکندر کی خاطر بھی ہے سدِّ باب
جو دارا بھی ہو تو مدارا نہیں

گئے پہنے نعلین واں مصطفےٰ
فرشتے کا جس جا گذارا نہیں

جہنم سے ہم نے قراروں کو کیا
جو آتش پہ ٹھہرے وہ پارا نہیں

پھرے دوست جب ہو گئی قبر بند
کھلا اب کہ کوئی ہمارا نہیں

گرے ڈگمگا کر زمیں پر حسین
فرس سے کسی نے اُتارا نہیں

ترے صبر کے میں فدا یا حسین
چھری کے تلے دم بھی مارا نہیں

کسی نے تری طرح سے اے انیس
عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

مرثیہ ۱۹

میر صاحب کی اولاد میں منجھلے صاحبزادے میر عسکری اپنے خاندانی فن کی طرف متوجہ نہ تھے اور کئی پشت سے یہی ذریعہ معاش تھا میر صاحب نے یہ مرثیہ اُن کو کہہ دیا رئیس اُن کا تخلص رکھ کر مقطع میں بھی رئیس کا نام ڈال دیا مقصود یہ تھا کہ اس سے اُن کو بھی مرثیہ کہنے کا شوق پیدا ہوگا اور یہی ذریعہ معاش ہو جائیگا لیکن میر عسکری صاحب اس فن سے مناسبت نہ رکھتے تھے آخر کو یہ مرثیہ خود میر صاحب کے نام سے مجلسوں میں پڑھا جانے لگا اور حقیقت میں ایک لفظ بھی اس میں میر عسکری کا نہیں ہے۔

نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری
ناطقے بند ہیں سُن سُن کے بلاغت میری

رنگ اُڑتے ہیں وہ رنگیں ہے عبارت میری
شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

ایک قطرے کو جو دوں بسط تو قلزم کر دوں
بحرِ مواجِ فصاحت کا تلاطم کر دوں

ماہ کو مہر کروں ذرہ کو انجم کر دوں
گنگ کو ماہرِ اندازِ تکلم کر دوں

دردِ سر ہوتا ہے جب رنگ فریاد کریں
بلبلیں مجھ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

اس ثناخواں کے بزرگوں میں ہیں کیا کیا مداح
جدِ اعلیٰ سا نہ ہوگا کوئی اعلیٰ مداح

باپ مداح کا مداح ہے دادا مداح
عمِ ذیقدر ثناخوانوں میں یکتا مداح

جو عنایات الٰہی سے ہوا نیک ہوا
نام بڑھتا گیا جب ایک کے بعد ایک ہوا

طبع ہر ایک کی موزوں قدِ زیبا موزوں
صورتِ سرو ازل سے ہیں سراپا موزوں

نثر بے سجع نہیں نظمِ معلّیٰ موزوں
کہیں سکتا نہیں آسکتا کجا نا موزوں

تول لے عقل کے میزان میں جو فہمیدہ ہے
بات جو منہ سے نکلتی ہے وہ سنجیدہ ہے

خلق میں مثلِ خلیق اور تھا خوشگو کوئی کب
نام لے دھوئے زباں کوثر و تسنیم سے جب

بلبلِ گلشنِ زہراؑ و علی عاشقِ رب
متبعِ مرثیہ گوئی میں ہوئے جن کے سب

ہو۔ اگر ذہن میں جودت ہے کہ موزونی ہے
اس احاطہ سے جو باہر ہے وہ بیرونی ہے

بھائی خوش فکرت و خوش لہجہ و پاکیزہ خصال
جن کا سینہ گہرِ علم سے ہے مالا مال

یہ فصاحت یہ بلاغت یہ سلاست یہ کمال
معجزہ گر اسے کہیے نہ تو ہے سحر حلال

اپنے موقع پہ جسے دیکھیے لاثانی ہے
لطف حضرت کا یہ ہے رحمتِ یزدانی ہے

کیوں نہ ہو بندۂ مورونی مولا ہوں میں
قلزمِ رحمتِ معبود کا قطرہ ہوں میں

جس میں لاکھوں دُرِ و مرجاں ہیں وہ دریا ہوں میں
مدح خوان پسرِ حضرتِ زہرا ہوں میں

وصف جوہر کا کروں یا صفتِ ذات کروں
اپنے رتبہ پہ نہ کیوں آپ مباہات کروں

مبتدی ہوں مجھے توقیر عطا کر یارب
شوقِ مداحیِ شبیر عطا کر یارب

سلکِ گوہر ہو وہ تقریر عطا کر یارب
نظم میں رونے کی تاثیر عطا کر یارب

جدّ و آبا کے سوا اور کی تقلید نہ ہو
لفظ مغلق نہ ہو گنجلک نہ ہو تعقید نہ ہو

وہ مرقع ہو کہ دیکھیں اسے گر اہلِ شعور
ہر ورق میں کہیں سایہ نظر آئے کہیں نور

غل ہو یہ ہے کششِ موقلم طرۂ حور
ایک ایک حرف میں ہو صنعتِ صانع کا ظہور

کوئی ناظر جو یہ نایاب نظیریں سمجھے
نقشِ ارژنگ کو کاواکِ لکیریں سمجھے

قلزمِ فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ
شمع تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ

صاف حیرت زدہ مانی ہو تو بہزاد ہو دنگ
خوں برستا نظر آئے جو دکھا دوں صفِ جنگ

رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی
بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

روزمرہ شرفا کا ہو سلاست ہو وہی
سامعیں جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی
لفظ بھی چست ہو مضمون بھی عالی ہووے
ہے کمی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لیے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے
داند آنکس کہ فصاحت بہ کلامے دارد

بزم کا رنگ جدا رزم کا میداں ہے جدا
فہم کامل ہو تو ہر نامہ کا عنواں ہے جدا
دبدبہ بھی ہو مصائب بھی ہوں توصیف بھی ہو
مطلع
ماجرا صبح شہادت کا بیاں کرتا ہوں
تشنہ کاموں کی عبادت کا بیاں کرتا ہوں
جن کا ہمتا نہیں ایک ایک مصاحب ایسا
صبح صادق کا ہوا چرخ پہ جس وقت ظہور
مثل خورشید برآمد ہوئے خیمے سے حضور
شش جہت میں رخ مولا سے ظہور حق تھا

ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں وہ بیاباں کا سحر
اوس نے فرش زمرد پہ بچھائے تھے گہر
دشت سے جھوم کے جب باد صبا آتی تھی
بلبلوں کی وہ صدائیں وہ گلوں کی خوشبو
قمریاں کہتی تھیں شمشاد پہ یا ہو یا ہو
وقت تسبیح کا تھا عشق کا دم بھرتے تھے

لب و لہجہ وہی سارا ہو متانت ہو وہی
یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہی
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے
سرمہ زیبا ہے فقط نرگس جادو کے لیے
زیب ہے خال سیہ چہرۂ گلرو کے لیے
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

یہ چمن اور ہے زخموں کا گلستاں ہے جدا
مختصر پڑھ کے رلا دینے کا ساماں ہے جدا
دل بھی محظوظ ہوں وقت بھی ہو تعریف بھی ہو
رنج داندوہ مصیبت کا بیاں کرتا ہوں
جاں نثاروں کی اطاعت کا بیاں کرتا ہوں
ایسے بندے نہ کبھی ہونگے نہ صاحب ایسا

زمزمہ کرنے لگے یاد الٰہی میں طیور
یک بیک پھیل گیا چار طرف دشت میں نور
صبح کا ذکر ہے کیا چاند کا چہرہ فق تھا
دمبدم جھومتے تھے وجد کے عالم میں شجر
لوٹی جاتی تھی لہکتے ہوئے سبزے پہ نظر
صاف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آتی تھی
دل کو الجھاتے تھے سنبل کے وہ پرخم گیسو
فاختہ کی یہ صدا سرو پہ تھی کو کو کو
اپنے معبود کی سب حمد و ثنا کرتے تھے

آئے سجادۂ طاعت پہ امام دوجہاں
اُس طرف طبل بجے یہاں ہوئی لشکر میں اذاں

وہ مصلی کہ زباں جن کی حدیث و قرآں
وہ نمازی کہ جو ایماں کے تنِ پاک کی جاں

زاہد ایسے تھے کہ ممتاز تھے ابراروں میں
عابد ایسے تھے کہ سجدے کیے تلواروں میں

عرش اعظم کو ہلاتی تھیں دعائیں اُن کی
وجد کرتے تھے ملک سُن کے صدائیں اُن کی

وہ عمامے وہ قبائیں وہ عبائیں اُن کی
حوریں لیتی تھیں بصد شوق بلائیں اُن کی

ذکر خالق میں لب اُن کے جو ہلے جاتے تھے
غنچے فردوس کے شادی سے کھلے جاتے تھے

کیا جوانانِ خوش اطوار تھے سبحان اللہ
کیا رفیقان وفادار تھے سبحان اللہ

صفدر و غازی و جرّار تھے سبحان اللہ
زاہد و عابد و ابرار تھے سبحان اللہ

زن و فرزند سے فرقت ہوئی مسکن چھوڑا
مگر احمد کے نواسے کا نہ دامن چھوڑا

اللہ اللہ عجب فوج عجب غازی تھے
عجب اسپ ارتھے و مثل عجب تازی تھے

لایق رزم و سزاوارِ سرافروزی تھے
گو بہت کم تھے پہ آمادۂ جانبازی تھے

پیاس ایسی تھی کہ آگ جان ہونٹوں پر
صابر ایسے تھے کہ پھیری نہ زبان ہونٹوں پر

زہد میں حضرت سلماں کے برابر تھا کوئی
دولت فقر و قناعت میں ابا ذر تھا کوئی

صدق گفتار میں عمار کا ہمسر تھا کوئی
حمزۂ عصر کوئی مالک اشتر تھا کوئی

ہونگے ایسے ہی محمد کے جو شیدا ہونگے
پھر جہاد ایسا نہ ہوگا نہ وہ پیدا ہونگے

گو مصیبت میں تلاطم میں تباہی میں رہے
سر کٹے پاؤں مگر راہِ الٰہی میں رہے

یوں سرافراز وہ سب لشکر شاہی میں رہے
جس طرح تیغ دودم دست سپاہی میں رہے

اس مصیبت میں نہ پایا کبھی شاکی اُن کو
آبرو ساقیِ کوثر نے عطا کی اُن کو

وہ تخشع وہ تضرع وہ قیام اور وہ قعود
وہ تذلل وہ دعائیں وہ رکوع اور وہ سجود

یاد حق دل میں تو سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ درود
یہ دعا خالق اکبر سے کہ اے رب ودود

یوں لٹیں ہم کہ نہ آل اور نہ اولاد رہے
مگر احمد کے نواسے کا گھر آباد رہے

موم فولاد ہو آوازوں میں وہ سوز و گداز
اپنے معبود سے سجدوں میں عجب راز و نیاز

سر تو سجادوں پہ تھے عرش معلیٰ پہ نماز
شیر دل منتخبِ دہر و حمید و ممتاز

چاند شرمندہ ہو چہرے متجلی ایسے
نہ امام ایسا ہوا پھر نہ مصلی ایسے

جب فریضہ کو ادا کر چکے وہ خوش کردار
کس کے کمروں کو لگا شوق لگائے ہتھیار

جلوہ فرما ہوئے گھوڑے پہ شہِ عرش وقار
علم فوج کو عباس نے کھولا اکبار

دشت میں نکہت فردوس یہ آنے لگی
عرش تک اس کے پھریرے کی ہوا جانے لگی

لہرو وہ سبز پھریرے کی وہ پنجے کی چمک
شرم سے ابر میں چھپ جاتا ہے خورشیدِ فلک

کہتے تھے صل علیٰ عرش پہ اٹھ کے ملک
دنگ تھے سب سماں سے تھا سماں ہکا بکا

کہیے پستی اسے جو اوج ہمانے دیکھا
وہ سماں پھر نہ کبھی ارض و سما نے دیکھا

اس طرح جب علم دلبر زہرا جائے
کس سے پھر معرکۂ رزم میں ٹھہرا جائے

سانپ دشمن کی نہ کیوں چھاتی پہ لہرا جائے
لہر میں تابہ فلک جس کا پھریرا جائے

رفع شر کو علمِ خیر بشر آیا تھا
سورۂ نصر پئے فتح و ظفر آیا تھا

وہ علمدار کہ جو شیرِ الٰہی کا خلف
گوہرِ بحرِ وفا نیرِ دینِ نجف

فخرِ حمزہ سے نمودار تھا جعفر کا شرف
کس طرح چاند کہوں چاند میں ہے عیب کلف

کس نے پایا وہ جو تھا جاہ و حشم ان کے لیے
یہ علم کے لیے تھے اور علم ان کے لیے

سرو فرمائے قداس طرح کا قامت ایسی
اسد اللہ کی تصویر تھے صورت ایسی

شیر نعروں سے دہل جاتے تھے صولت ایسی
جا کے پانی نہ پیا نہر میں ہمت ایسی

جان جب تک تھی طاعت میں رہے بھائی کی
تھے علمدار مگر بچوں کی سقائی کی

وہ بہشتی نے کیا جس کو وفا کہتے ہیں
سب انھیں عاشقِ شاہِ شہدا کہتے ہیں

جو بہادر ہیں وہ شمشیرِ خدا کہتے ہیں
اُن کو قبلہ تو انھیں قبلہ نما کہتے ہیں

عشق سردار و علمدار کا افسانہ ہے
وہ چراغِ رہِ دیں ہے تو یہ پروانہ ہے

اک طرف اکبر مہ رو سا جوانِ نایاب
کچھ جو بچپن تھا تو کچھ آمد ہنگامِ شباب

روشنی چہرے پہ ایسی کہ خجل ہو مہتاب
آنکھیں ایسی کہ رہا نرگسِ شہلا کو حجاب

جس نے ان گیسوؤں میں رخ کی ضیا کو دیکھا
شبِ معراج میں محبوبِ خدا کو دیکھا

ای خوشا حسنِ رخِ یوسفِ کنعانِ حسن
راحتِ روحِ حسین ابنِ علی جانِ حسن

جسم میں زورِ علی طبع میں احسانِ حسن
ہمہ تن خلقِ حسن حسنِ حسن شانِ حسن

تن پہ کرتی تھی نزاکت سے گرانی پوشاک
کیا بھلی لگتی تھی بچپن میں شہانی پوشاک

اللہ اللہ اسد اللہ کے نواسوں کا جلال
چاند سے چہروں پہ بل کھائے ہوئے زلفوں کے جال

نیمچے کاندھوں پہ رکھے ہوئے مانندِ ہلال
گرچہ بچپن تھا پہ رستم کو سمجھتے تھے وہ زال

صف سے گھوڑوں کو بڑھا کر جو پلٹ جاتے تھے
مورچے لشکرِ کفار کے ہٹ جاتے تھے

آستینوں کو چڑھائے ہوئے آمادۂ جنگ
وہی سارا اسد اللہ کا نقشہ وہی ڈھنگ

سرخ چہرے تھے کہ شیروں کا یہی ہوتا ہے رنگ
ولولہ صف کے الٹنے کا لڑائی کی امنگ

جسم پر تیر چلیں نیزۂ خونخوار چلے
شوق اس کا تھا کہ جلدی کہیں تلوار چلے

یک بیک طبلِ بجا فوج کے گرجے بادل
کوہ تھرائے زمیں ہل گئی گونجا جنگل

پھول ڈھالوں کے چمکنے لگے تلواروں کے پھل
مرنے والوں کو نظر آنے لگی شکلِ اجل

واں کے جوش بڑھانے لگے دل لشکر کا
فوجِ اسلام میں نعرہ ہوا یا حیدر کا

شور میدانیوں میں تھا کہ دلیرو نکلو
نیزہ بازی کرو رہواروں کو پھیرو نکلو

نہر فالوج میں ہے اب پیاسوں کو گھیرو نکلو
غازیو صف سے بڑھو غول سے شیرو نکلو

رستمو داد دو غازو کہ یہ دن داد کا ہے
سامنا حیدرِ کرار کی اولاد کا ہے

شورِ سادات میں تھا یا شہِ مرداں مدد ے
کعبۂ دیں مدد ے قبلۂ ایماں مدد ے

قوتِ بازوئے پیمبرِ ذیشاں مدد ے
دمِ تائید ہے ای فخرِ سلیماں مدد ے

تیسرا فاقہ ہے طاقت میں کمی ہے مولا
طلب قوت ثابت قدمی ہے مولا

پیاس میں حرفِ شکوے کا زباں پر لائیں
دل نہ تڑپے جو دمِ نزع نہ پانی پائیں
لاشے مقتل میں ہوں لاشِ شہِ دیگیر کے پاس

سامنے بڑھکے یکایک صفِ کفار آئی
روز روشن کے چھپانے کو شبِ تار آئی
ہنس کے منھ بھائی کا شاہِ شہدا نے دیکھا

عرض عباس نے کی جوش ہے جراروں کو
میہمانوں کا نہیں پاس ستمگاروں کو
روسیاہوں کو ہٹا دیں کہ بڑھے آتے ہیں

شہ نے فرمایا مجھے خود ہے شہادت منظور
ان سے منظور نہ تھی جنگ پہ اب ہوں مجبور
ذبح کرنے کے لیے لشکرِ ناری آئے

حکم پایا تھا کہ شیروں نے اڑائے تازی
واہ رے حربِ خوشا ضربِ تنہ جاں بازی
تن و سر لوٹتے ریتی پہ نظر آتے تھے

جس پہ غصہ میں گئے صید پہ شہباز گرا
جب گرا خاک پہ گھوڑے سے تو ممتاز گرا
ہاتھ منھ کٹ گئے سر اڑ گئے جی چھوٹ گئے

بعد غیروں کے عزیزوں نے کیا عزمِ نبرد
ہوک اٹھی کبھی سینے میں تو دل میں کبھی درد
کوئی گڑ لو تو کوئی سروِ سہی بالا تھا

سینہ صاف پہ فاقوں میں سنا نیزے کھائیں
تیرے فرزند کی تائید کریں مرحائیں
سر ہو نیزے پہ پہ حضرتِ شبیر کے پاس

مطلع

جھوم کر تیرہ گھٹا تاروں پہ یکبار آئی
تشنہ کاموں کی طرف تیروں کی بوچھار آئی
اپنے آقا کو بحسرت رفقا نے دیکھا

تیر سب کھاتے ہیں تولے ہوئے تلواروں کو
مصلحت ہو تو رضا دیجیے غمخواروں کو
ہم جو خاموش ہیں وہ منھ پہ چڑھے آتے ہیں

نہ لڑائی کی ہوس ہے نہ شجاعت کا غرور
خیر لڑ لو کہ ستاتے ہیں یہ بے جرم و قصور
کہیں جلدی میرے سر دینے کی باری آئے

مثلِ شہباز گیا ایک کے بعد اک غازی
اڑ گیا ہاتھ بڑھا جو پئے دست اندازی
ایک حملے میں قدم فوج کے اٹھ جاتے تھے

یہ کماں کٹ کے گری وہ قدِ انداز گرا
نہ اٹھا پھر کبھی جو تفرقہ پرداز گرا
مورچے ہو گئے پامال پرے ٹوٹ گئے

مطلع

سر کو پہنچوڑ کے بھرا سبطِ نبی نے دمِ سرد
سرخ ہوتا تھا کبھی چاند سا چہرہ کبھی زرد
وہ بچھڑنے لگے گودی میں جنھیں پالا تھا

زلفوں والا تھا کوئی کوئی مرادوں والا
کوئی بھائی کا پسر کوئی بہن کا پالا

چاند سا منھ جو کسی کا تھا تو گیسو ہالا
کوئی قامت میں بہت کم کوئی قد میں بالا

نوجواں کونسا خوشرو و خوش انداز نہ تھا
کتنے ایسے تھے کہ سبزہ ابھی آغاز نہ تھا

ہاتھ وہ بچوں کے اور چھوٹی سی وہ تلواریں
موم کر دیتی تھیں فولاد کو جن کی دھاریں

آب ہو شیر کا زہرہ جسے وہ للکاریں
بجلیاں کوند رہی ہیں کسے نیزہ ماریں

کس بشاشت سے ہزاروں دلیر آتے ہیں
بچے آتے ہیں کہ بپھرے ہوئے شیر آتے ہیں

یہی ہنگامہ رہا صبح سے تا وقتِ زوال
لاش پر لاش گری بھر گیا میدانِ قتال

مورچے سب تہ و بالا تھے پرے سب پامال
سر خرو خلق سے اٹھے اسد اللہ کے لال

کھیت ایسے بھی کسی فوج میں کم پڑتے ہیں
جو لڑا سب یہی سمجھے کہ علی لڑتے ہیں

قاسم و اکبر و عباس کا اللہ رے جہاد
الاماں کا تھا کہیں شور کہیں تھی فریاد

غل ہر اک ضرب پہ تھا اب ہوئی دنیا برباد
دے گئے خلق میں مردانگی و حرب کی داد

گو وہ دنیا میں نہیں عرش مقام اُن کے ہیں
آج تک عالمِ ایجاد میں نام اُن کے ہیں

مطلع

دوپہر میں وہ چمن باد خزاں نے لوٹا
پتا پتا ہوا تاراج تو بوٹا بوٹا

باپ بیٹے سے چھٹا بھائی سے بھائی چھوٹا
ابن زہرا کی کمر جھک گئی بازو ٹوٹا

پھر نہ یاور نہ وہ جانباز نہ وہ شیدا تھے
ظہر کے وقت حسین ابن علی تنہا تھے

ساتھ جو جو کہ بہادر تھے وطن سے آئے
سامنے سوتے تھے ریتی پہ سنانیں کھائے

دھوپ میں پیاس سے مثلِ گلِ تر مرجھائے
مر گئے پر نہ غریبوں نے کفن تک پائے

دھوپ پڑتی تھی یہ دن چرخ نے دکھلایا تھا
نہ تو چادر تھی کسی لاش پہ نہ سایا تھا

صاحبِ فوج پہ طاری تھا عجب رنج و ملال
زرد تھا رنگ تو آنکھیں تھیں لہو رونے سے لال

کبھی بھائی کا الم تھا کبھی بیٹے کا خیال
کبھی ڈھر کا تھا کہ لاشیں نہ کہیں ہو پامال

کبھی بڑھتے تھے وغا کو کبھی رک جاتے تھے
کبھی سیدھے ہوتے تھے کبھی جھک جاتے تھے

بڑھکے چلاتے تھے بیدرد کہ اب آپ آئیں
جوہر تیغ شہنشاہ نجف دکھلائیں

مرنے والے نہیں جیتے جو سنانیں کھائیں
کاٹ لیں آپ کا سر تن سے تو رصت پائیں

پسر سعد سے وعدہ ہی صلہ لینے کا
حکم ہی خیمۂ اقدس کے جلا دینے کا

شہ نے فرمایا کہ سر کاٹ لو حاضر ہوں میں
نہ تو لڑنے میں نہ مرجانے میں قاصر ہوں میں

فوج بھی اب نہیں نے یاور و ناصر ہوں میں
شہر و صحرا بھی تمھارا ہی مسافر ہوں میں

لوٹ لو پھونک دو تاراج کرو بہتر ہی
کلمہ گو یو یہ تمھارے ہی نبی کا گھر ہی

کئی سیدانیاں خیمے میں ہیں دے والی
جن کا رتبہ ہی زمانہ میں ہر ایک پر عالی

اب نہ وارث ہی کوئی سر پہ نہ کوئی والی
ان کو دیکھو کوئی رہ جائے جو خیمہ خالی

یہ بنی زادیاں بے پردہ نہ ہوں جس میں
ایک گوشہ ہو کہ بیٹھ کے رہیں جس میں

سن کے ان باتوں کا اعدا نے دیا جو کہ جواب
گر لکھوں ان کو تو ہو جائے جگر سنگ کا آب

قلب تھرا گیا ہر گز نہ رہی ضبط کی تاب
دیکھ کر رہ گئے گردوں کو شہ عرش جناب

اشک خالی اُسے کرتے ہیں جو دل بھر آئے
آپ رونے کے لیے خیمے کے در پر آئے

تھم کے چلائے کہ اے زینب و ام کلثوم
تم سے رخصت کو پھر آیا ہی حسین مظلوم

اب میرے قتل کے در پے ہی یہ سب لشکر شوم
ہاں جگا دو اُسے غش ہو جو سکینہ معصوم

نہیں ملتا جو زمانہ سے گزر جاتا ہے
کہدو عابد سے کہ مرنے کو پدر جاتا ہی

یہ صدا سن کے حرم خیمے سے مضطر دوڑے
شہ کی آواز پہ سب بیکس و بے پر دوڑے

گر پڑیں سر سے ردائیں تو کھلے سر دوڑے
بچے روتے ہوئے ماؤں کے برابر دوڑے

روکے چلائی سکینہ شہ والا آؤ
میں تمھیں ڈھونڈھتی تھی ویرسے بابا آؤ

آؤ اچھے میرے بابا میں تمھارے واری
دیکھو تم بن ہیں گلے تک میرے آنسو جاری

آج یہ کیا ہی کہ بھولے مری خاطر داری
ہاتھ پھیلا کے کہو آ میری بیٹی پیاری

منھ چھپانے کی ہی کیا وجہ نہ شرماؤ تم
اب میں پانی بھی نہ مانگونگی چلے آؤ تم

دیکھ کر پردے سے کہنے لگی یہ زینبِ زار
ابنِ زہرا تری مظلومی و غربت کے نثار

آؤ چادر سے کروں پاک میں چہرے کا غبار
شہ نے فرمایا بہن مر گئے سب مونس و یار

تم نے پالا تھا جسے ہم اُسے روئے ہیں
علی اکبر سے جگر بند کو کھو آئے ہیں

مُنہ دکھائیں کسے سب سے ہے ماتم زینب
گھر میں آنے کی نہیں بھائی کو مہلت زینب

کھینچ لائی ہے سکینہ کی محبت زینب
بھائی جاتا ہے دکھا دو ہمیں صورت زینب

نہ تو سر کھولو نہ منہ پیٹو نہ فریاد کرو
بھول جاؤ ہمیں للہ کو اب یاد کرو

صبر سے خوش ہے خدا اے مری غمخوار بہن
سہل ہو جاتا ہے جو امر ہو دشوار بہن

اپنی ماں کا ہے طریقہ تمھیں درکار بہن
پھر میں کہتا ہوں سکینہ سے خبردار بہن

ناز پرور ہے مرے بعد الم اس پہ نہ ہو
بندے کانوں سے اُتارو کہ ستم اس پہ نہ ہو

کہیو عابد سے یہ پیغام میرا بعد سلام
غش تھے تم پھر گئے دروازے تلک آ کے امام

قید میں پھنس کے نہ گھبرائیو تم اے گلفام
کاٹیو صبر و رضا سے سفرِ کوفہ و شام

ناؤ منجدھار میں ہے شور تلاطم جانو
ناخدا جاتا ہے گھر جانے بس اب تم جانو

کہہ کے یہ باگ پھرائی طرفِ لشکرِ شام
پڑ گیا خیمۂ ناموسِ نبی میں کہرام

رن میں گھوڑے کو اڑاتے ہوئے آئے جو امام
رعب سے فوج کے دل ہل گئے کانپے اندام

سر جھکے اُن کے جو کامل تھے زبان دانی میں
اُڑ گئے ہوش فصیحوں کے رجز خوانی میں

تھا یہ نعرہ کہ محمد کا نواسا ہوں میں
مجھکو پہچانو کہ خالق کا شناسا ہوں میں

زخمی ہونے سے نہ مرنے سے ہراساں ہوں میں
تیسرا دن ہے یہ گرمی میں کہ پیاسا ہوں میں

چین کیا چیز ہے آرام کسے کہتے ہیں
اس پہ شکوہ نہیں کچھ صبر اسے کہتے ہیں

اُس کا پیارا ہوں جو ہے ساقیِ حوضِ کوثر
اُس کا بیٹا ہوں جو ہے فاتحِ بابِ خیبر

اُس کا فرزند ہوں کی جس نے ہم بدر کی سر
اُس کا دلبر ہوں میں وہی جس کو نبی نے دختر

صاحبِ تخت ہوئے تیغ ملی تاج ملا
دوشِ احمد پہ انھیں رتبۂ معراج ملا

وہ علی حق نے جسے عرش سے بھیجی شمشیر
وہ علی جو ہوا احمد کا وصی روزِ غدیر
وہ علی سب سے زیادہ ہے عبادت جس کی
بیوطن ہوں نہ مسافر کوستاؤ للہ
اب کوئی ساتھ نہ یاور ہے نہ لشکر شاہ
ہاتھ آئیگا نہ انعام نہ زر پاؤ گے
نہ ابھی ختم ہوئی تھی یہ مسلسل تقریر
جوم کر تیغ کے قبضہ کو پکارے شبیر
پسرِ فاتح صفین و حُنین آتا ہے
لو کھنچی تیغ دوسر فوج پہ آفت آئی
فتح تسلیم کو آداب کو نصرت آئی
چوم لوں پاؤں جلال اس کے دمیں آیا
آپ سے ہو گئے جو ہوئے رخش نے بدلے تیور
تھوتھنی مل گئی سینے سے کیا دم کو چور
دمبدم گرد نسیم سحری پھرتی تھی
ابر ڈھالوں کا اُٹھا تیغ دو پیکر چمکی
سوے پستی کبھی کوندی کبھی سر پر چمکی
جس طرف آئی وہ ناگن سے ڈستے دیکھا
دھار ایسی کہ رواں ہوتا ہے دھارا جیسے
چمک ایسی کہ حسینوں کا اشارا جیسے
کوندنا برق کا شمشیر کی ضو میں دیکھا

وہ علی جس کا دو عالم میں نہیں کوئی نظیر
وہ علی جس کی رسولوں سے سوا ہے توقیر
وہ علی گھر میں خدا کے ہے ولادت جس کی
قتل کیوں کرتے ہو تم کونسا ایسا گناہ
تم کو لازم ہے غریبوں پہ ترحم کی نگاہ
یا دکھو میرا سر کاٹ کے پچھتاؤ گے
حجت اللہ کے فرزند پہ چلنے لگے تیر
لو خبردار چمکتی ہے علی کی شمشیر
لو صفین باندھ کے رو کو تو حسین آتا ہے
لو ہلا قائمۂ عرش قیامت آئی
فخر سے غاشیہ برداری کو نکہت آئی
ہاتھ جوڑے ہوئے سامنے اقبال جلو میں آیا
دونوں آنکھیں ابل آئیں کڑے بانی شر
مثل طاؤس اڑا گاہ ادھر گاہ اُدھر
جھوم کر پھرتا تھا گویا کہ پری پھرتی تھی
برق چھپتی ہے یہ چمکی تو برابر چمکی
کبھی انبوہ کے اندر کبھی باہر چمکی
مینہ سروں کا صفِ دشمن میں برستے دیکھا
گھاٹ وہ گھاٹ کہ دریا کا کنارا جیسے
روشنی وہ کہ گرے ٹوٹ کے تارا جیسے
کبھی ایسا نہیں دم خم مہِ نو میں دیکھا

اک اشارے میں ادھر کوئی دھرا کوئی چار
نہ پیادہ کوئی بچتا تھا سلامت نہ سوار

برق گرتی تھی کہ چلتی تھی صفوں پہ تلوار
غضب اللہ علیہم کے عیاں تھے آثار

موت ہر غول کو برباد کیے جاتی تھی
آگ گھیرے ہوئے دوزخ میں لیے جاتی تھی

تیغیں عاری ہوئیں ڈھالوں کے اڑے پرکالے
بند سب بھول گئے خوف سے تیروں والے

جو بڑھے ہاتھ سر دست قلم کر ڈالے
تیغ کہتی تھی یہ سب ہیں میرے دیکھے بھالے

صف پہ صف باندھ کے تیروں کو عبث تولے ہیں
ایسے عقدے میرے ناخن نے بہت کھولے ہیں

جب کبھی جائزہ فوج ستم لیتی ہوں
موت سے رحم نہ کرنے کی قسم لیتی ہوں

دو زبانوں سے سدا کار قلم لیتی ہوں
چہرے کٹ جاتے ہیں لشکر کے تو دم لیتی ہوں

برطرف ہو کے عدم کے سفری ہوتے ہیں
طبلقیں کٹتی ہیں چہرے نظری ہوتے ہیں

وہ برش اور وہ چمک اور وہ صفائی اس کی
کسی تلوار نے تیزی نہیں پائی اس کی

اس کا بازو جو اڑایا تو کلائی اس کی
جس کی گردن سے وہ گزری اجل آئی اس کی

صورت مرگ کسی نے بھی نہ آتے دیکھا
سر پہ چمکی تو کمر سے اسے جاتے دیکھا

کبھی ڈھالوں پہ گری اور کبھی تلواروں پر
پیدلوں پر کبھی آئی کبھی سواروں پر

کبھی ترکش پہ رکھا منھ کبھی سوفاروں پر
کبھی سر کاٹ کے آ پہونچی کمانداروں پر

گر کے اس غول سے اٹھی تو اس انبوہ میں تھی
کبھی دریا میں کبھی بر میں کبھی کوہ میں تھی

کبھی چہرہ کبھی شانہ کبھی پیکر کاٹا
کبھی در آئی گلے میں تو کبھی سر کاٹا

کبھی مغفر کبھی جوشن کبھی بکتر کاٹا
طول میں راکب و مرکب کو برابر کاٹا

برش تیغ کا غل قاف سے تا قاف رہا
پی گئی خون ہزاروں کا پہ منھ صاف رہا

نہ رکی خود پہ وہ اور نہ سر پر ٹھہری
نہ کسی تیغ پہ دم بھر نہ سپر پر ٹھہری

نہ جبیں پر نہ گلے پر نہ جگر پر ٹھہری
کاٹ کر زیں کو نہ گھوڑے کی کمر پر ٹھہری

جان گھبرا کے تن دشمن دیں سے نکلی
ہاتھ بھر ڈوب کے تلوار زمیں سے نکلی

کٹ گئی تیغ تلے جب صفِ دشمن آئی
یک بیک فصلِ فراقِ سر و گردن آئی

بگڑی اس طرح لڑائی کہ نہ کچھ بن آئی
تیغ کیا آئی کہ اڑتی ہوئی ناگن آئی

غل تھا بھاگو کہ یہ ہنگام ٹھہرنے کا نہیں
زہر اس کا جو چڑھے گا تو اترنے کا نہیں

وہ چمک اس کی سروں کا وہ برسنا ہر سو
گھاٹ سے تیغ کے اک حشر بپا تھا لب جو

آب میں صورتِ آتش تھی جلا دینے کی خو
اور دم بڑھتا تھا پیتی تھی جو اعدا کا لہو

کبھی جوشن تو کبھی صدر کشادہ کاٹا
جب چلی ضربت سابق سے زیادہ کاٹا

تنِ تنہا شہِ دیں لاکھ سواروں سے لڑے
نے سپر برچھیوں والوں کی قطاروں سے لڑے

صورتِ شیرِ خدا ظلم شعاروں سے لڑے
دو سے اک لڑ نہیں سکتا یہ ہزاروں سے لڑے

گر ہو غالب تو ہزاروں پہ وہی غالب ہو
جو دل و جانِ علی ابنِ ابی طالب ہو

تیسرے فاقہ میں جنگ یہ حملے یہ جدال
پیاس وہ پیاس کہ سلسل تھے سرابِ لبِ لال

دھوپ وہ دھوپ کہ سوکھے ہوئے تھے تازہ نہال
لوں وہ لوں جس کی حرارت سے پگھلتے تھے جبال

سنگریزوں میں تپ و تاب ہوا کاروں کی
سر پہ یا دھوپ تھی یا چھاؤں تھی تلواروں کی

شیر سے تھے کبھی جنگل میں ترائی میں کبھی
ڈھال کو چہرے پہ روکا نہ لڑائی میں کبھی

تیغ حیدر نے کمی کی نہ صفائی میں کبھی
فرق آیا نہ سر و تن کی جدائی میں کبھی

کبھی ابرو کا بھی ایسا نہ اشارا دیکھا
جس پہ اک بار چلی اس کو دوبارا دیکھا

آنکھ وہ آنکھ کہ شیروں کی جلالت جس میں
رخش وہ رخش کہ سبزے کی سرعت جس میں

تیغ وہ تیغ عیاں موت کی صورت جس میں
ہاتھ وہ ہاتھ ید اللہ کی طاقت جس میں

روک لے وار جگر کیا کسی بے پیر کا ہے
زور وہ جس میں اثر فاطمہ کے شیر کا ہے

جنگ میں پیاس کا صدمہ تنہ دیں سے پوچھو
تن تنہا کی وفا لشکرِ کیں سے پوچھو

زلزلہ دشت پر آفت کا زمیں سے پوچھو
ضربِ شمشیر دو سر رمح امیں سے پوچھو

باپ اس فوج میں تنہا پسر اس لشکر میں
کربلا میں یہ تلاطم ہوا یا خیبر میں

اسد اللہ کے صدقے شہ والا کے نثار
وہی حملے تھے وہی زور وہی تھی تلوار

فتح حیدر نے کیا جنگ میں خیبر کا حصا
مورچے فوج کے حضرت نے بھی توڑے کئی بار

کیوں نہ ہوں احمد مرسل کے نواسے تھے حسین
فرق اتنا تھا کہ دو روز کے پیاسے تھے حسین

ہر طرف فوج میں غل تھا کہ دہائی مولا
ہم نے دیکھی تیرے ہاتھوں کی صفائی مولا

الاماں خوب سزا جنگ کی پائی مولا
آپ کرتے ہیں بروں سے بھی بھلائی مولا

ہاتھ ہم باندھتے ہیں پھینک دے شمشیروں کو
بخشیے امت نااہل کی تقصیروں کو

آئی ہاتف کی یہ آواز کہ اے عرش مقام
یہ وغا تیسرے فاقہ میں بشر کا نہیں کام

اے محمد کے جگر بند امام ابن امام
لوح محفوظ پہ مرقوم ہے صابر تیرا نام

اب نہیں حکم لعینوں سے وغا کرنے کا
ہاں یہی وقت ہے وعدے کے وفا کرنے کا

آج ہے آٹھ بہشتوں کی نئی تیاری
نخل سرسبز ہیں فردوس میں نہریں جاری

شب سے حوریں ہیں مکلل بجواہر ساری
خانۂ دوست میں ہے دوست کی مہمانداری

پیشوائی کو رسول الثقلین آتے ہیں
عرش تک شور یہی ہے کہ حسین آتے ہیں

تھم گئے سن کے یہ آواز شہ جن و بشر
روک کر تیغ کو فرمایا کہ حاضر ہے یہ سر

عید ہو جلد اگر ذبح کریں بانی شر
شمر اظلم ہے کدھر کھینچ کے آئے خنجر

ہے وہ عاشق جو فدا ہونے کو موجود رہے
بس مری فتح یہی ہے کہ وہ خوشنود رہے

کہہ کے یہ میان میں مولا نے رکھی تیغ دودم
ہاتھ اٹھا کر یہ اشارہ کیا گھوڑے سے کہ تھم

رہ گیا سر کو ہلا کر فرس تیز قدم
چار جانب سے مسافر پہ چلے تیر ستم

نیزے یوں گرد تھے جیسے گل تر خاروں میں
چھپ گئے سبط نبی ظلم کی تلواروں میں

پہلے تیروں سے کمانداروں نے چھاتی چھانی
نیزے پہلو پہ لگاتے تھے ستم کے بانی

سر پہ تلواریں چلیں زخمی ہوئی پیشانی
خوں سے تر ہو گیا حضرت کا رخ نورانی

جسم سب چور تھا پرزے تھے زرہ جامے کے
پیچ کٹ کٹ کے کھلے جاتے تھے عمامے کے

برچھیاں مارتے تھے گھاٹ پہ جو تھے پہرے
کس طرف جائے کہاں تیغوں میں بیکس ٹھہرے

ایک ہزار اور کئی سو زخم تھے تن پر گہرے
دیکھنے والوں کے ہو جاتے تھے پانی زہرے

خوں میں ڈوبا ہوا وہ مصحفِ رخ سارا تھا
جز و ہر اک تنِ شبیر کا سی پارا تھا

ہاتھ سے باگ جدا تھی تو رکابوں سے قدم
غش میں سیدھے کبھی ہوتے تھے فرس پر کبھی خم

بہتے تھے پہلوؤں سے خوں کے دریڑے پیہم
کوئی بیکس کا مددگار نہ تھا ہائے ستم

مارے تلواروں کے مہلت تھی نہ دم لینے کی
کوششیں ہوتی تھیں کعبہ کے گرا دینے کی

دست سے آتی تھی زہرا کی صدا ہائے حسین
میرے بیکس میرے بے بس میرے دکھ پائے حسین

در سے چلاتی تھی زینب مرے ماں جائے حسین
کون تیغوں سے بچا کر تجھے لے آئے حسین

فاطمہ رو رہی ہے ہاتھوں سے پہلو تھامے
حکم گر ہو تو بہن دوڑ کے بازو تھامے

ہائے سیّد تیرا تن اور ستم کے بھالے
کس کو چلاؤں کہ جیتے نہیں مرنے والے

اُس پہ یہ ظلم دکھوں سے جسے زہرا پالے
کون سر سے ترے تلواروں کی آفت ٹالے

کون فریاد سُنے بے سر و سامانوں کی
یاں تو بستی بھی نہیں کوئی مسلمانوں کی

نرہا جب کہ ٹھہرنے کا فرس پر یارا
گر پڑا خاک پہ وہ عرشِ خدا کا تارا

غش سے کچھ دیر میں چونکا جو علی کا پیارا
نیزہ سینے پہ سناں ابنِ انس نے مارا

واں تو نیزے کی انی پشت سے باہر نکلی
یاں بہن خیمہ کی ڈیوڑھی سے کھلے سر نکلی

کھینچکر سینے سے نیزہ جو بڑھا دشمن دیں
جھک کے حضرت نے رکھی خاک پہ سجدے میں جبیں

تیز کرتا ہوا خنجر کو بڑھا شمر لعیں
آسماں ہل گئے تھرا گئی مقتل کی زمیں

کیا کہوں تیغ کو کس طرح گلے پر رکھا
پاؤں قرآں پہ رکھا حلق پہ خنجر رکھا

ڈھانپ کر ہاتھوں سے مُنہ بنت علی چلائی
ذبح ہوتے ہو مرے سامنے ہے ہے بھائی

ضرب اول تھی کہ تکبیر کی آواز آئی
گر پڑی خاک پہ غش کھا کے علی کی جائی

اُٹھ کے دوڑی تھی کہ ہنگامۂ محشر دیکھا
منہ جو کھولا تو سرِ شہ کو سناں پر دیکھا

روکے چلائی کہ ہی ہی میرے مظلوم حسین
کچھ مجھے آنکھوں سے ہوتا نہیں معلوم حسین
مُڑ کے دیکھو کہ مصیبت میں پڑی ہوں بھائی
بس انیس آگے نہ لکھ زینب بیتاب کے بین
قبر میں بھی نہ ملا محمد مختار کو چین
کتنے گھر شاہ کے مرجانے سے برباد ہوئے

فوج اعدا میں ترے قتل کی ہے دھوم حسین
ہائے میں رہ گئی دیدار سے محروم حسین
ننگے سر بلوۂ اعدا میں کھڑی ہوں بھائی
قتل ہو جانے پہ بھی دھوپ میں تھی لاش حسین
گھر جلا قید ہوئی آل رسول الثقلین
لٹ گئے یوں کہ نہ سادات پھر آباد ہوئے

رباعی

ہر دم غم سبط شہ لولاک کیا
جب نام لیا چشم کو نمناک کیا
تر ہو گیا رومال تو پھاڑا دامن
پایا نہ گریباں تو جگر چاک کیا

مرثیہ ۲۰

نکلی جو رن میں تیغِ حسینی غلاف سے
اُٹھنے لگے شرر دمِ خارا شگاف سے

بجلی بڑھی چمک کے جو دشتِ مصاف سے
صاف آئی الاماں کی صدا کوہِ قاف سے

طبقے فلک کے صورتِ گہوارہ ہل گئے
دب کر پہاڑ خاک کے دامن سے مل گئے

لرزہ تھا تحت و فوق و جنوب و شمال میں
سکان غرب و شرق تھے بیم و زوال میں

مضطر تھے شش جہت کے مکیں ایک حال میں
غل تھا کہ گھر گئے غضبِ ذوالجلال میں

شہ کا غضب نمونۂ قہرِ الٰہ تھا
تلوار کیا علم تھی کہ عالم تباہ تھا

راحت میں جن و انس و ملک کے خلل پڑے
قلزم میں ڈر کے مردمِ آبی اُچھل پڑے

کھا کھا کے جوشِ خاک سے چشمے اُبل پڑے
بیدِ الم سے غول جنوں کے نکل پڑے

اُلٹی زمیں سبھوں کے دلوں پر بیٹھ گئی
پریوں کے ہوش اُڑ گئے جانوں پہ بن گئی

اُٹھا جو الحفیظ کا روحانیوں میں شور
مُردے دہل کے چونک پڑے سب میانِ گور

چلّائے گرگ شیر و غزالاں و مار و مور
ہی بازوئے حسین میں دستِ خدا کا زور

اُلٹے ہیں مثلِ شیرِ خدا آستین کو
اک کروگا رعشہ بچالے زمین کو

جنگل میں تھی علم جو وہ تیغِ شرر فشاں
تھرا کے آسمان میں چھپتا تھا آسماں

غار اژدروں سے چھٹ گئے شیروں سے نیستاں
برپا تھا بر و بحر میں اک شور الاماں

مانندِ موج مچھلیوں میں اضطراب تھا
زہرہ ہر ایک سنگ کا پانی میں آب تھا

تاریک تھا چکاروں کی آنکھوں میں سب جہان
مضطر تھے شیر و گرگ نکالے ہوئے زبان

بن سے سیاہ گوش بھی بھاگے دبا کے کان
غل تھا یہ دام و دد میں کہ کیونکر بچے گی جان

تیغِ علی علم تھی جو دشتِ قتال میں
چیتوں نے منہ چھپائے تھے گینڈوں کی کھال میں

گھڑیال نیر آب تھے مضطر ادھر اُدھر
جا گہ پناہ کی کہیں ملتی نہ تھی مگر

تھی مچھلیوں کے چہروں پہ گرداب کی سپر
بری میان بحر تھے بحری میان بر

گھر چھٹ گئے تھے جانوروں کے بہ رنگ تھے
خشکی میں تھے نہنگ تری میں پلنگ تھے

غل تھا کہ ضرب تیغ علی سے خدا بچائے
یہ برق دیکھیے کسے پھونکے کسے جلائے

قہر خدا سے بچ کے کوئی کٹ مرف کو جائے
بچ جائے آج وہ جو دوبارہ حیات پائے

فولاد ہو کہ سنگ یہ منہ موڑتی نہیں
نے دو کیے کسی کو کبھی چھوڑتی نہیں

اعدا پہ جبکہ تیغ شہ لافتا چلی
بجلی ہوئی برش سے جلو میں قضا چلی

غل پڑ گیا کہ صرصر قہر خدا چلی
اک دم میں سرتنوں سے اڑے یہ ہوا چلی

غل تھا غضب حسین کا قہر الٰہی ہے
باد فنا سے گلشن ہستی تباہ ہے

تھرا رہے تھے شیر زہے ہیبت حسین
گیتی کو زلزلہ تھا زہے شوکت حسین

فاقوں میں کم ہوئی تھی نہ کچھ طاقت حسین
اک قدرت خدا تھی خوشا قدرت حسین

سوکھی ہوئی زباں پہ کسی کا گلا نہ تھا
سولہ پہر ہوئے تھے کہ پانی ملا نہ تھا

فاقوں سے رنگ زرد تو لب پیاس سے کبود
چہرے سے تھا جلال جہاں آفریں نمود

کرتا تھا نور حق جو سوئے آسماں صعود
تسبیح پڑھ رہے تھے ملک اور بشر درود

تھم جاتے تھے حسین جو تلوار تول کر
حوریں بلائیں لیتی تھیں غرفوں کو کھول کر

وہ ماہ رخ پہ ہالۂ گیسوئے تابدار
خوشبو پہ جس کی عنبر سارا بھی تھا نثار

تھا فاطمہ کا رشتۂ جاں ان کا تار تار
قرباں ہر ایک تار پہ سو نافۂ تتار

گیسو نہ تھے رخ خلف بوتراب پر
تھی جدول سیہ ورق آفتاب پر

سر لوح مصحف رخ پرنور ہے جبیں
آئینہ کی طرح سے نہ جس میں شکن نہ چیں

مرآت نور حق کا قسم آسمان دیں
قطرے عرق کے رشک دہ گوہر ثمیں

چھڑکاؤ تھا گلاب کا اس سرزمین پر
گرتے تھے ٹوٹ ٹوٹ کے اختر زمین پر

وہ اوجِ ذوالفقار وہ چُبھتی بھوؤں کا بل
اک نخل قد دکھاتا تھا تیغوں کے تین پھل

ہلتے تھے غیظ سے جو وہ ابرو بے بدل
گویا پروں کو تولتا تھا طائرِ اجل

پلکوں کے تیر سب کے کلیجوں کے پار تھے
کھینچی تھی یاں کمان ادھر اعدا نگار تھے

آنکھیں وہ نرگسی کہ غزال آنکھ کو چرائے
ہنگام غیظ شیر یہ چتون کہاں سے لائے

پنجہ سے اس مژہ کے وغا میں خدا بچائے
زہرہ ہے آب آب جگر کیوں نہ تھرتھرائے

سمجھو نہ دور آنکھ ملانے کی دیر ہے
پتلی ہے چشم میں کہ ترائی میں شیر ہے

ابرو ہیں نونِ حسن تو چشمِ حسیں ہے صاد
محرابِ کعبہ وہ ہے تو یہ قبلۂ مراد

گو یہ جدا جدا ہیں پہ ہے عین اتحاد
دیکھے عدو جو کوزہ نہ چشمِ اعتقاد

لاریب نورِ چشمِ نبی و علی یہ ہے
نقش جلی ہوا کہ خدا کا ولی یہ ہے

رخسار ہیں وہ گل جنھیں خوفِ خزاں نہیں
ٹکڑے ہیں لعل کے لبِ شیریں بیاں نہیں

ہے ماہی محیطِ فصاحت زباں نہیں
یہ فرطِ نازکی ہے کہ گویا دہاں نہیں

باتوں میں بند ہیں فصحا کائنات کے
صدقے ہیں بات بات پہ کوندے نبات کے

سوکھے لبوں پہ لعلِ بدخشاں نثار ہیں
دانتوں کے نور پر دُرِ غلطاں نثار ہیں

تابندگی پہ اختر تاباں نثار ہیں
یہ آب ہے کہ قطرۂ نیساں نثار ہیں

ایسے گہر نہیں کہیں بحرِ عمیق میں
گویا چمک رہے ہیں ستارے عقیق میں

وہ لعلِ لب وہ روئے مطہر وہ ریشِ شاہ
ہیں ایک جا ہلالِ شبِ قدر و نورِ ماہ

کیا خوشنما ہے گردِ قمر ہالۂ سیاہ
ہے صبح و شام ایک جگہ کیجیے نگاہ

ہے رتبۂ رخِ شہِ ذیشاں کھُلا ہوا
دیکھو دھرا ہے رحل پہ قرآں کھُلا ہوا

مدحِ گلوئے پاک کوئی کیا کرے بھلا
محبوبِ کبریا نے سند جس پہ منھ ملا

حیرت ہے کیوں اُلٹ نہ گیا دشتِ کربلا
خنجر سے کٹ گئیں وہ رگیں اور وہ گلا

بختا فروغ جس نے یہ ایماں کے طور کو
سر کاٹ کر بجھا دیا اُس شمعِ نور کو

وہ دوشِ پاک بادشہِ آسماں وقار
ہے کُل کے عاصیوں کی شفاعت کا جس پہ بار

بازو وہ ہیں کہ بازوئے دیں جن سے استوار
ساعد سے زور دستِ یداللہ آشکار

سب پر کھلی ہے عقدہ کشائی حضور کی
روشن ہے انگلیوں سے کہ ہیں شمع نور کی

ہر دم اُٹھا کے ہاتھ یہ فرماتے ہیں سخن
عالم میں خمسۂ نجبا ہیں شہِ زمن

کیوں جانتے ہو کون ہیں دنیا میں پنجتن
ہیں اور نبی و فاطمہ و حیدر و حسن

وہ رکن جب سے اُٹھ گئے رنج و بلا میں ہوں
اب میں فقط مخمس آلِ عبا میں ہوں

اعضا میں کیوں نہ ہاتھ کا ہو مرتبہ بلند
دست کرم وہ ہے کہ خدا کو بھی ہے پسند

ہے پنجتن کی ذات سے سب خلق بہرہ مند
پانچ انگلیوں میں ہاتھ کے ہیں چار دہ جو بند

عقدے یہ اُن سے کہتے ہیں جو ذی شعور ہیں
چودہ بزرگ خلق میں خالق کے نور ہیں

ہے طور نورِ ذاتِ خدا سینۂ حسین
صاف آئنہ ہے اک دلِ بے کینۂ حسین

اسرارِ حق ہے گوہرِ گنجینۂ حسین
روح الامیں ہے خادمِ دیرینۂ حسین

سینہ نہیں سفینۂ طوفانِ نوح ہے
ایماں کی سجدہ گاہ ہے قرآں کی روح ہے

آئینۂ حلب سے فزوں تر صفا میں ہے
یہ ضو نہ بدر میں ہے نہ شمس الضحیٰ میں ہے

ہاں دل میں ہے وہ ضو جو کلامِ خدا میں ہے
قرآں غلاف میں ہے کہ سینہ قبا میں ہے

کیا قہر ہے کسی نے نہ پاسِ ادب کیا
زانو اُسی پہ شرم نے رکھا غضب کیا

سینے پہ وہ پسینے کے قطروں کی آب و تاب
غرقِ عرق تھا شرم کے مارے جہاں گلاب

ہے گو کہ تین روز سے فاقے سے وہ جناب
پر نور ہے شکم صفتِ قرصِ آفتاب

پھولوں کی بو سے خوش ہیں کپڑے بسے ہوئے
اُمت کی مغفرت پہ کمر ہیں کسے ہوئے

بازو ہے تیرِ ظلم سے زخمی کمر ہے خم
طاقت جواب دیتی ہے مولا کو دم بدم

پر واہ رے ثبات کہ اُٹھتے نہیں قدم
تیغِ شہِ نجف ہے اسی ہاتھ میں علم

آنکھیں ہیں سرخ بحرِ شجاعت ہے جوش پر
شملہ چھٹا ہوا ہے عمامے کا دوش پر

اللہ رے نبی کی عبا و قبا کا نور
پردے میں جس کے جلوہ نما ہے خدا کا نور

زہرا و حیدر و حسن و مجتبےٰ کا نور
ہے شش جہت میں خامس آلِ عبا کا نور

حیراں لباس نور پہ سب حلّہ پوش ہیں
ادریس میں حواس نہ موسیٰ میں ہوش ہیں

بالائے دوش حضرتِ حمزہ کی ہے وہ ڈھال
زیبا ہے کہئے گرخِ فتح و ظفر کا حال

پھول اس کے وہ گہ تیغ کا پھل جس سے پائمال
شب میں عیاں ہیں چار ستارے تو اک ہلال

اس کو عروج کیوں نہ ملے قتل گاہ میں
پشتِ پناہِ خلق ہے جس کی پناہ میں

وہ آہنی کلہ وہ زرہ جامۂ حضور
جس کی ہر اک کڑی سے نکلتا تھا چھپ کے نور

حلقے وہ جن کو دیکھ کے شرمائے چشمِ حور
قندیلِ آہنی میں فروزاں ہے شمع طور

جوشن نہ تھا تنِ شہِ گردوں وقار میں
تارے چمکتے تھے شبِ تاریک و تار میں

سنانے پہ کس شکوہ سے ہے حلقۂ کماں
ہے جس کے ڈر سے قوس قزح چرخ پر طپاں

پیغام موت کا ہے ہر اک تیرِ جاں ستاں
ہر دم صدا یہ ہے لبِ سوفار سے کہ ہاں

سرکش کہاں ہیں لشکرِ کج عقل و فہم کے
گوشوں میں چھپتے پھرتے ہیں کیوں سہم سہم کے

دستانہ ہے کہ قبضۂ سیفِ قضا ہے یہ
شمشیر ہے زبانِ دہن اژدہا ہے یہ

ہمدست آستینِ شہِ لافتا ہے یہ
ثابت ہوا کہ پنجۂ شیرِ خدا ہے یہ

دستِ خدا کے لال جری ہیں دلیر ہیں
اس ہاتھ سے جہاں کے زبردست زیر ہیں

نیزہ ہے رشک افعیِ گیسوئے دلستاں
سینے کو جس کے ڈر سے چراتا ہے آسماں

کالی وہ ڈانڈ اور وہ چمکتی ہوئی سناں
غل تھا کہ اژدہا ہے نکالے ہوئے زباں

لشکر جو دیو کا ہو تو دم میں ہلاک ہو
اس کی ہوا لگے تو بدن جل کے خاک ہو

اس شان سے ہیں رن میں اکیلے امامِ دیں
اور واں پرے جمائے ہیں میداں میں لاکھیں

خنجر کہیں ہیں تیر کہیں برچھیاں کہیں
اللہ ری کشمکش نظر آتی نہیں زمیں

لشکر بڑھے ہیں شاہ پہ یوں شام و روم کے
آتی ہے جس طرح سے گھٹا جھوم جھوم کے

تیغوں کی اس گھٹا میں چمکتی ہیں بجلیاں
باجوں کے زور شور میں ہے رعد کی فغاں

چھائے ہوئے ہیں شہ پہ زرہ پوش سب جواں
لوہے کی ہے زمیں تو ڈھالوں کا آسماں

چاروں طرف سے نرغۂ فوج کثیر ہے
ابر کرم پہ بارش باران تیر ہے

ٹھہری ہے صف جمائے ہوئے اس طرح سے فوج
طوفاں میں جوش کھا کے اُٹھے جس طرح سے موج

ہر مرد کی کمر میں ہیں تلواریں ذوالفقار
ڈھالوں کا دور دور ہے نیزوں کا اج اوج

آفت جناب فاطمہ کے گھر پہ آتی ہے
ٹاپوں سے مرکبوں کے زمیں تھرتھراتی ہے

ہر صف میں برچھیاں بھی ہزاروں لچکتی ہیں
نوکیں وہ تیز ہیں کہ دلوں میں کھٹکتی ہیں

نیزے تلے ہوئے ہیں سناں میں چمکتی ہیں
ترکش کھلے ہوئے ہیں کمانیں کڑکتی ہیں

سنگینوں نے ہاتھوں میں پتھر اُٹھائے ہیں
تیغوں کے ساتھ گرز گراں سر اُٹھائے ہیں

گھوڑوں سے گونجتا ہے وہ سب وادیِ نبرد
گردوں میں مثل شیشۂ ساعت بھری ہے گرد

ہے چرخ چار میں یہ رخ آفتاب زرد
ڈر ہے گرے زمیں پہ نہ مینائے لاجورد

گرمی ہجوم فوج سے دوچند ہو گئی
خاک اس قدر اڑی کہ ہوا بند ہو گئی

دستے وہ مصر و زنگ کے وہ فوج روم و شام
دن دوپہر وہ دشت کی گرمی وہ اژدہام

تیغیں برہنہ ہو گئیں تھیں چھوڑ کر نیام
مانند شمع جل رہی تھیں برچھیاں تمام

تلواریں منہ چھپائے تھیں سائے میں ڈھال کے
خنجر بھی رہ گئے تھے زبانیں نکال کے

لوں چل رہی تھی رن میں کہ اللہ کی پناہ
ڈھالوں کے رنگ ہو گئے تھے دھوپ میں سیاہ

برچھی کے پھل پہ ہوتا تھا شعلے کا اشتباہ
گلخن بنی ہوئی تھی ہر اک آہنی کلاہ

گویا کہ قوس میں تھا گزر آفتاب کا
عالم تھا ہر خدنگ پہ تیر شہاب کا

سر پر لگائے تھا پسر سعد چتر زر
تھے دو غلام مروہ جنبان ادھر اُدھر

تنہا تھا دھوپ میں اسد اللہ کا پسر
زیر سایۂ علم تھا نہ عباس نامور

لگتی تھی کچھ بدن کو ہوا آہ سرد سے
گیسو اڑے ہوئے تھے بیاباں کی گرد سے

جنگل سے آرہی تھی یہ آواز بار بار
کیا آج تجھ پہ بن گئی اے میرے گلعذار

تو دھوپ میں کھڑا ہے مرا دل ہے بے قرار
سایہ تو کرلے رخ پہ عبا کا یہ ماں نثار

عالم سیاہ ہے مری چشم پر آب میں
سونا لگا گیا ہے چاند مرا آفتاب میں

مادر سے رو کے کہتے ہیں سلطان کربلا
کافی ہے آج سر پہ مرے سایۂ خدا

منصف ہوں آپ فرق پہ سایہ کروں میں کیا
سوتے ہیں آفتاب میں سب میرے مرتضا

پڑتی ہے خاک اڑ کے تن پاش پاش پہ
اماں روا نہیں علی اکبر کی لاش پر

کرتے ہیں ماں کی روح سے حضرت تو یہ کلام
ہمت سے بڑھی چلی آتی ہے فوج شام

کہتے ہیں مسکرا کے امام فلک مقام
کس سے لڑینگے کیوں ہے یہ کوشش یہ اژدہام

فاقوں سے حال غیر ہے محتاج آب ہوں
میں آپ ہی مسافر بے یار و رکاب ہوں

اللہ کیا ہجوم ہے کیا شور گیر و دار
اک جسم زار اور یہ نیزے کئی ہزار

اک سینہ اور یہ ناوک بیداد بے شمار
میرے لیے تو پیاس ہے خود تیغ آبدار

ان برچھیوں سے کس کو زمیں پر گرائینگے
سو خنجر اک گلے پہ یہ کیونکر پھرائینگے

لشکر یہ ہے کہ قہر کا دریا ہے موج زن
میں اک ضعیف و تشنہ و مظلوم و بے وطن

اکبر نہیں جلو میں نہ لخت دل حسن
واحسرتا کہ مرگئے عباس صف شکن

دیکھیں پسر پہ غرۂ فوج کثیر کو
لاؤں کہاں سے آج جناب امیر کو

آئی قریب سے یہ صدا اے شہ نجف
تجھسا پسر دیا مجھے حق نے نہ ہے شرف

مصروف ہے ثنا میں تری قدسیوں کی صف
لاکھوں ہیں گو ادھر پہ خدا ہے تری طرف

دیں ہے بلند کفر کی بنیاد پست ہے
ہر طرح تیری فتح ہے ان کی شکست ہے

پیاسا جتین روز رہا تو کنار جو
دین نبی کی رہ گئی دنیا میں آبرو

مقبول کردگار ہے نور خدا ہے تو
ناجی ہیں تیرے دوست تو ناری ہے عدو

جائینگے یہ کہاں جو ہیں تجھ سے پھرے ہوئے
ہیں سب کے سب خدا کے غضب میں گھرے ہوئے

ایوب تیرے صبر کے ہیں آج مدح خواں
لب پر خلیل کے ہے ترے حلم کا بیاں

یعقوب و نوح و آدم و یحییٰ ہیں اک زباں
ہے کل کا فخر دلبر پیغمبر زماں

عیسےٰ پکارتے ہیں کہ حق کا ظہور ہے
موسیٰ کا ہے یہ قول کہ خالق کا نور ہے

عبّاس جب سے قتل ہوا ہے فرات پر
حاضر ہے کربلا میں اسی وقت سے پدر

نانا ہیں بے حواس حسن ہیں برہنہ سر
ماں نے قرار پھرتی ہے تھامے ہوئے جگر

تجھ پر نثار ہونے کی کس کو ہوس نہیں
تقدیر سے کسی کا مری جان بس نہیں

کی عرض شاہ دیں نے پدر سے بانکسار
مولا میں اس عنایت و اشفاق کے نثار

یہ پرورش یہ غور زہے عز و افتخار
کیا سرفراز ہو گیا اس دم یہ خاکسار

بیٹے پہ چاہئیں یوں ہی اشفاق باپ کے
جان آ گئی غلام میں آنے سے آپ کے

بندہ تو قابل اس کے نہیں یا شہ زماں
جو ہوں مقربانِ خدا میرے مدح خواں

کیا میر اصبر اور مری ہمّت کا کیا بیاں
اک بندۂ حقیر و گنہگار و ناتواں

لب پر جو وہ بزرگ مرا ذکر لائے ہیں
یہ سب شرف حضور کے صدقے میں پائے ہیں

اب کچھ نہیں ہراس اگر لاکھ ہوں ستم
ہاں ایک ہے تباہیِ زینب کا مجھ کو غم

جب ذبح ہو حسین تہِ خنجرِ دو دم
اس کی ردا بچائیگا کون اے شہِ اُمم

سب گھر لُٹے مگر وہ اسیرِ بلا نہ ہو
میں نے کفن رہوں یہ بہن بے ردا نہ ہو

فرما کے یہ فرس سے اشارہ کیا کہ ہاں
کوندا مثالِ برق کمیتِ سبک عناں

وہ غیظ وہ رجز وہ جلال و شکوہ و شان
تھی دم بدم وہ سیف زبانی کہ الاماں

دونوں زبانیں تیغ کی بھی شعلہ ریز تھیں
بیتیں رجز کی تیغ دو دم سے بھی تیز تھیں

نعرہ یہ تھا کہ دلبرِ مشکل کشا ہوں میں
جوہر کشائے تیغِ شہِ لافتا ہوں میں

شمس الضحیٰ علی ہیں تو بدر الدجیٰ ہوں میں
قرآں گواہ ہے کہ زبانِ خدا ہوں میں

کس آیۂ کریم میں ذکرِ علی نہیں
قرآں میں کیا خفی ہے کہ ہم پر جلی نہیں

ہم تو ہیں اُس کلام میں اور ہم میں وہ کلام
جس طرح لام میں ہے الف اور الف میں لام

لاریب فیہ گر ہے وہ ہادی تو ہم امام
اُمّت کو فرض عین ہے دونوں کا احترام

جو منحرف ہوا وہ مطیع خدا نہیں
قرآن و اہلبیت ازل سے جدا نہیں

کچھ یاد ہے وصیت محبوب ذوالجلال
فرما گئے تھے خلق سے کیا وقت انتقال

بھولے کلام حق کو بھی اے قوم بدخصال
ہم اہلبیت ہیں سو ہمارا کیا یہ حال

کیوں منھ پھیر لیا ہے حدیث و کتاب سے
محشر میں کیا کہو گے رسالت مآب سے

تم یہ نہ جانیو کہ مجھے کچھ ہے خوف جاں
لازم ہے یہ سخن کہ میں ہوں ہادی جہاں

قبضے میں ہے حسین کے تیغ شرر فشاں
دشمن کو جس کی ضرب سے ملتی نہیں اماں

لاکھوں سے منھ پھیرے نہ کبھی وہ دلیر ہوں
میں مثنیٰ شجاعت و ہمت کا شیر ہوں

بخشا ہے مجھکو حق نے شہ لافتا کا زور
اس دست مرتعش میں ہے دست خدا کا زور

ہے انگلیوں کے بند میں خیبر کشا کا زور
پانی ہے میرے زور کے آگے ہوا کا زور

اُلٹوں فلک کو یوں جو ہو قصد انقلاب کا
جس طرح ٹوٹ جاتا ہے ساغر حباب کا

آگے بڑھوں جو تیر کو چلّے میں جوڑ کے
بھاگیں خطا شعار کمانوں کو چھوڑ کے

بیکار کر دوں شیر کا پنجہ مروڑ کے
ٹپکوں زمین پر در خیبر کو توڑ کے

اُلٹوں طبق زمین کے یوں جھک کے زین سے
جس طرح جھاڑ دیتے ہیں گرد آستین سے

اعلیٰ ہے عرش سے بھی مری ہمّت بلند
بجلی ابھی گرے جو بڑھوں چھیڑ کر سمند

رستم ہے ذوالفقار کی دہشت سے دردمند
کھلتا نہیں ہے دیو سے نیزے کا میرے بند

یہ جس شقی کے سینے سے گذرا وہ فوت ہے
اس کی سنان تیز سر انگشت موت ہے

دنیا ہو اک طرف تو لڑائی کو سر کروں
آئے غضب خدا کا ادھر رخ جدھر کروں

نے جبرئیل کا رقضا و قدر کروں
انگلی کے اک اشارے میں شق القمر کروں

طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی
رکھدوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

یہ تیغ سر پہ گر کے ٹھہرتی ہے زین پر
جب ہاتھ اُٹھائے برق گری ہے زمین پر

خیبر میں کیا گزر گئی روح الامین پر
کاٹے ہیں کس کی تیغ دو پیکر نے تین پر

جس وقت ضرب شیرِ خدا یاد آتی ہے
ماہی سمیت گاؤ زمیں تھرتھراتی ہے

میں شیر ہوں چھ لاکھ اگر ہو تو کیا ہو تم
اُٹھا جو میرا ہاتھ تو دم میں فنا ہو تم

واللہ میرے سامنے بیدست و پا ہو تم
پر کیا کروں کہ اُمتِ خیر الورا ہو تم

لو واسطہ رسولِ خدا کا نباہ دو
اب بھی کسی طرح مجھے جانے کی راہ دو

یہ کہہ کے چپ ہوئے جو امامِ فلک سریر
اس فوجِ قاہرہ سے اُٹھا شور دار و گیر

کھولے ہوئے نشانوں کو آگے بڑھے شریر
فرزندِ فاطمہ پہ چلے دس ہزار تیر

دہشت سے عافیت نے مُنہ اپنا چھپا لیا
کالی گھٹا نے ڈھالوں کی جنگل کو چھا لیا

دہ شور کوس حرب کا وہ بوق کا غریو
شرمندہ برچھیوں کی چمک سے سنان گیو

تیر و سراز صورتِ خنجر زبان ریو
وہ صورتیں کہ دیکھ کے ڈر جائے جن دیو

سب فوج یوں بڑھی تھی وغا کو امام سے
آندھی سیاہ آتی ہے جس دھوم دھام سے

برسے اِدھر سے تیر تو کوندی اُدھر سے برق
وہ برق چھپتی پھرتی تھی خود جس کے ڈر سے برق

چمکی وہ یوں کہ گر گئی سب کی نظر سے برق
روکیں کسے رُکی ہے کسی کی سپر سے برق

جل تھل بھرے لہو کے نہ دیراک گھڑی لگی
کیا ابر تیغ تھا کہ سروں کی جھڑی لگی

معجز نما تھی شاہ کی شمشیرِ آبدار
دکھلائی ماہِ صیف[1] میں برسات کی بہار

یاں برق واں ہوا تو اِدھر ابر رود بار
بہتا کہیں لہو کی کہیں خوں کی آبشار

یوں سر برس گئے یہ روانی تھی باڑھ میں
پڑتا ہے دونگڑا کبھی جیسے اساڑھ میں

بہتے تھے خوں میں چار طرف سر کٹے ہوئے
بڑھتے تھے جو بہت وہ کھڑے تھے ہٹے ہوئے

جو گھاٹ پر تھے زور تھے ان کے گھٹے ہوئے
تھے جا بجا سے ڈھالوں کے بادل پھٹے ہوئے

لڑنے میں اوج تیغ کا وہ چند ہو گیا
نکلی کمان تیروں کا مینھ بند ہو گیا

[1] لفظ گرما

بازو ہر اک کمان کا کمزور ہو گیا
تیروں کے مینہ برسنے کا اک شور ہو گیا

ڈھالوں کا ابروؤں میں شرابور ہو گیا
جو تھا کنارِ نہر لبِ گور ہو گیا

مشقِ شناوری تھی قیامت بڑھی ہوئی
اتنی وہ تیغِ خون کی ندی چڑھی ہوئی

کیا کیا چمک دکھاتی تھی سر کاٹ کاٹ کے
تنتی تھی کیا تنوں سے زمیں پاٹ پاٹ کے

پانی وہ خود پیے ہوئے تھی گھاٹ گھاٹ کے
دم اور بڑھ گیا تھا لہو چاٹ چاٹ کے

کیا جانیے ملا تھا مزا کیا زبان کو
کھا جاتی تھی ہما کی طرح استخوان کو

ہر ہاتھ میں اڑا کے کلائی نکل گئی
کوندی گری زمین میں سمائی نکل گئی

کاٹی زرہ دکھا کے صفائی نکل گئی
مچھلی تھی اک کہ دام میں آئی نکل گئی

چار آئنے کے پار تھی اس آب و تاب سے
جس طرح برق گر کے نکل جائے آب سے

کٹ کٹ کے ذوالفقار سے گرتے تھے خاک پر
پہونچوں سے ہاتھ شانوں سے بازو تنوں سے سر

قبضے سے تیغ برسے زرہ ہاتھ سے سپر
برچھی سے پھل کمان سے بر زہ زیں سے تبر

ترکش کہیں پڑے تھے نشانِ زری کہیں
پیکاں کہیں تھے شست کہیں تھی سری کہیں

مقتل میں ہوش فوجِ عمر و کے اڑا دیئے
ٹکڑے ہر ایک کے تن و سر کے اڑا دیئے

پرزے ستمگروں کے جگر کے اڑا دیئے
پرکالے ایکدم میں سپر کے اڑا دیئے

جب ڈھال پر چمک کے در آتی تھی خود میں
سر کٹ کے آن پڑتا تھا سرکش کی گود میں

وقت و غا عصا تھی کبھی اژدہا کبھی
تلوار بن گئی وہ کبھی اور قضا کبھی

بجلی کبھی تھی ابر کبھی اور ہوا کبھی
بنتی تھی نعش کفر کے خاطر بلا کبھی

پھرتے تھے جب حسین پیادوں کو رول کر
کھا لیتی تھی سروں کو دہن کھول کھول کر

اللہ کے غضب کی نشانی دکھا گئی
دریائی قہر حق کی روانی دکھا گئی

جل جل گئے وہ شعلہ فشانی دکھا گئی
کٹ کٹ گئے وہ سیف زبانی دکھا گئی

لب صورتِ شگاف قلم بند کر دیئے
فقروں نے ذوالفقار کے دم بند کر دیئے

پہونچی سُم فرس پہ جو بالائے سر گری
چمکی ادھر زمیں سے نکلکر اُدھر گری

ناری جلے ادھر وہ جدھر کوند کر گری
جس صف سے گر چلی یہ وہ صف خاک گری

دکھلا کے اوج جاتی تھی یوں ہر سوار پر
جنگل میں باز گرتا ہی جیسے شکار پر

دم میں گئی فلک پہ اور آئی ہزار بار
معراج دست شاہ میں پائی ہزار بار

دکھلا گئی صفوں کو صفائی ہزار بار
گرمی یہ تھی کہ خوں میں نہائی ہزار بار

جب تک چلی وہ زرد سپاہِ عدو رہی
اُس دن کے معرکہ میں وہی سرخرو رہی

غل تھا خطِ سیاہ نہ سمجھو یہ ناگ ہی
جو دشمن علی ہیں اُسے ان سے لاگ ہی

جلتا ہی دشت چار طرف بھاگ بھاگ ہی
جانیں بچاؤ تیغ کے پانی میں آگ ہی

پھونکے نہ یہ دم اس سے ہمارے نکلتے ہیں
اژدر کی طرح مُنھ سے شرارے نکلتے ہیں

ہلچل وہ ان صفوں کی وہ گھوڑے کی جست خیز
تھا ترک تازیں کہیں صرصر سے تند و تیز

صدقے گندھی ایال پہ گیسوئے مشک بیز
گرداوری میں ابر تو بجلی دم ستیز

وزنے قدم کے فیض سے سارے چمک گئے
جب پتلیاں اٹھیں تو ستارے چمک گئے

جرات میں رشکِ شیر تو ہیکل میں بیل تن
بولی کے وقت کبک دہی جست میں ہرن

بجلی کسی جگہ تو کہیں ابر قطرہ زن
بن بن کے آنے جانے میں طاؤس کا چلن

سیماب تھا زمیں پہ فلک پر سحاب تھا
دریا پہ موج تھا تو ہوا پر عقاب تھا

آنکھیں وہ جن کو دیکھ کے حیران ہی غزال
گردن وہ جس کی شرم سے ہی سرنگوں ملال

آہو کی جست شیر کی چیتوں پری کی چال
دل اس کے دست و پائے حنائی سے پائمال

ہر نعل پا کا حسن یہ تھا اس جلوس میں
آئینہ جس طرح سے ہو دستِ عروس میں

کیوں اعتقاد میں حکما کے نہ آئے فرق
اشراقی اس سے بحرِ تفکر میں سب ہیں غرق

راکب گراس کو غرب سے دوڑائے سوئے شرق
اور آسماں سے ساتھ ہی چمکے نکل کے برق

بجلی کی واں چمک نہ فلک پر تمام ہو
یاں کب سے غرب میں فرس تیز گام ہو

دیکھی نہیں کسی نے یہ نرمی شتاب میں
ہی جس کے زین صاف سے مخمل بھی خواب میں

سرعت کا اس کی وصف لکھیں گر کتاب میں
سطریں ہیں یہ صورتِ موجِ اضطراب میں

اس کی ثنا اگر کوئی لائے زبان پر
ساکن جو حرف ہو وہ نہ آئے زبان پر

روئیں سوار ہاتھ سے تیجی اگر گرائے
اور یہ فرس جنوب سے سوئے شمال جائے

وہ تازیانہ یاں نہ زمیں تک پہنچنے پائے
اس حد سے ایکدم میں وہ صد دیکھ کر پھر آئے

تنگی سے آسمان کی خفا یہ سمند ہی
کیونکر اڑے پری ہی کہ شیشے میں بند ہی

کل کی طرح اشارے میں سو بار پھیر لو
بجلی ہی جس طرف دمِ پیکار پھیر لو

کاوے میں شکل گنبدِ دوار پھیر لو
نقطے کے گرد صورتِ پرکار پھیر لو

دوڑے بروئے آب تو پتلی بھی تر نہ ہو
آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو

طاؤس ساجدھر گیا دم کو چور کیے
دم میں پرے سپاہ کے زیر و زبر کیے

کچلے کبھی بدن کبھی پامال سر کیے
کشتوں کو روندے روند کے سم خوں میں تر کیے

میداں میں تھا کسی کو نہ یارا ستیز کا
عالم ہر ایک نعل میں تھا تیغ تیز کا

زیبا ہی گر کہیں شعرا بادپا اُسے
آہستہ گر چلے تو نہ پائے ہوا اُسے

طائر جہاں کے جانتے ہیں سب جُدا اُسے
مہمیز و تازیانہ کی حاجت ہی کیا اُسے

فتراک گر ہوا سے کبھی اک ذری اڑی
یوں اڑ گیا کہ سب نے یہ جانا پری اڑی

مصروفِ جنگ تیغ سے تھے سرورِ حجاز
چمکا کے اسپ واں سے بڑھا ایک نیزہ باز

نامرد نے کیا جو ہیں دستِ ستم دراز
نیزہ اُٹھا کے کہنے لگے شاہ سرفراز

ہاں ای اجل گرفتہ کمر استوار کر
نیزے کا ہی غرور تو آ کوئی وار کر

کس طنطنہ سے شاہ پہ آیا وہ خود پسند
کل کی طرح سے پھرنے لگا ہر طرف سمند

نیزے سے اس کے آپ کو پہنچی نہ کچھ گزند
مشکل کشا کے لال نے کھولے تمام بند

تھا گو کہ نیزہ بازی پہ ظالم تلا ہوا
یاں تھا سب اس کے عزم کا عقدہ کھلا ہوا

نیزے کی اس لعیں سے لڑائی جو آپڑی
دونوں طرف سے جنگ میں کوشش ہوئی بڑی

انیوں سے اڑ رہے تھے شرارے گھڑی گھڑی
تھی چوب سے تو چوب سناں سے سناں لڑی

اک معرکہ تھا بیچ میں دشتِ قتال کے
دو مار گتھ گئے تھے زبانیں نکال کے

پیہم ہوئیں تکاں پہ تکانیں جو یک دگر
ظالم کبھی ادھر تھا تو حضرت کبھی ادھر

کس نوک جھوک سے وہیں نیزے کو پھیر کر
فرزند شیرحق نے دکھایا عجب ہنر

ظالم پہ آسماں سے بلا ناگہاں گری
دو تین نیزے اڑ کے زمین پر سناں گری

تھرا گیا بدن نہ رہی طاقتِ قرار
گھوڑے کی باگ پھیر کے بھاگا وہ نابکار

بچکر نکل چلا تھا کہ چمکا کے راہوار
نیزے کا اک کمر پہ کیا شاہ دیں نے وار

موذی تھا وہ لعیں پہ انی فتنہ کوب تھی
سر میں سناں تھی نوک کے مہروں میں چوب تھی

قربان زور بازوئے سلطانِ ارجمند
زیں سے اٹھا کے اس کو سناں پر کیا بلند

پہونچا سقر میں دارِ جہاں سے وہ خود پسند
ٹپکا زمیں پہ جب تو ہوا چور بند بند

اپنے ہنر پہ ناز تھا اس نیزہ باز کو
دکھلا دیا جہاں کے نشیب و فراز کو

کام اس خطا شعار کا جب ہوگیا اخیر
نکلا پرے سے اک قدر انداز بے نظیر

بدکیش و کج نہاد و خطا پیشہ و شریر
بلّے سے توڑ جاتا تھا جوشن کو جس کا تیر

کیا کوئی اس کے آگے بھلا سر اٹھا سکے
رستم بھی جس کماں کی نہ سیدھی اٹھا سکے

قبضے میں تیغ لیکے پکارے شہِ زماں
ہاں ناوک افگنی مجھے دکھلا تو اے جواں

ہاں نکلی منہ سے یاں کہ کھنچی اس طرف کماں
کھنچنا کماں کا تھا کہ چلا تیر بے اماں

حلقا دھر کماں کا خم ہو کے رہ گیا
یاں تیغ شہ سے تیر قلم ہو کے رہ گیا

خالی اسی روش سے ہوا ترکش شریر
تو دے لگائے کاٹ کے حضرت نے سارے تیر

چاہا تھا کشمکش میں کہ ہو جائے گوشہ گیر
چلّائے شہ کہ بھاگ نہ او سرکشوں کے پیر

پیچھے ہٹے نہ پاؤں مرا ہی یہ جنگ کا
تو بھی تو توڑ دیکھ لے میرے خدنگ کا

یاں دوش سے کماں کو اُتارا جناب نے
قبضے میں ماہ نو کو کیا آفتاب نے

بیٹے کے ہاتھ چوم لیے بوتراب نے
تا کا خطا کو تیرِ نگہ سے صواب نے

ترکش بھی اژدہا سا دہن کھولنے لگا
نکلا عقابِ تیر تو پر تولنے لگا

چلّے میں رکھ کے تیر بڑھے قبلۂ اُمم
اک ہاتھ راست کر کے کیا دوسرے کو خم

کچھ کہہ کے گوشِ شہ میں چلا تیرِ تیز دم
آواز دی کماں نے زہے شاہِ با کرم

چلّہ تو شستِ شاہِ زمن سے نکل گیا
واں تیر دل کو توڑ کے سن سے نکل گیا

گرز و سنان و تیغ و تبر کانپنے لگے
نیزے مثالِ شاخِ شجر کانپنے لگے

ڈر سے کماں کشوں کے جگر کانپنے لگے
گو ترکشوں میں تیر تھے پر کانپنے لگے

پیچھے ہٹے کھڑے تھے جو ظالم بڑھے ہوئے
گوشوں سے خود اُتر گئے چلّے چڑھے ہوئے

اللہ ری زد کہ تا تھا ہنگامِ دار و گیر
سو دل سے مثلِ رشتۂ تسبیح ایک تیر

کرتے تھے واہ واہ صفوں میں جوان و پیر
بازو کو چومتے تھے رسولِ فلک سریر

روحِ علی یہ کہتی تھی پاس آن آن کے
صدقے ہر ایک تیر کے قرباں کمان کے

شہ کے غضب سے چاہتی تھی ہر کماں اماں
مضطر زمیں تھی مانگتا تھا آسماں اماں

دیتے نہ تھے کسی کو امامِ زماں اماں
ہر صف میں تھا یہ شور کہ مولا اماں اماں

جب شاہ حملہ کرتے تھے شیرِ خدا کی طرح
دانتوں میں خس پکڑتے تھے سب کہربا کی طرح

کہتا تھا ہاتھ جوڑ کے یوں کوئی پُر غرور
اس وقت رحم اپنے غلاموں پہ ہو ضرور

موقوف کر جلال کو اے کبریا کے نور
صدقہ علی کی روح کا اب بخشیے قصور

آنکھیں ہم اپنی دور سے قدموں پہ ملتے ہیں
تلوار روکیے کہ بس اب دم نکلتے ہیں

اے نورِ چشمِ احمدِ مختار رحم کر
اے یا دگارِ حیدرِ کرار رحم کر

اے امتِ نبی کے مددگار رحم کر
اے بحرِ غیظِ حضرتِ قہّار رحم کر

اے نوحِ عصر ہم سے نہ تو انتقام لے
امّت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو تھام لے

اے افتخارِ حضرتِ آدم پناہ دے
اے فخرِ نوح و عیسیٰ و مریم پناہ دے
مولا تجھے قسم ہے رسولِ کبیر کی
اس غیظ میں سُنا جو بزرگوں کا شہ نے نام
گردن پھرا کے یاس سے دیکھا سوئے خیام
آنکھوں کو بند کر کے فرس ہانپنے لگا
لڑنے میں تھا نہ آپ کو کچھ پیاس کا خیال
آئی صدا کہ حضرتِ محبوبِ ذوالجلال
سمجھا تھا میں کہ اب مری اُمت تمام ہے
صبر و رضا و حلم کا رتبہ دکھا دیا
نانا کا خلق زور پدر کا دکھا دیا
باطل شقاوت و حسد و کینہ ہو گیا
شبیر واہ کیوں نہ ہو کس کا پسر ہے تو
کھولا ہے جس کو حق نے وہ حجت کا در ہے تو
امت کے ظلم سہتے ہو نانا سے چھوٹ کر
کیسی ہوا جہان کی نے اعتدال ہے
سایے سے جس نہال کے طوبےٰ نہال ہے
میں جن کی فکر میں کبھی سویا نہ چین سے
فاقوں میں جن کے واسطے باندھا شکم پہ سنگ
کیونکر نہ ہو یہ غنچہ دہن زیست سے بہ تنگ
بچپن سے بیٹھا رہوں اس نورِ عین کے

اے زیبِ بخشِ عرشِ معظم پناہ دے
اے باعثِ پناہِ دو عالم پناہ دے
چمکا نہ ذوالفقار جنابِ امیر کی
صدمہ ہوا یہ دل کو کہ رونے لگے امام
تھاما جگر کو ہاتھوں سے اور چھوڑ دی لگام
روکی جو ذوالفقار بدن کانپنے لگا
رکھدی جو تیغ ہاتھ سے جی ہو گیا نڈھال
تو صابروں کا فخر ہے اے فاطمہ کے لال
یہ جبر اختیار پہ تیرا ہی کام ہے
دم میں ہزار طرح کا جلوہ دکھا دیا
خالق کے رحم و قہر کا نقشہ دکھا دیا
ایسی جلا ہوئی کہ حق آئینہ ہو گیا
حقا کہ آسمانِ شرف کا قمر ہے تو
میں اصل جس شجر کی ہوں اس کا ثمر ہے تو
کیا ان کو پھل ملے گا مرا باغ لوٹ کر
سرسبز سب ہیں باغ مرا پائمال ہے
مرجھا گیا ہے دھوپ سے اس کا یہ حال ہے
پانی انھیں عزیز ہے میرے حسین سے
ان دشمنوں نے لال کا میرے کیا ہے رنگ
اک فاقہ کش نحیف سے یہ صف کشی یہ جنگ
میرا گلا بھی ساتھ کٹے گا حسین کے

رو کر کہا حسین نے یا سیّدِ عرب
لڑنا کبھی نہ ان سے یہ مظلوم و تشنہ لب

فریاد ہے کہ مجھکو ستایا ہے نے سبب
للّٰلہ لیتے چلیے مجھے ساتھ اپنے اب

دشمن ہوا ہے سارا زمانا غلام کا
امّت میں اب نہیں ہے ٹھکانا غلام کا

جس دن سے آپ اُٹھ گئے یا یا نہ میں نے چین
سب گھر تباہ ہو گیا یا شاہِ مشرقین

پیری میں چھٹ گیا علی اکبر سا نورِ عین
کب تک جہاں میں ٹھوکریں کھایا کرے حسین

پھیلا کے پاؤں خاک پہ سونا نصیب ہو
راحت ملے جو قبر کا کونا نصیب ہو

یہ کہتے تھے کہ فوجِ ستمگر پھر آ گئی
خیر النسا کے چاند پہ بدلی سی چھا گئی

بھائی جو گھر گیا تو بہن بلبلا گئی
فریادِ فاطمہ کی فلک تک صدا گئی

یاں گھر بنی کی آل کا نورِ ہو گیا
زخموں سے واں تنِ شہِ دیں چور ہو گیا

یاں ایک تن ضعیف اُدھر لاکھ نابکار
تیروں کے زخم تیغوں کے چھل چھپوں کے وار

سینہ شکستہ پسلیاں مجروح سر فگار
کیا درد کا حساب جراحت کا کیا شمار

یوں تو دل و جگر کے بھی جانکاہ زخم تھے
تن پر ہزار و نہ صد و پنجاہ زخم تھے

حربے ہزار ہا کسے روکے کسے بچائے
بے یار و آشنا کسے ڈھونڈے کسے بلائے

دکھ میں سپر ہو کون حمایت کو کون آئے
کیا وقت ہے نبی کے نواسے پہ ہائے ہائے

جھکتے ہیں زیں پہ منہ سے لہو ڈال ڈال کے
گھوڑے سے غش میں کون اُتارے سنبھال کے

گھوڑے سے گاہ غش میں ادھر گہ اُدھر جھکے
تیغیں چلیں جدھر کو شہِ بحر و بر جھکے

سیدھے کبھی ہوئے کبھی پکڑے جگر جھکے
تھامی کبھی ایال کبھی زین پر جھکے

صدمہ جو تھا بہن کے نکلنے کا شاہ کو
گردن پھرا کے دیکھتے تھے خیمہ گاہ کو

ہنگامِ عصر تھا کہ شہِ نیکخو گرے
زخموں سے لڑکے قطرۂ خوں چار سو گرے

کیا سنبھلے جس کے زخموں سے سیروں لہو گرے
سجدے کا اشتیاق جو تھا قبلہ رو گرے

آنکھیں تھیں بند جلوۂ حق تھا نگاہ میں
گرتے ہی محو ہو گئے یادِ الٰہ میں

اعدا میں غل ہوا کہ ہماری ظفر ہوئی
گھوڑے سے حسین گرے جنگ سر ہوئی

زینب ردا کو پھینک کے عریاں سر ہوئی
چلائی یوں سکینہ کہ میں بے پدر ہوئی

ہی ہی کوئی نہیں شہ والا کی لاش پر
اماں بس اب چلو مرے بابا کی لاش پر

مسند پہ شہ کے لوٹتی تھی کوئی سوگوار
ہی ہی کا شور تھا کہ قیامت تھی آشکار

چلاتی تھی کوئی مرے سید ترے نثار
ڈیوڑھی پہ آکے گر پڑے سجاد دل فگار

غل تھا فلک نے دفتر دنیا الٹ دیا
فضہ نے خیمہ گاہ کا پردا الٹ دیا

دیکھا یہ ذوالجناح کا سید انیس نے حال
خالی ہی زین اور ہی ماتھا لہو سے لال

گردن پہ اس طرح سے ہی بکھری ہوئی ہی بال
جس طرح کھولتی ہی زن سوگوار بال

روتا ہی یوں وہ غم میں شہ نامدار کے
جیسے پسر کو روتی ہی ماں ڈاڑھیں مار کے

دنیا نظر میں بیبیوں کے ہو گئی سیاہ
سمجھے یہ سب کہ قتل ہوا فاطمہ کا ماہ

عابد پکارے ہائے غضب گھر ہوا تباہ
چلائی بنت فاطمہ اے ذوالجناح شاہ

ہی ہی مرے غریب برادر کو کیا کیا
ہی ہی مرے غریب برادر کو کیا کیا

زیں سے ترے رسول کا پیارا کہاں گرا
دو دن کی بھوک پیاس کا مارا کہاں گرا

وہ عرش کبریا کا ستارا کہاں گرا
آقا ترا امام ہمارا کہاں گرا

سایہ ہی کچھ کہ لاش ہی جلتی زمین پر
لختے یہ کس کے خون کے ہیں تیرے زین پر

سر خاک پر ٹپک کے پکارا وہ راہوار
سیدانیو بچھڑ گیا مجھ سے مرا سوار

جلدی اتار لو یہ تبرک یہ ذوالفقار
کٹتا ہی واں گلوئے شہنشاہ نامدار

زہرا قریب لاش پسر خاک اڑاتی ہی
خیمے میں جاؤ لوٹنے کو فوج آتی ہی

راوی رقم یہ کرتا ہی احوال زرنگار
دن ہو گا تین چار گھڑی وقت قتل گاہ

خنجر ادھر تو شمر نے رکھا گلے پہ آہ
آندھی اٹھی کہ سارا جہاں ہو گیا تباہ

زانو دھرا جو سینہ پہ ایذا سوا ہوئی
غل تھا کہ لو قیامت کبرا بپا ہوئی

تھا عشق میں قبلہ روہِ دو عالم کا مقتدا
سجدہ بھی اس ولی کو نہ کرنے دیا ذرا

گردن پہ تیغ اور لبوں پہ یہ تھی دعا
وا جعفراہ وا ابتا وا محمدا

صدمے ہوئے رگوں پہ جو خنجر کی دھار کے
چپ ہو گئے نبی و علی کو پکار کے

اس حشر میں خیام کی جانب جد کی نظر
دیکھا وہ سانحہ کہ نہ دیکھے کوئی بشر

نکلی حرم سے ایک ضعیف برہنہ سر
چہرہ تو آفتاب سا اور کان میں گہر

چادر نہ اضطراب میں تھی جسم پاک پر
تھا اک سر اتو دوش پہ اور ایک خاک پر

چلاتی تھی ارے کوئی رستہ مجھے بتائے
کچھ سوجھتا نہیں یہ ضعیفہ کدھر کو جائے

اکبر کہاں ہے ہاتھ مرا تھامنے کو آئے
بھائی سے چھوٹتی ہے بہن ہائے ہائے ہائے

مہماں کیا تھا بادشہِ مشرقین کو
اے کربلا تجھی سے ہیں لونگی حسین کو

اے نہر پیاس سے مرا بھائی ہوئے قرار
اے دشت گرد میں نہ بھرے شہ کا جسم زار

اے نینوا حسین کے لاشے سے ہوشیار
اے خاک پاک حرمتِ مہماں نگاہدار

اے طائرو نہ دھوپ ہو بھائی کی لاش پر
سایہ کرو پروں کا تن پاش پاش پر

ٹوکر چکی تھی نصف مسافت وہ سوگوار
آئی صدائے حضرتِ خاتونِ روزگار

بیٹی ملے گا اب نہ محمد کا یادگار
پھر جا خدا کے واسطے پھر جا تو اے نثار

تن سے جدا سر پسر فاطمہ ہوا
اب آکے کیا کرے گی یہاں خاتمہ ہوا

گھبرا کے اس نے جانبِ مقتل جو کی نظر
دیکھا اک آفتاب کو نیزے پہ جلوہ گر

لاکی جو ساتھ تھی وہ پکاری یہ پیٹ کر
میں لٹ گئی پھوپھی مرے بابا کا ہے یہ سر

زلفیں لہو بھری ہوئیں رخ پر لٹکتی ہیں
ہے ہے رگوں سے خون کی بوندیں ٹپکتی ہیں

خاموش اے انیس جگر ہو گیا دو نیم
کام آئے گی یہ مدح بروز امید و بیم

عسرت کا غم نہ کھا کہ ہے آقا ترا کریم
اب جلد یاں سے روضۂ سرور پہ ہو مقیم

حاصل حضوریِ شہِ گردوں اساس ہو
ہو وہ غلام خاص جو آقا کے پاس ہو

مرثیہ ۲۱

جب تیغِ یداللہ کھنچی دشتِ وغا میں
اک برقِ غضب کوند گئی ارض و سما میں

چمکے جو شرر چار طرف اڑکے ہوا میں
اعدا میں ہوا غل کہ گھرے قہرِ خدا میں

سایہ جو پڑا تیغِ دو پیکر کا زمیں پر
جبریلِ امیں کانپ گئے عرشِ بریں پر

خورشید کو رعشہ ہوا کانپا فلکِ پیر
رنگِ رخِ جلادِ فلک ہو گیا تغیر

آنکھوں کے تلے پھرنے لگی موت کی تصویر
تھرا کے عطارد نے صدا دی کہ چلا تیر

غل تھا کہ الٹتا ہے زمانہ کوئی دم میں
چھپتا تھا قلم لوح میں اور لوح قلم میں

جبریل کو چلانے لگے عرش کے حامل
کرسی کو سنبھالو کہ قیامت ہوئی نازل

کہتے تھے سرافیل کہ قابو میں نہیں دل
ہے قہرِ الٰہی غضبِ سرورِ عادل

کونین سے ضربِ شہِ عالم نہ رکے گی
یہ تیغ وہ بجلی ہے کہ اک دم نہ رکے گی

برہم ہے جو طبعِ پسرِ سیدِ لولاک
سیاروں پہ ثابت تھا کہ اب تے ہیں افلاک

گھبرا کے نظر کرتے تھے عیسیٰ طرفِ خاک
ڈر تھا سپہرِ مہر نہ ہو جائے کہیں چاک

سر حیز پہ آ پہنچا ہے شمشیرِ دو سر کا
شق ہوئے نہ سینہ کہیں پھر آج قمر کا

سکانِ سمٰوات میں برپا تھا ادھر غل
رو رو کے ادھر ہوتا تھا گیتی کو تزلزل

معشوق کو تھا صبر نہ عاشق کو تحمل
گلشن پہ اداسی تھی جدا تھے گل و بلبل

تاریک تھا دل تابِ کسی دل کو نہیں تھی
پروانہ کہیں جلتا تھا اور شمع کہیں تھی

تھا خوف کے عالم میں ہر اک بندہ آزاد
شمشاد کی قمری کو فراموش ہوئی یاد

غنچوں کے چٹکنے میں نکلتی تھی یہ فریاد
ہے ہے چمن کی فیکون ہوتا ہے برباد

ناحق گلِ زہرا پہ جفا ہوتی ہے کل سے
باغی نہیں برآنے کے اس تیغ کے پھل سے

اڑنے سے پرندوں کے جہاں ہوگیا اندھیر
تھا عالمِ وحشت یہ ہرن ہوگئے تھے شیر

چیتوں میں یہ غل تھا کہ قیامت میں نہیں دیر
بھاگو کہ چمکتی ہے ید اللہ کی شمشیر

پھر جان کہاں آگئی سایہ میں گراس کے
ہستی کو جلا دینگے دم میں شرر اس کے

لرزاں تھا ہر ایک خوفِ شہِ جن و بشر سے
فریاد کی آتی تھی صدا سنگ و شجر سے

ہیبت تھی کہ اژدر بھی نکل آئے تھے ڈر سے
جنات کی جانوں پہ بنی جان کے ڈر سے

شمشیرِ شرر بار سے منھ سب کے مڑے تھے
اڑ سکتی نہ تھیں ہوش یہ پر یوں کے اڑے تھے

ہر بحر میں طوفاں تھا تو ہر بر میں تلاطم
تھا شور جزیروں میں سمندر میں تلاطم

جنت میں تزلزل تھا تو کوثر میں تلاطم
برپا تھا بنی جان کے لشکر میں تلاطم

جو خاک نشیں تھا وہ ہراساں اٹھا تھا
آبِ دمِ شمشیر سے طوفاں اُٹھا تھا

سب ساکنِ افلاک و زمیں کانپ رہے تھے
لرزہ تھا مکانوں کو مکیں کانپ رہے تھے

ہلتا تھا نجف رُکنِ رکیں کانپ رہے تھے
تھے امن میں پر روحِ امیں کانپ رہے تھے

اللہ رے ڈر ضربتِ اولادِ علی کا
غل فرش سے تھا عرش تلک نادِ علی کا

کس شان سے تولے ہوئے شمشیرِ شرر بار
میدانِ شہادت میں کھڑے ہیں شہِ ابرار

ہے چہرہ نورانی مولا سے نمودار
اجلال محمد غضب حیدرِ کرار

عالم شبِ معراج کا دکھلاتی ہیں تلفیں
غیظ آتا ہے سرور کو تو بل کھاتی ہیں تلفیں

شمشیر کی تابیں ہیں کہ ماتھے پہ شکن ہے
ابرو جو کماں ہے تو مژہ تیر فگن ہے

وہ چشمِ سیہ آہوئے صحرائے ختن ہے
غصّے سے جو ہو سرخ تو پھر شیرِ ہرن ہے

گہ شامِ مصیبت ہے گہے صبحِ طرب ہے
رحمت ہے سپیدی میں سیاہی میں غضب ہے

کچھ دھوپ سے کچھ غیظ سے تھے سرخ جو رخسار
تھا صاف شفق سے گلِ خورشید نمودار

دیتے تھے جو دانتوں کے تلے لعلِ گہربار
تھے پرچۂ یاقوت میں گویا دُرِ شہوار

مختارِ دو عالم کے جہاں زیرِ نگیں تھا
یہ نقشِ سلیماں کی بھی خاتم پہ نہیں تھا

وہ ریش مطہر کی سپیدی وہ سیاہی
دیتی تھی زمانے کی دورنگی پہ گواہی

یہ آئینۂ جسم پہ تھی گرد تباہی
تھیں بازوؤں میں مچھلیاں یا ریگ میں ماہی

مانند ید اللہ لڑائی پہ تُلے تھے
سو عقدۂ مشکل انھیں ہاتھوں سے کھُلے تھے

لو قبضے پہ ہے دست زبردست شہنشاہ
جن کی رگ و پے میں ہے بھرا زور ید اللہ

غیر از ید قدرت کوئی اس سے نہیں آگاہ
گر کوہ گراں ہو تو اُکھاڑے میں صفت کاہ

بھاری ہو یہ گر سارا جہاں جنگ میں تُل جائے
زور اس کا ہو گر قلعۂ خیبر پہ تو کھل جائے

اعدا بھی ہیں چپ شمع رسالت بھی ہے خاموش
سینے میں تلاطم ہے شجاعت کا ہے پہ جوش

تیر نگہ شہ سے جوانوں میں نہیں ہوش
چھپ جاتے ہیں ڈھالوں کی سیاہی میں زرہ پوش

جوہر نظر آتے ہیں جو اس تیغ دو دم کے
پانی ہوئے جاتے ہیں جگر اہل ستم کے

تولے ہوئے شمشیر کو پڑھتے ہیں یہ اشعار
دنیا بھی ہے نے مہر زمانہ بھی ہے غدار

تُف تجھ پہ ہے اے دہر ستمگار و جفاکار
بیدل تری اس سفلہ پرستی سے ہیں بیزار

تجھ سے محمدؐ سے علی سے نہ وفا کی
شاکی رہے سب تو نے کسی سے نہ وفا کی

تو نے غم فرزند میں آدم کو رلایا
عیسیٰؑ نے جہاں میں کوئی دم چین نہ پایا

خنجر سے لہو حضرت یحییٰ کا بہایا
کس چاہ میں یعقوب سے یوسفؑ کو چھڑایا

وہ کون سے دکھ تھے جو دکھائے نہیں تو نے
کیا کیا کنوئیں پیری میں جھنکائے نہیں تو نے

توڑے دُر دندان نبی سنگ جفا سے
مسجد ہوئی تر خون سر شیر خدا سے

فرصت نہ ملی فاطمہ کو رنج و بلا سے
ٹکڑے ہوا شبیر کا جگر زہر دغا سے

باقی تھا فقط میں سو عزیزوں سے چھٹا ہوں
پانی کو ترستا ہوں غریبی میں لٹا ہوں

نرغے کے پہ اعدا کو پکارے شہ ذی جاہ
اب جنگ میں کیا دیر ہے اے فرقۂ گمراہ

شاید مری قوت سے ابھی تم نہیں آگاہ
رستم تو یہاں زال ہے اور شیر ہے روباہ

تلوار کا مالک ہوں ولی ابن ولی ہوں
جرأت مرا حصہ ہے کہ فرزند علی ہوں

عاقل ہو تو مکار کی باتوں پہ نجاؤ
صابر ہوں میں صابر کو نہ تم غیظ میں لاؤ

دم میں غضب آ جائیگا دیکھو نہ ستاؤ
جینا ہو تو ہٹ جاؤ جو مرنا ہو تو آؤ

خیر اپنے سروں کی جو ہو منظور تو سر کو
دیکھو ابھی روکے ہوئے ہوں تیغ دو کر کو

مجھسا کوئی گر اور ہو تم لوگوں کا رہبر
بتھرہی پھرا دو مرے اس حلق پہ خنجر

اُمت کے جو کام آئے تو حاضر ہی مرا سر
پر میرے سوا کوئی نہیں سبطِ پیمبر

کھو کر مجھے ڈھونڈو گے تو فریاد کرو گے
جب میں نہ ملونگا تو بہت یاد کرو گے

جو زندہ ہی قدر اُس کی کسی کو نہیں زنہار
زندوں سے کچھ ان مردہ پسندوں کو نہیں کار

عبرت کی ہی جا فاعتبروا یا اولی الابصار
سو جاتا ہی جبدہ تو یہ سب ہوتے ہیں بیدار

روئے تو اسے کیا جو تنا کی تو اُسے کیا
تعریف اگر بعد فنا کی تو اُسے کیا

گر زیست میں فاقہ ہو تو غم کوئی نہ کھائے
اور وقت مصیبت میں کوئی پاس نہ آئے

یوں پیاس میں لاکر کوئی پانی نہ پلائے
اور بعد فنا فاتحہ شربت پہ دلائے

پروا نہیں پیوند ہو گر رختِ بدن میں
مرتے ہیں بس اس پر کہ تکلف ہو کفن میں

یوں ہاتھ نہ تھامیں جو گرے بندۂ معبود
تابوت کو دینا ہو جو کاندھا تو ہیں موجود

یوں جانتے ہیں قرض حسن دینے کو بے سود
زر صرف ہو میت کے جو ماتم میں تو خوشنود

یوں بھول کے بھی ذکر نہیں کرتے ہیں اس کا
مرجاتا ہی جب کوئی تو دم بھرتے ہیں اس کا

ہشیار ہو اے قوم کہ دُنیا ہی گذرگاہ
رہتا ہی گدا اس میں ہمیشہ نہ شہنشاہ

کیا مرحلۂ صعب ہی العظمۃ للہ
تھرّاتے ہیں ہبر بھی وہ پر خوف ہی یہ راہ

نے خوف ہیں وہ جن کو تو لائے علی ہی
ہاں زادِ سفر دوستی آلِ نبی ہی

کچھ دن بشر اس خانۂ دنیا میں ہی مہماں
دست ملک الموت میں ہی سب کا گریباں

زندوں میں ہیں گر آج تو کل ہونگے بیجان
پہلے سے ہی لازم سفر مرگ کا ساماں

اعمال و عقائد میں نہ ہرگز خلل آئے
کیا جانیئے کس وقت پیام اجل آئے

کچھ وقت معین نہیں انساں کی اجل کا
آج اُٹھ گئے وہ کرتے تھے ساماں جو کل کا

بندہ وہ ہی پابند رہے نیک عمل کا
پلّہ وہی بھاری ہی جو ہو جرم سے ہلکا

کیا خاک کا بوجھ اس کے لیے قبر میں کم ہی
ہو اور گناہوں کی گرانی تو ستم ہی

لو پند بھی آخر ہی نصیحت بھی ہوئی ختم
حجت مجھے منظور تھی حجت بھی ہوئی ختم

الفت بھی مروّت بھی محبت بھی ہوئی ختم
لو باب ترحم کی عبارت بھی ہوئی ختم

دل رکھتے ہو فولاد پہ جوہر ہیں تمھارے
اب تیغ ید اللہ ہی اور سر ہیں تمھارے

بے قتل مجھے چین کب آتا ہی خبردار!
سب فوج پہ اِدبار اب آتا ہی خبردار!

فرزندِ امیرِ عرب آتا ہی خبردار!
لشکر پہ خدا کا غضب آتا ہی خبردار!

فوجوں کی صفیں دم میں اُلٹ دیتا ہوں آکے
دیکھوں تو کہاں جاتے ہو پنجے سے قضا کے

خالق نے مرے قوتِ حیدر مجھے دی ہی
فیاض نے توقیرِ پیمبر مجھے دی ہی

مختار نے مختار ی کوثر مجھے دی ہی
کرار نے شمشیرِ دوپیکر مجھے دی ہی

کھُلجائیگی دم میں برش اس تیغ دوسر کی
کنجی تو مرے ہاتھ میں ہی فتح وظفر کی

غصّے میں مرے طور ہیں سب قہرِ خدا کے
غارت ہو نظر جس پہ کروں غیظ میں آکے

بچتا نہیں تلوار ہماری کوئی کھا کے
ناخن میں ہمارے ہیں ہنر عقدہ کشا کے

کس معرکہ میں تیغ کو تولا نہیں ہم نے
تھا کونسا در بند جو کھولا نہیں ہم نے

تم نار ہو میں نورِ خدائے دوجہاں ہوں
تم ننگ جہاں میں شرفِ کون ومکاں ہوں

تم جنگ میں روباہ ہو میں شیرِ ژیاں ہوں
تم کاہ سے کمزور ہو میں کوہِ گراں ہوں

لاکھوں ہوں تو ہی فتح بہر کیف ہماری
کرتی ہی صفیں صاف سدا سیف ہماری

اس تیغ سے رستم سا دلاور نہیں بچتا
سن سے جو یہ چلتی ہی تو خفر نہیں بچتا

منفر نہ فرق پہ جب سر نہیں بچتا
سر کیا ہی کہ اک ضرب میں پیکر نہیں بچتا

بجلی ہی یہ رکتے کبھی دیکھا نہیں اس کو
گر ہوں پرِ جبریل تو پروا نہیں اس کو

لاسیف اسی حجت قاطع کی ثنا ہے
آسیب سے کیا سیب کے پھل اس کا بنا ہے

یہ لشکر باغی کے لیے دار عنا ہے
سائے میں جو اس تیغ کے آیا وہ فنا ہے

جوہر میں جو فتح تو قبضے میں ظفر ہے
دشمن کے لیے تیغ ہے مومن کی سپر ہے

فخر عرب و روم و عجم کی ہے یہ تلوار
کاٹے ہیں نشاں جس نے علم کی ہے یہ تلوار

کاٹ اس میں غضب کا ہے ستم کی ہے یہ تلوار
مثل مہ نو بدر میں چمکی ہے یہ تلوار

ہلتی تھی زمیں ہاتھ جو قبضے پہ دھرا تھا
خندق کو اسی تیغ نے لاشوں سے بھرا تھا

پائی نہ اماں لشکر صفین و جمل سے
عنتر کو جلایا ہے اسی تیغ اجل نے

نہ لات نے مرحب کو بچایا نہ ہبل نے
کاٹا شجر کفر کو اس تیغ کے پھل نے

گر پاس نہ ہوتا پر جبریل امیں کا
ملتا نہ پتا زیر زمیں گاؤ زمیں کا

جس وقت سر چاہ علی کے قدم آئے
جنات ہزاروں تہ تیغ دو دم آئے

فریاد کناں ساکن بیت الالم آئے
یا شیر خدا دین محمد میں ہم آئے

دیجے گا سزا پھر اگر اس راہ سے نکلیں
یوسف کی قسم لو جو کبھی چاہ سے نکلیں

اک ہاتھ میں دو ہونگی سنانوں کو بچاؤ
ڈھونڈو نہ کہیں گاہ کمانوں کو بچاؤ

مٹ جائیگی یہ شان نشانوں کو بچاؤ
جب جانیں کہ اس تیغ سے جانوں کو بچاؤ

رکتی ہے نہ جوشن پہ نہ تھمتی ہے کمر پہ
یہ مرگ مفاجات سے جلد آتی ہے سر پہ

لے جان لیے خانۂ تن سے نہیں پھرتی
لے صاف کیے فوج کو رن سے نہیں پھرتی

کچھ ہو یہ شجاعت کے چلن سے نہیں پھرتی
لے سیر گل زخم بدن سے نہیں پھرتی

منھ خود و زرہ سے کبھی موڑا نہیں اس نے
دشمن کو کبھی جنگ میں چھوڑا نہیں اس نے

بیٹھی ہے تو سر تن سے جدا کر کے اٹھی ہے
دشمن کو اشارے میں فنا کر کے اٹھی ہے

کافر کے سراپا کو دو تا کر کے اٹھی ہے
ہر معرکہ میں حشر بپا کر کے اٹھی ہے

چمکی ہے یہ جس دم تو صفیں چاٹ گئی ہے
اک ہاتھ میں سو سر کے گلے کاٹ گئی ہے

پڑھکر یہ رجز شام کے بادل میں در آئے
چمکا کے فرس کو صفِ اول میں در آئے

بے دینوں کے دل ہل گئے جس دل میں در آئے
اک شیر ستے تلواروں کے جنگل میں در آئے

تھرا گیا میداں کہ ہزبر احد آیا
لشکر میں پڑا شور کہ بھاگو اسد آیا

اعدا کے سروں پر جو وہ تیغ دوسر آئی
اک تیر چھری تھی کہ کلیجوں میں در آئی

بجلی سی چمک کر ادھر آئی اُدھر آئی
دُو ہو گئی جب تیغ کے نیچے سپر آئی

دستانے میں یوں کاٹ گئی دستِ ستم کو
جس طرح سے کاٹے کوئی جلدی میں قلم کو

نے دست ہر اک صف تھی تو نے سر تھا ہر اک گول
خود اُلٹے ہوئے خاک پہ تھے صورتِ کشکول

شمشیر دوستی نے نکالی تھی نئی تول
سر بکتے تھے ارزاں پہ نہ لیتا تھا کوئی مول

اس تیغ سے فولاد کا دل نرم ہوا تھا
تن سرد تھے بازارِ اجل گرم ہوا تھا

چار آئنہ والوں کو نہ تھا تیغ سے چارا
چو رنگ تھے سینے تو کلیجے تھے دوپارا

کہتے تھے زرہ پوش نہیں جنگ کا یارا
بچ جائیں تو جانیں کہ ملی جان دوبارا

جوشن کو سنا تھا کہ حفاظت کا محل ہے
اس کی نہ خبر تھی کہ یہی دامِ اجل ہے

بکیش لڑائی کا چلن بھول گئے تھے
ناوک فگنی تیر فگن بھول گئے تھے

سب چلہ کشی عہد شکن بھول گئے تھے
بیہوشی میں ترکش کا دہن بھول گئے تھے

معلوم نہ تھا جسم میں جاں ہے کہ نہیں ہے
چلاتے تھے قبضے میں کماں ہے کہ نہیں ہے

تولے ہوئے بھالوں کو جفا کار تھے ہر چند
تھی عقدہ کشا تیغ نہ بندھتا تھا کوئی بند

کیا روکتے تیروں کو جوانانِ تنومند
تھا شیرِ نیستان اسد اللہ کا فرزند

بیرق تھے نہ بھالے تھے نہ پرچم نہ علم تھا
اک ہاتھ میں ہاتھ بھی نیزہ بھی قلم تھا

دم کی تھی دعا شاہ نے کیا تیغ دودم پر
نے خود پہ رکتی تھی نہ تھمتی تھی جھلم پر

گردن سے جو سینے پہ تو سینے سے شکم پر
تو سن سے رکابوں پہ رکابوں سے قدم پر

جوشن میں قوی میخ بکتر میں نگیں پر
سُم کاٹ کے گھوڑے کے جو دیکھا تو زمیں پر

غل تھا کہ زمانہ میں نہیں صف شکن ایسا
تلوار جو ایسی ہو تو ہو تیغ زن ایسا

دنیا میں لڑا ہی کوئی تشنہ دہن ایسا
کچھ حرف شکایت کا نہ آئے چلن ایسا

سکہ نہ ہو کیوں ضرب شجاع ازلی کا
کونین میں ہی نام حسین ابن علی کا

نیزوں کو ہلاتے تھے جو ہو اروں پہ تن کے
ٹکڑے بھی زمیں پر نہ ملے اُن کے بدن کے

جنگل میں چھپے آئے وہاں شیر جو بن کے
بھاگے وہ ہرن ہو کے بہادر تھے جو رن کے

صفدر نے جواں مردوں کے دل توڑ دیے تھے
نیزوں کے دم تیغ نے مُنھ موڑ دیے تھے

انبار تن و سر کے سراسر تھے زمیں پر
تن تھے کسی جا اور کہیں سر تھے زمیں پر

کاٹے ہوئے ہتھیار برابر تھے زمیں پر
جوشن کہیں ٹکڑے کہیں مغفر تھے زمیں پر

بیجاں کہیں وہ اہل ستم ساتھ بڑھے تھے
ریتی پہ کہیں پاؤں کہیں ہاتھ پڑے تھے

کس سر پہ چڑھی تیغ کہ توسن پہ نہ اتری
وہ کونسا توسن تھا کہ یہ سن سے نہ اتری

نے جان لیے جسم تہمتن سے نہ اتری
اتری جو نہ وہ موت بھی گردن سے نہ اتری

دشمن کو نہ زندہ کسی جا موت نے چھوڑا
تیغ اتری کمر سے تو گلا موت نے چھوڑا

چلتی تھی چپ و راس جو شمشیر دو دھاری
ریتی پہ تڑپتی تھی دو رستہ صف ناری

خنجر تھے گلوں پر تو کلیجوں پہ کٹاری
کٹ کٹ گئیں تیغیں ستم آرا ہوئے عاری

نوکیں جو پڑیں دل پہ کسی بانی شر کے
دو پر چھی کے پھل پار ہوئے ایک جگر کے

افعی کی طرح منھ سے نکالے تھی زباں تیغ
ہر دم صف کفار پہ تھی شعلہ فشاں تیغ

گرتی تھی چمک کر کبھی یاں اور کبھی واں تیغ
چھپنے تھے جفا جو پہ نہ دیتی تھی اماں تیغ

قبضے میں جو سب فوج تھی اس تیغ دو سر کے
بچ سکتے تھے دشمن نہ ادھر کے نہ اُدھر کے

غل تھا کہ ڈھالوں سے یہ تلوار رُکے گی
روکے سے نہ یہ برق شرر بار رُکے گی

سو بار گرے گی پہ نہ اکبار رُکے گی
برق غضب ایزد قہار رُکے گی

انگشت قضا کہتے ہیں اس تیغ کے پھل کو
سر پر کبھی آتے نہیں دیکھا ہی اجل کو

پشہ وہ کہ لشکر کو پریشان کیا جس نے
آب ایسی کہ خشکی میں یہ طوفان کیا جس نے

دم ایسا کہ سب فوج کو بیجان کیا جس نے
زہر ایسا کہ جنگل کو گلستان کیا جس نے

سر سے کڑوں کاٹے تھے پہ رنگ اس کا ہلاہل تھا
ہر ناب میں ناگن کی طرح زہر بھرا تھا

قبضہ وہ جسے رکھتے تھے قبضے میں ید اللہ
نابوں سے عیاں تھا کہ عدم کی ہے یہ راہ

جوہر وہ کہ ہر فرد بشر جس سے ہو آگاہ
قد آفت دوراں برش الظلمۃ للہ

باڑھ ایسی مقابل کبھی دریا نہیں جس سے
گھاٹ ایسا کہ جیا کوئی اترا نہیں جس سے

مومن کے لیے نور ہے کافر کے لیے نار
یہ رنگ نیا تھا کہیں آتش کہیں گلزار

اعجاز تو دیکھو کہیں راحت کہیں آزار
قدرت کا تماشا ہے کہیں گل تو کہیں خار

دم بند تھے دہشت سے شجاعانِ جہاں کے
مسدود تھے سب رستے وہاں امن و اماں کے

ناری کو سقر تک کبھی پہونچا کے پھر آئی
دیکھا کسی موذی کو تو بل کھا کے پھر آئی

ناگن کی طرح سن سے کبھی جا کے پھر آئی
جانا تھا کہ بس فوج پہ لہرا کے پھر آئی

غل تھا کبھی یوں تیغ کو چلتے نہیں دیکھا
افعی کو بھی یہ زہر اگلتے نہیں دیکھا

خونخواریوں کا چاٹ کے گرمائی ہوئی تھی
بجھتی جو نہ تھی پیاس تو جھنجلائی ہوئی تھی

دریا کی طرف جلنے پہ لہرائی ہوئی تھی
سب فوج پہ اک برق غضب چھائی ہوئی تھی

منہ کیا تھا کہ اک قہر تھا خم تھا کہ غضب تھا
لشکر کا لہو پی گئی دم تھا کہ غضب تھا

دو کر کے سر و صدر و شکم ناف سے نکلی
تعریف دلِ صاحبِ انصاف سے نکلی

بجلی سی جو چار آئنہ صاف سے نکلی
یا فاتح خیبر کی صدا قاف سے نکلی

چل جاتا تھا جب وار امامِ مدنی کا
غل ہوتا تھا افلاک پہ اللہ غنی کا

جب تن کے چلی حال عدو غیر کر آئی
جس صف پہ گری خاتمہ بالخیر کر آئی

کشتوں کے تڑپنے کی کبھی سیر کر آئی
دریا کی طرف خوں میں کبھی پیر کر آئی

سب گھاٹ سے دنیائے تلک خوں میں تر تھی
تلوار نہ تھی ماہیِ دریائے ظفر تھی

وہ سیل جدھر آئی تلاطم نظر آیا
آنکھوں سے نہاں مجمع مردم نظر آیا

ہلچل میں سواروں کا پر اگم نظر آیا
جو تھا بہ سرِ زیں وہ تہ سم نظر آیا

مُنہ کھول کے اژدر نے نوالہ کیا سب کو
بجلی کی تڑپ نے تہ و بالا کیا سب کو

دو شخصوں نے اک غول سے رہوار نکالے
اک ہاتھ میں نیزہ لیے اک تیغ سنبھالے

چار آئنہ بر میں سپریں کاندھوں پہ ڈالے
امداد کو پہونچے کئی سو برچھیوں والے

کس دھوم سے وارد سرِ میداں ہوئے دونوں
پڑھ پڑھ کے رجز جنگ کے خواہاں ہوئے دونوں

ایک ایک ستم پیشہ و سرہنگ و جفا جو
مغرور و سیہ کار و سیہ رنگ و سیہ رو

بدصورت و بدہیئت و بدسیرت و بدخو
سینے جو کشادہ تو قوی ساعد و بازو

پیاسے تھے لہیں خونِ امامِ ازلی کے
دونوں کو عداوت تھی گھرانے سے علی کے

برچھوں کو ہلاتے ہوئے آئے جو وہ بدکار
ہر گشت میں پھرتے تھے فرس صورتِ پرکار

شبدیز کو چمکا کے پکارے شہِ ابرار
آتی ہے اجل سر پہ خبردار خبردار

حافظ ہے خدا کچھ مجھے پروا نہیں جو ہو
یہ بھی ہو شگوں نیک کہ پہلے ہی سے وہ ہو

یوں کہنے لگے طعن سے دونوں ستم ایجاد
حضرت بھی بلا لیں جسے چاہیں پئے امداد

فرمایا پکاروں کسے میں بیکس و ناشاد
ابتو نہ بھتیجا ہے نہ بھائی ہے نہ اولاد

سب مر گئے تنہا ہیں لاکھوں میں کھڑے ہیں
یہ خاک پہ لاشے انھیں پیارو کے پڑے ہیں

گو کوئی نہ بھائی نہ پسر ساتھ ہے میرے
ہاں ایک خدا آٹھ پہر ساتھ ہے میرے

میں سیفِ الٰہی ہوں ظفر ساتھ ہے میرے
ہمدم کی طرح تیغ دو سر ساتھ ہے میرے

تم دونوں ہو کیا فتح کبھی پا نہیں سکتے
لاکھوں ہوں تو قبضے سے مرے جا نہیں سکتے

ناگاہ بڑھے تول کے نیزوں کو وہ خونریز
مہمیز جو کی برق مجسم ہوئی شبدیز

تاپوں سے ہلا دور تلک دشت بلاخیز
فولاد میں در آئیں سنانیں تھیں وہ تہ تیز

آمد میں یہ دعوے تھا ہر اک بانیِ شر کو
نوکوں پہ اٹھا لیتے ہیں زہرا کے پسر کو

مکاروں نے دکھلائی بہت شعبدہ بازی
دیکھا کیے ہنس ہنس کے شہنشاہ حجازی

تھے عقل کے کوتاہ جو کی دست درازی
ہاتھ آتا ہی کب ابن ید اللہ سا غازی

جو منہ پہ چڑھا خاک کا پیوند ہوا ہی
نیزوں سے کہیں عقدہ کشا بند ہوا ہی

وار آپ نے جب ردّ کیے ان کے کئی باری
تھرّانے لگے ہاتھ یہ دہشت ہوئی طاری

تھی تیغ شہِ دیں غضبِ ایزدِ باری
کانپا جو کلیجا دو دلے ہو گئے ناری

نیزوں کی سناں کو دمِ شمشیر نے کاٹا
غل تھا کہ سرِ شمع کو گلگیر نے کاٹا

اک ضرب میں دونوں کے جو نیزے ہوئے بیکار
تلواریں علم کر کے پھر آئے وہ ستمگار

تیغیں جو چپ و راس سے چلنے لگیں اکبار
رو کے سپرِ حضرتِ حمزہ پہ وہ سب وار

دونوں کو ڈرایا بھی نہ شمشیر دوسرے سے
پسپا ہوئے وہ خود تو ٹھہے آپ اِدھر سے

اک ضرب میں بٹ تھا اس کا اُڑا اور سپر اس کی
دو تھا جو سر اس کا تو جدا تھی کمر اس کی

اس کو خبر اس کی تھی نہ اس کو خبر اس کی
کی موت نے دعوت اِدھر اس کی اُدھر اس کی

گرمی میں لڑے تھے شہِ دلگیر سے دونوں
ٹھنڈے ہوئے آبِ دمِ شمشیر سے دونوں

اک ہاتھ میں بیجان ہوئے دونوں جو ستمگر
حضرت نے کہا اور بھی ہی کوئی دلاور

دعوے ہو تو دیکھے مری تلوار کے جوہر
پھر تاب کسے تھی کہ مقابل ہو جو آکر

دونوں کو اجل لائی تھی شمشیر کے منہ پر
صید آپ سے جاتا ہی کوئی شیر کے منہ پر

ہاتھ ایسا جسے دستِ خدا کہیے تو حق ہی
ضرب ایسی کہ جس ضرب سے دل کفر کا شق ہی

جب چاہیں الٹ دیں کفِ ہر میں یک ورق ہی
یہ سب ہی مگر آپ کو اُمت کا قلق ہی

دیتے تھے دوہائی جو پرے اہلِ جفا کے
آنسو نکل آتے تھے امامِ دوسرا کے

ہر چند کہ بیٹوں کے تھے قاتل وہ ستمگار
ننگی جو اماں سب نے تو خود روک لی تلوار

بدعہد تھی کیا امتِ غدّار و جفا کار
یاں ہاتھ رکا واں سے ہوئی نیزوں کی بوچھار

یاں رحم تھا اور امتِ عاصی کی دعا تھی
واں صلح میں تھا کر لڑائی میں دغا تھی

واں ظلم و ستم تھے اودھر الطاف و مدارا
باطل پہ وہ تھے حق پہ ید اللہ کا پیارا

وہ خاک کے ذرّے تھے یہ تھا عرش کا تارا
واں لاکھ ستمگر ادھر اک پیاس کا مارا

واں قتل کا غل فوج مخالف میں پڑا تھا
سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ ادھر شکر خدا تھا

سب سے پسر سعد یہ کہتا تھا کہ جاؤ
جلدی سر فرزند نبی کاٹ کے لاؤ

لینا ہی نہ سرخ تو خوں شہ کا بہاؤ
فرماتے تھے شبیر کہ حاضر ہوں میں آؤ

طوفاں سے کہیں کشتی تن پار اتر جائے
سر تن سے جدا ہو تو بڑا بار اتر جائے

نقصان مرا کیا ہے اگر تم نے دغا کی
جاگیر شہادت مجھے خالق نے عطا کی

اللہ سے وعدہ کیا جو اس پہ وفا کی
میراث نہیں سر یہ تو امانت ہے خدا کی

سر دینے میں حجت نہیں تکرار نہیں ہے
ہم لوگوں کے اقرار میں انکار نہیں ہے

فرما کے یہ قبضے سے رکھا تیغ دو سر کو
لٹکا دیا ہرنے پہ دلاور نے سپر کو

پایا تھا جو تنہا شہ مرداں کے پسر کو
بس گھیر لیا شام کے بادل نے قمر کو

لشکر کی سیاہی تھی کہ گھر لگ گئے شبیر
سب فوج کی تیغوں کے تلے آگئے شبیر

اک نور کو گھیرے ہوئے ظلمت نظر آئی
دن کو شب دیرہ کی علامت نظر آئی

خود شافع محشر پہ قیامت نظر آئی
قرآن کے بچنے کی نہ صورت نظر آئی

کٹتی تھیں رگیں ظلم کا دروازہ کھلا تھا
اجزائے تن پاک کا شیرازہ کھلا تھا

بت گرد تھے اور بیچ میں وہ کعبۂ ایماں
تھا نوح پہ خشکی میں عجب طرح کا طوفاں

دو لاکھ دل آزار اور اک عیسیٰ دوراں
کیا مورچہ بندی تھی پئے قتل سلیماں

فرعونیوں کا حضرت عیسےٰ پہ یہ ستم تھا
سب فوج کی تیغیں تھیں ادھر اک شاہ کا دم تھا

بیکس پہ ہزاروں جو چلے تیر سے پہلو
غربال ہوا سینۂ شاہانہ خوش خو

تیزے جو برابر سے لگاتے تھے جفا جو
چھد جاتے تھے دونوں کبھی شاہ کبھی بازو

بند آنکھیں کیے جھومتے تھے گھوڑے پہ یہ رن میں
تلواروں کے پھل لگتے تھے اس پھول سے تن میں

پھولے ہیں گل زخم کوئی جا نہیں خالی
شرماتی ہے جن سے گل صد برگ کی لالی

یوں کٹکے لٹک آئے تھے دستِ شہِ عالی
جیسے کوئی کرتا ہے قلم پھول کی ڈالی

جلکر جو پھر آئینگے نہیں باغِ جہاں میں
عالم کو دکھاتے ہیں بہار اپنی خزاں میں

جب مارتا تھا سنگ دہن پر کوئی غدار
فرماتے تھے فریاد ہے یا احمدِ مختار

پڑتی تھی قفا سے جو کوئی فرق پہ تلوار
سر تھام کے چلاتے تھے یا حیدرِ کرار

چھدتا تھا جو تیروں سے جگر شاہِ زمن کا
نعرہ لبِ خشکیدہ پہ تھا ہائے حسن کا

تھا خون کا دریا جو ہر اک زخم سے جاری
مُنھ زرد تھا اور تن کی قبا سرخ تھی ساری

پہلو پہ جو لگ جاتا تھا بھالا کوئی بھاری
جھک جھک کے سنبھل جاتا تھا وہ عاشقِ باری

مجروح سراپا جو امامِ دو جہاں تھے
دو خون کے پرنالے رکابوں سے رواں تھے

یاں ایک تنِ زار ادھر سیکڑوں خونخوار
کھایا کبھی نیزہ کبھی برچھی کبھی تلوار

طاقت جو نہیں ہرنے پہ جھکجاتے ہیں ہر بار
نکلے ہیں رکابوں سے قدم ہاتھ ہیں بیکار

سینے سے کوئی تیر نکالا نہیں جاتا
اب تو دلِ مجروح سنبھالا نہیں جاتا

غش سے کبھی چونکے کبھی جھومے کبھی تھرّائے
کی آہ کبھی اور کبھی اشک آنکھوں میں بھر آئے

تلواروں سے جو چور ہو بچکر وہ کدھر جائے
دم ہونٹوں پہ تھا اور کوئی ہمدم بھی نہ تھا ہائے

یوں تیروں کی بوچھار کسی تن پہ نہ ہوئے
جو شاہ پہ گذری کسی دشمن پہ نہ ہوئے

رہوار سے ناگاہ گرے قبلۂ کونین
تڑپا جو نواسا تو نبی ہو گئے بے چین

ماتم کا ہوا غل فلک ارض کے مابین
اعدا میں ہوا فتح کا غل بیبیوں میں بین

تھرّا گئے چودہ طبقے ارض و سما کے
نعروں کی صدا آنے لگی شیرِ خدا کے

خنجر کو لیے شمر چلا جب طرفِ شاہ
آئی یہ صدا رحم کر اس پیاسے پہ للّٰلہ

خاتونِ قیامت ہوں میں کیا تو نہیں آگاہ
فریاد جفا جو نے کسی کی نہ سنی آہ

بالائے سرِ شاہ جو وہ بے ادب آیا
غل تھا کہ الٹتا ہے زمانہ غضب آیا

رکھنے جو لگا سینے پہ زانو ستم آرا
زہرا کی صدا آئی برابر سے دوبارا

پتھر کے تلے دب گیا ہی ہی مرا پیارا
سفاک نے زانو کو نہ سینے سے اتارا

ظالم جگر شیر خدا کاٹ کے اٹھا
خنجر سے مسافر کا گلا کاٹ کے اٹھا

چہرے پہ سکینہ کے یتیمی سی جو چھائی
زینب درِ خیمہ سے تڑپ کر نکل آئی

رستے میں خبر آکے یہ فضہ نے سنائی
مارے گئے شبیر دوہائی ہی دوہائی

مادر کو تڑپتا ہوا جنگاہ میں دیکھا
آگے جو بڑھی بھائی کا سر راہ میں دیکھا

ہاں اہل عزا مرثیہ اب ہوتا ہی آخر
پُرسا دو کہ ہی فاطمہ اس بزم میں حاضر

ہی ہی شہ آوارہ وطن ہائے مسافر
مذبوح تفاتشنہ دہن صابر و شاکر

زلفیں وہ تری خاک میں سب اٹ گئیں آقا
ہی ہی تری خنجر سے رگیں کٹ گئیں آقا

آقا ترے عمامۂ گلگوں کے تصدق
سید ترے پیراہنِ پرخوں کے تصدق

ان زخموں کے صدقے دلِ محزوں کے تصدق
ریتی پہ تڑپتے قدِ موزوں کے تصدق

خنجر کے تلے سجدۂ رب کرنے کے صدقے
سرور ترے پانی کے طلب کرنے کے صدقے

ہاں اہلِ عزا روؤ کہ ماتم ہوا آخر
اے مجلسیو پیٹو کہ یہ غم ہوا آخر

سامان عزائے شہِ عالم ہوا آخر
کیا مجمع احباب تھا برہم ہوا آخر

یہ مجلس آخر ہی جگر بندِ نبی کی
تم لوگوں سے رخصت ہی حسین ابنِ علی کی

کیا خوب کٹے آٹھ دن اور دو یہ مہینے
نیلے رہے ماتم سے عزاداروں کے سینے

کوتاہ کیا ہاتھ نہ ماتم سے کسی نے
ہر روز دعائیں تمہیں دیں روح نبی نے

دل روتا ہی صدمہ ہی عجب طرح کا جاں پر
دیکھو تو کہ کیا آج اُداسی ہی مکاں پر

آقا ترے قربان خدا حافظ و ناصر
اے شیعوں کے مہمان خدا حافظ و ناصر

اے فاطمہ کی جان خدا حافظ و ناصر
اے دیں کے سلطان خدا حافظ و ناصر

مجبور ہیں گر قبر میں ہم ہوئینگے مولا
جیتے ہیں تو پھر اگلے برس روئینگے مولا

خاموش انیس اب کہ ہی سینے میں جگر چاک
حق ہی ترا مداحِ سبطِ شہِ لولاک

حاسد سے نہ کچھ خوف نہ دشمن سے ہی کچھ باک
نافہم ہی وہ چاند پہ ڈالے جو کوئی خاک

سب مدح کریں نظم کی یہ نظم و نسق ہی
باطل ہی سو باطل ہی جو حق ہی سو وہ حق ہی

سلام

ابتدا سے ہم ضعیف و ناتواں پیدا ہوئے
اُڑ گیا جب رنگ رُخ سے استخواں پیدا ہوئے

خاکساری نے دکھائیں رفعتوں پر رفعتیں
اس زمیں سے واہ کیا کیا آسماں پیدا ہوئے

علم خالق کا خزانہ ہی میانِ کاف و نون
ایک کن کہنے سے یہ کون و مکاں پیدا ہوئے

ہاتھ خالی آئی لاشوں پر شہیدوں کے نسیم
پھول بھی اس فصل میں ایسے گراں پیدا ہوئے

نوبتِ جمشید و دارا و سکندر اب کہاں
خاک تک چھانی نہ قبروں کے نشاں پیدا ہوئے

جو عدم سے آگیا دنیا میں بولی ہنس کے موت
اور لو دو چار دن کے ہمہاں پیدا ہوئے

ضبط دیکھو سب کی سُن لی پر نہ اپنی کچھ کہی
اس زباں دانی پہ گویا لے زباں پیدا ہوئے

جانِ ہی حُر نے تو حضرت نے دیا باغِ ارم
میہماں ایسے نہ ایسے میزباں پیدا ہوئے

یک بیک ایسا زمانے میں ہوا ہی انقلاب
قدرداں سب اُٹھ گئے ناقدرداں پیدا ہوئے

بود و نابود علی اصغر کا کیا کیجے بیاں
بے زبانی سے اُٹھے نے زباں پیدا ہوئے

دیکھ کر لاشوں کو حضرت کہتے تھے واغربتا
موت لے آئی کہاں ان کو کہاں پیدا ہوئے

احتیاطِ جسم کیا انجام کو سوچو انیس
خاک ہونے کو یہ مشتِ استخواں پیدا ہوئے

مرثیہ ۲۲

جب قیدیوں کو خانۂ زنداں میں شب ہوئی
بچوں کی مارے خوف کے حالت عجب ہوئی

گھٹ گھٹ کے دخترِ شہِ دیں جاں بلب ہوئی
مضطر کمال بنت امیرِ عرب ہوئی

آفت کا سامنا تھا نئی واردات تھی
زہرا کی بیٹیوں پہ قیامت کی رات تھی

پہلے پہل کی قید وہ اور وارثوں کے داغ
یہ رنگ تھا کہ ہووے خزاں دیدہ جیسے باغ

رونے سے اہلِ بیت کو اک دم نہ تھا فراغ
نے چاندنی نہ شمع نہ مشعل نہ واں چراغ

غل تھا کہ ایسے گھر بھی الٰہی جہاں میں ہیں
ثابت نہیں کہ قبر میں ہیں یا مکاں میں ہیں

یوں وہ شکستہ حال تڑپتے تھے ہر نفس
دشوار جیسے صید پہ ہو تنگیِ قفس

جانوں کو تھی بدن سے نکل جانے کی ہوس
بازو بندھے ہوئے تھے نہ تھا کچھ کسی کا بس

دل چھاتیوں میں صورتِ بسمل پھڑکتے تھے
زنداں کے در سے جا کے سروں کو پٹکتے تھے

اس گھر میں اہلِ بیتِ محمد ہوئے تھے بند
جز کہنگی جسے نہ کسی نے کیا پسند

تنگی سے ایک ایک کو تکلیف تھی دو چند
تھوڑی سی جا مگر کہیں پست اور کہیں بلند

وہ بیبیاں اسیر تھیں اُس قصرِ زشت میں
ہیں جن کی لونڈیوں کے لیے گھر بہشت میں

زنداں میں جبکہ آلِ پیمبر ہوئے اسیر
کونین کے امیر کھلے سر ہوئے اسیر

سب رشتہ دار حیدرِ صفدر ہوئے اسیر
وحشت سرا میں عرش کے اختر ہوئے اسیر

دو بیبیاں اسیر تھیں اُس قصرِ زشت میں
ہیں جن کی لونڈیوں کے لیے گھر بہشت میں

بستی وہ فاطمہ کی کہاں اور وہ گھر اجاڑ
جانوں پہ تھی بنی ہوئی قسمت کا تھا بگاڑ

کیا دل کھلیں کہ شام سے جب بند ہوں کواڑ
دیواریں تھیں بلند کہ چھاتی پہ تھے پہاڑ

گھبرا کے چھت کو بیبیاں ہر بار تکتی تھیں
ٹوٹے مکاں کی رات کو کڑیاں کو کتی تھیں

کیجے شکستگی خرابی کا کیا بیاں
ثابت نہ جس میں سقف نہ دراور نہ سائباں

وحشت کا گھر ہراس کی جا خوف کا مکاں
وہ شب کہ الحذر وہ اندھیرا کہ الاماں

ظلمت کدائے گور تھی زنداں کا گھر نہ تھا
حجرے یہ تنگ تھے کہ ہوا کا گذر نہ تھا

مثل دل یزید تھا وہ سب مکاں سیاہ
تاروں کی روشنی کو بھی ملتی تھی واں نہ راہ

چھایا تھا دل جلی ہوئی رانڈوں کا دود آہ
حجرے کہ چشم ترکے نکلتی نہ تھی نگاہ

دیکھے کسی کی شکل کوئی یہ محال تھا
روزن بھی تھا کوئی تو وہ چشم غزال تھا

شب کا تو ذکر کیا ہے کہ لگتا تھا دن کو ڈر
ظاہر تھے جا بجا حشرات زمیں کے گھر

تھے وقف آشیان ابابیل سقف و در
نکلا وہ مر کے قید ہوا اس میں جو بشر

گھر تھا اجل کا خانہ رنج و بلا نہ تھا
برسوں سے واں چراغ کسی شب جلا نہ تھا

وہ تیرگی کہ ہو شب ظلمات اس سے دنگ
ہر در بسان حجرۂ چشم بخیل تنگ

تھی ان کی صبح و شام سواد دیار رنگ
دیوار و سقف و بام و زمین سیاہ رنگ

قید اس میں تھے حرم شہ گردوں مقام کے
کیا صبح مل گئی تھی خرابے کو شام کے

گرمی کی فصل اور ہوا کا وہ احتباس
وہ ضیق اس مکان کی اور قید کا ہراس

اندوہ کا وفور دلوں پر ہجوم یاس
مائیں جو تہلکہ میں تو بچے تھے بے حواس

دیواریں بھی شکست تھیں در بھی جھکے ہوئے
جانیں بھی غم سے تنگ تھیں دل بھی رکے ہوئے

ہر دم زمیں سے ان کی نکلتا تھا یوں بخار
جیسے دھواں تنور سے اٹھتا ہے بار بار

گرمی سے یوں زمیں پہ تڑپتے تھے سوگوار
جس طرح سے سپند ہو آتش پہ بے قرار

جھک جھک کے آسمان کو حسرت سے تکتے تھے
کیسے ہوائے سرد کو بچے بلکتے تھے

جھڑتی تھی واں کی سقف سے ہر دم سرون خاک
تھے گرد سے بھرے ہوئے رانڈوں کے جسم پاک

بھاگی تھی روشنی بھی یہ حجرے تھے ہولناک
کہتے تھے اب مکاں یہ گرا اب ہوئے ہلاک

قسمت میں ہے کہ قبر اسی جا نصیب ہو
اچھا تو ہے جو خاک کا پردا نصیب ہو

ایک ایک سے یہ کہتی تھی زینب جگر فگار
لائق نہ اس مکان کے تھے ہم گناہگار

مجبور جو غریب ہوں کیا ان کا اختیار
سایہ تو ہے سروں پہ کرو شکر کردگار

ہے جائے گریہ حال شہ مشرقین پر
کیا گزری ہوگی دھوپ میں لاش حسین پر

غارتگروں نے لوٹ لیا کہنہ پیرہن
وہ ریگ گرم اور وہ عریانی بدن

ہے ہے وہ شب پہاڑ سی اور کربلا کا بن
کس طرح جائے بھائی تلک کیا کرے بہن

پیاسا گلا کٹا کے موئے جس کی راہ میں
سوپنی ہے میں نے لاش اسی کی پناہ میں

رسّی مرے گلے کی کوئی کھولدے اگر
مقتل کو ڈھونڈھتی ہوئی جاؤں برہنہ سر

نکلی میں جب تو پھر نہیں درکار راہبر
رستے میں پوچھ لونگی کہ ہے کربلا کدھر

ممکن ہے یہ کہ لاش کو زینب نہ پائیگی
بھائی کے گل کی بو مجھے کوسوں سے آئیگی

کہنے لگی یہ اٹھ کے سکینہ جگر فگار
لیتی چلو مجھے بھی پھپھی تم پہ میں نثار

چھپ کر چلی گئیں تو میں روؤنگی زار زار
تم نے بھی کیا بھلا دیا دل سے ہمارا پیار

مر جاؤنگی اگر نہ پدر سے ملاؤ گی
کیا اس اندھیرے گھر میں مجھے چھوڑ جاؤ گی

رو کر تب اس یتیم سے زینب نے یہ کہا
واری کہاں میں اور کہاں دشت کربلا

بیکس اسیر وام بلا غم کی مبتلا
قیدی کو کون جانے کی دیگا بھلا رہا

بھائی کی لاش پاس اگر رہنے پاتی میں
زنداں میں قید ہونے کو کاہے کو آتی میں

ہے دشت کربلا تو کئی دن کی یاں سے راہ
ایسے کہاں نصیب کہ حاصل ہو وصل شاہ

گھر میں یزید کے ہے سر شاہ دیں پناہ
ہم قید اس مکاں میں ہیں لے جرم و بے گناہ

ہم سا کوئی جہاں میں نہ آفت نصیب ہو
ممکن نہیں کہ سر کی زیارت نصیب ہو

یہ تفرقہ بھی ہوتا ہے کم زیر آسماں
ہے ایک شہر پائے ہیں لیکن الگ مکاں

ہم ہیں کہیں کہیں ہے سر شاہ انس و جاں
میں کس کے آگے اپنی مصیبت کروں بیاں

نے بس ہیں رشتہ دار شہ ذوالفقار کے
حاکم کے ڈر سے رو نہیں سکتے پکار کے

کہنے لگی یہ سُن کے سکینہ بچشم تر
ہی ہی پھوپھی نہ آئینگے کیا اب مرے پدر

حاکم کے گھر میں قید ہیں سلطان بحر و بر
اب مجکو نیند کا ہیکو آئے گی رات بھر

سچ کہتی ہو نہ شاہ خوش انجام آئینگے
اماں تو کہتی تھیں کہ سرِ شام آئینگے

جب رو کے پوچھتی ہوں کہ بابا گئے کدھر
بہلاتی ہیں مجھے کہ سدھارے ہیں نہر پر

کہتا ہی کوئی دور نہیں شاہِ بحر و بر
رو وُ نہ تم اب آئینگے اب آئینگے پدر

خاطر کی بات کیا کوئی پہچانتا نہیں
سُن لیتی ہوں میں سب کی پہ دل مانتا نہیں

سمجھاتی ہیں چچی کہ اب آنسو نہ تم بہاؤ
آرام سے سُلاؤں میں گودی میں سی آؤ

اب عنقریب ہی کہ چچا اور پدر کو پاؤ
کہتی ہوں ان سے میں بھلا تم قسم تو کھاؤ

سچ ہی اگر تو کس لیے بیتاب ہوتی ہو
کیوں مُنھ کو پھیر کر مری جانب سے روتی ہو

ماں سے جو پوچھتی ہوں کہ تم بھی تو کچھ کہو
وہ کہتی ہیں کہ آؤ مری جان سو رہو

اس شب کو اور شہ کی جدائی کا غم سہو
کہیو تب ہی جو شہ سے ملاقات کل نہ ہو

دل صبح سے اچاٹ ہی بستی اجاڑ ہی
مجکو تو کاٹنا اسی شب کا پہاڑ ہی

معلوم ہو گیا مجھے بہلاتے ہیں یہ سب
تا مر نجائے قید میں گھٹ کر یہ تشنہ لب

کیا حاصل اس چھپانے سے شاید جیوں گی اب
میں کس بلا میں پھنس گئی یاں آ کے ہے غضب

یہ لوگ تو کبھی نہ مفصل بتائینگے
میں اپنی جان دونگی جو بابا نہ آئینگے

یہ ذکر تھا ابھی کہ ہوا بند نفل در
زنداں میں اور ہو گئی ظلمت زیادہ تر

گھبرا کے دیکھنے لگیں راندیں اِدھر اُدھر
جز تیرگی کسی کو نہ آتا تھا کچھ نظر

تڑپے یہ دل کہ سینوں میں سانسیں اکھڑ گئیں
ماؤں سے بچے بچوں سے مائیں بچھڑ گئیں

نظروں سے صورتیں جو ہوئیں یک بیک نہاں
ہاتھوں سے ڈھونڈھنے لگیں بچوں کو بیبیاں

چلائی بے حواسی میں بانوئے خستہ جاں
دیکھو تو بیبیو کہ ہی اصغر مرا کہاں

دل پر سکینہ جان کے صدمے گذر نہ جائیں
بچے مرے دہل کے اندھیرے میں ڈر نہ جائیں

پھرتا تھا گھٹنیوں ابھی یاں میرا نونہال
بچے کا میرے صاحبو رکھیو ذرا خیال

کہنے لگی یہ زینب بیکس بصد ملال
کس کی تلاش میں ہو کہاں ہے تمھارا لال

ملتا نہیں ہے پھر جسے ہاتھوں سے کھوتے ہیں
تم جن کو ڈھونڈھتی ہو وہ مقتل میں سوتے ہیں

چھاتی کو پیٹ کر یہ پکاری وہ سوگوار
لو جانتی تھی میں کہ یہیں ہے وہ گلعذار

ہے دور مجھ سے ہائے مرا طفل شیر خوار
اصغر تمھارے ننھے سے لاشے کے میں نثار

اے لال دامن شہ خوشخو میں سوتے ہو
ماں سے بچھڑ کے باپ کے پہلو میں سوتے ہو

راتوں کو اُٹھ کے دودھ یہ ماں اب کسے پلائے
کس کی بلائیں پیار سے لے کس کے صدقے جائے

آجاؤ ماں کے پاس اگر نیند وان سے آئے
ان چھوٹے چھوٹے پاؤں کو ہاتھوں سے ماں دبائے

اُلفت جو ہے پدر کی تو ماں کا بھی رد ہو
گو دُان کی گرم ہو مری چھاتی بھی سرد ہو

باندھے اس بیان پر بلکتے تھے سب حرم
باقر پکارتے تھے کہ کیونکر جیئنگے ہم

چلاتی تھی سکینہ کہ گھٹتا ہے میرا دم
زنداں کا در بھی ہو گیا معمور ہے ستم

کھولے گا قفل کون جو عباس آئینگے
لو اب پدر کدھر سے مرے پاس آئینگے

مکرے کے سر اندھیرے میں چلا ئینگے اسیر
اب روشنی کہاں سے بھلا لائینگے اسیر

گرمی کے مارے اور بھی گھبرائینگے اسیر
ہے ہے یہ کیا غضب ہوا مر جائینگے اسیر

دربانوں کو پکار دو پیمبر کے واسطے
کھلوا دو قفل فاتح خیبر کے واسطے

زنداں کا در کدھر ہے مجھے لیچلو شتاب
دربانوں سے کہونگی میں با دیدۂ پرآب

دادا مرا ہے شہر علوم نبی کا باب
مجھ پر کروگے رحم تو ہوگا تمھیں ثواب

پھر کل سے بیکسوں کو نظر بند کیجیو
اے لیویں بابا جان تو در بند کیجیو

بولا نہ جب کوئی تو ہوا غم زیادہ تر
دیوار پکڑے پکڑے گئی وہ قریب در

پٹ کو ہلا ہلا کے پکاری وہ نوحہ گر
دربانو جاگتے ہو کہ سوتے ہو بے خبر

بیکس ہوں تشنہ لب ہیں فلک کی ستائی ہوں
کچھ تم سے اپنا حال میں کہنے کو آئی ہوں

بولا کوئی کہ کون ہی تو ای نحیف و زار
دل ہو گیا ہی تیری صدا سُن کے بے قرار

اک آہ سرد بھر کے یہ بولی وہ دلفگار
اے آفت زدہ اسیر و پریشان و سوگوار

چھوٹے سے سن میں قیدی نہ دانِ شام ہوں
میں دختر حسین علیہ السلام ہوں

پوتی ہوں اُس کی جو کہ ہی کونین کا امیر
شبیر الہ بادشہِ آسماں سریر

ایسا کریم تھا وہ دو عالم کا دستگیر
جس نے ہزاروں قید سے چھوڑا دیئے اسیر

شہرت جہاں میں ہمتِ مشکلکشا کی ہی
ہم آج ہیں اسیر یہ قدرت خدا کی ہی

کہتی نہیں میں یہ کہ کروقید سے رہا
چھٹ جائینگے کبھی کہ اسیروں کا ہی خدا

کھانے کی کچھ طلب ہی نہ پانی کی التجا
ہاں قفل کھولدوگے تو دونگی تمھیں دعا

جائینگے ہم کہاں کہ تمھارے حوالے ہیں
بابا حسین آج کی شب آنے والے ہیں

اصغر ہی ان کے ساتھ یقیں ہی کہ جلد آئیں
ایسے نہیں ہیں وہ کہ مجھے رات بھر رلائیں

چوکی کے لوگ سو رہیں در پر مجھے بٹھائیں
دھڑکا مجھے یہ ہی کہ کہیں آکے پھر نہ جائیں

نیند آئیگی نہ مجکو بہت بے قرار ہوں
بھاگے کوئی اسیر تو میں ذمہ دار ہوں

منظور ابھی نہ ہو تمھیں در کھولنا اگر
آکر پکاریں شاہ تو تم کھولدیجو در

دیکھا تی ہوں پتا تمھیں ان کا میں نوحہ گر
معلوم ہوگا صاف کہ طالع ہوا قمر

پُر زلف مشک فام کی پھیلیگی دور سے
چٹکیگی چاندنی رُخ روشن کے نور سے

باندھے ہی مصطفےٰ کا عمامہ وہ تاجدار
اور ہی نشانِ سجدہ ستارہ سا آشکار

ہالہ ساگر وماہ کے ہی خط مشکبار
زیبِ کمر ہی شیرِ الٰہی کی ذوالفقار

گہہ ذکر حق ہی گاہ زبان پر درود ہی
سوکھے لبوں سے پیاس کی شدت نمود ہی

ساتھ ان کے ہوئیگا علی اکبر سا گلعذار
گیسو لٹکتے ہیں رخ روشن پہ اس کے چار

تصویر ہی نبی کی سراپا وہ ذی وقار
یوسف ہیں مصر حسن کے بھائی کے میں نثار

نجم فلک پسینے کے قطروں سے ماند ہیں
دنیا کی روشنی ہیں اندھیرے کے چاند ہیں

ہونگے جلو میں حضرتِ عباس نوجواں
ہوتا ہی جس سے دبدبۂ شیرِ حق عیاں

اس شیر کا نشان یہ ہی اور شکوہ و شاں
اک دوش پر تو مشک ہی اک دوش پر نشاں

قمری تو قد پہ چال پہ صدقے تدرو ہیں
نامِ خدا علی کے گلستاں کے سرو ہیں

مجھ بن نہ سوئے ہونگے شہنشاہِ خوش خصال
بیتاب میں ہوں ان کو بھی ہوگا مرا خیال

تم دیکھ لیجو مجھسے ہی الفت انھیں کمال
آتے ہی تم سے پوچھینگے پہلے ہی میرا حال

میں خود کہونگی مجھ پہ جو آفت گذر گئی
مر جائینگے پدر یہ نہ کہنا کہ مر گئی

ہوتے نہیں عزیز کسے دختر و پسر
پر مجھکو چاہتے ہیں وہ سب سے زیادہ تر

سوتی تھی ان کی چھاتی پہ مُنھ رکھکے رات بھر
زنداں میں اب زمین پہ تڑپتی ہوں تا سحر

موقوف ان پہ میری حیات و ممات ہی
آنے کا ہی یہ دن یہی وعدے کی رات کی

بولے نگاہ ہاں کہ ترا دھیان ہی کدھر
جا ماں کے پاس بیٹھ کہاں تو کہاں پدر

بے صبح کے ہوئے نہیں کھلنے کا قفل در
کیا شمر کے طمانچوں کا تجکو نہیں ہی ڈر

دن کو بھی روتی رہتی ہی شب کو بھی روتی ہی
نہ ہم کو سونے دیتی ہی نہ آپ سوتی ہی

ناحق ابھی سے کاہیکو کرتی ہی شور و شین
جا قفل کھولدینگے بھلا آئیں تو حسین

رونے سے تیرے شب کو بھی ملتا نہیں ہی چین
ہر وقت کے سُنے نہیں جاتے ہیں تیرے بین

بلوائیں شمر کو تری تعزیر کے لیے
رونا نہ کم کرے گی تو شبیر کے لیے

ماں بہنیں قید ہوگئیں آتش سے گھر جلا
آیا بچانے کوئی برے وقت میں بھلا

کھائے طمانچے جب تو ترا زور کب چلا
کس دیوے آکے شمر نہ رسی سے پھر گلا

ان سے چھٹے تو اور بھی صدمہ دو چند ہو
ایسا نہ ہو جا کسی حجرے میں بند ہو

یہ بات سُن کے سہم گئی وہ جگر فگار
دروازے سے سرک کے لگی رونے زار زار

دالان سے پکاری یہ بانوئے نامدار
بی بی کدھر گئیں ادھر آؤ یہ ماں نثار

کھولے گا کون در کسے چلاتی پھرتی ہو
واری کہاں اندھیرے میں ٹکراتی پھرتی ہو

زنجیر در ندات کو کھولینگے یہ لعیں
پستی بلند خانۂ زنداں کی ہے زمیں
دشمن ہر اک ہے لشکرِ اہلِ عناد میں
بولی سکینہ جان ہے تن میں یا کہ جائے
نے جرم کان زخمی ہوئے اور طمانچے کھائے
واں کیا ہے یاں نہ بیٹھ کے آنسو بہاؤں میں
کبرا کے صدقہ جاؤ بھلاؤ ہمارا پیار
مشکل ہے صبر دل پہ مرا کیا ہے اختیار
راحت بہت نصیب میں کم لیکے آئے ہیں
اصغر کو اپنی گود میں لو مجھسے کیا ہے کام
تم اپنے دل میں سمجھو کہ میں ہو گئی تمام
سبطِ رسول سے مجھے پیارا نہیں کوئی
بیٹی سے رو کے بولی یہ بانوئے تشنہ لب
میں نے ہی شہ سے تم کو چھڑایا ہے بے سبب
جو چاہو کہہ لو ایسی ہی تقصیروار ہوں
صدقے ہے جاں تلک مری گھر بار کیا ہے چیز
سب سے سوا ہے یوسف زہرا تمھیں عزیز
واری گلہ جو ماں کا کیا سب بجا کیا
بابا کے آگے سچ ہے بھلا ماں کی قدر کیا
بیزار تم ہو مجھ سے میں اصغر سے ہوں خفا
بیٹوں کا کیا گلہ ہے بھلا وہ تو دور ہیں

ماں صدقے جائے گھر کیا کھانے کو کیوں گئیں
گھبرا کے گر پڑو نہ اندھیرے میں تم کہیں
سونا بھی آج بھول گئیں شہ کی یاد میں
بیٹھی ہوں جب تلک کہ سواری نہ پھر آئے
جو چاہے مجھ فلک کی ستائی کو پھر ستائے
اچھا مجھے پدر سے ملا دو تو آؤں میں
سمجھو کہ ایک بیٹی ہوئی باپ پر نثار
اب کوئی دم میں تن سے نکلتی ہے جانِ زار
اتنی ہی عمر خلق میں ہم لیکے آئے ہیں
پیاری تھی سارے گھر کی میں بھتیجے تلک کا نام
اماں بس اب پکار و نہ لے کے میرا نام
بابا ہی جب نہیں تو ہمارا نہیں کوئی
ہاں بی بی سچ ہے میری ہی تقصیر ہے یہ سب
لو آؤ بس معاف کرو جرم ماں کا اب
سمجھو نہ ماں یہ جانو کہ خدمت گزار ہوں
میں اک تمھارے باپ کی ادنیٰ سی ہوں کنیز
میں جانتی ہوں کیا مجھے اتنی نہیں تمیز
میں نے تمھارے باپ کو تم سے جدا کیا
کسرائی میں وہ احمدِ مرسل کا دلربا
پوچھی خبر نہ ماں کی دیا ساتھ باپ کا
تقصیروار ہیں ہمیں سب نے قصور ہیں

مشہور ہے کہ چاہتے ہیں باپ کو پسر
بیٹی کو ماں سے ہوتی ہے اُلفت زیادہ تر

اک بدنصیب ہم ہیں کہ مر جائیں بھی اگر
بیٹوں کو کچھ خیال نہ بیٹی کو کچھ خبر

گو ہم نہ ہوں عزیز وہ ہم کو تو پیارے ہیں
ماں سمجھیں یا نہ سمجھیں پر آنکھوں کے تارے ہیں

روتی ہوئی یہ کہہ کے اُٹھی بانوئے حزیں
بیٹی کو ڈھونڈھتی ہوئی دروازے کے قریں

روتی تھی منہ کو کرتے سے ڈھانپے وہ مہ جبیں
پاس آکے ماں نے سر سے قدم تک بلائیں لیں

سر کو جھکا کے پہلے تو وہ پیچھے ہٹ گئی
پھر ننھے ہاتھ اُٹھا کے گلے سے لپٹ گئی

لے آئی ماں گلے سے لگا کر بچشم تر
چپ ہو کے لیٹی گود میں مانکی وہ نوحہ گر

بیٹھیں اسیر بیبیاں سب گرد آن کر
ہاتھوں سے کوئی پاؤں دباتی تھی کوئی سر

ماں لیتی تھی بلائیں پھوپھی صدقے جاتی تھی
بابا بغیر نیند اسے لیکن نہ آتی تھی

ماں کہتی تھی تھپک کے مریجان سو رہو
زخمی ہیں پھر نہ دُکھنے لگیں کان سو رہو

فرماتی تھیں پھوپھی کہ میرے جان سو رہو
کبرا یہ کہتی تھیں بہن اک آن سو رہو

جی چاہتا ہے چین سے کوئی دم تمھیں
بابا جب آئینگے تو جگا دینگے ہم تمھیں

کہتی تھی ایک ایک سے رو کر وہ ماہرو
تھی شہ کے ساتھ شام سے سونے کی مجھکو خو

کیا نیند آئے غم سے جگر ہو گیا لہو
سینہ کہاں وہ چاند سا اور اب کہاں وہ بو

تھوڑا ستم سہا ہے بچھڑ کر حسین سے
سوؤنگی اب تو قبر میں جا کر میں چین سے

لو گو بس اب کھونہ مری زندگی کی آس
بابا تو آچکے ہیں جائینگے ان کے پاس

ماں نے کہا کرو نہ مری جاں کلام بس
باتیں یہ سُن کے اور میں ہوتی ہوں بے حواس

اصغر تو جا کے بھول گئے ماں کی یاد کو
کیا تم بھی بھول جاؤ گی اس نامراد کو

بی بی تمھیں بتاؤ بھلا ماں کا کیا قصور
بابا اگر ہیں دور تو میں تو نہیں ہوں دور

صادق ہے اپنے قول کا وہ کبریا کا نور
اتنا کہونگی میں کہ حسین آئینگے ضرور

کیا دوگی ہم کو آج جو بابا کو پاؤ گی
پر یاد رکھیو یہ کہ ہمیں بھول جاؤ گی

تم کو سکھائے رکھتی ہوں جس دم پدر ملے
صدقے گئی نہ آنے کے کیجو بہت گلے

ماں واری سچ ہی غنچۂ دل کس طرح کھلے
یوں اس کو بھول جاتے ہیں جو باپ سے ملے

دفتر مصیبتوں کا بھی اپنے نہ کھولونگی
تم جب تلک نہ بولوگی میں بھی نہ بولونگی

سچ ہی نہ صاحبان کی نہ بھائی یہ مجکو بات
بچی کو میری غم ہی مجھے تلخ ہی حیات

بوسے جو منہ کے لینے لگیں شاہ خوش صفات
رکھ لیجو اپنے چہرے پہ تم چھوٹے چھوٹے ہات

آزردگی کی ہی یہ جگہ کیوں چلے گئے
اصغر کو ساتھ لے گئے تم کو نہ لے گئے

اک آہ سرد بھر کے یہ بولی وہ نوحہ گر
اماں میں چپ رہونگی بھلا آئیں تو پدر

رونے لگیں گے ڈھونڈ کے جب ادھر ادھر
اس وقت گر پڑونگی میں قدموں پہ دوڑ کر

اتنا تو کہدو مجھ سے اگر مر نہ جاؤنگی
صدقے تمھارے منہ کے میں بالکو پاؤنگی

میرے طمانچے کھانے کا ان سے نہ کہیو حال
اماں بہت کڑھینگے شہنشاہ خوش خصال

ہوئیگا غیظ سے علی اکبر کا رنگ لال
عباس نامدار کو جائیگا جلال

منظور ہی کہ قید ستم سے رہائی ہو
ایسا نہ ہو کہ پھر کہیں ان سے لڑائی ہو

کیوں اماں جان قبلۂ عالم ابھی جو آئیں
رو رو کر اشتیاق سے مجکو گلے لگائیں

جیتا خدا کرے علی اصغر کو ساتھ لائیں
صدمے جو گزرے ہیں ابھی سب مجکو بھولجائیں

سو جاں سے میں نثار شہ خوش خصال کے
کیا سوؤں ہاتھ چاندسی گردن میں ڈال کے

لیکر بلائیں بانوئے بیکس نے یہ کہا
ای عاشق پدر تری باتوں کے میں فدا

سمجھو ہیں تم اب انھیں عرصہ نہیں ذرا
آئے کوئی گھڑی کو شہنشاہ کربلا

بابا سے ہم بغل تمھیں ہونا نصیب ہو
چھاتی پہ ان کی رات کو سونا نصیب ہو

صدقے گئی جب آئیں شہنشاہ انس و جاں
میرا گلا نہ کیجو تم ان سے سکینہ جان

تقصیر جو ہوئی وہ تمھیں بخشو داری ماں
آزردہ مجھ سے ہونگے بہت سرور زماں

لشکر یزید کا دم غارت نہ لے سکا
سیلی لگائی جب تو مرا بس نہ چل سکا

بیٹی سے ماں نے کہیں جو یہ باتیں بچشم تر
جاگی بہت تھی سو رہی وہ عاشقِ پدر

سب ہو گئے خموش اسیرانِ نوحہ گر
بدلی نگاہبانوں نے چوکی بجا پہر

فاقوں میں قیدیوں نے اِدھر شکرِ رب کیا
اور اُس طرف یزید نے خاصہ طلب کیا

زنداں میں مضطر تھے اسیرانِ نوحہ گر
وہ ہولناک شب وہ اندھیرا کہ الحذر

بیٹھیں تھیں فرشِ خاک پہ رانڈیں برہنہ سر
بدلی نگاہبانوں نے چوکی بجا پہر

فاقوں میں قیدیوں نے ادھر شکرِ رب کیا
اور اُس طرف یزید نے خاصہ طلب کیا

جلدی محلسرا میں روانہ ہوا طعام
خاصہ چنا خواصوں نے بازینت تمام

ہاں ہنہ کو بلاؤ یہ بولا امیرِ شام
تب اک کنیزِ خاص نے اس سے کیا کلام

خاصہ نہ دن کو نوش کیا ہے نہ سوئی ہیں
بی بی سحر سے آج کئی بار روئی ہیں

لیٹی رہی ہیں منہ کو لپیٹے بصد ملال
چہرہ ہے زرد رونے سے آنکھیں ہیں دونوں لال

کنگھی نہ سر میں کی ہے نہ سرمے کا ہے خیال
کیوں دل گرفتہ ہیں نہیں کھلتا کسی پہ حال

حمام نے کیا ہے نہ کپڑے بدلتی ہیں
مہندی کے بدلے وہ کفِ افسوس ملتی ہیں

گہنا اُتار ڈالا ہے یوں جی میں آئی ہے
بے وجہ سوگواروں کی صورت بنائی ہے

تکیہ ہے تر یہ اشکوں کی ندی بہائی ہے
مسند پہ بیٹھنے کی قسم کل سے کھائی ہے

یہ شکل رنج و غم کی ہے اس باتمیز کی
جیسے سنائی آئے کسی کے عزیز کی

بولا خبر یہ سنتے ہی وہ بانیِ ستم
جا کر کہو کہ دیر سے یاں منتظر ہیں ہم

دوڑیں یہ حکم سُن کے خواصیں کئی بہم
ناچار ہند آن کے بیٹھی بچشمِ نم

ہرگز یزید کے تو نہ جانب نگاہ کی
دیکھا طعام گم تو اک سرد آہ کی

پوچھا یزید نے کہ ہے کچھ بادمزہ مزاج
بولی یہ ہند ہوتا ہے یاں رو دل میں آج

ہے ظلم اور ستم کا ترے عہد میں رواج
اپنے جگر کے زخم کا میں کیا کروں علاج

تجکو تو عید ہے مجھے صدمے گذرتے ہیں
یہ کون ہیں جو راتوں کو فریاد کرتے ہیں

بتلا یہ سب اسیر مسلماں ہیں یا نہیں
قوم ان کی کیا ہے صاحب ایماں ہیں یا نہیں

محبوب کبریا کے ثنا خواں ہیں یا نہیں
آیا یہ لوگ قایل قرآں ہیں یا نہیں

سنتی ہوں کیں آج سے نہ ہونگے زمانے میں
یہ کس خطا پہ قید ہوئے قید خانے میں

ہیں کیا یہ لوگ منکر پیغمبر الہ
شاید نہیں علی کے گھرانے سے ان کو راہ

کیوں ہاتھ سب کے باندھے ہیں کھلتا نہیں آہ
کاٹا ہے کس کا سر کسے لوٹا ہے بے گناہ

کافر ہے وہ عناد جسے پنجتن سے ہے
کیا دشمنی کچھ ان کو حسین و حسن سے ہے

کوئی اگر کہے بھی تو میں مانتی ہوں کب
ابرار و حق پرست ہیں قیدی یہ سب کے سب

میں سن چکی ہوں آپ صبائے نماز شب
فاقوں میں بھی وہ کرتے ہیں تا صبح شکر رب

گرمی سے گو کہ سینوں میں دم اکھڑ رہے ہیں
ماؤں کے ساتھ سجدے میں بچے بھی جھکتے ہیں

قیدی ہیں پر قضا کبھی ہوتی نہیں نماز
رکھتے ہیں پانچ وقت زمین پر سر نیاز

آواز میں سنا نہیں یہ سوز یہ گداز
سجدے میں حق سے کہتے ہیں کچھ اپنے دل کا راز

چھوٹے بڑوں کو عادت طاعت گذاری ہے
آٹھوں پہر درود زبانوں پہ جاری ہے

قیدی ہے ظاہرا کوئی بیمار و ناتواں
معلوم کچھ نہیں کہ وہ لڑکا ہے یا جواں

آواز اک ضعیف سی آتی تھی ہر زماں
کیسا کراہتا ہے سحر تک وہ نیمجاں

یہ درد ہے صدا میں کہ دل ٹکڑے ہوتے ہیں
رونے پہ اس کے لوگ محلے کے روتے ہیں

کرتا ہے جب تلاوت قرآں وہ حق کا نور
ہوتا ہے صحن حضرت داؤد کا ظہور

رشتہ کچھ اس کو مصحف ناطق سے ہے ضرور
قرآں کے حرف حرف کے معنی پہ ہے عبور

تقریر کیا فصیح ہے کیا خوش بیان ہے
گویا زبان اس کی خدا کی زبان ہے

دن بھر تو اس کو رہتا ہے غش اور درد سر
کرتا ہے نصف شب مناجات تا سحر

واللہ کیا دعاؤں کے فقروں میں ہے اثر
پہ جائے آب ہو کے جو پتھر کا ہو جگر

شاید کوئی عزیز شہ مشرقین ہے
صوت حزیں میں حسن صدائے حسین ہے

کہتے ہیں صبر و شکر اسے اللہ رے حوصلہ
شکوہ نہ طوق کا ہو نہ زنجیر کا گلہ

جاری ہو صبح و شام عبادت کا سلسلہ
ہر دم رواں ہو چشم سے اشکوں کا قافلہ

گردن جھکی ہوئی ہو خدا پر نگاہ ہو
لب پر کبھی تو آہ کبھی لا الہ ہو

سنتی ہوں ننھے بچے بھی دو چار ہیں اسیر
لڑکی بھی کوئی قید ہو رشکِ مہ منیر

رونے سے اس کے لگتے ہیں میرے جگر پہ تیر
کیا قہر ہے یہ ظلم غریبوں پہ اے امیر

دکھوے کسی کو یہ نہیں عادت کریم کی
قرآں میں حق نے کی ہے سفارش یتیم کی

اے رائے قلب کو اتنا بھی کر نہ سخت
عقبیٰ میں روسفید ہو تا اُو سیاہ بخت

رہتے ہیں سر جھکائے ہوئے بار و درخت
ڈر ہے مجھے کہیں نہ الٹ جائے تیرا تخت

حاکم کو خوف چاہیے قہرِ الٰہ سے
اکثر گری ہے برق یتیموں کی آہ سے

کرتے ہیں لطف و رحم فقیروں پہ اغنیا
عقبیٰ میں کام آتا ہے یا نکا دیا سیا

خالق نے اپنے ملک کا حاکم تجھے کیا
جز نام نیک کون جہاں میں سدا جیا

زنداں میں قیدیوں کا بہت حال غیر ہے
کچھ خیر کر کہ خیر سے عقبےٰ نجیر ہے

قاروں کا گنج اور ستم ایجاد کیا ہوا
نمرود کس طرف گیا شدّاد کیا ہوا

تھا پہلے وہ جو بانی بیداد کیا ہوا
فرعون بد نہاد سا جبلاّد کیا ہوا

وہ قبر میں ہیں آج جو کل تھے رواق میں
ڈھونڈو تو خاک بھی نہیں کسریٰ کے طاق میں

گرمی کی فصل اور یہ مکاں تنگ ہائے ہائے
اب رحم کر اے کوئی معصوم مر نہ جائے

فاقے سے ہوں وہ قید میں تو نعمتیں کھائے
پانی تو پیاس میں کوئی جا کر انھیں پلائے

دل سے بھلا نہ وعدۂ روزِ نخست کو
بیمار کو دوا نہ غذا تندرست کو

کھانے کو میں نہ ہاتھ لگاؤں گی کیسی بھوک
اُٹھتی ہے بار بار کلیجے میں میرے ہوک

ان کے بغیر مجھ کو یہ کھانا ہے مثل خوک
یہ بیکسوں پہ ظلم غریبوں سے یہ سلوک

خوش ہو گا حق دلوں کو یتیموں کے شاد کر
کیا رحم تھا کرم کو محمدؐ کے یاد کر

کافر کے گھر کو بھی کبھی لوٹا نہ بعد جنگ
چادر گلے میں ڈال کے کھینچا ہوئے نہ تنگ

جو ہاتھ آیا دیدیا سائل کو نے درنگ
عسرت یہ تھی کہ فاقوں میں باندھا شکم پہ سنگ

اس بادشاہِ دیں کو نہ کچھ فکر اور تھی
رانڈوں کی پرورش تھی یتیموں کی غور تھی

یکساں تھا خلق آپ کا شاہ و فقیر سے
بٹھلاتے تھے فقیر کو برتر امیر سے

باتیں تھیں پرورش کی یتیم و اسیر سے
کرتے تھے سیر انہیں طبق و شہد و شیر سے

ہر شب کو قیدیوں کی خبر لینے جاتے تھے
دو دن کے بعد نانِ جویں آپ کھاتے تھے

ہو آج تک جہاں میں علی کے کرم کا شور
ہر ایک کی زباں پہ ہو نقل فقیر کور

تھا بازوئے رسول میں دستِ خدا کا زور
پرواہ رے کرم نہ گوارا تھا رنج مور

کی اس نے کچھ زباں سے شکایت تو ڈر گئے
کاندھے پہ رکھ کے مشک ضعیفہ کے گھر گئے

رانڈوں کے وارث اور یتیموں کے تھے پدر
قاتل پہ مرتے مرتے رکھی رحم کی نظر

ہر دم حسین پر یہ تقید تھی اے پسر
قیدی کے بھی طعام کی رکھیو ذرا خبر

راضی نہ اس کے قتل پہ مشکل کشا ہوئے
مشکیں جو باندھ دیں تو حسن سے خفا ہوئے

خلقِ خدا ہو معترفِ حسنِ مجتبا
دریائے فیض ابر کرم منبعِ سخا

یا وش بخیر ذکر کروں کیا حسین کا
آقا کو دیر گا دسلامت رکھے خدا

دونوں جہاں میں کیا برکت ایک دم سے ہو
قایم جو ہو زمین تو انھیں کے قدم سے ہو

دینا ہوا اور حسین ہیں اس نام کے نثار
فیضِ نبی تو عصمت خاتونِ روزگار

ہو بات بات میں کرمِ شاہِ ذوالفقار
اور خلق میں نظیر حسن ہو وہ ذی وقار

خو ہو پیمبروں کی شہِ مشرقین میں
ہیں جمع کس قدر حسنات ایک حسین میں

تھی میں بھی فیضِ صحبتِ مولا سے بہرہ ور
پیدا کیا ہو حق نے عجب طرح کا بشر

نیلے نشان ہیں چاند سے کاندھوں پہ جلوہ گر
لیکر اناج جاتے ہیں خود بیکسوں کے گھر

اس پر بھی ہر گھڑی یہ دعا ہو الٰہ سے
یارب بچائیو مجھے بارِ گناہ سے

اس سالکِ طریقِ ہدایت کے میں فدا
ناقے تو پیچھے ہوتے ہیں آگے وہ مقتدا

اس سال بھی سُنا ہے کہ تشریف لائے ہیں
کیا جانے حج کے بعد سدھارے ہیں کدھر

رہتی ہوں اس خیال میں پہروں میں نوحہ گر
ہے دھوم کچھ دنوں سے جدال و قتال کی

اس خاندان میں کون ہا ہے سوائے شاہ
آگاہ ہوں کہ شاہ سے کینہ تجھے تھا آہ

بیتاب ہوں خیالِ شہِ نیکنام میں
وہ واں کا مقام تردد کی ہے یہ جا

پھر تھا نہ شک مجھے کوئی ہوتا جو دوسرا
اس نام پاک سے برکت ہے جہان میں

کیں ہند نے یہ درد کی باتیں جو ایک بار
اللہ رے جوشِ ماتمِ سلطانِ نامدار

خنجر غمِ حسین کا دشمن پہ چل گیا
رو کر پھر اس سے کہنے لگی ہند خوش سیر

گر کہہ تو دیکھ آؤں انھیں جا کے اک نظر
ہیں غیر یا عزیز شہِ انس و جاں کے ہیں

ناچار ہو کے ہند سے ظالم نے یہ کہا
واں جا کے اور ہوئیگا تجھ کو قلق سوا

پہلو میں مضطرب تھا دل اس حق پرست کا

غیر سب حج کو آتے ہیں اکثر پیادہ پا
خالق نے ان پہ ختم کیا زہد و اتقا

کعبے میں اہلِ بیت بھی ہمراہ آئے ہیں
لونڈی نے پھر سنی نہیں آقا کی کچھ خبر

کعبے میں گھر گئے ہوں نہ سلطانِ بحر و بر
یارب تو خیر کیجیو زہرا کے لال کی

قایم رہے جہان میں شہ کو مرا لہ
ہے ہے کیا نہ ہو کہیں زہرا کا گھر تباہ

شہزادیاں اسیر نہ ہوں فوجِ شام میں
روتے ہیں نام لیکے یہ قیدی حسین کا

گر ہے تو اک حسین ہے زہرا کا دلربا
عقدے وہ کھولدیتے ہیں سب ایک آن میں

ہر قلب پر ستم کی چلی تیغ آبدار
رو یا جھکا کے سر کو یزید زبوں شعار

کیا نام میں اثر ہے کہ پتھر پگھل گیا
ہوں بے قرار صورتِ بسمل میں نوحہ گر

شاید انھیں سے شہ کی مفصل سنوں خبر
دریافت تو کروں کہ یہ قیدی کہاں کے ہیں

جا دیکھ آ انھیں مرا نقصاں ہے اس میں کیا
سنتے ہی یہ کلام اُٹھی ہند باوفا

اُٹھتے ہی جلد حکم دیا بندوبست کا

سب عورتوں کو لیکے چلی جب وہ حق شناس
کہنے لگیں یہ سب جو کنیزیں تھیں آس پاس

کپڑے یہ ملگجے ہیں بدل ڈالیئے لباس
اس نے کہا کہ ہے مرے دل پر ہجوم یاس

اک دم میں سوگواروں کو میں دیکھ آتی ہوں
کیسا لباس کیا کسی شادی میں جاتی ہوں

میلے ہی کپڑے چاہئیں جب دل پہ ہو ملال
کچھ سوچ ہے مجھے تمھیں کچھ اور ہے خیال

کنگھی وہ کیا کرے کہ پریشاں ہو جس کا حال
ہے سر کا گوندھنا بھی مجھے اس گھڑی وبال

جی چاہتا ہے یہ کہ گریبان چاک ہو
کپڑے تو سب سیاہ ہوں اور سر پہ خاک ہو

لازم ہے بزم غم میں عزادار بن کے جائے
خود روئے پیٹے بین کرے اوروں کو رلائے

واں وارثوں کا سوگ ہے کپڑے کئے دکھائے
روتا ہے دل مقام ہے عبرت کا ہائے ہائے

کپڑے بدل کے رانڈوں میں جانا روا نہیں
ان میں چلی ہوں جن کے سروں پر ردا نہیں

نکلی محلسرا سے یہ کہکر وہ خوش سیر
تھیں ساتھ ساتھ چند خواصیں بھی نوحہ گر

پہونچی جناب حضرت زینب کو یہ خبر
رنگ اڑ گیا یہ کہنے لگیں سر کو پیٹ کر

اپنا نہیں خیال بزرگوں کا پاس ہے
ہے ہے کہاں چھپوں وہ مری روشناس ہے

ہے شرم کی جگہ کہ میں ہوں خواہر امام
غمگین و سوگوار و پریشان و تشنہ کام

ہم ہیں فقیر ہم میں امیروں کا کیا ہے کام
لوگو بتا نہ دیجو کہیں اس کو میرا نام

پوچھے جو وہ کسی سے کہ زینب کدھر گئی
کہدیجو کہ بھائی کے ہمراہ مر گئی

رو کر ہر اک سے بانوئے ناشاد نے کہا
کیا حاصل اضطراب سے قسمت کا جو لکھا

لوگو خدا کے واسطے چپکے رہو ذرا
رو رو کے سو گئی ہے ابھی میری دلربا

پھر حشر قید خانہ میں ہوگا جو روئیگی
چونکی اگر تو صبح تلک پھر نہ سوئے گی

چپ ہو گئے یہ سن کے اسیران نوحہ گر
جا بیٹھی ایک گوشہ میں زینب جھکا کے سر

آئی سواری زن حاکم قریب در
درباں بھی دور ہٹ گئے دروازہ کھولکر

وحشت پہ قید خانہ کی جس دم نگاہ کی
ہاتھوں پہ ہاتھ رکھ کے خواصوں نے آہ کی

دل ہند کا تو رند ہگیا تھرا گیا جگر
بولی ٹھہر کے ڈیوڑھی پہ یہ قبر ہی کہ گھر

دیکھا نہیں مکاں کوئی تاریک اس قدر
پوچھو کوئی کسی سے کہ ہیں بیبیاں کدھر

ایسا بھی ظلم کرتا ہی کوئی جہان میں
بندے خدا کے بند ہیں ایسے مکان میں

بڑھکر کسی کنیز نے تب یہ کیا بیاں
بی بی کوئی اسیروں میں ننھ نہیں ہی یاں

چلیے محل میں آپ بھلا جائینگی کہاں
قابل نہیں حضور کے جانے کے یہ مکاں

گر غش ہوئے تو آپ میں آیا نہ جائیگا
ہم سے تو اس خرابے میں جایا نہ جائیگا

آزردہ ہو کے کہنے لگی ہند نوحہ گر
عبرت کا یہ مقام ہی لونڈی خدا سے ڈر

آخر جو اس میں قید ہیں وہ بھی تو ہیں بشر
تاراج یوں جہاں میں نہوے کسی کا گھر

جانے وہی کلیجے پہ جس کے چھری لگے
ایسی نہ بات کہہ کہ خدا کو بری لگے

یہ بات کہہ کے آگے بڑھی وہ بصد الم
اک آفتاب دین نظر آیا اسیر غم

حلقہ گلے میں طوق کا زنجیر میں قدم
بولی ٹھہر کے وہ کہ رہے شوکت و حشم

انساں ہی یہ اندھیرے میں یا شمع طور ہی
آئی ندائے غیب کہ خالق کا نور ہی

پڑھتی ہوئی درود گئی جب قریب تر
اللہ رے حسن کرنے لگی خیرگی نظر

غل عورتوں میں تھا یہ فرشتہ ہی یا بشر
اُترا ہی آسماں سے خرابے میں یا قمر

رتبے میں ہی بزرگ نسب میں جلیل ہی
ثابت ہی ضعف سے کہ نہایت علیل ہی

کوئی بلائیں لیکے یہ کہتی تھی بار بار
اے بیکس و اسیر و بلاکش ترے نثار

ہو ہی گلا یہ چاند سا اور طوق خاردار
بیگوری گوری پنڈلیاں زنجیر سے فگار

لوگو بزرگ اس کے مقرر امیر ہیں
گویا جناب یوسف کنعاں اسیر ہیں

بولی کوئی کہ عابد و زاہد ہی یہ جواں
گھٹا جبیں پہ کثرت طاعت کا ہی نشاں

ایماں کا نور چہرۂ انور سے ہی عیاں
دیکھا نہیں حیا سے کہ ہیں کون بیبیاں

برج شریف قوم یہ گردوں اساس ہی
اشراف کو ہر ایک کی حرمت کا پاس ہی

جو غیر کی طرف نہ حیا سے کرے نظر
ماں بہن نہیں ایسے شخص کی بلوے میں ننگے سر

یہ خیر ہووے جس کی طبیعت میں اُس سے شر
ٹوٹے غضب خدا کا لعینوں کی جان پر

تقوے پہ اس کے عفت و عصمت گواہ ہے
قرآن ہم اُٹھالیں کہ یہ نئے گناہ ہے

افسوس ایسے بندۂ صالح پہ یہ تعب
زنداں میں کاٹتا ہے تڑپ کر تمام شب

بستر زمیں کا اور یہ تنِ زار ہے غضب
آنکھیں جو بند ہیں یہ نقاہت کا ہے سبب

ہے خامشی دلیل عبادت کے شوق کی
گردن جھکی ہوئی ہے گرانی سے طوق کی

باتیں یہ کر کے بیبیاں روتی تھیں زار زار
سینے میں تھا مگر نہ دل ہند کو قرار

کہتی تھی دیکھ کر رُخِ اقدس کو بار بار
کس ملک کا رئیس ہے یارب یہ ذی وقار

آنکھوں میں صاف پھرتی ہے صورت امام کی
تصویر ہے حسینِ علیہ السلام کی

آخر دبا کے پاؤں یہ بولی وہ نیکنام
اُٹھیے کہ دیر سے میں کھڑی ہوں پئے سلام

بولے یہ آنکھیں کھول کے مولائے خاص و عام
اس بیکس و یتیم و بلا کش سے کیا ہے کام

ہجر پدر میں تلخ ہے لذّت حیات کی
طاقت نہ آنکھیں کھولنے کی ہے نہ بات کی

بولی یہ ہند کب سے علالت ہے میں نثار
فرمایا ساتویں سے محرم کی ہے بخار

اس نے کہا طبیب کو دکھلاؤ حالِ زار
فرمایا خیر شافیِ مطلق ہے کردگار

راضی ہیں اس پہ ہم جو رضائے حبیب ہے
وہی ہے یہ تپ اسی نے جو سب کا طبیب ہے

رنج و بلا کو لطفِ خدا جانتے ہیں ہم
دُکھ میں کراہنے کو گلا جانتے ہیں ہم

ہر درد جانستاں کو دوا جانتے ہیں ہم
عارض ہو عارضہ تو شفا جانتے ہیں ہم

کچھ غم نہیں مرض سے اگر حال خیر ہے
صحت ہماری یہ ہے کہ عقبےٰ بخیر ہے

ایذا کو چین رنج کو راحت سمجھتے ہیں
شیریں کو تلخ شور کو لذت سمجھتے ہیں

صابر ہیں نانِ جو کو بھی نعمت سمجھتے ہیں
مرنے کو راہِ حق میں سعادت سمجھتے ہیں

عسرت ہو دکھ ہو قید ہو فاقہ کشی رہے
دولت یہی بڑی ہے کہ خالق خوشی رہے

یہ ذکر سُن کے رونے لگی ہند باوفا
کی عرض کیا ہے اسم مبارک حضور کا

گردن جھکا کے قبلۂ چارم نے یہ کہا
بیکس عزیز مردہ گرفتار رونے نوا

کیا پوچھتی ہے نام و نشاں خاکسار کا
اک بندۂ حقیر ہوں پروردگار کا

زیبا ہے نام پاک پئے خالقِ ودود
روزی رسانِ عالمیاں واجب الوجود

جو معرضِ فنا میں ہیں کیا ان کی ہست و بود
قطروں کی کیا بساط حبابوں کی کیا نمود

درپیش منزلِ لحدِ خوفناک ہے
آغاز اپنا خاک ہے انجام خاک ہے

تھے مرتضیٰ علی کے جہاں میں بہت خطاب
شیرِ خدا امیرِ عرب مالک الرقاب

کارہ تھا پر ترقی ظاہر سے وہ جناب
ہوتے تھے شاد کہتا تھا جو یا ابو تراب

جس کو فروتنی ہے وہی سربلند ہے
خالق کو خاکساریِ انساں پسند ہے

اس نے کہا بتائیے والد کا اپنے نام
فرمایا فاتحہ کشِ وطن آوارہ تشنہ کام

مقتول نیزہ و تبر و خنجر و حسام
جس کو ملا نہ پیاس میں پانی کا ایک جام

بے گور و بے کفن جسدِ پاش پاش ہے
سربان ہے کربلائے معلیٰ میں لاش ہے

پوچھا وطن کو اُس نے تو بولے شہِ زمن
دارِ فنا مقامِ فنا منزلِ محن

بیٹھے فقیر تھک کے جہاں ہے وہی وطن
بے خانماں اسیر و پریشان و خستہ تن

پردیس میں تباہ ہوئے شہر چھٹ گیا
جنگل میں ہم بھی لٹ گئے اور گھر بھی لٹ گیا

اس نے کہا کہ طوق سے ہوگا دم خفا
فرمایا جس میں خالقِ کونین کی رضا

گھٹتا ہے گر گلا تو کچھ اس کا نہیں گلا
بندے ہیں امرِ حق میں ہمیں اختیار کیا

صابر ہیں غیرِ شکرِ خدا کیا سخن کریں
ہم وہ نہیں کہ شکوۂ طوق و رسن کریں

وہ بولی اور بھائی بھی کہا تھے مہ منیر
فرمایا ہاں جواں تھا اک اور اک صغیر

جرات میں بے عدیل تھے صورت میں بے نظیر
دونوں کو تین روز نہ پانی ملا نہ شیر

اعدا کو دشمنی تھی صغیر و کبیر سے
برچھی سے ایک قتل ہوا ایک تیر سے

غش ہو گئے یہ کہہ کے امامِ فلک اساس
تھرا کے واں سے آگے بڑھی ہند نے حواس

پہونچی ٹھہر ٹھہر کے جو سیدانیوں کے پاس
رانڈوں کی شان دیکھ کے بولی وہ حق شناس

چہرے سبھوں کے غیرتِ خورشید و ماہ ہیں
گویا کہ اہلِ بیتِ رسالت پناہ ہیں

پیدا ہوا ان کی شان سے سیدانیوں کی شان
ظاہر ہے صبر و شکر سے سادات کا نشان

یا ہاشمی ہیں یا علوی ہیں یہ خستہ جاں
کس میں یہ معرفت کے سخن در یہ بیاں

یہ لاکھ گر چھپائیں تو کب مانتی ہوں میں
خوشبو کو اہلِ بیت کی پہچانتی ہوں میں

مٹی میں گو بھرے ہوئے ہیں ان کے روئے پاک
چھپتا ہے کوئی چاند پہ ڈالے ہزار خاک

ہر چند ہیں مصیبت و محنت سے سب ہلاک
روشن ہے قید خانۂ تاریک ہو لناک

ہیں کس طرح کہوں کہ یہ آلِ عبا نہیں
ہاں فرق اتنا ہے کہ سروں پر ردا نہیں

چہروں کی آب و تاب پہ لوگو کرو تو غور
دیکھا ہے قیدیوں کا کسی نے کبھی یہ طور

بازو ہیں ایک رسّی میں ہے یہ ظلم و جور
بچے بھی ہیں بندھے ہوئے دیکھو تم یا ور

مٹی میں مل گیا یہ چمن وا مصیبتا
ان گوریوں گردنوں میں رسن وا مصیبتا

اگر قریب کہنے لگی ہند خوشخصال
اے بیبیو ہٹا دو ذرا رخ سے اپنے بال

مجھ سے تو کچھ بیان کرو اپنے دل کا حال
کھنچتی تمہاری ہو گئی کس بن میں بال بال

کیوں پھر گئے عدو تمہیں بلوائے عام میں
کس جرم پر اسیر ہوئے ملک شام میں

سنتی ہوں میں مدینے میں ہے آپکا وطن
للہ کچھ کہو خبرِ سرورِ زمن

ہیں خیریت سے حضرتِ شبیر کی بہن
زندہ رکھے جہاں میں انھیں ربِّ ذوالمنن

وہ بی بی روح بنتِ رسالت پناہ ہے
عصمت پہ جس کی خالقِ اکبر گواہ ہے

کیوں بیبیو بتاؤ خدا کے لیے ذرا
ہے خیر سے مدینے میں فرزندِ مرتضا

سنتی ہوں اب جوان ہیں ہمشکلِ مصطفےٰ
سرسبز رکھے باغِ جہاں میں انھیں خدا

شہرت ہے ابنِ فاطمہ زہرا کے ماہ کی
حسرت تو شہ کو ہوئیگی اکبر کے بیاہ کی

حق سے یہی ہے شام و سحر اب مری دعا
آقا مرے جہاں میں سلامت ہیں سدا

اکبر کا سہرا بانو کو دکھلائے اب خدا
گھر میں بہو کو لائے جگر بند مصطفےٰ

ارمان نکلے بادشہِ مشرقین کا
آباد گھر ہو فاطمہ کے نورِ عین کا

جب ہند ختم کر چکی رو رو کے یہ کلام
بانو کے پاس آ کے یہ بولی وہ نیکنام

صدقے گئی بتایئے کیا آپ کا ہے نام
للہ کچھ کہو میں ہوئی جاتی ہوں تمام

زنداں میں سب اسیروں کی سردار آپ ہیں
ان قیدیوں کی قافلہ سالار آپ ہیں

بانو نے اس سے پھر یہ کہا تھام کر جگر
ہم قیدیوں کے نام ہیں مظلوم و نوحہ گر

زینب کو پھر بتا کے یہ بولی بچشمِ تر
یہ بی بی جو کہ روتی ہیں نہوڑائے اپنا سر

تو دل میں جانتی ہے کہ ان کی عزیز ہوں
مختار یہ مری ہیں میں ان کی کنیز ہوں

وہ بولی کی ہیں آپ کے فرزند خوش سیر
فرمایا رو کے لٹ گیا بی بی ہمارا گھر

تیر و سناں سے قتل ہوئے رن میں دو پسر
زنداں میں اک اسیر ہے مظلوم نوحہ گر

ٹکڑے جگر کے صدمۂ فرقت سے ہوتے ہیں
جو گود میں پلے تھے وہ جنگل میں سوتے ہیں

یہ سُن کے ہند رونے لگی تب بہ اشکِ آہ
پھر مڑ کے روئے حضرتِ زینت پہ کی نگاہ

رخ سے ہٹائے بال تو حالت ہوئی تباہ
بے ساختہ کہا کہ زہے قدرتِ الٰہ

ہرگز غلط نہیں جو مجھے اشتباہ ہے
زینب تمھیں ہو خالقِ اکبر گواہ ہے

کہنے لگی یہ ہند سے زینب جگر فگار
کیوں فال بد نکالتی ہے مجھ سے بار بار

اے ہند ان کا نام نہ لے بہر کردگار
نسبت جنہاں سے دے گہ وہ ہے فاطمہ وقار

اعدا تو مجھکو لیگئے بلوائے عام میں
دشمن نہ ان کے قید ہوں زندانِ شام میں

وہ شاد کام اور میں بیکس جگر فگار
آباد وہ ہیں اور میں زنداں میں سوگوار

بلوے میں لیگئے مجھے اعدا بحال زار
باہر کنیزان کی نہیں نکلی زینہار

وہ بی بی پردہ دار ہے اور خوش خصال ہے
زینب میں ہی ہوں یہ ترا بیجا خیال ہے

یہ سن کے بے قرار ہوئی ہند خوش خصال
دیکھا بغور رُخ تو یہ بولی بصد ملال

اے میری شاہزادی چھپاؤ نہ مجھ سے حال
زینب تمھیں ہو خواہر شبیر باکمال

تم کو قسم ہے فرقِ شہِ مشرقین کی
جلدی کہو خبر مرے آقا حسین کی

یہ کہہ کے پیٹنے جو لگی ہند ذی وقار
فوطِ قلق سے دل ہوا زینب کا بیقرار

چلائیں سر کو پیٹ کے با چشمِ اشکبار
اے ہند کٹ گیا سرِ شبیر نامدار

پانی دیا نہ سبطِ رسالت پناہ کو
حاکم نے بے گناہ کیا قتل شاہ کو

اے ہند کیا کہوں خبرِ شاہِ تشنہ لب
ہنگامِ عصر لٹ گیا زہرا کا باغ سب

مطلق ڈرا نہ خالقِ اکبر سے بے ادب
چوبِ یزید اور لبِ شبیر ہے غضب

رونے نہ پائے ماتمِ شاہِ شہید میں
سر ننگے لیگئے ہمیں بزمِ یزید میں

کیا پوچھتی ہے تو خبرِ شاہِ بحر و بر
فرقِ حسین تھا کبھی نیزے پہ جلوہ گر

باندھا درخت میں کبھی خولی نے بے خطر
لٹکا دریزید پہ سبطِ نبی کا سر

یاں تک تھی دشمنی سپہِ بدخصال کو
پتھر لگائے راہ میں زہرا کے لال کو

اے ہند رن میں شاہ کے یاور ہوئے شہید
عباس قتل ہو گئے اصغر ہوئے شہید

بن بیاہے دشت میں علی اکبر ہوئے شہید
شبر کا لال اور مرے دلبر ہوئے شہید

مرجھا کے فاطمہ کی نہ کھیتی ہری ہوئی
بچوں سے گود ہو گئی خالی بھری ہوئی

میداں میں بے کفن ہے ابھی لاشِ شاہِ پاک
ہے ہے وہ اُس اور وہ میدان ہولناک

واحسرتا وہ گرم ہوا اور وہ فرشِ خاک
کس طرح دل نہ ہو مرا سینے میں چاک چاک

چہلم تلک ہوا نہ شہِ مشرقین کا
ابتک پڑا ہے دھوپ میں لاشہ حسین کا

منگوایا ہند نے جو سرِ شاہِ بحر و بر
مجرے کو اُٹھ کھڑے ہوئے قیدی بچشمِ تر

جب سر پہ شاہ دیں کے سکینہ نے کی نظر
چلائی رو کے ہائے غضب مر گئے پدر

دنیا سے تشنہ کام سفر کر گئے حسین
لو مجھ پہ لیا یہ راز کھلا مر گئے حسین

پھر سر کو پیٹتی ہوئی دوڑی وہ سوگوار
دامن میں لے لیا سر شبیر نامدار

منھ رکھ کے منھ پہ شہ کے جو روئی وہ دلفگار
صدمہ ہوا نکلنے لگی تن سے جان زار

دنیا سے سب کی زیست کا نقشہ بدل گیا
جنبش ہوئی لبوں کو بس اور دم نکل گیا

بانو نے سر کو پیٹ کے تب یہ کیا بیاں
بس مل چکیں حسین سے قربان جائے ماں

اے نورعین بس نہ کرو نالہ و فغاں
ایسا نہ ہو کہ گھٹ کے نکل جائے تن سے جاں

بچھڑے ہیں کب سے بادشہ مشرقین سے
ہم بھی تو مل لیں فاطمہ کے نورعین سے

اٹھی یہ کہہ کے بانوئے بیکس برہنہ سر
دیکھا پڑی ہے خاک پہ نے جان وہ نوحہ گر

زینب کو پھر دکھا کے یہ بولی بچشم تر
بچی کو میری لیگئے سلطانِ بحر و بر

زنداں کے تھے وہ ظلم کہ عاجز تھی جان سے
افسوس چل بسی مری پیاری جہان سے

بی بی تمھاری ننھی سی میت کے میں نثار
منھ سے اٹھاؤ کرتے کا دامن پھر ایکبار

جی بھر کے تجھ کو دیکھ لے مادر جگر فگار
اماں کو اپنے پاس بلا لو تو ہو قرار

فرصت کبھی نہ ہوگی ہمیں شور و شین سے
تم یاں سے جا کے قبر میں سوؤ گی چین سے

ہے ہے اٹھائے قید میں کیا کیا نہ رنج و غم
باندھا گلے کو تم نے رسی سے ہے ستم

بابا کو یاد کر کے جو روتی تھیں دمبدم
دیتے تھے گھڑکیاں تمھیں یہ بانیِ ستم

زخمی ہیں کان پھول سے عارض کبود ہیں
ابتک نشان طمانچوں کے رخ پر نمود ہیں

بی بی خدا پہ خوب ہے روشن ہمارا حال
چادر تلک نہیں ہے چھپاؤں جو سر کے بال

کس طرح دوں کفن تجھے اے میری خوردسال
نادار ہوں میں پاس نہ دولت ہے اور نہ مال

سنگِ الم سے شیشۂ دل پاش پاش ہے
دو گز کفن کے واسطے محتاج لاش ہے

ہوتا جو واری پاس مرے کچھ بھی مال و زر
تربت بناتی ننھی سی میں سوختہ جگر

تابوت پر میں باندھتی سہرا بچشم تر
جو پوچھتا تو بس یہی کہتی میں نوحہ گر

میت یہی ہے بنتِ شہِ مشرقین کی
دنیا سے آج اٹھگئی عاشق حسین کی

بس اے انیس بزم میں ہے گریہ و بکا
یارب بحق احمد و زہرا و مجتبا
دم لب پہ ہے زیارت مولا نصیب ہو

وقتِ دعا ہے خالق اکبر سے کر دعا
دکھلا دے جلد روضۂ سلطانِ کربلا
بیمارِ غم کو قرب مسیحا نصیب ہو

رباعی

عزت ہے یار و آشنا کے آگے
یہ پاؤں چلیں تو راہ مولا میں چلیں

محجوب نہ ہوں شاہ و گدا کے آگے
یہ ہاتھ جب اٹھیں تو خدا کے آگے

رباعی

گو صورتِ دریا ہمہ تن جوش میں ہیں
کیا پوچھتے ہو مقام و مسکن میرا

لب خشک ہیں چشم تر ہے خاموش میں ہیں
مانندِ حباب خانہ بردوش ہوں میں

رباعی

مر آئینۂ خاطر کی جلا ہے رونا
پوچھا جو علاجِ دل مسیحا نے کہا

اور دیدۂ مردم کی ضیا ہے رونا
ہر درد کی دنیا میں دوا ہے رونا